سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت کراچی

اگست 2018

نگران اعلیٰ

معراج رسول

یوم آزادی مبارک

وردی، وعدہ اور وفا: مادرِ وطن کے عشق سے سرشار ایک شیر جواں کا زندگی نامہ

پہلا سیاسی لوٹا: پاکستانی سیاست کے ایک دلچسپ کردار کا ذکر خاص

قربانی: یومِ آزادی پر اسے ٹوٹا دل، بچھڑا یار بہت یاد آتا

جشنِ آزادی و ساون نمبر کی مناسبت سے اگست 2018ء کا خوب صورت پاکیزہ

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

شیرین حیدر اور **رفعت سراج** کے ناول کی چونکا دینے والی اقساط

دُردانہ نوشین خان نے چھیڑا اچھوتا موضوع اپنے نئے منی ناول **صُفہ** میں

حیا بخاری کے پُراثر قلم سے لکھا ایک یادگار ناولٹ...... **محبت لفظ ہے لیکن**

تہجّد......قیام اُللیل

کے موضوع پر پڑھیے...... **شمع ہدایت** کے سلسلے

میں **اختر شجاعت** کی زبردست تحقیق

اس کے علاوہ

نامور قلم کاروں کی متاثر کن تحریریں جن میں **رفاقت جاوید، پروین عذرا تشنہ، اسما طاہر، نگہت غفار، افراح سکندر، فرحین اظفر** و دیگر شامل ہیں

دلچسپ معلوماتی، تفریحی و اصلاحی مستقل سلسلے جن میں حُسن افزا نسخے، مزیدار کہانیوں کی تراکیب و مسحور کُن شاعری بھی شامل ہے اور یہ سب آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے ہی تو ہے

• قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 28 ❖ شمارہ 06 ❖ جولائی 2018ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

❖❖❖

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

❖❖❖

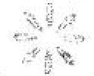
سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرِ سالانہ 900 روپے



پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

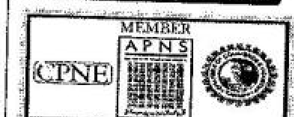
مقامِ اشاعت: C-63' فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ' کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس' ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ایک منی کہانی یاد آ رہی ہے سوچا آپ کو بھی سنا دوں۔

''ایک رفاہی تنظیم تھی'' خاصی مقبول۔ اس کے بہت سارے ممبران تھے۔ ان میں سے چند نے آواز اٹھائی کہ تنظیم کی کارکردگی غیر اطمینان بخش ہے۔ یہ ڈوب رہی ہے۔ اس میں اصلاح کی بہت ضرورت ہے، یا تو اصلاح کریں یا اسے توڑ دیں۔

تنظیم کے صدر نے مشاورتی کمیٹی سے سوال کیا۔ ''آپ میں سے جتنے لوگ غیر مطمئن ہیں ہاتھ کھڑے کردیں۔'' وہاں موجود بیس افراد نے ہاتھ اٹھا دیے۔ صدر نے ان پر نظر ڈال کر کہا۔ ''ہمیں سب کو ساتھ لے کر چلنا ہے، آپ سب بتائیں تنظیم میں کس قسم کی تبدیلی کی جائے؟'' تمام ممبران سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک گھنٹے بعد انہوں نے تجویز دی۔ ''تنظیم کے آٹھ صدر، چھ نائب صدر، چھ جنرل سیکریٹری ہونا چاہیے، سب کو پنشن بھی ملنا چاہیے۔''

صدر نے اپنی کیل نکلی ہوئی کرسی اور پھر کھڑکی دروازوں پر لگے، پھٹے پرانے پردوں پر نظر ڈالی اور تشویش سے کہا۔ ''اور میرے بچے؟''

مشترکہ آواز سنائی دی۔ ''وہ تاحیات صدر ہوں گے، ہم تا عمر ان کی جوتیاں سیدھی کریں گے۔''

پتا نہیں کیوں مجھے یہ کہانی آئینہ سی لگ رہی ہے کیونکہ پرچہ آنے تک الیکشن سر پر آ چکے ہوں گے۔

معراج رسول

سلمیٰ کا بلما

23 نومبر 1914ء کو بھرت پور راجستھان میں اس نے آنکھیں کھولیں۔ والد ڈاکٹر تھے۔ اسی پیشے نے انہیں وزیر آباد مغربی پنجاب سے یہاں کھینچ لایا تھا۔ ابھی وہ سنِ شعور کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ والد نے بھرت پور ریاست کی نوکری چھوڑ دی اور جموں کشمیر کی ریاست پونچھ منتقل ہو گئے۔ وہاں بھی وہ ریاست کے راجا کے نجی معالج کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ گو کہ ڈاکٹر صاحب کا وہ بیٹا ابھی نوجوانی کی سیڑھیوں پر تھا پھر بھی اسے قدرت کی صناعی سے عشق تھا۔ پونچھ کی وادیوں کے حسن نے اسے گرویدہ کر لیا تھا۔ وہ اس چھوٹی سی عمر میں وادی کے حسن سے متاثر ہونے کے لیے گھنٹوں اکیلے بیٹھا رہتا۔ سردیوں میں برف کے گرنے سے بہاروں میں پھولوں کے کھلنے تک وہ فطرت کی گوناگوں کیفیتوں کا قریب سے مطالعہ کرتا۔ گویا چھوٹی عمر میں بڑی بڑی باتیں سوچنے لگا تھا۔ کشمیر کی وادیوں مرغزاروں میں رہنے والوں کی مجبوری بے چارگی اور غربت کا تضاد اسے واضح اور شدید محسوس ہوتا اور وہ سوچنے لگتا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کے اسباب و علل پر غور کرتا۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ اب وہ بڑی کلاسوں کا طالب علم تھا، اس کے مضامین میں سائنس اس کا پسندیدہ سبجیکٹ تھا۔ سائنس کا طریقہ استدلال اور استخراج خاص پسند تھا کیونکہ وہ اشیاء کو اجزاء میں تقسیم کرتا اور پھر ان اجزاء کو ایک مرکب میں باندھ دیتا اور اس طرح تخلیق اور تخریب کے اصولوں کو سمجھنے کی عقلی کوشش کرتا۔ فطرت اور سائنس کے بعد تیسرا موڑ اشتراکیت کا آیا، اس نے مارکس، لینن اور اینگلز کی تعلیمات کا مطالعہ شروع کیا۔ یہی وجہ تھی کہ 1947ء میں جب آزادی کا بگل بجا تو اس نے ایک ملک کی آزادی کے تصور کو پرے جھٹک دیا۔ اس نے ایشیا، افریقا، جنوبی امریکا کے کروڑوں عوام کی آزادی کی تحریک کو کسی اور صورت میں دیکھا۔ اسی کے ساتھ اس کی دلچسپی ادب میں بھی بڑھنے لگی۔ سب سے پہلی ادبی کتاب جو اس نے پڑھی وہ الف لیلہ کا اردو ترجمہ تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اس وقت تیسری جماعت میں تھا پھر تو اسے ادب کا ایسا چسکا پڑا کہ اس نے اردو ہندی کے علاوہ انگریزی کے تمام بڑے مصنفین کو پڑھ ڈالا۔ پھر جب 1930ء میں لاہور کے فورمین کرسچن کالج میں آیا تو اس نے کالج کے میگزین کا انگریزی حصے کی ادارت سنبھال لی۔ 1932ء میں اس کا پہلا افسانہ ''سادھو'' چھپا تو پھر وہ لکھتا ہی چلا گیا۔ ایک سو سے زیادہ ناولیں اور کئی ہزار افسانے، کہانیاں اس نے لکھیں۔ افسانوی مجموعے میں خیال، نظارے، ہوائی قلعے، گھونگٹ میں گوری، ٹوٹے ہوئے تارے، زندگی کے موڑ پر، نغمے کی موت، پرانے خدا، ان داتا، تین غنڈے، ہم وحشی ہیں، اجنتا سے آگے، ایک گرجا، ایک خندق، سمندر دور ہے، شکست کے بعد، نئے غلام، میں انتظار کروں گا، مزاحیہ افسانے، ایک روپیا ایک پھول، یوکلپٹس کی ڈالی، ہائیڈروجن بم کے بعد، نئے افسانے، کعبے کا کفن، دل کسی کا دوست نہیں، مسکرانے والیاں، کرشن چندر کے افسانے، سپنوں کا قیدی، مس نینی تال، دسواں پل، گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو، آدھے گھنٹے کا خدا، اجنبی لڑکی کالے بال وغیرہ بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ افسانوی مجموعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنا لکھتے تھے۔ ناولوں کے علاوہ انہوں نے فلم اسکرپٹ بھی لکھا۔ دھرتی کے لعل (1946) ممتا (1966) شرافت (1970) زیادہ مشہور فلمیں ہیں۔ انہوں نے سلمیٰ صدیقی سے دوسری شادی کی تھی۔ اسی لیے قریبی دوست انہیں سلمیٰ کو بلما کہہ کر مخاطب کرتے۔ بمبئی والے گھر میں بیٹھے لکھ رہے تھے۔ عنوان تھا ''ادب برائے بطخ'' انہوں نے پہلا جملہ لکھا تھا۔ ''نورانی کو بچپن ہی سے جانوروں کا شوق تھا۔ کبوتر، بندر، رنگ برنگی چڑیاں......'' کہ حرکت قلب کا حملہ ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کی پہلی بیوی ودیاوتی سے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں ایک بیٹا، بیٹے کو جیسے ہی خبر ملی کہ ہارٹ اٹیک ہوا ہے وہ فوراً سوتیلی ماں سلمیٰ صدیقی کے پاس پہنچا اور سلمیٰ کے منع کرنے کے باوجود باپ کی نعش کو اٹھا لے گیا۔ سلمیٰ سے شادی کرنے سے پہلے ہی وہ مسلمان ہو چکے تھے پھر بھی بیٹے نے شمشان گھاٹ لے کر چتا جلوا دی۔ مسلمان ہو کر بھی چتا کی آگ میں جلنے والے قلم کار کو ہم کرشن چندر کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیرِ اعلیٰ



☆ نزاہت افشاں کی گاؤں مہورہ، فتح جنگ سے آمد۔ ''29 مئی کی صبح ہی سرگزشت مل گیا۔ اداریہ میں معراج رسول صاحب ایک تلخ حقیقت کو عیاں کررہے تھے۔ بہرحال ایک سنی سنائی کہانی ہے کہ رمضان کے بعد شیطان تمام دکانداروں کو مبارک باد دینے پہنچ گیا، کسی نے وجہ پوچھی تو بولا میں رمضان میں قید تھا لیکن ان دکانداروں نے میری عدم موجودگی میں میرے کام کو بخوبی سرانجام دیا اس لیے میں انہیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔ اب آتے ہیں نئے شمارے کی طرف یک صفحی سرگزشت اس بار ناصر کاظمی کے حوالے سے تھی۔ ناصر غزل کے بہت عمدہ اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی سے ایک انٹرویو کے دوران پوچھا گیا کہ بیسویں صدی کے تین عظیم شعراء کون کون سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا تھا کہ نظم کے تین بڑے شاعر اقبال، فیض اور مجید امجد ہیں جب کہ غزل کے تین بڑے شاعر حسرت موہانی، جگر مرادآبادی اور ناصر کاظمی ہیں اور یہ رائے کسی عام ناقد کی نہیں بلکہ ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسی فاضل ہستی کی ہے۔ ناصر کو میر ثانی اور مقلد میر بھی کہا گیا، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ناصر نے 47 سال کی مختصری زندگی میں جو اہم تخلیقات پیش کیں ان کے ہم عصر شعراء جنہوں نے 90,90 سال کی طویل عمریں پائیں ان سے بہتر ادب تخلیق نہ کرسکے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ناصر صرف شاعر ہی نہیں........ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کے نثری مضمونوں کا مجموعہ ''خشک چشمے کے کنارے'' اس بات کا گواہ ہے۔ بہرحال ناصر کاظمی مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے تھے ناصر نے اپنی تاریخ پیدائش 8 دسمبر 1925ء بتائی جب کہ میٹرک کی سند پر ان کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر 1923ء ہے۔ میرے پاس لکھائی کے نمونے بھی موجود ہیں اور ساتھ ہی میٹرک کی سند کی فوٹو کاپی بھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں دوسرے شعراء کی طرح ناصر کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا یہاں تک کہ وقت رخصت ان کے پاس علاج کے لیے پیسے تک نہ تھے۔ رکشا اور تانگے والوں نے چندہ جمع کرکے کچھ رقم انہیں اسپتال میں پیش کی تھی مگر اہل اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ناصر کی وفات معدہ کے کینسر سے ہوئی مگر یہ ایک بہانہ بنا درحقیقت انہیں کم مائیگی کے احساس نے اندر سے توڑ دیا تھا اسی صدمے نے ناصر کی جان لے لی۔ غم روزگار اس کے علاوہ تھا۔ وہ تو بھلا ہو، حفیظ ہوشیار پوری کا جنہوں نے ناصر کو 1964ء میں ریڈیو پاکستان پر اسکرپٹ رائٹر لگوا دیا تھا یوں ناصر کو قدرے اطمینان ہوا لیکن حقیقت یہی ہے کہ ناصر سے بے رخی برتی گئی حالانکہ فراق گورکھپوری، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر دین تاثیر جیسے لوگ بھی ناصر کی شاعری کے مداح تھے۔ ''غلام آقا'' بہت زبردست تحریر تھی۔ حضرت بلالؓ کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ''چارہ گر'' اور ''بابائے کراچی'' اعلیٰ پائے کی تحریریں تھیں۔ انور فرہاد اس بار ''تسلیم فاضلی'' کے ساتھ حاضر تھے، معلوماتی تحریر تھی۔ 35 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوجانا اور وہ بھی اتنی عمدہ شاعری کرکے یہ بہت حیران کن بات ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ارے یہ کیا، اس بار نسرین کا سرے سے کوئی ذکر نہیں۔ ندیم صاحب سچ مچ بنت فرنگ کی صحبت ساحرانہ میں قندِ فارس کو بھول گئے۔ خیر حیرانگی کی کوئی بات نہیں کیونکہ مرد حضرات کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے۔ باقی مجموعی طور پر سفرنامہ اچھا جارہا ہے لیکن باجی نسرین کا ذکر نہ ہو تو ہمیں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ ''ہتھیار'' اور ''سیاسی قتل'' بھی بہترین تحریریں تھیں۔ ''ناسور'' اب ہمارے لیے ناسور بن چکی ہے کیونکہ یہ مار دھاڑ والے قسط وار ناول پڑھ پڑھ کر ہم اکتا چکے ہیں۔ ''ماں صدقے'' اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔ نوشین احمقوں کی طرح شادی کے بعد پھر میکے پہنچ گئی تھی لیکن اس کے والد شیخ عبدالعزیز کو خراج تحسین پیش کیا جانا چاہیے کہ اس نے دانشمندی سے کام لے کر اسے حقیقت کا احساس

دلایا کہ میکہ اب تمہارا گھر نہیں اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ ''امانت'' اچھی تحریر تھی۔ ''معاوضہ'' میں ساحر کے ساتھ بہت برا ہوا سازشی عناصر نے اسے بہت گھاگ طریقے سے نہ صرف ناکارہ کردیا بلکہ اس کی زندگی ہی خطرے میں ڈال دی۔ ''انصاف'' بھی سبق آموز تحریر تھی۔ قدرت نے ظلم و جبر کے ساتھ جیتنے والے کو اپنی پکڑ میں لے لیا۔ ''مٹھی بھر زمین'' میں جو حالات رقم کیے گئے یہ کوئی نئی بات نہیں آج بھی غریب مزارعوں پر نام نہاد وڈیرے ظلم و ستم کررہے ہیں لیکن وہ یہ تلخ حقیقت بھول گئے ہیں کہ جس زمین کے لیے وہ اتنا جھگڑا کررہے ہیں شاید انہیں اس میں دوگز زمین بھی نہ ملے آخری آرام گاہ کے لیے۔ ''سلسلہ عذاب'' اور ''گناہ گار'' بھی درس آموز تحریریں تھیں۔ ''بھیڑیئے'' زبردست تحریر تھی اور بھارتی بھیڑیوں کے ظلم و ستم کو عیاں کررہی تھی۔ شہرِ خیال میں صدارت اس بار ہمارے محترم تبصرہ نگار بھائی آفتاب احمد نصیر اشرفی کے حصے میں آئی۔ اشرفی صاحب آپ نے ہماری کمی کو محسوس کیا بہت بہت شکریہ۔ کرکٹ کے حوالے سے آپ نے درست فرمایا۔ عبدالجبار رومی اور سینئر تبصرہ نگار خالد محمود بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ سید امتیاز حسین بخاری سے شکایت ہے کہ وہ پہلے کی طرح بھرپور علمی تبصرہ کیوں نہیں لکھتے۔ حمیرا کوکب واسطی آپ نے جن شخصیات کے نام لیے یہ سب میری پسندیدہ ہستیاں ہیں خصوصاً اکبرالہ آبادی کا تو میں عاشق صادق ہوں، ویسے تاریخ اسلام اور اردو ادب کو میں نے نہ صرف پڑھا ہے بلکہ کھایا، پیا اور ہضم کیا ہوا ہے اور یہ بھی آگاہی دیتا چلوں کہ اکبر پر ہم نے صرف طنز و مزاح کا لیبل لگایا ہوا ہے حالانکہ اکبر غزل کا بہت بلند پایہ اور نامور شاعر ہے۔ اقبال بھی اکبر کے معترف تھے۔ طارق خان تمر کھولہ سے، آپ نے کہا کہ لوگ اتنے طویل تبصرے کیسے لکھ لیتے ہیں؟ تو جناب جامع تبصرہ لکھنے کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے ورنہ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کوثر علی کوثر کوئٹہ سے، جناب آپ کا کہنا ہے کہ علی سفیان آفاقی کی کمی محسوس نہیں ہورہی۔ یہ درست نہیں کیونکہ علی سفیان آفاقی جیسی جامع العلوم ہستی کا نعم البدل کوئی لکھاری نہیں ہوسکتا۔ آفاقی صاحب کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی اس لیے کہ ہر قلم کار کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اس بار یہ کیا کہ میری پیاری سسٹر سدرہ بانو ناگوری پھر غیر حاضر ہیں؟ (ان کا خط تاخیر سے ملا اور عید کی چھٹیوں کے سبب پرچہ پریس بھیجا جاچکا تھا) رانا شاہد بھی غیر حاضر تھے۔ حکیم سید رضا شاہ میانوالی نہ جانے کہاں غائب ہیں۔ راولپنڈی سے احمد خان توحیدی صاحب بھی کہیں گم ہیں؟ آخر میں ایک تصحیح کرتا چلوں کہ محترمہ سدرہ بانو ناگوری نے مئی کے شمارے میں یہ مشہور شعر ''یادِ ماضی عذاب ہے یارب! چھین لے مجھ سے حافظہ میرا'' غالب سے منسوب کیا جب کہ حقیقت میں یہ شعر ہے جناب اختر انصاری کا تفصیل کے لیے دیکھیے ان کا مجموعہ کلام ''آبگینے'' (صحیح کہا، یہ شعر اختر انصاری کا ہے جو غالب سے منسوب ہوگیا) تمام احباب کو سلامِ عقیدت۔''

☆ قیصر خان کی گل افشانی بھکر سے۔ ''اداریہ میں انکل مہنگائی کا رونا رو رہے تھے جو کہ رمضان کے مہینے میں شروع سے آرہی ہے۔ معاشرے میں رمضان کے علاوہ دیگر دنوں کے ایام و حالات بھی دیکھیں پرائیویٹ اسپتال، اسکول، کالج جو خدمت کے نام پر ناجائز رقم لیتے ہیں، غریب کہاں جائے! یہود و نصاریٰ عوام کو سہولت دینے والے ادارے بہتر سے بہتر کام کررہے ہیں اور ہم مسلمان دوسروں کے واسطے رکاوٹ پیدا کرنے میں لگے ہیں۔ یک صفحی میں ناصر کاظمی کے بارے میں پڑھنے کو ملا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، (آمین) شہرِ خیال میں ہمارے انکل محترم خلیفہ اشرفی صاحب کرسی صدارت پر ملے، بہت مبارک اللہ تعالیٰ لمبی عمر دے (آمین)۔ ان کے علاوہ نئے اور پرانے تمام تبصرے پسند آئے ممتاز اشعر صاحب میرے پڑوسی ہیں۔ محمد عامر ساحل، قرۃ العین، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری وغیرہ حاضر نہیں تھے ساتھ میں خالد محمود صاحب بھی لیٹ کمرز میں میرے بھکر کے محمد عماد صاحب تھے سید انور عباس شاہ گم ہوگئے ہیں دنیا کے جھمیلوں میں۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس بار مئوذن رسولؐ کے بارے میں بہت اعلیٰ تحریر لائے، اللہ تعالیٰ سلامت رکھے۔ چارہ گر، بابائے کراچی، برفیلا جہنم، لمبے ہاتھ، جنگجو ملکہ، جہان دیگر، ہتھیار، سیاسی قتل کے ساتھ انکل انور فرہاد اور انکل ندیم اقبال باکمال مضمون اور سفرنامہ لے کر آئے۔ کچھ بے وفائی کی بو آرہی ہے انکل ندیم میں لیکن لگتا ہے سنبھل جائیں گے، سچ بیانیوں میں سلسلہ عذاب آخری کہانی نے بہت دکھی کیا۔ معلوم نہیں دوست بھی کیا خوب ملتے ہیں، مصیبت کی وجہ ... بنے اور وہ دکھ ملا جو آج تک جاری ہے۔ اتنی اذیت ناک کہانی تھی کہ دل مٹھی میں آگیا۔ اتنے دکھی الفاظ تھے کہ میرا دل پورا ... پریشان رہا اللہ صبر دے، (آمین)۔''

☆ حنیف ادیب لاہور سے لکھتے ہیں۔ ''نیا شمارہ سرگزشت کا پیشِ نظر ہے۔ ابھی تک زیادہ پڑھ نہیں سکا۔ جو کچھ پڑھا ہے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کررہا ہوں۔ ندیم اقبال کے سفرنامے کی قسط پڑھی۔ بہت دلچسپ ہے۔ نئی قسط میں پہلے سے زیادہ ہی کوہ پیمائی کی ہے جو قاری کو شروع سے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے۔ محترم مصنف کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جہاں جہاں کے ماحول، اردگرد اور آس پاس کی دلکشی کی تصویر بڑے خوب صورت اور واضح الفاظ اور دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ منظر نگاری کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ ندیم کا انداز بیان بے حد دلکش ہے جس سے قاری خوب محظوظ ہوتا ہے۔ وہ حالات و واقعات، مقامات کی بڑی خوب صورتی سے تصویر کشی کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ الفاظ کا خوب صورت چناؤ مصنف کی تحریر کو ایک نرالا نکھار دے دیتا ہے۔ سچ بیانی جو میں پڑھ سکا ہوں وہ ''معاوضہ'' کے عنوان سے ہے۔ دلچسپ اور اچھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے واقعات کو واضح اور اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک تجویز پیش کر رہا ہوں وہ یہ کہ جیسے علمی آزمائش آرہی تھی۔ اب آپ اگر یہ سلسلہ شروع کریں کہ ہر ماہ کوئی اچھا سا ایک شعر دے دیں اور قارئین سے اس کے شاعر کا نام دریافت کریں تو میرے خیال میں یہ سلسلہ بڑا اچھا رہے گا۔ یہ میری ایک تجویز ہے اگر پسند آئے تو۔ (آپ کی تجویز نوٹ کرلی)۔''

☆ صوفی شاہ ہری پور ہزارہ سے لکھتی ہیں۔ ''سرگزشت باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ اس سے پہلے دو دفعہ بلکہ تین بار ای میل بھی کی مگر شاید آپ کو نہیں ملی اس میں، میں نے ایک سچ بیانی ''دیالی'' کا خصوصی طور سے ذکر کیا تھا جس نے میرے ذہن اور دل پر ایک گہرا تاثر چھوڑا تھا۔ ایک شمارے میں کسی محترمہ نے پراسرار کہانیوں کے بارے میں لکھا تھا کہ نہ دیا کریں مگر ان کو نہیں پتا کہ بہت سے قارئین ایسے بھی ہیں کہ جن کو ہر مہینے انتظار رہتا ہے کہ کوئی نہ کوئی پراسرار سچ بیانی پڑھنے کو ملے گی اور سچ کہوں انکل اگرچہ مجھے تو اب پراسرار نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔ نزاہت افشاں صاحب نے مجھے کسی شمارے میں یاد کیا تھا تب کی گئی ہوئی میں آج حاضر ہوئی ہوں۔ بھائی نزاہت بہت شکریہ یاد کرنے کا۔ بشریٰ افضل روبینہ نفیس کہاں گم ہیں آپ لوگ۔ آگے الیکشن بھی آرہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ نیک اور ایمان دار لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی ڈور تھمائے جو پاکستان کے ساتھ مخلص ہوں تمام قارئین و اسٹاف کو سلام۔''

☆ اویس شیخ کا ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ای میل۔ ''آج خط بھیجنے کی تاریخ گزر چکی ہے۔ تبصرہ لکھ لیتا لیکن اسے پوسٹ کرنے کا وقت نہیں ملتا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ سے ریگولر ہونے کی کوشش کروں گا۔ اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے، آمین۔''

☆ ہارون ملک کا ای میل لاہور سے۔ ''سرگزشت سے ایک پرانی وابستگی ہے لیکن پہلی مرتبہ سرگزشت کے شہر خیال میں حاضری قبول فرمائیے۔ جولائی کا شمارہ ستائیس تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے سنسنی خیزیوں سے بھرپور سلسلہ ''ناسور'' پڑھی۔ پچھلے چند شماروں میں شہر خیال میں ''ناسور'' کے بارے میں منفی تبصرے دیکھنے کو ملے جس پر مجھے اپنے خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ناسور موجودہ تناظر میں ایک بہترین ناول ہے کہ کس طرح قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے وقت کے ناسوروں اور فرعونوں کا مقابلہ کیا جائے اور اپنا اور اپنی فیملی کا دفاع کیا جائے نہ کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ بہرحال اگر تحریر میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ کوتاہیاں ہو بھی جائیں تو ان کو درگزر فرما کر اصلاح کیجیے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ہمیشہ کی طرح ٹاپ پر رہی، اس کے علاوہ برفیلا جہنم اور سچ بیانیوں میں ماں صدقے کو بہترین پایا۔ سچ بیانیوں میں آپ بیتیوں کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ مثال کے طور پر جولائی کے سلسلے میں مٹھی بھر زمین میں امتیاز تو بعد میں مرگیا تھا لیکن امتیاز اور فرید کے درمیان آدھی رات کو ہونے والی لفظ بہ لفظ گفتگو کا حقیقت سے کتنا تعلق ہے؟ (کیا فرید بھی مرگیا تھا؟ ایسا تو کہانی میں کہیں نہیں لکھا ہے۔ ہمیں جس کہانی پر بھی شبہ ہوتا ہے کہ یہ سچ نہیں ہے تو اسے فوراً مسترد کر دیتے ہیں)۔''

☆ ابرار الحق کا ای میل لاہور سے۔ ''اس بار کا شمارہ ضخامت میں کم لیکن ''ریڈنگ میٹر'' میں زیادہ تھا۔ اس کاوش کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ اتنے بہتر انداز میں زیادہ مواد دیا ہے۔ اس بار کے شمارے میں چارہ گر اور زویا اعجاز اور بابائے کراچی از شکیل صدیقی بہت پسند آئی۔ غلام آقا کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ منفرد و نفیس انداز انور فرہاد بھی خاصے کی چیز تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ندیم اقبال الفاظ سے کھیلنے کا فن جانتے ہیں۔ سچ بیانیوں میں ماں صدقے اور سلسلہ عذاب بہت پسند آئی ہے۔''

☆ کسا زہرا کا ای میل۔ ''سب سے پہلے سلام ان سب کو جو اس رسالے کو مرتب کرتے ہیں۔ خاص کر معراج رسول صاحب اور عذرا رسول صاحبہ کو اور پھر تمام قارئین کو۔ میں سرگزشت ڈائجسٹ انتہا سے زیادہ پسند کرتی ہوں اس لیے کہ اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ اس رسالے کو تخلیق کیا جاتا ہے معلومات کے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کے واقعات سے بھی ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کی ہے۔ شہر خیال میں آئندہ بھی لکھتی رہوں گی۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا کراچی سے خلوص نامہ۔ ''بہت بجھے دل کے ساتھ تبصرہ ارسال کر رہی ہوں کیونکہ آپ نے

اس بار بھی میرا تبصرہ شائع نہیں کیا، پچھلے ماہ بھی B.L میں جگہ ملی تھی لیکن اب تو وہاں بھی ہمارا نام و نشان تک نہیں۔ انکل سرگزشت مجھے 22,21 تاریخ تک مل جاتا ہے اور میں صرف دو یا تین دن میں پورا رسالہ پڑھ کر خط پوسٹ کر دیتی ہوں، آپ خود بھی میرے تبصروں پر لکھی ہوئی تاریخ دیکھتے ہوں گے پھر بھی میرے ساتھ یہ بے رخی برتی جارہی ہے، کیوں؟ (گزشتہ دو پرچے رمضان اور عید کی وجہ سے پہلے تیار کرلیے گئے۔ تمہارے خطوط ملے لیکن پرچا پریس جانے کے بعد۔ ایسا ہو جاتا ہے اس لیے دل پر نہ لو، تمہارا شمار سرگزشت کے ان قارئین میں ہے جن کے تبصرے کا میں انتظار کرتا ہوں۔ بس اب غصہ تھوک کر مسکرا دو) ایمانی جذبے سے سرشار کرتی ڈاکٹر ساجد امجد کی ''غلام آقا'' سیدھی دل میں اتر گئی، سبحان اللہ۔ کیا شان تھی بلالؓ کی اور کیا مقام تھا اللہ اللہ۔ لیکن پیارے نبیؐ کے اس چہیتے نے جس دین اسلام کے لیے اس قدر سختیاں جھیلیں کہ کبھی جھلستی دھوپ میں آبلے پہلے سے تو کبھی بھاری بھرکم پتھروں کا بوجھ اپنے سینے پر برداشت کیا۔ آج اس دین اسلام کا ہم نام نہاد مسلمانوں نے کیا حشر کر دیا ہے، روزے مہنگائی کی نذر ہوگئے، عبادات، نمازیں، خیرات، زکوٰۃ دکھاوے کی ہوگئی۔ حج اور قربانی کاروبار بن گئے۔ مسجدیں فرقوں میں بٹ گئیں۔ ان پڑھ اور جاہل لوگ مولوی اور مذہبی اسکالر بنے اپنے اپنے فرقوں کی دکان سجا کر دین اسلام کا چہرہ مسخ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ہم پیارے دین کی بہت بے قدری کر رہے ہیں تف ہے ہم پر۔ انور فرہاد صاحب جان کر اچھا لگا کہ آپ اپنے پڑھنے والوں کی خواہشات کا احترام کرتے ہیں۔ تسلیم فاضلی کے مدھر اور شاہکار گیت کبھی کبھی ریڈیو پاکستان یا ایف ایم کے دوسرے چینلو پر سننے کو مل جاتے ہیں تو کانوں میں جیسے رس سا گھل جاتا ہے، آپ پلیز ماضی کی سپرہٹ اداکارہ روحی بانو پر بھی کچھ لکھیں۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں الجھتی ''آتش فشاں'' اور ''برفیلا جہنم'' نے دل کی دھڑکنوں کو تیز تر کر دیا لیکن جوں جوں پڑھتے گئے دل کو تسلی ہوتی گئی کہ دونوں کا اختتام بھی خوشی ہوگیا۔ ''ناسور'' پڑھ کر اب بوریت سی ہونے لگی ہے اس کا سدباب کریں۔ اب نعمان کے دشمنوں میں اضافہ کرنے کے بجائے اس کے موجودہ دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کا کچھ سوچیں۔ بابائے کراچی پڑھتے ہوئے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے نصاب کا کوئی خشک مضمون پڑھ رہے ہوں۔ بڑی معذرت کے ساتھ شکیل صدیقی صاحب کہ بابائے کراچی کی روداد میں وہ کشش ہی نہیں تھی جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے سکے آپ کے انداز تحریر میں نکھار ہوتا تو یہ تحریر کچھ بہتر ہو سکتی تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' پڑھ کر مزہ آگیا۔ بے حد دلچسپ اور بہت اچھے، میگی اور سرجی کے انوکھے عشق نے خوب انجوائے کروایا، جاناں اور جولین نے بھی بوریت کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ ندیم بھائی بڑے سلیقے سے ٹورنٹو کے حسن کو بیان کر رہے ہیں۔ اسکاٹش خواتین، مطیع، مفتی، خان، شہباز بھی اپنے اپنے انداز میں اس سفرنامے کی رونقوں کو بڑھا رہے ہیں۔ زویا اعجاز کا انتخاب ہمیشہ کی طرح لاجواب رہا، دنیا کی عظیم فاتح معظمہ کے حوصلوں اور جستجو نے بے حد متاثر کیا۔ انکل آپ بیت بازی اور علمی آزمائش کے سلسلے کو کیوں بند کر رہے ہیں اس سے اچھا تھا کہ آپ سچ بیانیوں میں کچھ کمی کر دیتے۔ کہانیاں تو ہر جگہ مل جاتی ہیں مگر بیت بازی اور ذہنی آزمائش کے سلسلے کہیں اور نہیں مل سکتے اس لیے براہ مہربانی اس سلسلے کو دوبارہ بحال کریں۔ (ذہنی آزمائش کی جگہ بہت جلد نیا سلسلہ شروع کیا جائے گا تھوڑا انتظار کرلیں۔ یوں بھی ذہنی آزمائش منفرد سلسلہ تھا لیکن پہلے جیسی دلچسپی قارئین نہیں لے رہے تھے) اور ہمارے شہر خیال کے محترم بھائی آفتاب احمد نے جو تجویز دی ہے اس پر غور فرمائیے، روپے کی قدر دن بدن گرتی جارہی ہے۔ ڈالر کے مزید مہنگا ہونے کے خدشات بھی ہیں اس لیے پھر ایسا نہ ہو کہ آپ سرگزشت کا وزن مزید کم کرنے پر مجبور ہو جائیں (نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ کچھ دنوں کی بات ہے ہم پھر سے پرانے صفحات پر آجائیں گے۔ یاد کریں ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے) ملکی صورت حال کی عکاسی کرتا ''اداریہ'' ذہن کے دریچوں میں کئی سوال چھوڑ گیا ہر رمضان سے پہلے اخبار اور ٹاک شوز میں چیخ چیخ کر اشیائے خورونوش کے مہنگا ہونے کا رونا رویا جاتا ہے لیکن عملی طور پر ان مسائل کے سدباب کی کوشش نہیں کی جاتی، تو پھر ہر سال واویلوں اور چیخنے چلانے کا فائدہ کیا ہے، دیکھ لیجیے الیکشن سر پر ہیں، قوم کو نئے نئے خواب دکھائے جارہے ہیں۔ کراچی کو پیرس بنانے کا شوشا چھوڑا جارہا ہے چند دن کے خواب پھر وہی سراب، مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ برسہا برس سے دھوکے کھانے والی ہماری عوام ان عیاروں کے جال میں پھنس کیسے جاتی ہے۔ مٹھی بھر زمین کا انجام [illegible]۔ زر، زن اور زمین ازل سے فساد کا سبب بنتے آئے ہیں وکیل صاحب کو تو سزا مل گئی مگر جو اصل مجرم تھے ان کا آخر میں کوئی [illegible] نہیں کیا گیا ''ماں صدقے'' اور ''دلہن'' بھی اچھی رہیں۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ ''ماہ جولائی کا سرگزشت روایتی تابانیوں اور ضیاء پاشیوں کی [illegible] نئی آب و تاب نئے لے آؤٹ کے ساتھ مقررہ تاریخ 23 جون کو مل گیا تھا۔ شمارہ دیکھ کر بے پایاں خوشی ہوئی اور بے تابی و رغبت سے مطالعہ کرنے لگا۔ نئے علمی، ادبی ثقافتی و تحقیقی تاریخی معلوماتی مواد اور تحریریں احباب فکر و دانش کے لیے

خاص اہمیت وافادیت کی حامل ہیں، اتنا خوب صورت جریدہ جو پاکستانی قوم کا نمائندہ جریدہ ہے جسے عالمی سطح پر شہرت ومقبولیت حاصل ہے خوب صورت اور دیدہ زیب ٹائٹل دیکھ کر دلی سکون وقلبی طمانیت حاصل ہوئی اور بار بار دیکھتا ہی رہا۔ آپ کے حسن انتخاب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ سرگزشت کا مطالعہ میرے لیے خوشی اور سکون کا باعث ہے، ذہن کو آسودگی اور دل کو تسکین ملتی ہے آپ نے نہایت مہربانی اور نوازش فرمائی ہے کہ میرا خط شہر خیال میں شامل کیا ہے۔ ان نوازشات کے لیے آپ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ آیندہ بھی اپنی نوازشات کی بارش مجھ پر برساتے رہیں گے۔ علم وعرفان ادب و صحافت کی روشنی پھیلانے میں آپ کی خدمات قابل صد توصیف ستائش ہیں۔ جب میں سرگزشت کا مطالعہ کرتا ہوں ہر صفحہ پر مضامین کی تازگی کی بہار جاوداں بکھری ہوئی ہے اور خوشبوگل مسحور کررہی ہے۔ نئے نئے موضوعات با معنی با مقصد اور تخلیقی و تحقیقی معلوماتی خزانے میں اضافہ ہوا۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ ماہ رمضان المبارک جیسے مقدس توبہ واستغفار کے مہینے میں بھی بعض مسلمان مال ودولت بنانے میں مصروف ہوجاتے ہیں اور مہنگائی کا طوفان قابو میں نہیں آتا، کیا اسلام ایسا ہی درس دیتا ہے؟ جب کہ غیر مسلم اپنی خوشی کے تہواروں میں خصوصی رعایت کرتے ہیں اور مسلمان خصوصی مہنگائی کرتے ہیں ایسے مسلمانوں کے بارے میں اقبالؒ نے کہا تھا یہ مسلماں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود۔ شاعر پہلی بارش میں شاعر محبت ناصر کاظمی پر سیر حاصل مضمون قلم بند کیا گیا ہے۔ گویا شمارہ کا ماحصل یک کی صفحی ہے۔ شہر خیال میں داخل ہوا تو آفتاب احمد نصیر اشرفی صدارت کررہے تھے۔ آپ کا تبصرہ قابل مطالعہ ہے مبارک باد قبول فرمایئے گا۔ سب دوستوں کے خطوط قابل مطالعہ تھے، کئی دوست غیر حاضر تھے۔ وہ اپنی حاضری کو یقینی بنائیں نوازش ہوگی۔ نئے دوستوں کو میں خوش آمدید جی آیاں نوں کہتا ہوں ڈاکٹر ساجد امجد اس بار ''غلام آقا'' جیسی بصیرت و ایمان افروز کہانی لے کر رونق سرگزشت ہوئے ہیں، قابل داد ہے۔ حضرت بلالؓ کے بارے میں عرفان ومعرفت عزم واستقلال عشق رسول اللہ کی راہ میں ثابت قدمی معلومات کا خزانہ میسر آیا۔ ان کے کردار اور شخصیت کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ ملا۔ ''چارہ گر'' زویا اعجاز ''بابائے کراچی'' شکیل صدیقی قابل مطالعہ ہے جو مشعلِ راہ ہیں۔ قلم نگری میں اس بار محترم انور فرہاد منفرد نغمہ نگار تسلیم فاضلی کو سرگزشت کی زینت بنائے ہوئے تھے اور شعراء کو اہمیت ووقعت دے رہے تھے۔ تسلیم فاضلی ایک حساس اور درد مند دل رکھتے تھے اور فطری شاعر تھے اور سدا بہار نغموں کے تخلیق کار تھے۔ ان جیسا منفرد نغمہ نگار نغمہ نگاری کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ میں تسلیم فاضلی کے تقریباً تمام فلمی نغمات مختلف گلوکاروں کی آواز میں سن چکا ہوں اور مجھے ازبر بھی ہیں۔ شہنشاہ غزل مہدی حسن کی آواز میں یہ گیت مجھے سب سے زیادہ پسند ہے جس میں ذاتی جذبات واحساسات کی فراوانی ہے۔ گیت یہ ہے ''جو درد ملا اپنوں سے ملا غیروں سے شکایت کون کرے۔ جو زخم دیا پھولوں نے دیا کانٹوں سے شکایت کون کرے۔'' جناب انور فرہاد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے پسندیدہ نغمہ نگار سے میری ملاقات کرائی ہے اور معلومات کا خزانہ دیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ تسلیم فاضلی خوبرو اداکارہ نشو سے سچی اور دلی محبت کرتا تھا۔ اس کی شاعری اس کی محبت کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کی زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتی ہے اور وفاداری سے مزین ہے۔ خاندان والوں نے اس پر ظلم کیا۔ زندگی مرد اور عورت نے گزارنی ہوتی ہے اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ دو محبت کرنے والے دلوں کو جدا کردیا گیا۔ آخر تسلیم فاضلی نے دنیا چھوڑ کر وفاداری کی مثال قائم کرکے نشو سے بے وفائی نہ کی۔ تذکرہ میں سید احتشام کی ''جنگجو ملکہ'' دل گداز دل نواز دل سوز کہانی کے ساتھ جلوہ فگن تھے۔ پڑھ کر لطف آیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ندیم اقبال نئی تابانیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ سحر زدہ کررہے تھے اور معلومات کا خزانہ تقسیم کررہے تھے۔ ''ناسور'' کی نئی قسط قابل مطالعہ تھی۔ ''ماں صدقے'' ایس ایم نوشاد کراچی کی ایک بھرپور تحریر تھی جو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ لیے ہوئے تھی۔ اوّل نمبر کی دلچسپ کہانی ہے۔ ناصر حسین بلوچ تونسہ شریف کی دلہن ناقابل فراموش کہانی ہے۔ دوسرے نمبر پر ہے پڑھ کر بہت زیادہ لطف آیا۔ افتخار حسین اعوان کشمیر کی بھیڑیے نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ''بیت بازی'' میں ٹوکن غائب تھا اور ''عملی آزمائش'' کا سلسلہ نمبر 150 میں بھی شخصیت کا ذکر نہیں تھا اور ٹوکن بھی نہیں تھا۔ بحالتِ مجبوری آپ نے اس سلسلے کو بند کردیا۔ یہ سلسلہ تو سرگزشت کی رونق تھا اس سے ذہنی ورزش ہوتی تھی اور تحقیق کے کئی در کھلتے تھے اور اس سلسلے میں آپ نے جلد بازی سے کام لیا۔ بیت بازی کا ایک صفحہ بھی کم کردیا۔ کئی قارئین تو بیت بازی بھی ختم کر کے موضوعاتی شعر کا صفحہ بنانے کا لکھ رہے ہیں۔ اب آپ کیا کریں گے۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے۔ ''میرا خط لیٹ پہنچا ہو تو تاخیر سے پہنچنے والے خطوط کی لسٹ میں نام کیوں نہیں (آپ کے خط میں بھرپور تبصرہ ہوتا ہے اس لیے مجھے بھی انتظار رہتا ہے۔ دونوں بار خطوط تب پہنچے جب کاپی پریس جاچکی تھی) ''غلام آقا'' کا لفظ لفظ دل کی آنکھوں سے پڑھا ہے۔ حضرت بلالؓ نے اسلام کی بقا اور سربلندی کے لیے جتنی تکالیف اور اذیتیں سہی ہیں اتنی سختیاں بے زبان اور سخت جلد رکھنے والا جانور بھی برداشت نہ کرپائے گا، جلد پر کوڑوں سے نقش ونگار بن گئے لیکن احد احد کا ورد نہ چھوڑا۔ اذان بلالؓ کا چبوترہ سفید ستونوں پر مسجد نبوی میں ریاض الجنہ کے قریب آج بھی موجود ہے اور میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ دمشق میں حضرت سیدنا بلالؓ کی قبر مبارک پر حاضر ہوکر فاتحہ کا شرف حاصل کرچکا ہوں۔ ''لمبے ہاتھ'' میں محنت کے ساتھ انسانی ذہانت کا بڑا ہاتھ ہے جس سے معمولی جزویات کو نظر انداز نہ کیا گیا اور تصوراتی اندازے لگا کر جائے وقوعہ ڈھونڈ لی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں آخر وقت جب جدا ہونے کا لمحہ آیا تو سب اداس اور رنجیدہ تھے جس کی صرف ایک وجہ ہے، جب دلوں میں خلوص ہو ایک دوسرے پر بوجھ نہ بنا جائے اور عزت واحترام کی فضا قائم رہے تو کم وقت کا ساتھ بھی میٹھی چبھن ضرور دیتا ہے، جب پرانی یادوں کی کتاب کے ورق کھلتے ہیں تو آہ نکل جاتی ہے ایسے بے ضرر تعلق کو کسی سے شیئر بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایسا محض جذباتی تعلق دوسروں کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو، الٹا شخصیت کو مشکوک بنانا عقلمندی نہیں ہے۔ ''ناسور'' میں نعمان کیسا بے ضرر اور پرامن جوان تھا اسے جرائم کی دنیا میں دھکیل دیا گیا پھر اس نے واپس آنے کی سنجیدگی سے کوشش نہیں کی۔ سچ بیانیوں میں ''ماں صدقے'' پہلی کہانی ہے گو ان واقعات کی ابتداء محبت اور عمر بھر ساتھ نبھانے کے عہد پر رکھی گئی لیکن ایک وقت سب اپنے اصولوں، خواہشوں اور انا کے قیدی بن گئے اور کئی محاذ بن گئے لیکن نوشین کے ابا نے سخت رویّہ اپنا کر اور اپنا اختیارات کا ڈنڈا چلا کر سب کو رام کرلیا ورنہ بہو کی ناراضگی خوامخواہ بدمزگی پھیلا کر دلوں میں نفرت کا بیج بونے لگی تھی اب سب کو درمیانی راہ نظر آگئی ہے اور نفرت کے بیج کی آبیاری نہ ہوسکی اگر شیخ عبدالعزیز جیسے والدین بیٹیوں کے ناجائز مطالبات پر حوصلہ شکنی کرتے رہے تو کئی گھر ٹوٹنے سے بچ جائیں گے۔ ''دلہن'' میں اقبال شرعی بندھن کو مذاق بنائے رہا تمام صلاحیتوں کا اعتراف بھی رہا، اس کے باوجود دل آزاری کا کوئی موقع جانے نہ دیا، دل کانچ کی مثال ٹھہرا۔ ٹوٹ گیا یا دراڑ آگئی، تب پچھتاوے بھی یہ داغ دھو نہ سکیں گے۔ حاکم ہونے کا یہ مطلب تھوڑا ہے کہ غصہ اور نفرت کا ایسا اظہار کرو جو عقل سے بیگانہ بھی برداشت نہ کرسکے پھر دوستوں سے بیویوں کی صفات، عادات، فرمائشیں اور کارنامے سن لیے پھر بھی قدر دان نہ ہوئے، حالات معمول پر رہنے کے لیے سجدہ شکر بجالائے اور جو نعمتیں آسانی سے حاصل ہوگئیں ان کی قدر کیجیے یہی کامیابی کا راستہ ہے۔ ''امانت'' میں نیلم وفا کا پیکر ہے لیکن زندگی ایسے نہیں گزرتی خاص طور پر عورت کے لیے نازک بلکہ خطرناک موڑ آتے ہیں۔ والدین کی زندگی تک تحفظ رہتا ہے پھر کٹی پتنگ کی طرح کوئی محفوظ ٹھکانا نہیں ہوتا۔ سب لوٹنے کے چکر میں جلد بگاڑ دیتے ہیں اور مشرقی عورت اپنا حقیقی گھر بسا کر ہی اللہ اور اس کے رسولؐ کے روبرو سرخرو ہوتی ہے موجودہ حالات کے تناظر میں نیلم کا فیصلہ غلط اور جذباتی ہے اسے قائل کرنے کی اصل میں کسی میں صلاحیت ہی نہ تھی۔ اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کی بجائے مشرقی اقدار کا علم بلند کرکے خفت مٹالی ہے۔ ''حادثہ'' پڑھ کر تھرتھرا اٹھا ہوں، کیا اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ایسے خطرناک منصوبے بنائے جاتے ہیں؟ انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں محض دنیاوی خواہشات اور کامیابیوں کے لیے ایسا کھیل کھیلا گیا کہ صلاحیتیں سلب ہوکر رہ گئیں اور نامور ادیب عذاب میں مبتلا ہوگیا۔ کیا ابن ادیب اور شرمین کو یہ خوشیاں ہمیشہ حاصل رہیں گی آج کی بھاگ دوڑ میں حادثات ساتھ چلتے ہیں۔ جان نہ بھی جائے تو ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنا اور زندگی بھر کی معذوری عام سی بات ہے وہ بھی کسی ایسی انہونی کا شکار ہوسکتے ہیں۔ یہ ایمان کی کمزوری ہے۔ اللہ کا خوف دلوں سے نکل گیا ہے جب گرفت میں آئے تو تڑپنا، واویلا اور بے بسی کا تماشا پورا شہر دیکھے گا اور اعمال پھن پھیلائے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی کراچی سے خیال آفرینی۔ ''انشاء اللہ ''غلام آقا'' جیسی تحریریں ڈاکٹر ساجد امجد کے نامہ اعمال کو دائیں ہاتھ میں تھمائے جانے کا سبب بنیں گی۔ حضرت بلالؓ کے عشقِ رسولؐ پر رائے زنی اور تبصرہ! ہم کیا اور ہماری اوقات کیا؟ اس بصارت کی خوش قسمتی ہے کہ بصیرت کو فیض یاب کیا۔ آپ کے اداریے نے آنکھوں میں ندامت اور دل میں کسک سی بھردی کہ ہم کیسی کیسی اعلیٰ ترین ہستیوں کے پیروکار ہوکر کیسی کیسی پستیوں کا شکار ہیں۔ بارش جب تک اچھی لگتی ہے جب تک وہ راحت مہیا کرتی ہے۔ بلاشبہ ناصر کاظمی کی شاعری عرصہ بعد برسی ہوئی اس پہلی بارش کی طرح ہے جو ہمیشہ بھلی لگتی ہے سرورق پر ناصر کاظمی کی تصویر بھی بھلی لگی (تصویر ناصر کاظمی سے ملتی ہوئی ہے لیکن تسنیم فاضلی کی ہے) ''چارہ گر'' بہت ہی دلچسپ اور شاندار تھی۔ اپنے بچپن میں اپنے اساتذہ کے لیے درد سری رہنے والی اینڈریا استاد بنی تو اس نے نہ صرف تعلیم کو نئی جہتوں سے روشناس کیا بلکہ بطور استاد بھی ناقابلِ فراموش نقوش چھوڑے ''آتش فشاں'' اور ''برفیلا جہنم'' ایک دوسرے کی ضد تو تھیں لیکن دونوں اچھی تھیں۔ تسلیم فاضلی کی شاعری یقیناً بہت انمول لیکن ذرا سماعت کو ان آوازوں کی سمت لے جاکر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ جس کسی نے بھی اسے گایا امر کردیا۔ مصنف کی ٹاپ ٹین ترتیب سے ہم مطمئن نہیں ہماری دانست میں تسلیم فاضلی کے سو گانے یکجا کرکے دیکھیں تو ایک گانا دس

کی برابری کرتا نظر آئے گا۔ لمبے ہاتھ، جنگجو ملک، جہانِ دیگر مناسب سی تھیں جب کہ سیاسی قتل اور ہتھیار بہت اچھی تھیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' مسلسل شاندار جارہی ہے۔ دلہن، ماں صدقے اور انصاف بالترتیب بیچ تھا۔ ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر ساجد امجد اور ضیاء تسنیم بلگرامی کی ہر تحریر بلا مقابلہ ہے، ہمارے تجزیے میں جو کہانی سب سے شاندار ہوتی ہے وہ دیگر تحریروں سے موازنے کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس مرتبہ شکیل صدیقی چھا گئے۔ ''بابائے کراچی'' کو لاکر جمشید نسروانجی کی ذات ہماری جہالت اور کم علمی کا وہ تازیانہ ہے جو ہمارے ذہن کو ہمیشہ اذیت دیتا رہے گا۔ ہمارا دعوئی مطالعہ اس ماہ کے شمارے نے معلوماتی زمین کی قبر میں دفن کردیا۔ ہمیں بابائے کراچی کے بارے میں اب سے پہلے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پارسی خاندان کا ایک اور احسان محسن کراچی کی شکل میں جمشید صاحب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اے محسن ہم اہل کراچی آپ کو لاکھوں بار سیلوٹ کرتے ہیں۔ مراسلے اور پارچوں پر عرق ریزی کرتے ہوئے منشی محمد عزیز میمن، قرۃ العین حیدر، انیس الرحمٰن، تسنیم بٹ، احمد ندیم، انور حسین، اسماء توحید اور ظفر عابدی بہت اچھے لگے۔ علمی آزمائش 150 ماہ بعد ختم ہوئی اب بیت بازی کا فارمیٹ بھی تبدیل کردیں اگر ہوسکے تو قلمی دوستی کا ایک صفحہ ترتیب دے ڈالیں اور اگر مزید ممکن ہو تو ایک صفحے پر دو یا چار شہر خیال کے ساتھیوں کا تعارف بمعہ تصویر یا بغیر تصویر چھاپ کر ہمارے دلوں کو تسکین بخشیں (آپ کا مشورہ بھلا لگا، غور کیا جارہا ہے) اس مرتبہ شہر خیال میں خود کو مرکزی حیثیت میں دیکھ کر تھوڑا سا اترانا تو بنتا تو ہے۔ نزاہت افشاں نے بتایا کہ رانا محمد شاہد کے والد محترم وصال فرما گئے ہیں تو ہمیں انتہائی رنج دکھ ہوا ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک عبد کا اپنے معبود سے جا ملنا کسی بھی طرح دکھ اور افسوس کے زمرے میں نہیں آتا، ہاں البتہ مرحوم کے لیے مسلسل ایصال ثواب ہماری ذمہ داری ہے سو ہم ہمیشہ اپنی دعاؤں میں اپنا یہ فریضہ سرانجام دیتے رہیں گے۔ رضا احمد اعوان کو طلعت حسین اچھے نہیں لگتے بڑی حیرت ہے۔ قیصر عباس خان اور دیگر ساتھی ہمارے ہم خیال ہیں کہ قیمت بڑھادی جائے صفحات کم نہ کیے جائیں۔ سید امتیاز حسین بخاری کا اضطراب کم ہوجائے گا۔ جب وہ اگلے کسی شمارے میں اپنا شعر پڑھ لیں گے۔ انجم فاروق ساحلی کی آپ کی طرف سے کی گئی گوشمالی بروقت اور ٹھیک تھی۔ ہم دل شکنی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حمیرا کوکب واسطی کو اگر نیرہ نور کو پڑھنا ہے تو سابقہ شمارے تلاش کریں اور بلال رضوی بھی سلطان نورالدین اور سلطان صلاح الدین ایوبی کو تلاش کریں۔ طارق خان کا ڈیموں پر تبصرہ اچھا لگا۔ امیر حمزہ کا تبصرہ مناسب تھا۔ عبدالجبار رومی انصاری کی معروف ساتھیوں کی شہر خیال میں واپسی کی خواہش ہماری بھی خواہش ہے اکبر انصاری اور نادر شاہ کو سلام۔ ممتاز اشعر کو خوش آمدید۔ انعام الحق، رابعہ کوثر، آفاق محسن، کوثر علی، عنایت حسین بھٹی بھی خوب رہے سب سے خوب صورت تبصرہ خالد محمود صاحب کا ہے جو فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام دس ہزار سال قبل تشریف لائے۔ اس سلسلے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمیں اس بحث میں معلومات کی خواہش کی حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ قرآن مجید ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کی رشد و ہدایت کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے جب کہ اکثر پیغمبروں کی عمریں ہزار ہزار برس سے بھی زیادہ تھیں کیونکہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان دنیا میں کب آیا۔ سائنس کو موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنا کہا ہوا خود ہی سدھارے اور وہ ایسا کرتی بھی ہے۔''

☆ رانا محمد شاہد کا تبصرہ بورے والا سے۔ ''حضرت بلالؓ پر ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر پڑھی تو تھوڑی دیر کے لیے دل بھر آیا کہ ہم جو اپنے ذاتی مفادات کے لیے بھی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں پر واویلا مچانے لگتے ہیں حضرت بلالؓ نے اذیتوں کی جو داستان رقم کی وہ مضبوط ایمان و یقین کی وجہ سے ان کا اپنے اللہ پر یقین و ایمان تھا کہ جس نے ان اذیتوں و قربانیوں کا صلہ جب دیا تو مکہ اور مدینہ فضاؤں کے ساتھ ساری دنیا نے دیکھا کہ جلیل القدر صحابہ بھی حضرت بلالؓ کی قسمت پر رشک کیا کرتے تھے۔ وہ دنیا کی نظر میں ضرور غلام اور کالے تھے مگر اللہ کے نزدیک حسین ترین ٹھہرے۔ شکیل صدیقی نے محسن کراچی کے بارے میں دلچسپ اور معلوماتی تحریر لکھی۔ عروس البلاد کراچی کو روشنیوں کا شہر بنانے کے لیے کن کن لوگوں نے جدوجہد کی جب کہ آج وسائل ہونے کے باوجود کراچی کی صورتِ حال دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ گزشتہ ماہ تبصرہ نہیں بھیج سکا تھا بلکہ شمارہ بھی لیٹ لیا تھا۔ 26 مئی کو ابو ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے۔ چار رمضان المبارک کی صبح سحری کے وقت وہ چھت سے نیچے آرہے تھے کہ سیڑھیوں سے گر گئے۔ سر کی بیک سائیڈ پر شدید چوٹ آئی۔ ڈاکٹرز کے کہنے کے مطابق ہم انہیں لاہور کے جناح اسپتال لے گئے۔ وہاں دو دن آئی سی یو میں رہے۔ پھر وارڈ میں شفٹ ہوگئے اور دس رمضان المبارک کو اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے۔ جہاں ایک دن ہم سب کو چلے جانا ہے۔ والدین کے جانے کا دکھ وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس تکلیف و کرب سے گزرے ہیں۔ انسان کو چین نہیں آتا۔ عید کے دن عید کی نماز سے پہلے دل غم سے بھر گیا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ سوچا کبھی ابو کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے اس کھلے میدان میں آیا کرتے تھے بس اب تو یادیں ہیں اور ان کے لیے دعائیں ہیں۔ خاتمہ اور اختتام تو ہر انسان کا مقدر ہے اور ہر عید نے بھی گزر ہی جانا ہوتا ہے مگر یہ عید جیسے گزری

وہ بتا نہیں سکتا۔ والدین چلے گئے کبھی کبھی بے کلی سی دل کو گھیر لیتی ہے کہ رفتہ رفتہ سب سنگتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ 2014ء میں امی اور اب ابو چلے گئے۔ ہم بھی ایک دن چلے جائیں گے کہ یہی نظامِ زندگی ہے۔ میں، بھائی نزاہت افشاں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے تعزیت کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ اعجاز حسین سٹھار، قیصر خان اور جنہوں نے فون پر تعزیت کی سب کا شکر گزار ہوں۔ سرگزشت اور اس میں لکھنے والوں کے ساتھ محبت و چاہت کا ایک رشتہ ہے۔ اس لیے ایک بار پھر آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے۔''

☆ انجم فاروق ساحلی نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ جولائی [illegible] میں شائع ہوا۔ ''کوپرا کا ریچھ'' اور ''آدم خور'' کہانیوں کے سلسلے میں جو شکایت لاحق ہوئی ہیں اس کے لیے ادارہ اور [illegible] سے معذرت خواہ ہوں۔ ان دونوں کہانیوں کے آخر میں ''ترجمہ و استفادہ'' لکھنا ضروری تھا لیکن کہانیاں بھیجتے وقت یہ [illegible] کی وجہ سے رہ گیا۔ خیال نہ رہا جس طرح روزمرہ زندگی میں کوئی کمی کوتاہی ہوجاتی ہے۔ یہ غلطی بھی ایسے ہی ہوئی۔ [illegible] ہر طرح کی احتیاط کی جارہی ہے (اسی غلطی نے آپ کی تمام کہانیوں کو مشکوک بنادیا) پرانی تحریروں میں ''خطرناک مجرم'' قاتل [illegible] اس کے علاوہ علم و ادب کا گہوارہ حیدرآباد ادبی تحریر سے استفادہ کے بعد لکھا گیا ہے اس کا حوالہ درج کردیا گیا تھا (علم و ادب کا گہوارہ نہایت خشک ہے) باقی شکاریات کی کوئی کہانی ہے تو اسے مسترد کردیں۔''

☆ ندیم اقبال کا ای میل مشی گن امریکا سے ''میں ایک بار پھر اپنے ان تمام دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، جو مجھ جیسے ادنیٰ قلمکار کی تحریر کو سراہ رہے ہیں۔ یہ سرگزشت کا احسان ہے کہ اس نے مجھ ایسے شخص سے لکھوا لیا ورنہ میں نے تو خط کے علاوہ صرف ڈائری ہی لکھی تھی۔ اتنا طویل سفرنامہ لکھنے کے بارے میں تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ سرگزشت کے ساتھ ان قارئین کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کی حوصلہ افزائی نے مجھے سہارا دیا۔ اُمید ہے ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے بعد بھی کچھ اور لکھوں، جو سرگزشت کے قارئین کو پسند آئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سرگزشت کی وجہ سے امریکا اور کینیڈا کے اردو حلقے میں بھی میری پہچان بن گئی ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات سے بھی مسلسل تقاضا ہورہا ہے کہ میں لکھوں لیکن میں سرگزشت کے قارئین سے دور ہونا نہیں چاہتا۔ یہ قارئین میرا سرمایہ ہیں۔ انہی کی حوصلہ افزائی نے مجھے لکھنے کی ترغیب دی ہے۔ خصوصاً بھائی سید امتیاز حسین بخاری، انجم فاروق، آفتاب احمد نصیر اشرفی، نزاہت افشاں، امیر حمزہ، قیصر عباس، عنایت حسین بھٹی، خالد محمود، عبداللہ شجاع سندھی، رانا محمد شاہد، قیصر خان، اعجاز حسین سٹھار، اویس شیخ، سدرہ بانو ناگوری، فقیر غلام حسین رضا، سیف اللہ، انور عباس، محمد احمد رضا، عبدالجبار رومی کے علاوہ اور بھی کئی دوستوں کا شکر گزار ہوں جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔ اس بار کے شمارے میں حضرت بلالؓ پر تحریر مجھے بہت پسند آئی ہے۔''

☆ محمد یونس، پشاور سے رقمطراز ہیں۔ ''جولائی کے شمارے میں شامل تمام تحریریں دل کو چھورہی ہیں میں حیران ہوں کہ کس کو چھوڑوں اور کس کی تعریف کروں، حضرت بلال حبشیؓ پر اتنا عمدہ شخصیت نامہ لکھنے پر دل کی گہرائی سے مبارک باد اور ''چارہ گر'' کی مصنفہ زویا اعجاز کو بھی مبارک باد۔ محترمہ خوب لکھ رہی ہیں۔ انور فرہاد نے پاکستان کے مایہ ناز گیت نگار تسلیم فاضلی پر بہترین معلومات دیں۔ کہانیوں میں ''ماں صدقے'' اور ''سلسلہ عذاب'' نے رونے پر مجبور کردیا۔ معاوضہ بھی اچھی تحریر تھی لیکن ہضم نہیں ہوئی۔ ''انصاف'' بھی پسند آئی لیکن ''دلہن'' تو لاجواب ٹھہری۔ اس میں ایک ایسا سبق ہے جسے ہر گھر میں نافذ کرنا چاہیے۔ اب آخر میں اپنی پسندیدہ تحریر کی طرف آتے ہیں۔ اس بار ندیم اقبال صاحب نے کمال کردیا۔ پوری قسط میں نسرین کا ذکر نہیں کیا۔ ویسے لکھتے خوب ہیں۔''

☆ ڈاکٹر روبینہ انصاری نے بکھر سے لکھا ہے۔ ''یہ زندگی بھی اب اتنی مصروف ہوچکی ہے کہ بتایا نہیں جاسکتا۔ وقت ایسے گزر جاتا ہے کہ پتا ہی نہیں لگتا۔ میں ہر ماہ سوچتی ہوں اور ایسی مصروفیت گھیر لیتی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ جب شہر خیال پڑھتی ہوں دل کرتا ہے ابھی اس محفل میں پہنچ جاؤں لیکن لکھنا لکھانا رات میں بہتر ہوتا ہے لیکن جیسے ہی لکھنے بیٹھتی ہوں کہ نفیس صاحب آجاتے ہیں ان کی کاروباری مصروفیت تھکے ہارے انسان کو چائے کھانا دینے میں لکھنے کا وقت گزر جاتا ہے اس لیے محفل سے دور ہوں۔ سرگزشت کا مطالعہ بھی پابندی سے کر نہیں پارہی ہوں۔ پھر بھی جتنے شمارے پڑھے ان میں ہر بار محفل کے دوستوں نے مجھے آواز دی۔ میں ان سب کی شکر گزار ہوں۔''

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط: وہاب ملک، ملتان۔ ذیشان احمد، کراچی۔ نازیہ نوشین، کوئٹہ۔ ندیم یامین، لاہور۔ اشفاق احمد، سرگودھا۔ روبینہ منصور، اسلام آباد۔ تحریم فاطمہ، حیدرآباد۔ نسیم اختر، لیہ۔ اطہر صدیقی، فیصل آباد۔

شاہ ولایت

ضیاء تسنیم بلگرامی

انسان کے خمیر میں تجسس کا مادہ کچھ زیادہ ہی ہے اور یہی تجسس اسے ترقی کی منازل تک لے جاتا ہے لیکن تجسس کی دو راہ ہے۔ ایک فلسفے کی جانب لے جاتی ہے جسے شاہراہِ حیرت کہا جاسکتا ہے کیونکہ حیرت نے ہی مادی ترقی پر کامیابی کا سفر بتایا لیکن دوسری راہ خوف کی ہے اور خوف نے مذہب کی جانب گامزن کیا۔ باطنی دنیا کی جانب کھینچا۔ یہ راہِ دشوار بھی ہے اور مبہم بھی۔ یہ اپنی ذات اور باطن میں سفر کرنے والے ہی صوفی کہلائے۔ انہوں نے دنیا اور علائق دنیا کو ٹھوکروں میں رکھ دیا۔ یہ روش حرص و ہوس سے دور بہت دور رکھتی ہے۔ ریاضت اور نفس کشی کا شیوہ اختیار کراتی ہے۔ سیدھے، سچے اور بہادروں میں شمار کراتی ہے، شاہ ولایت کا شمار بھی ایسی ہی برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے۔

شہنشاہوں کے تحائف کو ٹھوکر مارنے والے کا تذکرہ

مدینہ منورہ سے سید سلیمان بن سید حسن الحسینی نامی ایک بزرگ ہندوستان میں داخل ہوئے اور شمالی ہندوستان میں بارہ بنکی کے ردولی نامی قصبے میں سکونت پذیر ہوگئے۔ حکومت نے انہیں انعام واکرام اور بخشش وعطا سے اتنا نوازا کہ یہ بہت جلد صاحب ثروت اور اہل جائیداد ہوگئے۔ یہیں ان کی کئی اولادیں ہوئیں۔ ان کی آخری اولاد علاء الدین نامی ایک بچہ تھا۔ یہ ابھی پانچ چھ سال ہی کا تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ علاء الدین کے دوسرے بھائی جوان یا نوجوان تھے، وہ چاہتے تو مل جل کر رہتے اور اپنے چھوٹے بھائی کو اپنی کفالت میں لے لیتے لیکن ان کے ارادے کچھ اور تھے۔

ماں اپنے جوان بیٹوں کی باہمی سرگوشیوں اور نظروں کے تیور سے کچھ خطرات محسوس کررہی تھیں۔ انہوں نے بیٹوں کو حکم دیا۔ ''نماز عشاء کے بعد تم سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں چند نصیحتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

خود غرض اور لالچی بیٹے دلوں میں کھوٹ اور چہروں پر سعادت مندی کے آثار لیے عشاء کی نماز کے بعد ماں کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ ماں کڑکڑاتی سردی میں کمرے کے دروازے بند کیے لحاف میں دبکی بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی گود میں علاؤ الدین تھا۔ بیٹے مسکین صورت بنائے سامنے کے تخت پر بیٹھ گئے۔

ماں نے انہیں بغور دیکھا اور ان کی قلبی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

سب سے بڑے بیٹے نے کھنکار کر سوال کیا۔ ''اماں آپ نے ہمیں کس لیے یاد فرمایا ہے؟''

ماں نے نہایت پُرسوز آواز میں کہا۔ ''میرے بیٹو! تمہارا باپ مدینہ منورہ سے یہاں آیا تھا۔ تمہارا نسب حسنی الحسینی ہے۔ اس خاندان کی کچھ عظیم الشان روایات ہیں ایکا اور اتحاد۔ اگر تم واقعات کربلا پر غور کرو گے تو تمہیں بھائی بہنوں اور چچا بھتیجوں وغیرہ کے بے مثال اتحاد اور یگانگت کی ایک ایسی مثال ملے گی جو تمہیں کہیں اور نہیں نظر آئے گی۔''

بڑے بیٹے نے اکتا کر کہا۔ ''اماں آپ کہنا کیا چاہتی ہیں، اس طولانی تمہید سے تو ہمارے سروں میں درد ہونے لگا ہے۔''

دوسرے بھائی نے کہا۔ ''کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم اپنی خاندانی روایات تک سے واقف نہیں۔''

ماں نے قطع کلام ہوجانے سے دکھ محسوس کیا لیکن ضبط کر گئیں۔ بولیں۔ ''میرے بیٹو! تمہارے باپ نے کافی املاک اور نقدی چھوڑی ہے، میں چاہتی ہوں کہ تم سب مل

جل کر رہو اور اپنے چھوٹے بھائی علاء الدین کی سرپرستی قبول کرو، یہ تمہاری محبت اور خلوص کا بھوکا ہے اور اپنے باپ کی املاک اور نقدی میں برابر کا حصہ دار ہے۔''

بڑے بھائی نے ریاکاری سے جواب دیا۔ ''علاء الدین ہم سب کا بھائی نہیں بیٹا ہے۔ آخر آپ ہماری طرف سے بدگمان کیوں ہیں، ہم اسے اپنی آنکھ کا تارا بنا کے رکھیں گے۔ آپ ہرگز فکرمند نہ ہوں۔''

اور یہی کلمات تقریباً ہر بھائی نے باری باری ادا کیے لیکن ماں کو معلوم نہیں کیا ہوگیا تھا کہ وہ پھر بھی مطمئن نہ ہوئیں۔

اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ کچی داڑھی والا چالیس پینتالیس سالہ رسول بخش بچپنے سے اس خاندان کی خدمت کر رہا تھا۔ وہ علاء الدین کو گود میں لے کر اِدھر اُدھر نکل جاتا اور [illegible] وتفریح کراتا رہتا۔ ایک دن وہ علاء الدین کو امرودوں کے باغ سے لیے چلا آرہا تھا کہ راہ میں علاء الدین کا سب [illegible] بھائی مل گیا۔ اس نے علاء الدین کو محبت سے گود میں [illegible] پیار کرنے لگا۔ پھر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور [illegible] کو ایک طرف لے گیا، کہنے لگا۔ ''رسول بخش! کیا [illegible] معلوم کہ امرودوں کے باغ کے اس پاس کہیں ایک بھیڑیا موجود ہے جو آبادی کے کئی بچوں کو اٹھا لے جا چکا ہے۔''

''معلوم ہے۔'' رسول بخش نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ ''لیکن میں اسے باغ کی طرف اس وقت لے جاتا ہوں جب اس کے آس پاس کے کھیتوں میں کام شروع ہو چکا ہوتا ہے اور باغ کے رکھوالے طوطوں اور دوسرے پرندوں سے باغ کی رکھوالی کر رہے ہوتے ہیں۔''

بڑے بھائی نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تو چاہے تو تجھے دس بیگھہ زمین اور دو سو روپے فوراً مل سکتے ہیں۔''

رسول بخش کی طمع سے آنکھیں کھل گئیں پوچھا۔ ''اگر ایسا ہوجائے تو آپ کا یہ غلام شادی کرنے کے لائق ہوجائے گا اور زندگی بھر آپ کو دعائیں دیتا رہے گا۔''

علاء الدین نے تنہائی کی وجہ سے منہ بنانا شروع کردیا اور بسورتے ہوئے رسول بخش کو آواز دی۔

بڑا بھائی غصے سے علاء الدین کی طرف بڑھا اور دو طمانچے رسید کردیے۔ ''مرا کیوں جاتا ہے۔ باتیں تک نہیں کرنے دیتا تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑا رہ، ورنہ مار مار کے پلیتھن نکال دوں گا۔ تیرا ہ میں بے جا محبت کا قائل نہیں

ہوں۔"

علاء الدین سہم گیا۔ بڑا بھائی رسول بخش کے پاس واپس گیا بولا۔ "رسول بخش! بس تجھے یہ کرنا ہے کہ تو ایک دن صبح سورج نکلنے سے پہلے علاء الدین کو سیر و تفریح کرانے اس باغ میں لے آ، میں یہاں پہلے سے موجود رہوں گا۔ تو علاء الدین کو میرے حوالے کرکے بھیڑیا بھیڑیا چیختے ہوئے خوف زدہ ہو کر بھاگ جانا اور ہر شخص سے یہی کہنا کہ علاء الدین کو بھیڑیا لے گیا۔"

رسول بخش کو کچھ تامل ہوا۔ بڑا بھائی سمجھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے۔ دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر تو نے میری تجویز پر عمل کیا تو ہوسکتا ہے کہ میں تجھے اس کے بجائے بیس بیگھ اور دو سو کے بجائے چار سو روپے دے دوں لیکن اگر تو نے میری بات نہ مانی اور اس کا دوسروں پر اظہار بھی کر دیا تو یہ سمجھ لینا کہ تو قتل کر دیا جائے گا۔"

رسول بخش نے بے بسی سے کہا۔ "صاحب! میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میرے بعد علاء الدین کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

بڑے بھائی نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔ "میں جو کچھ کروں گا اس میں سارے بھائیوں کی مرضی شامل ہے میرے پاس شیر کا پنجہ موجود ہے۔ میں انگلیوں میں شیر کا پنجہ پھنسا کے علاء الدین کا پیٹ اس طرح چاک کروں گا اور اس کی پشت اور چہرے کو کچھ اس طرح نوچ نوچ کر زخمی کروں گا کہ بعد میں دیکھنے والے ہرگز یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ علاء الدین کو بھیڑیے نے نہیں ہلاک کیا۔"

رسول بخش نے اپنے خوف کو نہایت ضبط اور احتیاط سے چھپائے رکھا، پوچھا۔ "لیکن صاحب! آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

بڑے بھائی نے قدرے ترشی سے کہا۔ "ہر چند تجھے اس قسم کے سوال و جواب کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن پھر بھی چونکہ میں نے تجھے اپنے اعتماد میں لیا ہے اس لیے میں محدود حد تک تیرے چند سوالات کے جوابات ضرور دوں گا۔"

رسول بخش کی ٹانگیں لرزنے لگی تھیں لیکن وہ بڑے ضبط سے سیدھے کھڑے رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑے بھائی نے کہا۔ "ہاں تو تو یہ پوچھ رہا تھا کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ تو سن لے باپ کے انتقال کے بعد جو جائداد، املاک اور زمین ہم سب کے حصے میں آئی ہے اس کے حصے بخرے میں بڑی زحمت پیش آرہی ہے۔ اگر اس میں سے علاء الدین کا حق نکال دیا جائے تو چھ بھائیوں میں بڑی آسانی سے ترکہ یا ورثہ تقسیم کیا جاسکتا ہے پھر ہم سب کو یہ شبہہ بھی ہے کہ علاء الدین ہماری ماں کا بیٹا نہیں ہے۔ ہمارے باپ نے کوئی خفیہ شادی کر رکھی تھی۔ علاء الدین اس کا بیٹا ہے پھر جب علاء الدین کی ماں کا انتقال ہو گیا تو باپ نے علاء الدین کو میری ماں کے حوالے کر دیا۔ میری شریف النفس ماں نے اپنی سوت کی اولاد کو بالکل اپنی اولاد کی طرح پالنا پوسنا شروع کر دیا، یہ ہے اصل واقعہ جس کا ہم بھائیوں اور ماں کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں۔"

رسول بخش کو بڑے بھائی کے اس زبردست جھوٹ پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ بچپن سے اسی گھر میں رہ رہا تھا۔ اسے اس گھر کی ایک ایک بات کا علم تھا۔ یہ جھوٹا واقعہ جس کا بڑے بھائی نے نہایت سنجیدگی سے اظہار کیا تھا اس کے لیے قطعاً ناقابل یقین تھا کیونکہ وہ دائی جس نے علاء الدین کی پیدائش میں خدمت کی تھی بقید حیات تھی اور اب بھی مختلف تیوہاروں اور تقریبوں کے موقع پر حاضری دے کر اپنا حق لے جایا کرتی تھی لیکن رسول بخش کے فرار کی کوئی راہ بھی تو نہ تھی۔

بڑے بھائی نے ترش روئی سے پوچھا۔ "تو میری تجویز پر کب عمل کر رہا ہے؟"

رسول بخش نے جواب دیا۔ "ایک ہفتہ بعد کیونکہ آپ کی تجویز پر عقل مندی سے کام کرنے کے لیے مجھے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" بڑے بھائی نے کہا۔ "آج سہ شنبہ (منگل) ہے اگلے چہار شنبہ (بدھ) تک کا تجھے موقع دیا جارہا ہے پنج شنبے کو تو علی الصباح علاء الدین کے ساتھ اس باغ میں مجھے ملے گا۔"

رسول بخش نے جواب دیا۔ "بہت بہتر جناب! آپ کے حکم کی پوری پوری تعمیل ہوگی لیکن یہ بھی تو بتایئے کہ انعام کا روپیا اور زمین ہمیں کب ملے گی؟"

بڑے بھائی نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "دو سو روپے تم مجھ سے کل ہی لے لینا۔ بقیہ روپے اور زمین تمہیں کام ہو جانے کے بعد ملے گی۔"

رسول بخش نے خوش ہو کر کہا۔ "پھر تو میں پوری طرح تیار ہوں جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

بڑے بھائی نے اپنی راہ لی اور رسول بخش علاء الدین کو گود میں اٹھا کر گھر چلا گیا۔

بڑے بھائی نے حسب وعدہ دوسرے دن رسول بخش

کو دو سو روپے دے دیے۔ روپے پا کر اس کے چہرے پر ایسی تازگی آگئی گویا جوانی واپس آگئی ہو، تمام بھائی اس کی نگرانی کر رہے تھے کہ کہیں وہ اس منصوبے کو ماں پر نہ ظاہر کر دے لیکن رسول بخش کا بشاش رویہ اور ہر دم مسکراتے رہنے کا انداز انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ رسول بخش حرص و طمع کے دام میں پھنس چکا ہے۔ جمعے کو اوّل پہر جب کہ سب بھائی اِدھر اُدھر کام میں مصروف تھے اور نماز جمعہ سے پہلے پہلے ضروری کام نمٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ رسول بخش نے بڑے بھائی کے منصوبے کا ذکر ماں کے سامنے کر دیا اور کہا۔ "اماں! اب بہتری اسی میں ہے کہ مجھے جو دو سو روپے پیشگی ملے ہیں انہیں لے کر ہم تینوں یہاں سے چپ چاپ نکل چلیں کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر ہم اب بھی یہاں رہے تو چھوٹے بھیا علاء الدین اور میں خود کسی نہ کسی طرح ہلاک ضرور کر دیے جائیں گے۔"

ماں کانپ گئیں، لرز کر بولیں۔ "اگر علاء الدین کے بھائی برادرانِ یوسف بن چکے ہیں تو ہمیں مجبوراً یہاں سے چلے جانا پڑے گا۔ ہم اپنے علاء الدین کو یوں ہرگز نہ مرنے دیں گے۔"

لیکن سوال یہ تھا کہ یہ لوگ جائیں تو جائیں کہاں؟ بہت غور و فکر کے بعد ماں نے اتنی دور چلے جانے کا ارادہ کرلیا جہاں ان کے بڑے بیٹوں کی رسائی بہت مشکل تھی۔ مدینہ منورہ واپس چلے جانے کا ارادہ۔ وہاں ان کا خاندان موجود ہی تھا۔

پیر کی رات کو جب کہ ان کے سارے بیٹے اپنے اپنے لحافوں میں گھسے گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ ماں نے علاء الدین کو شال میں لپیٹ کر گود میں لے لیا۔ رسول بخش نے تیز رفتار بیل گاڑی کا پہلے ہی سے انتظام کرلیا تھا۔ تینوں اس پر سوار ہوئے رسول بخش بیل کو خود ہی ہانک رہا تھا۔ یہ تینوں صبح ہوتے ہوتے جنوب مغرب میں اتنی دور جا چلے تھے کہ برادران یوسف انہیں با آسانی نہیں پاسکتے تھے اور اس صورت میں کہ انہیں ان تینوں کی منزل کا کوئی پتا نہ تھا۔ ان کا تعاقب کس سمت میں کرتے۔

یہ تینوں بدقت تمام سورت کی بندرگاہ پہنچے اور وہاں سے جدے کے لیے روانہ ہو گئے کنارے کنارے چلنے والا جہاز انہیں جدے تک لے گیا۔ جدے سے انہوں نے مکے کا رخ کیا۔ خانہ کعبہ میں حاضری دے کر ماں نے علاء الدین کے حق میں دعائیں کیں اور یہاں سے مدینہ منورہ چلی گئیں۔

وہاں ان کا بہت بڑا کنبہ موجود تھا، اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ علاء الدین دیارِ نبیؐ میں پرورش پانے لگے۔

ننھے علاء الدین کو بھی اصل واقعات کا کسی حد تک علم ہو چکا تھا۔ دولت، املاک، روپیا اور جائداد کیسی چیزیں ہیں جس کے لیے لوگ انسان کے قتل پر آمادہ ہو جاتے ہیں؟ اکثر تنہائی میں یہ سوال دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ رسول اللہؐ کے مزار پر حاضری دیتے اور ننھے منے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتے کہ یا رسول اللہ! دولت اور املاک کی محبت کے ناپاک جذبے سے میرے دل کو محفوظ رکھیے میں آپ سے اس کی پناہ مانگتا ہوں۔"

دل کی گہرائیوں اور معصوم زبان سے نکلی ہوئی دعائیں بابِ اجابت کو پہنچیں اور علاء الدین کے دل کو دولت اور مال کی حرص و طمع کی آلائش سے محفوظ کر دیا گیا۔

علاء الدین مدینے کے اساتذہ کی خدمت میں بٹھا دیے گئے اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔ زندگی سکون سے گزرنے لگی۔ ماں کو اپنی وہ اولادیں بھی یاد آتیں جن کی شقاوت سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے ہندوستان کو خیر باد کہا تھا۔ وہ گھڑی دو گھڑی کے لیے اداس ہو جاتیں، آنکھیں بھیگ جاتیں۔ دوپٹے کے آنچل سے انہیں پونچھتیں اور زبردستی دنیا داری میں الجھ کر سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی زندگی ایک غمکدہ تھی۔ ایک ایسا غمکدہ جو موت کی طرح ناقابل رد، اٹل اور لازمی تھا۔ علاء الدین کے لیے انہوں نے ساری اولادیں چھوڑ دیں، اگر وہ چاہتیں تو علاء الدین کو قربان کر کے وہ ساری اولادوں کی قربت حاصل کر سکتی تھیں لیکن مشیت ایزدی ایسا نہیں چاہتی تھی وہ وہی چاہتی تھی جس پر انہوں نے عمل کیا۔

ابھی درس کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ماں بیمار رہنے لگیں۔ انہیں جو غم اندر ہی اندر کھا رہا تھا اب وہ روح سے جسم میں داخل ہو گیا تھا اور انہیں گھن کی طرح کھوکھلا کرنے لگا۔ اِدھر رسول بخش بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ علاء الدین کو اس کا بڑا دکھ ہوا۔ کچھ عرصے بعد ماں بھی چل بسی۔ علاء الدین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب تک دنیا نے انہیں دکھ ہی دکھ دیے تھے۔ دنیا سے نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ کچھ عرصے مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے اس کے بعد رسولؐ کے مزار اقدس پر آخری بار حاضری دی اور رخصت کی اجازت چاہی۔

مدینے سے نکل کر یہ طلب علم ایک استاد سے دوسرے استاد تک جاتے رہے اور علم کی پیاس بجھا کر اور آگے بڑھتے

رہے یہاں تک کہ عرب سے نکل کر ایران میں داخل ہو گئے اور وقت کے بڑے بڑے علماء سے درس لیتے رہے۔ ایران سے ہندوستان پہنچے اور دہلی میں حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دے کر چلہ کشی میں مصروف ہو گئے۔ ان پر جذب کی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور لوگ انہیں مجذوب کہنے لگے۔

کچھ عرصے بعد حضرت بختیار کاکیؒ نے انہیں عالم رویا میں آگرے جانے کا حکم دیا۔ یہ تعمیل حکم کے لیے آگرے چلے گئے اور جمنا کے کنارے قیام کیا، ان کا چرچا ان سے پہلے ہی آگرے پہنچ چکا تھا۔ یہاں لوگ انہیں گھیرنے لگے لیکن یہ ان پر کم ہی توجہ فرماتے۔ خود بازار جاتے، سودا سلف خریدتے اور واپس آکر اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے، اس وقت جو بھی موجود ہوتا اسے اپنے کھانے میں شریک کر لیتے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ کھانے پر بہت سارے لوگ جمع ہونے لگے۔ یہ سب کے لیے خود ہی کھانا پکاتے اور سبھی کو کھانے میں شریک کر لیتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس مشغلے نے ان کی عبادت و ریاضت میں فتور ڈال دیا۔

ایک دن دوپہر کے کھانے پر تقریباً پچاس آدمی حاضر تھے آپ نے سب کو پکا کر کھلایا اور پانی پلا کر بچ جانے والی روٹیاں ایک کپڑے میں لپیٹ لیں، کٹیا سے باہر نکلے اور کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیوں والا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آواز بھرا گئی، گلا رندھ گیا، باآواز بلند فرمایا۔ ''اے جبرئیل تم کہاں ہو؟ ادھر آؤ میرے پاس، اے میکائیل کیا تم تک میری آواز پہنچ رہی ہے؟ اگر پہنچ رہی ہے تو تم بھی میرے قریب آؤ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ اے اسرافیل کیا تم نے میری آواز سنی؟ سن لی تو اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ تم بھی یہاں آجاؤ تم تینوں مقرب بارگاہ ایزدی ہو، مجھ عاجز و ناتواں کا حال زار بارگاہ ذوالجلال میں عرض کر دو اور کہو کہ یہ ذمہ داری جو مجھے سونپی گئی ہے کسی بہت بڑے ولی اللہ کے سپرد کر دی جائے۔ یہ عاجز اس بار عظیم کے اٹھانے کی خود میں سکت نہیں پاتا۔''

اتنا کہہ کر زار و قطار رونے لگے اور کچھ سکوت کے بعد مزید فرمایا۔ ''اس خدمت کی وجہ سے میں عبادت نہیں کر سکتا۔ دن رات لوگوں کے نان و لقمے کے لیے حیران و پریشان رہتا ہوں، آخر اس غلام کو کب تک خوار رکھا جائے گا؟''

اس کے بعد اٹھ کر وضو فرمایا اور کپڑے میں بندھی ہوئی روٹیاں کھول کر سامنے رکھ لیں۔ انہیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے سامنے ڈھیر لگایا اور پھر جو جانور بھی سامنے آیا اسے کھلانا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس فیض عام سے طوطے، کوے، کبوتر اور مینا تک محروم نہ رہے آخر میں چند ٹکڑے باقی بچے وہ خود کھا لیے۔

یہ ابراہیم لودھی کا عہد تھا۔ اس نے از راہ عقیدت ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور وظیفہ اتنا زیادہ تھا کہ اس سے ان کے سارے ارادت مندوں اور خادموں کا خرچ چلنے لگا۔ لوگوں نے آپ کو علاء الدین کی نسبت سے محبت میں علاول بلاول کہنا شروع کر دیا۔ ابراہیم لودھی کے بعض امراء جنہیں آپ کی دعاؤں کا فیض نہیں حاصل ہو سکا تھا۔ شاہ صاحب سے ناراض رہنے لگے۔ وہ جب بھی موقع ملتا ان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے رہتے۔ پرانی مثل کے مطابق کہ سو پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیاں بھی جلنے لگتی ہیں۔ ابراہیم لودھی بھی چغلخوروں کی باتوں سے متاثر ہوا، پوچھا۔ ''کیا تم لوگوں کو حضرت علاول بلاول کی بزرگی میں کسی قسم کا شبہ ہے؟''

ایک حاسد امیر نے جواب دیا۔ ''جہاں پناہ جس کی بات کرتے ہیں اس ناچیز کی رائے میں تو وہ پکا دنیادار اور لالچی انسان ہے۔ حضور کی خوش اعتقادی سے فائدے اٹھا رہا ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''کیا ہم اس کا وظیفہ بند کر دیں؟''

''نہیں حضور والا!'' ایک حاسد امیر نے جواب دیا۔ ''حضور والا کی ذات چشمہ جود و سخا ہے ایک لخت پورا وظیفہ بند کر دینا حضور والا کی شان کریمی کے خلاف ہے ہاں اس میں تخفیف ضرور کی جا سکتی ہے۔''

بادشاہ نے فی الفور حکم صادر کر دیا۔ ''علاول کے وظیفے میں دو تہائی کی کمی کر دی جائے۔''

جب یہ کل وظیفے کی ایک تہائی رقم لے کر شاہی خدمت گار آپ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کو اس کمی کا علم ہوا تو ہنس کر فرمایا۔ ''بابا! تو ایسا کہاں کا رازق ہے تو تو درمیان کا واسطہ ہے ہمارا حق مار کے تو بددیانتی اور خیانت کا مرتکب ہوا۔ اب یہ خائن زیادہ دن حکومت نہیں کر سکے گا۔ ہم کوئی دوسرا بندوبست کرتے ہیں۔'' اس کے بعد شاہی خدمتگار سے فرمایا۔ ''اپنے بادشاہ سے جا کر کہہ دو ہم نے اس کی مدت سلطنت میں دو تہائی کی کمی کر دی اور اس کی جگہ کابل سے دوسرے امانت دار کو طلب کر لیا ہے۔''

خدمت گار نے مارے ڈر کے شاہ صاحب کا یہ پیغام بادشاہ تک نہیں پہنچایا۔

کچھ ہی عرصے بعد آگرے میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ کابل سے فرغانہ کا خانہ بدوش فرماں روا ظہیر الدین بابر قسمت آزمائی کی غرض سے ہندوستان کی طرف چل پڑا ہے اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتا، آندھی طوفان کی طرح بڑھا چلا آرہا ہے۔

ابراہیم لودھی اپنی عظیم الشان فوج لے کر پانی پت پہنچ گیا اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس مغل قسمت آزما کو پانی پت سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔

اسی دوران حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں سلسلہ چشت کا ایک گہر آبدار حاضر ہوا اور نیاز مندانہ انداز میں حضرت علاول بلاول کی بزرگی اور عظمت کا اعتراف کرلیا۔

آپ نے اسے نظر بھر کے دیکھا اور فرمایا۔ ”سلیم چشتی! ہم نے سیکری کے پہاڑ کو تمہارے لیے سونے کا کردیا۔ فرماں روایانِ وقت تیرے در پر حاضری دیں گے، ہم تجھے سیکری کی حکومت دیتے ہیں۔“

سلیم چشتی اس وقت سیکری چلے گئے۔

پانی پت میں ابراہیم لودھی اور بابر کی افواج میں خوفناک مقابلہ ہوا جس میں ابراہیم لودھی نے شکست فاش کھائی اور بابر دہلی سے گزرتا ہوا آگرے میں داخل ہوگیا۔

نئے بادشاہ نے شاہ صاحب کی بڑی عزت کی اور ان کی رضا جوئی اور خوشنودی کو عین خوش قسمتی سمجھنے لگا۔

☆☆☆

ہند میں مغلیہ سلطنت کا بانی اور فاتح ظہیر الدین بابر بسترِ علالت پر دراز موت اور زندگی کی کشاکش میں مبتلا تھا۔ اطبا اور حکماء عاجز آچکے تھے۔ کسی مصاحب نے دبی آواز میں عرض کیا۔ ”صاحبان! جمنا کے کنارے ایک کٹیا میں علاء الدین نامی ایک خداشناس ٹھہرا ہوا ہے ہم سب کو اس سے مل کر دعا کی درخواست کرنی چاہیے ممکن ہے خدا ان کی دعا سن لے۔“

مصاحب کے مشورے پر عمل کیا گیا اور ایک چھ نفری وفد حضرت علاء الدین کی کٹیا کے دروازے پر کھڑے ہوکر اندر داخلے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ اندر سے تلاوت قرآن پاک کی آواز آرہی تھی۔

وفد کے سربراہ نے کہا۔ ”حضرت شاہ صاحب! چند نیاز مند آپ کی قدم بوسی کی تمنا میں حاضری کی اجازت چاہتے ہیں۔“

اندر سے جواب ملا۔ ”واپس جاؤ چھوٹا بادشاہ بڑے بادشاہ سے ملاقات کرکے رہے گا۔“

وفد مایوسی کے یہ کلمات سن کر الٹے قدموں واپس گیا اور ولی عہد ہمایوں کو شاہ علاء الدین کا جواب سنادیا۔

ہمایوں نے کہا۔ ”آپ لوگ ایک بار پھر اس بزرگ کی خدمت میں واپس جائیں۔ ان اللہ والوں کو اتنا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر یہ چاہیں تو کسی اور کی عمر کم کرا کے قریب المرگ شخص کو زندگی بخش سکتے ہیں۔“

ولی عہد کی ہدایت پر وفد پھر شاہ علاء الدین کی کٹیا پہنچ گیا لیکن اب کٹیا خالی تھی وہاں کوئی بھی نہ تھا شاہی وفد ان کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھیل گیا دور دور ان کا کوئی پتا نہ تھا۔ وفد ان کی تلاش میں ناکام رہ کر ولی عہد کے پاس پہنچا اور اس کے روبرو اپنی مجبوری کا اظہار کردیا۔

ہمایوں نے کرب سے کہا۔ ”تم لوگوں نے انہیں آس پاس دل جمعی سے نہیں تلاش کیا، ورنہ وہ ضرور مل جاتے۔“

وفد کے سربراہ نے اپنی رائے دی۔ ”حضور والا! خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو ہم ہمت ہارنے والے نہیں تھے، ان سے ملنے اور ایک ہی مسئلے پر سوال و جواب کرنے میں ایک ڈر باقی رہتا ہے وہ یہ کہ کہیں ان کی زبان سے کوئی ایسا ویسا کلمہ نہ نکل جائے جس سے نصیب دشمنانِ مغلیہ سلطنت ہی......“

ہمایوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہا۔ ”اچھا خاموش رہو اور اس موضوع پر اب کوئی بات نہ کی جائے۔“

تھوڑی دیر بعد کول (علی گڑھ) سے ایک سوار آگرے میں داخل ہوا۔ وہ بادشاہ کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا اور علاء الدین کے ارادت مندوں میں داخل تھا۔ جب اس کے سامنے علاء الدین کی خدمت میں دوبارہ جانے کا ذکر آیا تو اس نے کہا۔ ”وہ آگرے میں ہیں کہاں؟ انہیں تو میں کول میں حضرت جمال الدین العارفینؒ کے پاس حوض کے کنارے چھوڑے آرہا ہوں اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں آگرے جارہا ہوں تو انہوں نے بادشاہ کے لیے یہ پیغام دیا ہے کہ بادشاہ سے کہو اس کی جس شہنشاہ سے ملاقات ہونے والی ہے اس میں وقت کی رد و بدل نہیں ہوتی جو وقت طے پاگیا ہے اس پر حاضری ضروری ہے۔“

بابر کا انتقال ہوگیا اور ہمایوں نے اقتدار سنبھالا، علاء الدین ابھی تک کول ہی میں تشریف فرما تھے۔ ہمایوں نے ان سے آگرے واپس آنے کی درخواست کی لیکن وہ نہیں آئے، آخرکار ہمایوں نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر حضرت شاہ

صاحب یوں تشریف نہیں لاتے تو بادشاہ خود حاضر ہوگا اور انہیں اپنے ساتھ واپس لانے کی ہر کوشش کر گزرے گا۔ ہمایوں کی منت سماجت کام کرگئی اور حضرت علاء الدین آگرے واپس آگئے۔ لوگوں کا ہجوم انہیں پھر گھیرنے لگا۔

ایک دن ابراہیم لودھی کا وزیر اشرفیوں کا طباق لے کر آدھی رات کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بطور نذرانہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”حضور! کچھ میرے حق میں بھی دعا ہوجائے۔“

آپ نے یہ نذرانہ قبول نہیں کیا، فوراً خفگی سے حکم دیا۔ ”اسے واپس لے جا، میں کچھ نہیں کرسکتا۔“

سابق وزیر نے کہا۔ ”حضرت! پھر میں کہاں جاؤں؟ آپ خود ہی سوچیے جس نے وزارت کی ہو، وہ نکما اور بے کار پھرے اس کی دل پر کیا بیتتی ہوگی؟“

آپ نے غصے میں فرمایا۔ ”لوگوں کے رزق پر ڈاکے ڈال اور وظیفے کی رحمتوں میں کمی کر پھر دیکھ خدا تجھے کیسی مکافات میں مبتلا کرتا ہے، تو یہ اشرفیاں واپس لے جا۔“

لودھی وزیر دل برداشتہ ہوکر اشرفیاں واپس لے گیا۔ اس کے چلے جانے کے تقریباً پون گھنٹے بعد چار آدمی آپ کے پاس پہنچے اور اپنی چمچاتی چھریاں ہوا میں لہرا کر بولے۔ ”اوہ پاگل انسان! تو نے اشرفیوں کا طباق کیوں واپس کردیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”وہ اشرفیاں کب تھیں، آگ تھیں انہیں جو بھی چھوئے گا جل مرے گا۔“ پھر پوچھا۔ ”تم کون ہو اور کیا لینے آئے ہو؟“

چاروں میں سے سب سے زیادہ وجیہہ اور متحرک شخص نے غصے سے آنکھیں نکال کر جواب دیا۔ ”ہم لٹیرے ہیں اور آج ہمیں ہر جگہ ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔“

”اچھا۔“ آپ نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ”اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ وہ اشرفیوں والا طباق دوبارہ منگوالیں اور اسے ہم ضرورت [illegible] میں تقسیم فرمادیں اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہماری چمچاتی چھریاں ہیں اور آپ ہیں۔ بے رو و رعایت پیٹ میں گھونپ دیں گے۔“

”اچھا ذرا صبح ہونے کا انتظار کرو۔“ آپ نے جواب دیا۔ ”ہم وہ اشرفیاں دوبارہ منگوادیں گے۔“

اس رات لودھی وزیر نے خواب میں دیکھا کہ حضرت علاول بلاول فرما رہے ہیں۔ ”بیٹے! وہ اشرفیوں والا طباق لے کر فوراً حاضر ہوجاؤ۔“

صبح فجر کے فوراً بعد لودھی وزیر اشرفیوں کا طباق لے کر حاضر ہوگیا۔ آپ نے تھوڑی دیر بعد یہ اشرفیاں چاروں لٹیروں کے حوالے کردیں اور ایک بار پھر فرمایا۔ ”تم سب خوب اچھی طرح سن لو، ان اشرفیوں میں آگ ہے انہیں جو چھوئے گا جھلس جائے گا۔“

لٹیروں نے شاہ صاحب کی باتیں بے پروائی سے سنیں اور اشرفیاں لے کر شراب خانے چلے گئے اور وہاں خوب ڈٹ کے شراب پی، جب نشے میں دھت مے خانے سے باہر نکلے تو انہیں اچانک اشرفیوں کی تقسیم کا خیال آیا ان کے سرغنہ نے کہا۔ ”اب ہمیں یہ اشرفیاں بحصہ مساوی آپس میں تقسیم کرلینی چاہئیں۔“

ایک نے جھومتے ہوئے کہا۔ ”بے شک لیکن اس بات کا بطور خاص خیال رہے کہ یہ راز میں نے بتایا تھا اس لیے زیادہ حصے کا بھی میں ہی حقدار ہوں۔“

دوسرے نے اس خیال کی مخالفت کی بولا۔ ”تو نہیں زیادہ حصے کا حقدار، میں ہوں کیونکہ شاہ صاحب کو چھری دکھانے میں، میں سب سے آگے تھا اور یہ میری چھری کا ہی کرشمہ ہے جو شاہ صاحب نے خوفزدہ ہوکر اشرفیاں دوبارہ منگوادیں۔“

تیسرے نے ان دونوں کو ڈانٹ دیا، کہنے لگا ”تم دونوں زیادہ پی گئے ہو اور نشے میں دھت بہک رہے ہو، کیا تمہیں یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ ہمیشہ حصے بخرے میں کرتا رہا ہوں اور تم سب میری دیانت کے پیشِ نظر حصے سے کچھ زیادہ ہی دیتے رہے ہو۔“

چوتھا ہنسا اور نہایت تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارا سردار ہوں کیا نشے میں تم مجھے پہچان بھی نہیں رہے؟ اپنے سردار کے ہوتے ہوئے ایسی بے سروپا اور فضول باتیں کررہے ہو، سردار کا حصہ ہمیشہ زیادہ ہوا کرتا ہے۔“

سردار کی بات پر تینوں چھریاں کھینچ کر اس پر پل پڑے اور ذرا سی دیر میں اس کے ٹکڑے اڑادیے۔ اس کے بعد یہ تینوں آپس ہی میں لڑنے جھگڑنے لگے اور آخر تینوں ہی زخمی ہوکر سسکنے لگے جب شہر کوتوال موقع واردات پر پہنچا تو ان قریب المرگ میں سے ایک نے اپنا نزاعی بیان دے کر ساری کیفیت شہر کوتوال کے گوش گزار کردی اور مرگیا۔

کوتوال اشرفیاں لے کر حضرت شاہ صاحب کی

خدمت میں پہنچا اور سارا قصہ سنا کر اشرفیاں پیش کرنے لگا۔

آپ نے جواب دیا اسے یہاں سے لے جاؤ، ان میں آگ چھپی ہے جو چھوئے گا جل جائے گا۔"

کوتوال نے اشرفیاں اپنے قبضے میں کیں اور گھر چلا آیا۔ کئی دن بعد شہر کوتوال کے گھر پر ڈاکا پڑا۔ ڈاکوؤں نے اشرفیاں اپنے قبضے میں کیں اور شہر کوتوال کو اس کے پورے کنبے کے ساتھ قتل کر دیا۔

☆☆☆

مغل فرمانروا ہمایوں! اپنے چند امراء کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ اس وقت آپ شاہ ولایت کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے آپ نے ایک نگاہ غلط انداز ہمایوں پر ڈالی اور حکم دیا۔ "بادشاہ اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔"

ہمایوں نے مطلب نہیں سمجھا حیرت سے پوچھا۔ "حضرت کیا فرما رہے ہیں؟ کچھ وضاحت سے فرما دیں۔"

آپ نے ترشی سے کہا۔ "میری صاف بات کا بھی مطلب نہیں سمجھتا، میں کہہ رہا ہوں کہ تو یہاں سے اپنے وطن چلا جا خدا ایک تجھ سے زیادہ لائق انسان کو چند سال حکمرانی کا موقع دینا چاہتا ہے۔"

ہمایوں گھبرا گیا۔ آپ نے ہمایوں کو بالواسطہ خبردار کیا۔ "بادشاہ سے کہہ دو شیر کو پچھاڑنے والا آ رہا ہے وہ اپنے وطن واپس چلا جائے۔"

ادھر یہ مکالمے ادا ہو رہے تھے دوسری طرف شیر خان سوری بہار سے مغرب کی طرف چلا آ رہا تھا مقابلے پر جانے سے پہلے امراء نے کہا۔ "ایک بار حضرت ولایت شاہ کی بارگاہ میں پھر حاضری دینی چاہیے اور ان سے اس مقابلے کے لیے واضح حکم حاصل کرنا چاہیے۔"

بیرم خان کی سرکردگی میں ایک وفد شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور سارا حال سنا کے ان کی رائے طلب کی۔

آپ نے ناراضی سے فرمایا۔ "میں دو مہینے سے یہ کہہ رہا ہوں کہ بادشاہ سے کہو اپنے وطن واپس چلا جائے۔"

بیرم خان نے کہا۔ "لیکن حضور والا! یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارا بادشاہ چند لٹیروں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے۔"

آپ نے فرمایا۔ "احمق سردار! جب تو خود ہی کوئی فیصلہ کر چکا ہے تو پھر مجھ سے رائے لینے کیوں آیا؟ جا جو تیرے جی میں آئے کر میں خاموش رہوں گا۔"

بیرم خان ڈر گیا، بولا۔ "حضرت! یہ غلام تو آپ کا تابعدار ہے بھلا یہ میری مجال کہ آپ کے حکم کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں۔"

آپ نے کہا۔ "تب پھر ہمارا فیصلہ ہی سچا اور اچھا ہے۔ اپنے بادشاہ سے کہو وہ یہاں سے پہلے ہی چلا جائے، اس سے یہ بھی کہو کہ وہ مایوس نہ ہو، ہم اسے دوبارہ بلا لیں گے۔"

"کتنے عرصے بعد؟" بیرم خان نے سوال کیا۔

آپ نے ترشی سے کہا۔ "یہ مت پوچھو۔ جب جی میں آئے گا بلا لیں گے۔"

اس کے بعد آپ خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور قرآن پاک کو گلے میں لٹکا کر آگرہ سے کہیں اور چلے گئے۔

ہمایوں کو جب آپ کے ارشادات کا علم ہوا تو بہت بددل ہوا۔ امراء نے کہا۔ "حضور والا یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب شہر اور حکومت پر کوئی برا وقت پڑنے والا ہوتا ہے تو حضرت ولایت شاہ ترک سکونت اختیار کر جاتے ہیں، ان کا آگرے سے چلا جانا اچھی بات نہیں ہے۔"

ہمایوں نے منور بیگ نامی ایک امیر کو حکم دیا۔ "تم حضرت ولایت شاہ کے خادموں کو چالیس روپے اور اونٹ دے کر کہو کہ وہ کسی بھی طرح انہیں آگرے واپس لائیں۔"

ہمایوں یہ حکم دے کر قنوج روانہ ہو گیا کیونکہ شیر خان کی فوجیں وہاں سے آگرے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہی تھیں۔ لوگ حضرت ولایت شاہ کو تلاش کرتے ہوئے دہلی پہنچ گئے۔ جہاں وہ قیام فرماتے، مریدوں نے عاجزی سے عرض کیا۔ "حضرت شاہ صاحب! آگرے میں آپ کی جدائی کے غم میں ملائکہ اور شاہ پریاں بہت ملول ہیں اور رو رو کر برا حال کیے جا رہی ہیں۔ براہ کرم وہاں تشریف لے چلیے۔"

حضرت ولایت شاہ صوفی اور صلحا کو ملائکہ کہتے تھے اور پردہ نشین عبادت گزار خواتین کو شاہ پریاں کا خطاب دے رکھا تھا مرید بمشکل انہیں آگرے واپس لائے۔

آدھی رات گزر چکی تھی، مریدوں نے دیکھا حضرت ولایت شاہ چونک کر اٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی آٹا گوندھ کر روٹیاں پکانے لگے۔ کسی مرید نے دریافت کیا۔ "حضرت یہ روٹیاں کس کے لیے پکا رہے ہیں؟"

غصے میں جواب دیا۔ "بادشاہ کے لیے، ہزار مرتبہ کہہ دیا تو اپنے وطن واپس جا لیکن نہیں مانتا۔ اپنی سی کیے جاتا ہے

آخر مجبور ہو کر زادِ راہ تیار کیے دیتا ہوں اب بھی نہیں مانے گا تو بہت پچھتائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد چند گھڑ سوار حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پہنچے، گھوڑے سے اتر کر آپ کی خدمت میں دو زانو ہو گئے آپ نے ان میں سے ایک پر نظریں جمائیں اور ترشی سے کہا۔ "کیا تمہیں میرا پیام نہیں ملا تھا کہ اب تم اپنے وطن واپس چلے جاؤ؟"

نو وارد نے جواب دیا۔ "حضرت آپ کا پیام مل تو ضرور گیا تھا لیکن خدا کے آخری فیصلے کے انتظار میں مجھے کچھ تو کرنا ہی تھا؟"

آپ نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

نو وارد نے جواب دیا۔ "ہمیں شکست فاش ہوئی اور شیر خانی لشکر بہت جلد آگرے میں داخل ہونے والا ہے۔"

جو روٹیاں پک چکی تھیں حضرت ولایت شاہ نے وہ نو وارد کے حوالے کر دیں اور حکم دیا۔ "تو اسی وقت ایران چلا جا اور ان روٹیوں کو زادِ راہ سمجھ۔"

نو وارد نے توے پر پڑی ہوئی روٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس میں میرا کوئی حصہ نہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ بھی تمہاری ہی ہے لیکن یہ اس وقت ملے گی جب تم ایران سے دوبارہ واپس آؤ گے۔"

مریدوں نے اس نو وارد عقیدت مند کو پہچان لیا۔ یہ ہمایوں تھا جو شیر خان سے شکست اٹھا کر حضرت ولایت شاہ کا علم سننے آیا تھا۔

ہمایوں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "اس وقت زمین اور آسمان دونوں ہی ہمارے دشمن ہو رہے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم بخیریت تمام ایران پہنچ جائیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بک بک کیا کرتا ہے، اپنا راستہ لے کیا ہم نے یونہی تجھے زادِ راہ دی ہے۔"

ہمایوں .... اسی وقت آگرے سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆

شیر خان، شیر شاہ ہو گیا، اس نے اپنی عسکری قوت میں بے پناہ اضافہ کیا، مشہور داروغہ، توپ خانہ رومی خان کو حکم دیا کیا کہ توپیں ڈھال لی جائیں اس حکم پر تیزی سے عمل درآمد ہونے لگا۔ حضرت ولایت شاہ بازار سے گزر رہے تھے کہ سامنے سے رومی خان آ گیا۔ وہ نیاز مندانہ آپ کے سامنے جھک گیا آپ نے بے پروائی سے اس پر نظر ڈالی۔ رومی خان نے ادب سے عرض کیا۔ "حضرت! اگر ذرا سی تکلیف گوارا فرمائیں تو یہ ناچیز آپ کو اپنا کارنامہ دکھانے کی سعادت حاصل کرے۔"

آپ نے دریافت فرمایا۔ "کیسا کارنامہ؟"

رومی خان نے جواب دیا۔ "میں بادشاہ کے حکم پر توپیں ڈھلوا رہا ہوں، اب تک جو کام ہو چکا ہے اس کا مشاہدہ کرانا چاہتا ہوں۔"

آپ خاموشی سے رومی خان کے ساتھ ہو لیے۔ رومی خان نے انہیں توپیں ڈھلنے کے کارخانے میں پہنچا دیا۔ وہاں ہر طرف بھٹیاں جل رہی تھیں۔ لوہا گلایا پگھلایا جا رہا تھا بہت سی توپیں تیار کھڑی تھیں کچھ ناقص حالت میں تھیں ایک طرف تانبے کا ذخیرہ تھا جسے توپ میں لگایا جا رہا تھا۔ تقریباً ایک ہزار مزدور اور کاریگر کام میں لگے ہوئے تھے۔

حضرت ولایت شاہ نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ کر بولے۔ "اللہ اکبر! رومی خان تو آدمی ہے یا موت کا فرشتہ؟ تو انسانوں کی ہلاکت کا سامان اتنے اہتمام سے کر رہا ہے۔ توبہ توبہ۔" پھر ان توپوں کی طرف عجیب انداز سے اشارہ کیا اور پھر اِدھر اُدھر موجود لوگوں سے کہا۔ "دیکھتے کیا ہو آگے بڑھو اور انہیں توڑ پھوڑ کر بیچ کھاؤ۔"

آپ کے ان کلمات کا شیر شاہ سوری کے عہد میں اس طرح عمل ہوا کہ جب پورا شہر افراتفری اور ہنگاموں کا شکار تھا بلوائیوں نے توپ خانے پر حملہ کر دیا۔ انہیں توڑا پھوڑا اور توپوں کے لوہے اور تانبے کو بازار میں بیچ بیچ کر کھانے پینے کا سامان خریدا۔

☆......☆

شیر شاہ کالنجر پر فوج کشی کرنے جا رہا تھا۔ اس نے بابا فرید گنج شکرؒ کے گھرانے کے ایک بزرگ عزیز شیخ کبیرؒ سے درخواست کی۔ "ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے کہ آپ ہماری طرف سے حضرت ولایت شاہؒ کی خدمت میں حاضری دیں۔ انہیں ہماری طرف سے کچھ اشرفیاں بطور نذرانہ پیش کریں اور کہیں کہ ہم کالنجر کی تسخیر کو جا رہے ہیں۔"

شیخ کبیر نے حضرت ولایت شاہؒ کی خدمت میں حاضری دی اور اشرفیوں کو کاغذ میں لپیٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دیا۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ "اس کاغذ میں کیا ہے؟"

شیخ کبیر نے جواب دیا۔ "اشرفیاں حضرت سوری

بادشاہ کالنجر جہاد کرنے جارہا ہے اور وہ آپ سے دعائیہ استمداد کا خواہش مند ہے۔"

آپ نے اشرفیوں کو ٹھوکر ماردی اور ہنس کر فرمایا۔

"سبحان اللہ! کیا خوب آگ لگ رہی ہے آگ، اِدھر آ میری آنکھوں سے دیکھ، پتھر اور پہاڑ قہر کی آگ میں جل رہے ہیں اور رہا تیرا بادشاہ، آگ تو اس کی طرف بھی بڑھ رہی ہے۔ کالنجر قلعے کی تسخیر کے لیے کب جارہا ہے وہ تو آگ میں جلنے جارہا ہے۔ شیخ کبیر! تم وہاں ہرگز نہ جانا۔"

پھر اشرفیاں اٹھائیں اور شیخ کبیرؒ کے سر پر ماردیں، جلال میں بولے۔ "کیا تم مجھے بابا فرید کی نظر میں شرمندہ کرنا چاہتے ہو، خبردار جو شیر خان کے ساتھ گئے تو اس کے ساتھ ہی تم بھی جل جاؤ گے۔"

شیخ کبیرؒ نے واپس جاکر شیر شاہ کو من وعن سنادیا۔ شیر شاہ کچھ دیر ساکت رہا، کچھ سوچتا رہا اس کے بعد کہا۔ "شاہ ولایت تو ایک مجذوب انسان ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ان کلمات میں کون سا بھید چھپا ہے۔"

جب شیر شاہ فوج لے کر کالنجر چلا گیا تو آپ نے دامن جھاڑتے ہوئے افسوس سے فرمایا۔ "افسوس کہ آگ لگ رہی ہے، افسوس کہ آگ لگ رہی ہے۔"

عین حالت جنگ میں شیر شاہ کے بارودی ذخیرے میں آگ لگ گئی اور شیر شاہ جھلس کر انتقال کرگیا۔

شیر شاہ کی ناگہانی موت سے ملک میں انتشار پیدا ہوگیا۔ اسلام شاہ جو بعد میں سلیم شاہ سوری کہلایا اپنے بڑے بھائی کی عدم موجودگی میں تخت نشین ہوگیا۔ درباری امراء اس کی مخالفت میں لگ گئے۔ سلیم شاہ بھی ان سے خوف زدہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر دولہ خان سے کہا۔ "اس عالم انتشار اور سراسیمگی میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

دولہ خان نے جواب دیا۔ "حضور ولایت شاہ مجذوب کے پاس تشریف لے چلیں، وہ جو کچھ کہیں گے وہی حضور کا مستقبل ہوگا۔"

اتفاق کی بات کہ جب سلیم شاہ اپنے وزیر کے ساتھ حضرت ولایت شاہ کے پاس پہنچا۔ باغی امراء بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ بادشاہ اور وزیر کو دیکھ کر ایک طرف چھپ گئے۔ بادشاہ حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے کئی دوسرے نذرانوں کے علاوہ پچاس بیڑے بھی لایا تھا۔ یہ بیڑے ایک رومال میں بندھے تھے جب وہ بیڑوں والا رومال حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں پیش کررہا تھا تو دل میں یہ شگون لیے ہوئے تھا کہ اگر حضرت ولایت شاہ اسے ان بیڑوں میں سے چار واپس کردیں گے تو وہ اس سے یہ شگون لے گا کہ وہ مخالف اور باغی امراء پر غالب آجائے گا۔

حضرت ولایت شاہ تھوڑی دیر پہلے کلام پاک کی تلاوت کررہے تھے، قرآن پاک کو نہایت ادب سے رحل پر رکھ دیا اور بادشاہ کے بیڑوں میں سے چھیالیس خود لے کر چار اسے واپس کردیے اور فرمایا۔

"بلاشبہ ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ (نائب) بنادیا ہے پس تو لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلے کر۔" پھر خود سے فرمایا۔ "سبحان اللہ! غریب کو ذرا سا تو ملک ملا ہے اس میں بھی حاسد اور بدخواہ حصہ لگانا چاہتے ہیں۔" پھر دولہ خان کو حکم دیا۔ "دولہ خان! تم چند روز جمعیت خاطر کے ساتھ اپنے بادشاہ کی خدمت میں زیادہ حاضری دو خدا محافظ ہے۔"

دولہ خان نے بادشاہ کے کان میں کہا۔ "حضور! اب ہمیں فوراً چلا جانا چاہیے کیوں کہ اگر کچھ دیر اور ٹھہرے اور حضرت ولایت شاہ کی زبان سے کچھ اور نکل گیا تو بہت برا ہوگا۔"

اسی وقت ایک مرید نے دولہ خان سے سرگوشی میں کہا۔ "حضور! باغی امراء بھی اپنی قسمت کا فیصلہ سننے حاضر ہوئے ہیں آپ ابھی واپس نہ جائیں اور کسی طرح چھپ کر ان کی قسمتوں کا فیصلہ بھی سنتے جائیں۔"

سلیم شاہ سوری اور دولہ خان باہر نکل کر شاہ ولایت کے ایک مرید کی مدد سے ایسی جگہ روپوش ہوگئے جہاں سے باغی سرداروں کی باتیں صاف سنی جاسکتی تھیں۔"

جلال خان نامی باغی سردار حضرت ولایت شاہ کی خدمت میں ادب سے جھک گیا اور اس کے ساتھیوں کے بقول اس نے اپنے دل میں نیت کی کہ اگر شاہ ولایت اسے ہندوستان پر حکمرانی کی خوش خبری سنائیں گے تو وہ پرگنہ آگرہ نذرانے میں آپ کو پیش کردے گا۔

آپ نے جلال خان کو دیکھتے ہی منہ پھیرلیا۔ بولے۔ "جلال خان! خدا سے شرم کرو! تم نے شیر شاہ کا نمک کھایا ہے اب اس کے بیٹے سے نمک حرامی نہ کرو۔ سلیم شاہ خدا کی طرف سے بادشاہ مقرر ہوا ہے اس لیے ہم بھی اس کی طرفداری کریں گے جاؤ اس کے دوست بن جاؤ ورنہ وہ تمہیں قتل کرادے یا چھوڑ دے اس پر اسے پوری قدرت عطا ہوئی ہے۔"

جلال خان فوراً پیچھے ہٹا اور خواص خان اور سعید خان نامی سردار آگے بڑھے انہیں دیکھتے ہی آپ نے فرمایا۔ "بے وقوفو تمہارے سر تمہارے کاندھوں سے کہاں چلے گئے؟ وہ تو میدان میں لڑھکتے پھر رہے ہیں جن کا سر کٹ چکا ہو وہ بادشاہ سے جنگ کس طرح کریں گے۔"

باغی سردار اپنے نوشتہ تقدیر پڑھ چکنے کے بعد بھی سلیم شاہ کے مقابلے میں اتر پڑے اور اسے حکم دیا کہ حکومت ہمارے حوالے کرکے گوشہ نشینی یا اطاعت اختیار کرلو۔

سلیم شاہ نے دولہ خان کو ایک بار پھر ولایت شاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور پوچھا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

آپ اس وقت مٹی کی دیوار کھڑی کررہے تھے دولہ خان کو دیکھتے ہی فرمایا۔ "تو ناحق آیا ہم تو پہلے ہی سے اس کا پشتیبان تعمیر کررہے ہیں۔" یہ کہہ کر گیلی مٹی دیوار پر کھینچ ماری جو چپک گئی۔ دولہ خان سے اس چھوبرے کی طرف۔ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سلیم شاہ کا اقتدار جم چکا بالکل اسی طرح جس طرح یہ مٹی چپک گئی ہے۔"

باغی سرداروں سے زور کا معرکہ کارزار گرم ہوا اور ان میں سے بعض سردار شکست کھاکر قتل ہوئے اور بعضوں نے بھاگ کر دور دراز پہاڑیوں میں روپوشی اختیار کی۔

☆......☆

آپ کی زبان سے جو بھی نکلا، ظاہر ہوکر رہا، احکام اشاروں میں صادر ہوتے تھے اور اس کا مفہوم حقیقی اس وقت سمجھ میں آتا تھا جب آپ کا حکم واقعے کی شکل میں ظاہر ہوجاتا تھا۔

ایک صاحب آپ کے حجرے کے باہر سے اندر کی طرف جھانکنے لگے۔ آپ نے بھی اسے دیکھ لیا۔ فرمایا۔ "اندر کیا دیکھتا ہے اپنے سر پر دیکھ لے۔"

اس نے گھبراکر اپنا سر ٹٹولا اور کہنے لگا۔ "سر پر تو کچھ بھی نہیں حضرت شاہ صاحب۔"

آپ نے حقارت سے فرمایا۔ "خوب اپنے سر کا کوا تجھے نظر نہیں آتا۔"

وہ شخص خوش خوش وہاں سے ہٹ آیا اور لوگوں سے فخریہ کہنے لگا۔ "آج تو شاہ صاحب نے میرے لیے بھی کچھ ارشاد فرمایا۔"

لوگوں نے پوچھا۔ "شاہ صاحب نے کیا فرمایا؟"

اس نے جواب دیا۔ "آپ نے میرے سر پر کوے کی موجودگی کی بشارت دی ہے۔"

اور اس بشارت کا نتیجہ یوں سامنے آیا کہ کچھ عرصہ بعد اسی شخص کو سولی پر چڑھادیا گیا اور جب وہ مرگیا تو اس کی لٹکی ہوئی لاش کے سر پر کوے بیٹھتے اور کائیں کائیں کرکے شور مچاتے رہے۔

اسی طرح ایک سیدزادے گڑ اور چنے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان چنوں میں سے چار مٹھیاں سیدزادے کے حوالے کردیں اور فرمایا۔ "ہم کیا کریں تیری قسمت یہی چار مٹھیاں تیری قسمت میں ہیں۔"

"سیدزادہ ان کلمات پر غور کرتا گھر پہنچا تو معلوم ہوا، سرکاری دیوان کا ہرکارہ آیا تھا وہ کہتا تھا کہ تنخواہیں تقسیم ہورہی ہیں حاضر ہوکر اپنی تنخواہ وصول کرلو۔"

سیدزادہ چار سال سے پریشان تھا اور اسے تنخواہ نہیں مل رہی تھی۔ سیدزادے نے کہا۔ "میں تو سرکاری ملازمت ہی سے بیزار ہوں، مجھے نہیں چاہیے تنخواہ ونخواہ۔ چار سال سے تو ملی نہیں اب کیا ملے گی۔"

دیوان کا آدمی پھر آیا اور سیدزادے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں دیکھا ایک ہجوم اکٹھا ہے اور لوگ اپنی تنخواہیں وصول کررہے ہیں، انہیں تین تین ماہ کی تنخواہیں دی جارہی تھیں۔ سیدزادے کو دیکھتے ہی دیوان نے منشی کو حکم دیا۔ "ان کا سارا حساب بے باق کردیا جائے۔"

منشی نے ناگواری سے کہا۔ "سب کو تین تین ماہ کی تنخواہ دی جارہی ہے انہیں پورا حساب کس طرح دیا جائے ہاں ان کے ساتھ اتنی رعایت ضرور کرسکتا ہوں کہ بجائے تین ماہ کے چار ماہ کی تنخواہ دے دوں۔"

دیوان نے کہا۔ "اچھا چار ہی ماہ کی تنخواہ دے دو بقیہ کا حساب کتاب ہوتا رہے گا۔"

چنانچہ سیدزادے کو چار ماہ کی تنخواہ دے دی گئی اور بقیہ کا حساب انہیں زندگی بھر نہ مل سکا۔

یہ عظیم ہستی جب تک زندہ رہی مرجع خاص وعام رہی، بڑے بڑے بادشاہ یہاں معمولی آدمیوں کی طرح اپنے مستقبل کا فیصلہ سننے آیا کرتے تھے اور بڑے بڑے سرکش جب اس چوکھٹ میں داخل ہوتے تو ان کی حیثیت حضرت ولایت شاہ کی نظر میں روباہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ مگر جب بلاوے کا وقت آیا تو آگرے سے غائب ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ آگرہ میں ان کا مرقد نہیں ہے لیکن آس پاس کے کئی شہروں میں قبریں ان کے نام سے موسوم ہیں۔

وردی، وعدہ اور وفا

زویا اعجاز

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ شاعر مشرق کے شعر کا یہ مصرع تاریخ عالم ہے، ہر خطۂ زمین پر برسہا برس بعد ہی کوئی نادر روزگار شخصیت پیدا ہوتی ہے لیکن وطنِ عزیز کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں نابغۂ روزگار بہت بڑی تعداد میں پروان چڑھے۔ عبیداللہ سندھی ہوں یا حسن علی آفندی، علامہ اقبال ہوں یا شہنشاہ اکبر۔ کیسے کیسے لعل و گر پیدا ہوئے لیکن جب ہم عسکری قوت کی طرف دیکھتے ہیں تو وہاں ایک قطار نظر آتی ہے جن کی نظیر نہیں، جو وطن کی محافظت کے لیے اپنی قربانی کی فصیل کھڑی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ انہی کی قربانیوں کا ثمر ہے کہ ہم آرام و سکون سے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں ورنہ ہمارے چاروں طرف بری نظر رکھنے والے دانت گاڑے بیٹھے ہیں اور وقتاً فوقتاً کتوں کی طرح جھپٹتے بھی ہیں۔ یہ تو ہمارے محافظوں کا کمال ہے کہ وہ ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ انہی میں سے ایک شیر جواں کا تذکرہ جب اس نے برف زار میں دشمن کی سازش کو پیروں سے کچلا اور اپنے لہو سے شمع فروزاں کی، یہ انہی لہو کے قطروں کا فیض ہے کہ ہم امن و آشتی کے سائے تلے زندگی گزار رہے ہیں۔

ہمارے وہ مشعل راہ جن کی زندگانی ہمارے لیے سبق ہے

ضلع صوابی کے اس گاؤں 'نواں کلی' میں یکم جنوری کی یخ بستہ صبح کا ٹھٹھرا ہوا سورج نہایت شان سے افق سے اٹھلاتا ہوا طلوع ہو رہا تھا۔ ٹھٹھرے، خوابیدہ وجود اس کی کرنوں سے تمازت پاتے ہی بہت سکون اور فرحت محسوس کرنے لگے۔ توانائی کی ایک نئی لہر جذب کرتے ہی جہاں ایک جانب سب اپنے معمولات میں مشغول ہو چکے تھے وہیں ایک گھر ایسا بھی تھا جس کے مکین اپنی ذات و معمولات میں ایک جامد سی کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ یہ گھر 'خان گلاب' کا تھا جسے علاقہ میں بہت عزت اور بلند مرتبہ حاصل تھا۔

خان گلاب آج صبح ہی سے بہت بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن بھی معمول سے کہیں زیادہ دیر جاری رہی اور اب وہ دھوپ نکلتے ہی آنگن میں آبیٹھا تھا۔ اس کا بیٹا 'خورشید خان' زیر لب مسکراتا والد کی اس کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ خود خورشید خان بھی کافی بے چین تھا لیکن خان گلاب کا اضطراب بہر حال اس سے کہیں زیادہ تھا۔

''آج نئے سال کا آغاز بھی ہو گیا۔ ہفتے اب دن، مہینے اب ہفتے اور سال مہینوں کی طرح گذرنے لگے ہیں۔'' خورشید خان کے بھائی نے محفل کے شرکاء کی خاموشی ختم کرنے کے لیے ایک رسمی سی بات کہی۔

''ہاں! کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔'' خورشید نے اتفاق کیا۔

''تم لوگ یہ کیوں بھول رہے ہو کہ یہ ایک عیسوی سال کا آغاز ہے۔ ہمارا اسلامی سال تو محرم الحرام سے شروع ہوتا ہے۔'' خان گلاب نے حسبِ عادت انہیں ٹوکا۔

''جی ہاں بابا جان! لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دنیا ایک نئی دہائی میں قدم رکھنے کے لیے تیار ہے۔ بیسویں صدی آج 'ستر' برس کی ہو گئی ہے۔''

''اس صدی نے بڑی خونریزی دکھائی ہے۔ انسانیت کو اس کے فراہم کردہ گہرے اور ان مٹ روگ ملے، تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان کے تو نام ہی بدنام تھے۔ کل ہی کی بات تو محسوس ہوتی ہے کہ لاکھوں جانوں کی قربانیاں اور لہو کی بھینٹ لینے کے بعد وقت نے ہمارے کاسہ میں نئے ملک کی نعمت عطا کی تھی اور اب اس غدر کو بیتے 'تیئس' سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔'' خان گلاب کی آنکھوں میں ماضی کے خونی مناظر پوری شدت سے لہرائے۔

خورشید خان کو اس کی یہی کیفیت مطلوب تھی۔ اس کے موجودہ اضطراب اور بے کلی کا خاتمہ انہی جذبات سے ممکن ہو سکتا تھا۔

''ہمارا ملک اب خیر سے اپنے شباب میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کی نوزائیدگی کے وقت دشمن نے بہت بلند و بانگ دعوے کیے تھے کہ یہ ریاست زیادہ دیر تک اپنے قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکے گی۔'' خورشید نے بات آگے بڑھائی۔

''یہ ملک اللہ کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور اللہ ہی نے ہر مشکل مقام پر اس کی حفاظت فرمائی ہے۔ مجھے خدشہ تو صرف اس بات کا ہے کہ شباب میں لڑکھڑائے ہوئے





قدموں کی لغزش کا تاوان عمر بھر ایک ان چاہا روگ بن کر ساتھ رہتا ہے۔ دعا یہی مطلوب ہے کہ مؤرخ ایسی کوئی لغزش اس ملک عزیز کے شباب کی قسمت میں نہ لکھے۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔'' خان گلاب کے چھوٹے بیٹے نے خلوص دل سے کہا۔

وطن عزیز کے بارے میں یہ گفتگو اور ماضی کے متعلق جنگ اس خاندان کی زندگی کا اہم حصہ تھی۔ تقسیم کا عمل انہوں نے بہت قریب سے دیکھ رکھا تھا۔ خان گلاب نے بٹوارے کے وقت غلط سرحد بندی کے تنازعہ پر کھڑے ہونے والے مسائل اور جنگ میں رضا کارانہ طور پر حصہ بھی لیا تھا۔ اس جنگ کی یادیں آج بھی اس کے دل و دماغ میں روز اول کی طرح نقش تھیں۔ وہ دانستہ طور پر ان نقوش کو دھندلانے ہی نہ دیتا تھا۔ ہر گزرتا سال ان واقعات کے گلشن میں خزاں کی بجائے بھرپور بہار کا موسم نازل کر رہا تھا۔

یہ باتیں کافی دیر تک یونہی چلتی رہیں۔ محفل میں موجود اضطراب اب کم ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر اور گزری تو ایک ملازمہ اپنی اوڑھنی سے چہرہ ڈھانپے آنگن میں چلی آئی۔ اس کے ہر ایک انداز میں سرشاری اور جوش نمایاں تھا۔ وہاں موجود افراد کو اپنے دلوں کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہونے لگی۔

''مبارک ہو...... بڑے لالہ کو اللہ پاک نے ایک بار پھر بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔''

''الٰہی! تیرا شکر......'' خان گلاب نے کہا۔ خورشید خان کی آنکھوں میں بھی تشکر کے آنسو چمکنے لگے تھے۔

''اسے میرے پاس مردانے میں پہنچا دو۔ اس کے کان میں اذان میں ہی دوں گا۔'' اس کے بوڑھے وجود کی سرشاری قابل دید تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا مردانے کی طرف چل دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں نومولود کو گرم کمبل میں لپیٹ کر اس کے سامنے لے آیا گیا۔ اس نے نرمی اور محبت سے پوتے کو تھام لیا۔ بچے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ لمحہ بھر کے لیے مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

''ماشاء اللہ! اللہ پاک میرے چاند کو نظر بد سے بچائے۔'' اس نے بچے کی پیشانی پر محبت بھرا بوسہ ثبت کیا اور اس کی سماعت میں اللہ کی کبریائی کی شہادت گوش گذار نے لگا۔

''تو بہت خوش قسمت ہے خورشید خان! بہت ہی بھاگوان بچہ ہوگا یہ۔'' چند لمحوں بعد اس نے بیٹے کو مخاطب کیا۔

''وہ بھلا کیسے بابا جان؟'' چھوٹے بیٹے نے تجسس سے دریافت کیا۔

''مجھے اس کی پیشانی پر مخصوص چمک اور کشادگی دکھائی دے رہی ہے۔ ایسے بچے بہت ہی خوش قسمت اور قدرت کی جانب سے خصوصی صلاحیتوں سے ودیعت شدہ ہوتے ہیں۔'' والد کی باتیں سن کر خورشید خان خوشی سے

پھولا نہ سمار ہا تھا۔

''اس کا نام کیا رکھنا ہے بابا جان؟''

''کرنل۔'' اس نے برجستگی سے جواب دیا۔

''یہ بھلا کیا نام ہوا؟'' اہلخانہ کا ردِعمل بھی بے ساختہ تھا لیکن اگلے ہی پل وہ اس کا 'پس منظر' خود بخود ہی سمجھ گئے۔

''اللہ پاک نے میری ہر اولاد کو کئی بار اولادِ نرینہ کی نعمت سے سرفراز کیا ہے۔ خورشید کے بھی اس سے قبل دو بیٹے ہیں لیکن ایسی تابانی اور وقار مجھے کسی بھی بچے میں نظر نہیں آیا۔ میں نے اپنی ہر دعا میں پروردگارِ دو عالم سے ایک ہی عرض کی تھی کہ میری نسل میں کوئی ایسا 'نگینہ' ضرور پیدا فرمائے جو وطنِ عزیز کا محافظ اور اپنے پُرکھوں کی روایات کا اصل وارث ثابت ہو۔ میں اپنے دیگر بچوں کی اہلیت پر کوئی سوال نہیں اٹھا رہا لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ خورشید خان کا یہ بیٹا ایک روز اپنے خاندان 'نواں کلی اور صوابی کی ہی نہیں بلکہ پاک سرزمین کی شان ثابت ہوگا۔''

''اس سے بڑھ کر خوش نصیبی ہمارے لیے اور کیا ہوگی بھلا؟'' چھوٹے بیٹے نے بلا تامل کہا۔

''بس تو پھر طے پایا...... اس کا نام آج سے کرنل ہوگا، کرنل شیر خان۔'' خورشید خان کا انداز حتمی تھا۔

''میرا کرنل ایک روز پاکستانی فوج کا لازمی حصہ بنے گا اور دلیرانہ کارناموں کی ایک نئی مثال قائم کرے گا۔'' دادا کی آنکھوں نے خواب بننے کا آغاز کر دیا تھا۔

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بابا جان!'' خورشید نے جذبے سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں محبت نمی کی صورت چمک رہی تھی۔

☆......☆

کرنل شیر کی پیدائش کے بعد بوڑھا خان گلاب ایک بار پھر جوان ہو اٹھا تھا۔

اس کا وجدان گواہی دیتا تھا کہ یہ پوتا اس کے لیے بہت باسعادت ثابت ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عمر کی نقدی اب اپنے اختتام تک آن پہنچی ہے۔ کم سے کم وقت میں اسے کرنل شیر خان کے کردار کو ان مٹ مضبوطی اور عظمت کی نئی بلندی میں ڈھال کر ایک حقیقی جری اور مومن سپاہی پیدا کرنا تھا۔ اس روز کے بعد خان گلاب نے پوتے کو اپنے ساتھ ہی نتھی کر لیا۔ اس کی پرورش کا کٹھن مرحلہ وہ اپنے زورِ بازو سے طے کرنا چاہتا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ وہ بڑا ہو رہا تھا۔

چھوٹی سی عمر میں ہی اسے کلمے اور کئی ایک مسنون دعائیں یاد کروادی گئیں۔ اس کا حافظہ غیر معمولی تھا اور ذہانت بے مثال۔ کسی بھی چیز کو یاد کرنے کے بعد وہ اسے کبھی نہیں بھولتا تھا۔ خان گلاب نے اسے نماز یاد کروانے کے بعد فوراً ہی اپنے ساتھ مسجد بھی لے جانا شروع کر دیا۔ وہ نوعمری میں ہی اسے نماز کا پابند بنا دینا چاہتے تھے۔

نماز کے بعد وہ اسے سیر کے لیے لے جایا کرتے۔ یہ لمحات ان دادا پوتا کے لیے بہت قیمتی ہوتے تھے۔ خان گلاب اس دوران اس کی ذہن سازی کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ کرنل کے معمولی سے معمولی سوال کو بھی بھرپور شفقت اور توجہ سے سن کر تسلی بخش جواب دیتے۔ اس کی مشاہداتی قوت اور ذہانت ہر مظہرِ فطرت کو ایک منفرد زاویہ سے دیکھتی اور محسوس کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک روز اس نے دادا سے کہا:

''یہ درخت اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق ہیں ناں دادا!''

''وہ کیسے بھلا دادا کی جان!'' وہ چونک گئے۔

''میں نے انہیں ہمیشہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہی دیکھا ہے۔ اس کی لکڑی پر کیڑے مکوڑے رینگتے ہیں۔ اس کے پتوں اور شاخوں پر پرندے گھونسلا بنا کر رہتے ہیں۔ سخت گرمی میں بھی یہ سب کو سایہ دیتا ہے۔ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے کہتا چلا گیا۔

''تمہاری یہ سب باتیں ٹھیک ہیں میرے بچے! اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق بہترین ہے لیکن افضل ترین مقام صرف انسان کو حاصل ہے۔''

''انسان کیسے ہوسکتا ہے دادا جان؟''

''کیوں؟ انسان کیوں نہیں ہوسکتا؟'' انہوں نے جوابی سوال داغا۔

''انسان تو دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں ناں! ابھی دو روز پہلے ہی تو گل خان اور شمشیر کی لڑائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔'' اس کی معصومیت بھی بے انتہا مدلل تھی۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو دادا کی جان! انسان بے شک اپنا اصل مقام و مرتبہ بھول چکا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اسے فرشتوں نے بھی سجدہ کیا تھا۔''

''کیا واقعی دادا جی؟'' وہ حیران تھا اور پُرجوش بھی۔

''ہاں میرے بچے! اللہ تعالیٰ نے علم کی بنیاد پر اسے ... عطا کیا تھا اور پھر اسے اپنا خلیفہ بنا کر دنیا میں بھیج دیا ... وہ اللہ کے احکامات کے مطابق یہاں نظامِ حکومت قائم ... اس کے لیے جہاد کر سکے۔''

''جہاد کرنا کیا ہوتا ہے دادا جی؟'' اس کے سوال ... گلاب سنبھل گیا۔ یہ لمحات اس کے لیے بہت قیمتی ... پوتے کے ذہن نے آج پہلی بار 'فی سبیل اللہ ... جانا تھا۔ 'شہادت' کا مقام و مرتبہ پہچاننا تھا اس لیے ... بھی بے احتیاطی کا متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ کچھ دیر ... خیالات مجتمع کرتے رہے اور پھر نرمی سے ... ''اللہ تعالیٰ نے زندگی کی صورت میں ہمیں ... نعمت عطا کی ہے بیٹا! انسان کی تخلیق کا مقصد ... تھا۔ ہر وہ انسان جو اللہ کی خوشنودی کے لیے ... فرائض سرانجام دے، جس کام کے کرنے کا حکم ... بجا لائے، ممانعت شدہ اعمال سے گریز کرے تو ... صورت میں وہ ہر پل حالتِ عبادت ہی میں ہوتا ... ان سب عبادات میں افضل ترین درجہ جہاد کو دیا ... ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑنا، اس کی خوشنودی کے لیے اپنی ... کا سودا کرنا جہاد ہے۔ ایک عام انسان کے لیے ... ہی بلند ترین مرتبہ ہے۔ اللہ کی نافرمانی اور برائی ... توں سے اجتناب کرنا، دوسروں کو بھی اس سے ... اللہ کے دشمنوں سے لڑنا جہاد ہے۔ اس کا صلہ جنت کی ... میں ملے گا۔ جنت کی خوبصورتی، آسائشات اور ... کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

کرنل شیر کا رواں رواں سنسنی آمیز لذت محسوس کر رہا ... گلاب اس کی یہ کیفیت بغور دیکھ رہے تھے۔ ان ... شدت سے تمنا کرنے لگا کہ وہ پوتے کو ان راہوں ... بننے کے لیے بھی آمادہ کرنا شروع کر دیں لیکن ضبط ... تھا۔ وہ اس عظیم ترین رتبے کے لیے اس پر کوئی جبر یا ... مسلط نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس آرزو کی کونپل ... شیر کے وجود میں پھوٹنی زیادہ ضروری ... اس کونپل کو داخلی تحریک ملنے کی صورت میں ... حقیقی معنوں میں تناور ثابت ہوسکتا تھا۔ کرنل ... میں کھوئی کھوئی سی کیفیت دیکھ کر ان کی ... نظریں بھانپ گئی تھیں کہ مطلوبہ وقت اب زیادہ ... نہیں ہے۔

☆......☆

کرنل شیر خان کی پرورش اور تربیت نہایت احسن طریقہ سے جاری تھی۔

نماز اور کلمے تو اسے پہلے ہی یاد ہو چکے تھے۔ گھر کے مردوں کے ہمراہ مسجد میں نمازِ پنجگانہ کی ادائیگی بھی اس کے لیے بہت اہمیت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے ہم عمر بچے رکوع وسجود میں نمازیوں کو مختلف طریقوں سے زچ کرنے میں لطف محسوس کرتے لیکن وہ ان سب شیطانی حرکات اور منفی شرارتوں سے کوسوں دور تھا۔ ایسے خشوع و خضوع سے نماز کی ادائیگی میں بہت فرحت ملتی تھی۔ علاقے کے دیگر افراد بھی اس غیر معمولی امر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''تمہارا یہ بیٹا بہت خوش بخت ہوگا خورشید خان!'' ایک معمر شخص نے نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد اس سے کہا۔ دیگر اہلخانہ گھر روانہ ہو چکے تھے۔

''یہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کی پاک ذات کا کرم ہے چاچا! وہ جس کو چاہے، نیک و سعادت منداولاد سے نواز کر دنیا و آخرت میں سرخرو فرمادے۔''

''اس کے ہم عمر لڑکوں کی شرارتوں سے تنگ آکر مولانا صاحب کوئی سنجیدہ قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ جب کہ شیر خان سے وہ بہت خوش ہیں، اللہ ایسی سنجیدگی اور سعادت سبھی کو عطا فرمائے۔''

''ارے چاچا جی! بچے تو سبھی ایک ہی فطرت کے ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی خاص فائدہ یا خاص مقصد کے لیے شیر لب ہلاتے ہوئے نماز کو جسمانی ورزش سمجھ کر ادا کرتا ہو اور کسی کو علم بھی نہ ہو۔'' ایک اور شخص نے ہنستے ہوئے چوٹ کی۔ اس کا بیٹا بھی انہی شرارتی لڑکوں کے ٹولے میں شمار ہوتا تھا۔

''میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے بختیار خان! انسان کی پرکھ آتی ہے مجھے۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ خورشید خان کا یہ بیٹا ایک روز اس علاقے کا نام ضرور روشن کرے گا۔ اس کی پیشانی پر غیر معمولی چمک ہے۔''

''کیوں میاں؟ ذرا سورۃ اخلاص تو سناؤ ہمیں!'' بختیار اب بھی بے یقین تھا۔

کرنل شیر نے فوری طور پر خوش الحانی اور جذبے سے اس کی یہ فرمائش پوری کر دی۔ اس کی آواز کا گداز دلوں کو پگھلانے لگتا تھا۔

''ماشاء اللہ...... جیتے رہو!'' بختیار نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اسے حافظِ قرآن بنانا خورشید بھائی! ماشاء اللہ اس کی زبان میں بہت تاثیر ہے۔" قریب ہی موجود ایک شخص نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے عالم دین بھی بنانا خورشید میاں! جانے کیوں دل کہنے لگا ہے کہ اسے دین میں بلندترین مقام حاصل ہوگا۔" بختیار یکدم ہی بالکل تبدیل شدہ انسان دکھائی دینے لگا تھا۔

"کیوں نہ یہ فیصلہ خود شیر ہی سے کروالیا جائے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے؟" خورشید نے مسکرا کر کہا۔

"بتاؤ بیٹا! آپ بڑے ہوکر کیا بنو گے؟ ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ، فوجی، حافظ، عالم یا کچھ اور؟" معمر شخص نے پوچھا۔

"مومن، میں بڑا ہوکر مومن بننا چاہتا ہوں۔" کرنل شیر رسان سے بولا۔

"آپ جانتے بھی ہو کہ مومن کیا ہوتا ہے؟" وہاں موجود بھی افراد چونک گئے تھے۔

"جی ہاں! دادا جان نے بتایا تھا کہ مومن وہ ہوتا ہے جو اللہ کی ہر بات مانے۔" اس نے معصومیت سے بتایا۔

"سبحان اللہ!" حاضرین کی زبان سے بے ساختہ تعریفی کلمات برآمد ہوئے۔ "مومن کے بعد کیا بنو گے بیٹا؟"

"یہ تو اللہ کی مرضی ہوگی ناں چاچا جی! جب میں اس کی ہر بات مانوں گا تو انعام میں وہ مجھے جو بھی رستہ دینا چاہے، قبول ہوگا۔" اس چھوٹے سے لڑکے کے منہ سے گہری فلسفیانہ باتیں سن کر وہاں ہر ایک فرد اس کے لیے بے پناہ محبت محسوس کررہا تھا۔

"اللہ پاک تمہیں ہر امتحان میں سرخروئی عطا فرمائے میرے بچے! تمہارے لیے ہر منزل آسان ہو۔" معمر شخص نے اسے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔

مجمع اب چھٹنے لگا تھا۔ خورشید خان بھی بیٹے کو لیے واپس چلا آیا۔ اولاد کے لیے تعریفی کلمات نے فطری طور پر ہی اسے بہت خوشی عطا کی تھی تاہم اس کے مستقبل کا فیصلہ وہ حالات اور شیر خان کا ذاتی میلان دیکھ کر ہی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تمام تر سوچوں اور منصوبہ بندیوں سے قطع نظر کاتب تقدیر کی جانب سے کرنل شیر کی قسمت میں لکھے گئے بلند ترین رتبے سے ہر کوئی انجان تھا۔

☆......☆

وقت دبے پاؤں مزید آگے بڑھ گیا۔

اس روز کرنل کھیل کود سے فراغت پاتے ہی گھر لوٹا تو اس کے چہرے پر غصہ اور آزردگی کے دبے دبے تاثرات تھے۔

"کیا ہوا میرے شیر بیٹے کو؟" خان گلاب نے محبت سے پوچھا۔

"میں اب باہر کبھی کھیلنے نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟ کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟"

"سب بچے مجھے چڑاتے ہیں۔"

"میں نے تمہیں کسی مشکل سے ڈرنا یا پیچھے ہٹنا تو نہیں سکھایا کرنل!"

"آپ نے مشکل سے ڈرنا نہیں سکھایا لیکن میرا نام مشکل ضرور رکھ دیا اور اپنا اتنا عجیب نام بھی کبھی تبدیل نہ کیا۔" اس کی بے ساختگی پر خان گلاب بے اختیار ہنس پڑے۔

"کیا عجیب ہے بھئی میرے نام میں؟" ہنسی پر قابو پاتے ہوئے ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہورہے تھے۔

"سب لڑکے مجھے کہتے ہیں تمہارے دادا اتنے بڑے کڑیل سے آدمی اور نام تو دیکھو! کتنا نازک سا گلاب۔"

"گلاب پھولوں کا بادشاہ ہوتا ہے میرے بچے! ایک نایاب اور بے مثال تخلیق خداوندی۔"

"مگر آپ کا نام گلاب نہیں ہونا چاہیے تھا۔" اس کی معصوم ضد اب بھی برقرار تھی۔

"جبکہ میرا خیال ہے کہ اس سے بہترین کوئی اور نام مجھے والدین دے ہی نہیں سکتے تھے۔ گلاب، مہک، وقار، شان اور نایاب ہونے کی جیتی جاگتی علامت۔ دوستوں کے لیے انمول اور دشمن کے لیے خاردار...... ہم مسلمانوں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے میرے چاند!" دادا کی منطق سن کر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں دیکھ کر خان گلاب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"اچھا! اب بتاؤ تمہیں اپنے نام سے کیا اعتراض ہے بھلا؟ اتنا شاندار نام تو ہے، کرنل شیر خان، ادا کرتے منہ میں مٹھاس سی گھل جاتی ہے۔"

"سب بچے مجھے چڑاتے ہیں کہ ایسا انوکھا نام پورے گاؤں میں کسی کا بھی نہیں ہے۔"

"وہ انجان ہیں۔ اس کی اہمیت سے واقف

"[illegible] واقف ہونا چاہتا ہوں دادا جی! مجھے تو بتایئے [illegible] نے اصرار کیا۔

"[illegible] بیٹا! اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں آگاہی دے [illegible] انہوں نے گہری نظروں سے پوتے کو دیکھا جو [illegible] کا تھا۔

"[illegible] یہ نام سننے والوں کے لیے بے [illegible] اور نامانوس بھی...... حقیقت تو یہ ہے کہ یہ [illegible] فوجی عہدہ ہے اور اس عہدے کے حامل ایک [illegible] بھی زندگی میں پہلی اور آخری بار بے پناہ [illegible]"

"وہ کون تھا دادا جی؟" کہانیاں سننے کے شائق [illegible] نے کہا۔ دادا نے ہمیشہ علی ابن طالب، حسین ابن [illegible] خالد بن ولید، طارق بن زیاد، میجر عزیز بھٹی اور راشد [illegible] جیسے بہادروں کی کہانیاں سنا کر اس کا خون [illegible] پایا تھا۔ آج وہ کسی نئے کردار سے متعارف ہونے والا تھا [illegible] فطری تھا۔

"اس کردار سے تعارف کروانے سے قبل میں تمہیں [illegible] اور داستان سنانا چاہتا ہوں بیٹا! گئے وقتوں کی بات ہے۔ [illegible] بزرگوں نے غلامی کے اندھیروں کو آزادی کے [illegible] میں تبدیل کرنے کے لیے ہندوؤں اور انگریزوں [illegible] آزمائی کی تھی۔ وہ وقت بہت کٹھن تھا۔ ایک صدی [illegible] کے نشے میں چور انگریز قوم اقتدار چھوڑنے کے [illegible] نہ تھی۔ ہندوؤں کا ایک ہی نعرہ تھا، ہندوستان [illegible] مسلمانوں نے بروقت ہواؤں کا رخ بھانپ [illegible] کہ ہندو اپنی سازشوں اور عیاریوں سے ان [illegible] دیں گے اس لیے انہوں نے ایک نیا نعرہ [illegible]

"[illegible] تھا دادا جی؟" کرنل نے فوراً پوچھا۔

"[illegible] اور چلے جاؤ! ہندوستان میں امن اسی [illegible] قائم رہ سکتا تھا کہ دونوں اقوام کو بالکل جائز [illegible] علاقے دے دیے جائیں۔" خان [illegible] توقف کیا اور پوتے کی آنکھوں میں ابھرنے [illegible] بھانپ لیا۔

"[illegible] یہ سوچ رہے ہوگے کہ انگریزوں کے [illegible] بعد یہ دونوں اقوام اکٹھی بھی تو رہ سکتی تھیں [illegible] رہی تھیں۔" دادا کی بات پر کرنل نے اثبات [illegible] ہلا دیا۔

"[illegible] کبھی بھی نہیں ہوسکتا تھا...... کبھی بھی نہیں۔ وہ بیرونی ممالک سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ ان کے تخت و تاج پر قبضہ کرکے ایک نئے اسلامی نظام حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔ ہندو برہمنوں کی اجارہ داری کا ایک ہی جھٹکے میں خاتمہ ہوگیا۔ اسلامی مساوات اور اخوت نے صدیوں پرانے گلے سڑے نظام کی دھجیاں اڑادی تھیں۔ ہندو معاشرے کے کچلے ہوئے طبقات نے بغاوت کا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہوئے جوق در جوق اسلام قبول کیا اور اس نئے معاشرے کے لیے تقویت بنتے چلے گئے۔ یہ "گناہ" ہندو برہمنوں کے لیے ہرگز قابل معافی نہیں تھا۔ ہندو قوم کی ایک بہت بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی نفرت، غصہ اور انتقام کبھی سرد نہیں ہونے دیتے۔ بڑے اہتمام سے اس کی پرورش کرکے پروان چڑھاتے ہوئے اگلی نسل تک منتقل کردیتے ہیں۔ منتقم مزاجی کی یہ خوبی ان کی نسلوں کو زہریلا بنادیتی ہے۔ وہ مختلف باغی سرگرمیوں سے مسلم حکومت کی ناک میں دم کرتے رہے اور پھر انگریزوں کی آمد سے ان کی دلی مراد بر آئی۔ جنگ آزادی میں ان

سید آل رضا کی شاعری کا آغاز یوں تو پرتاب گڑھ کے دوران قیام ہو چکا تھا اور وہ بہ حیثیت شاعر مشاعروں میں شرکت بھی کرتے رہے تھے لیکن لکھنو آنے کے بعد ان کی شاعری نے بڑی ترقی کی۔ انہیں یہاں کے مشاعروں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ موصوف نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے ادبی رتبے کو منوالیا۔ اس زمانے میں لکھنو میں جتنی ادبی انجمنیں تھیں، سب میں وہ حصہ لیتے تھے۔ چونکہ آل رضا صاحب کا ادبی مرتبہ مسلم تھا اس کے اعتراف میں "انجمن معین الادب" نے جس کے ارکان میں صفی لکھنوی اور ظریف بھی شامل تھے انہیں نائب صدر کی حیثیت سے منتخب کیا۔ بعدازاں صدارت کے فرائض بھی تفویض کردیے گئے۔ اس انجمن کے متعلق سید ہاشم رضا صاحب نے بتایا: یہ لکھنو کی بڑی مشہور انجمن تھی۔ حفیظ جالندھری اور جگر مراد آبادی جیسے شعراء اس کے مشاعروں میں آتے تھے۔ اس انجمن کے تحت بہت سے مشاعرے آل رضا صاحب کے گھر پر ہوئے۔ ہم اس وقت طالب علم تھے۔ ہم بھی شریک ہوتے تھے۔ موصوف نے کئی سال تک اس انجمن کی صدارت کی۔

اقتباس: پاکستانی ادب کے معمار
از: ڈاکٹر سید محسنہ نقوی

دونوں ہی اقوام نے 'گھس بیٹھوں' کو باہر نکالنے کے لیے بھرپور کوشش کی لیکن اپنوں کی غداری سے شکست کا جھومر پیشانی پر سج گیا۔ اس موقع پر بھی ہندوؤں نے فوراً پینترا بدلا۔ وہ انگریزوں کی مادری زبان سیکھ چکے تھے اس لیے نہایت آسانی سے انہیں یہ باور کروانے میں کامیاب ہوگئے کہ جنگ آزادی تو اصل میں مسلمانوں کی حکمت عملی تھی۔ ہندو چونکہ پہلے سے ہی ان کے غلام تھے اس لیے حق ماتحتی ادا کرنے کے لیے انگریزوں کے خلاف ہتھیار نہ اٹھاتے تو اور کیا کرتے؟" خان گلاب نے تنفس درست کرنے کے لیے توقف کیا۔

"مسلمانوں نے اپنی بات کیوں نہ سمجھائی انہیں؟ وہ انہیں یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ اپنی آزادی کے لیے لڑنا ان کا حق تھا۔" وہ بے چینی سے بولا۔

"یہی تو ستم ظریفی تھی میرے بچے! مسلمانوں کو ان کی زبان آتی ہی کہاں تھی؟ اس وقت کے علمائے کرام کا ماننا تھا کہ انگریز چونکہ ایک کافر قوم ہے لہٰذا ان کی زبان سیکھنے والا بھی کافر ہو جائے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" کرنل نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

"بحیثیت قوم یہی ہماری سب سے بڑی کمزوری رہی ہے کہ ہم نے اپنی میراث سے منہ موڑے رکھا ہے۔ قرآن وحدیث کے احکامات کے مطابق تو دنیاوی علم حاصل کرنے میں کوئی قباحت ہی نہیں لیکن ہم کوئی بھی تبدیلی آسانی سے قبول نہیں کرتے بلکہ حتی الامکان اس سے فرار کی راہیں اپناتے ہیں۔"

"پھر...... پھر کیا ہوا دادا جان؟" اپنی کتابوں میں قیام پاکستان کے بارے میں پڑھنے کے باوجود آج دادا سے انوکھے حقائق جان کر وہ دنگ ہو رہا تھا۔

"پھر وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے چند روشن دماغ افراد نے تعلیم کا بیڑہ اٹھایا۔ انہیں شعور فراہم کیا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد انگریزوں کو قانونی طور پر ہندوستان چھوڑنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ہندو اسی موقع کی تاک میں تھے۔ انہوں نے ہزاروں برس سے پالی گئی نفرت کا مکمل حساب چکانا تھا۔ اس بار مسلمانوں کو بروقت ان کی چال سمجھ آگئی اور انہوں نے اپنے لیے مکمل علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ تبدیلی دیکھ کر ہندو شپٹا اٹھے۔ ان کے سرکردہ رہنماؤں نے تقسیم ہند کی مخالفت شروع کر دی۔ اہنسا کے پجاری موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنے مخصوص انداز میں اس عمل کو روکنے کے لیے بیانات داغنے شروع کر دیے۔"

"وہ کیا کہتا تھا دادا جی؟" کرنل اب اس داستان میں مکمل طور پر غرق ہو چکا تھا۔

"اس کا کہنا تھا کہ رام اور رحیم ایک تو ہیں۔ مسلمان اور ہندو ایک ہی خدا کے بچے ہیں۔ تو پھر علیحدگی کیوں؟ کبھی کہتا کہ تاریخ سے ایسی کوئی مثال ڈھونڈ کر لا دو جہاں چند نادانوں نے اپنے پرکھوں کے دھرم سے منہ موڑ کر ایک الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ دھرم بھرشٹ کرنے والے پہلے بھی ہندوستانی تھے، اب بھی ہندوستانی ہیں اور بھوش میں بھی رہیں گے۔ وہ اپنے پورے حقوق کے ساتھ یہاں رہ سکتے ہیں۔ اس کے یہ الفاظ اور پیشکش بہت پُرکشش تھی۔ عام اور کم تعلیم یافتہ مسلمان اس کی چرب زبانی میں آ بھی جاتے لیکن اب ان کی قیادت اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے ہاتھ میں تھی جو 1867 میں ہندی اردو تنازعہ کے موقع پر اسی موہن داس کرم چند گاندھی کی ایک بات اب تک فراموش نہ کر پائے تھے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جس کا رسم الخط عربی سے ملتا ہے۔ لہٰذا یہ ہمیں بالکل گوارا نہیں۔ جو شخص رسم الخط کی بنیاد پر مسلمانوں سے اتنا متعصب ہو سکتا تھا، وہ بعد میں کیونکر ان کے حق میں مثبت رہ پاتا۔ اس نے ایک ہی رٹ برقرار رکھی کہ ہندوستان کا بٹوارہ کسی زندہ وجود کو دو حصوں میں کاٹنے کے مترادف ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم فریقین کو موت کے منہ میں دھکیل دیں۔" خان گلاب کی آنکھیں ماضی کے نقوش کھوجتے پل پل رنگ بدل رہی تھیں۔

"جب ان کی مخالفتوں، سازشوں اور تمام تر تدابیر کے باوجود مسلم قیادت اپنے مؤقف پر قائم رہی تو سابقہ طیش اس نئی اہانت میں ڈھل گیا۔ بٹوارہ انا کا مسئلہ بن گیا۔ اب انگریز اور ہندو گٹھ جوڑ کی شکل اختیار کر گئے تھے اور دونوں کا مقصد اس نئی ریاست کی تباہی تھا۔ کانگریس کے ایک نمایاں رہنما 'سردار پٹیل' نے متعصب ہندوؤں کو بھرپور [illegible] دیتے ہوئے کہا۔ 'جناح کو اس کی ضد پوری کر لینے دو۔ اپنی جاتی کے لوگوں کو الگ دیش دے کر اپنا نام اتہاس میں امر کرنا چاہتا ہے لیکن یہ دیش سفل نہیں ہوگا۔ پانچ سال کے اندر ہی مسلم لیگ ہمارے دروازوں پر آکر الحاق کر لینے کی بھیک مانگ رہی ہوگی۔'

ایک طرف ہندو اس خوش فہمی میں مبتلا مسلمانوں کی بربادی کا سامان کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے تو دوسری جانب انگریزوں کی خواہش تھی کہ وہ ان دونوں نوزائیدہ ریاستوں پر اپنا تسلط کسی نہ کسی طرح قائم رکھیں۔ آخری وائسرائے دونوں ممالک کا گورنر جنرل بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مردِ مومن، مردِ آہن اور مردِ بحران قائداعظم محمد علی جناح نے جب اسے یہ بتایا کہ پاکستانی قیادت کو اس کی یہ تجویز کسی صورت قبول نہیں تو جانتے ہو اس نے کیا کہا؟"

"کک...... کیا کہا؟" کرنل مکمل ٹرانس میں تھا۔

"اس نے نہایت رعونت سے کہا آپ کو شاید علم نہیں اس انکار کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ جناح کبھی کسی دباؤ میں نہیں آتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں پاکستان کے سرمائے سے چند کروڑ کی محرومی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے فوری طور پر ان کی بات کاٹی اور پھنکارتے ہوئے بولا۔ 'نہیں! مسٹر جناح! آپ کو تمام تر سرمایوں اور پھر پاکستان سے محروم ہونا پڑے گا۔'

قائد نے بڑے وقار سے جواب دیا کہ یہ ملک اللہ کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ اس کی رکھوالی بھی وہی پاک ذات کرے گی۔ وہی میرے بعد بھی اس قوم میں ایسے وارث پیدا فرمائے گا جو اس سفینہ کو کبھی ڈگمگانے نہیں دیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن اور کانگریس کے گٹھ جوڑ نے سرمائے، تحفظ، اسلحہ غرضیکہ ہر قسم کا ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر ایک اور مسئلہ میں الجھا دیا...... کشمیر جو ہر لحاظ سے پاکستان سے الحاق کا حقدار تھا لیکن اسے ہندوؤں کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ وہاں کی 80 فیصد غیور مسلم آبادی کے لیے [illegible] کا یہ نیا طوق کسی صورت قابل قبول نہیں تھا۔ انہوں نے سر پر کفن باندھ لیے اور وقت کے فرعون سے الجھ گئے۔ میں بھی اس جنگ میں رضاکارانہ طور پر شریک ہوا تھا۔"

"مجھے اس جنگ کے متعلق بھی کچھ بتائیے دادا جان!؟" اس نے اصرار کیا۔

"وہ ایک طوفانی یلغار تھی جس کی طاقت سہنے میں ناکامی کے بعد ہندوستان یہ معاملہ اقوام متحدہ میں لے گیا تھا۔ اسی جنگ کے دوران مجھے وہ شخص ملا تھا۔ وہ ایک دستے کا سپہ سالار اور حقیقی معنوں میں مردِ آہن تھا۔ اس کی ذہانت بے مثال تھی اور ہر حکمت عملی بروقت و کامیاب۔ اس کے وجود میں پارہ بھرا تھا اور اعصاب میں برق کوندتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ دشمنوں کے لیے ایک قہر تھا۔ اس نے ہندوستانی فوج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس کی جرأت، دلیری اور کردار کی عظمت نے میرے دل میں ایسا گھر کیا کہ میں نے اسی وقت عہد کر لیا کہ اگر غازی بن کر لوٹا تو اپنی نسل میں ایک ایسا ہی وارث ضرور تیار کروں گا۔" خان گلاب یکدم خاموش ہوئے اور دم بخود بیٹھے پوتے سے پوچھا۔ "کیا تم جاننا نہیں چاہو گے کہ اس مردِ مجاہد کا نام کیا تھا؟"

"کرنل شیر...... وہ کرنل شیر ہی تھا ناں دادا جان؟" اس کا لہجہ سرسرا اٹھا۔

"ہاں! اور جانتے ہو کہ یہ طویل داستان تمہیں سنانے کا کیا مقصد ہے؟" ان کے اگلے سوال پر کرنل کا سر اثبات میں ہل گیا۔

"میں بھی اسی کرنل کی طرح اپنے ملک کے لیے دشمنوں سے لڑوں گا، اللہ کے اس تحفہ کو جناح کا حقیقی وارث بن کر سنبھالا دوں گا، ماؤنٹ بیٹن اور پٹیل کے ہم قوم افراد کے سامنے انہیں کبھی شرمندہ نہیں ہونے دوں گا، میں تعلیم سے کبھی منہ نہیں موڑوں گا، غیر مسلم افراد پر کبھی اپنے اعتبار کی دولت نچھاور نہیں کروں گا۔" وہ فرطِ جوش سے کہتا چلا گیا۔ تاہم اس کیفیت میں کسی بھی قسم کا کوئی جذباتی یا وقتی ابال نظر نہیں آتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے وجود کی گہرائی میں یہ خواہش بہت پہلے سے ہی موجود تھی جو آج اپنی قوم کی طویل داستان سن کر شعور کی گرفت میں آگئی تھی۔ خان گلاب کے لیے یہ لمحہ ہی سرمایۂ حیات تھا۔

"میری ایک بات یاد رکھنا بیٹا! دشمن نے ہمیں ہر موڑ پر بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ ابھی چند سال پہلے ہی تو اس کی سازشوں سے پاکستان دولخت ہو گیا تھا۔ تم نے ہر حال میں میرا یہ خواب پورا کرنا ہے۔ اس داستان کو زندگی میں کبھی فراموش نہ کرنا۔ تمہیں اگلی کئی نسلوں کے لیے ایک مثال بننا ہے۔" انہوں نے فرطِ محبت سے پوتے کی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔

"میں آپ سے کیا ہوا ہر وعدہ نبھاؤں گا۔" کرنل شیر کے لب ولہجہ میں آہن کی جھنکار تھی۔

☆......☆

زندگی بے مقصد ہو تو ایک طویل، لامتناہی رہگذر کی طرح معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اسی زندگی میں کوئی مقصد در آئے تو شب وروز طوفانی رفتار اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ کرنل شیر خان کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

اس روز کے بعد وہ اپنے وجود میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔شریر طبیعت کے ساتھ احساس ذمہ داری اور حساسیت بھی گندھ گئی تھی۔دیانتدار، فرمانبردار اور محنتی تو وہ پہلے بھی تھا لیکن اس کے بعد تو یہ شخصی اوصاف عروج پر پہنچ گئے۔خاندان، دوست احباب میں اس کی محنت، لگن، پڑھائی میں بہترین نتائج اور کردار کی مثبت خوبیاں ایک مثال بن گئیں۔والدین اس پر رشک کرتے اور کسی بھی نظر بد سے محفوظ رکھنے کی دعائیں کیا کرتے۔تقدیر بھی اسے مختلف آزمائشوں کی بھٹی سے گذار کر کندن بنانے کے درپے تھی۔پہلے شفیق دادا کو موت کا ظالم پنچھی اپنے خونی جبڑوں میں دبوچ کر لے گیا اور پھر والدہ نے بھی خاموشی سے دارفانی کو الوداع کہہ دیا۔اس موقع پر برداشت اور ضبط کی تمام حدیں پارہ پارہ ہوگئی تھیں لیکن کرنل شیر نے یہ صدمات بہت وقار اور خاموشی سے سہہ لیے۔اس کا صبر اور ظرف بھی اہلخانہ کے لیے حیران کن تھا۔تمام تر خونی رشتوں سے محبت وانسیت اپنی مسلم سہی لیکن اس کی زندگی میں دادا اور والدہ کی اہمیت بہرحال سب سے زیادہ تھی۔آٹھ سال کی عمر میں ان رشتوں سے جدائی نے کرنل شیر کی زندگی میں بردباری اور متانت کا ایک نیا باب رقم کردیا۔اسے اپنا بھرم بھی بے حد عزیز تھا۔وہ سنجیدگی و بے زاری اپنے وجود پر طاری کرکے کسی کی نظر میں ترحم بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا اس لیے شرارتوں سے ناتہ بھی نہ ٹوٹنے دیا۔

اس کی پرورش اور ضروریات زندگی کی تکمیل کی ذمہ داری چچیوں اور پھپھیوں نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔دونوں بڑی بہنیں بھی اپنے بھائی کے آگے پیچھے رہتیں۔گہری سیاہ، روشن آنکھوں اور من موہنی صورت والا یہ لڑکا سبھی کو اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوتا تھا۔چند حاسدانہ اور منفی جذبات کے حامل احباب نے اس موقع پر مخصوص فطرت کے مطابق اس بھاری ذمہ داری سے دلبرداشتہ کرنے کی بھی بہت کوشش کی۔اکثر وہ ان خواتین کو ایک ہی بات کہتے پائے جاتے:

''پرائی ذمہ داری سر لے کر تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔''

''کون سی پرائی ذمہ داری؟ شیرا تو ہمارا اپنا بچہ ہے۔ہم نے اپنی اولاد اور اس میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔'' وہ دوٹوک جواب دیتیں۔

''تم جو بھی کہو لیکن پرایا تو پرایا ہی ہوتا ہے۔ذرا سی بھی اونچ نیچ ہوگئی تو سب تمہاری ہی ذات پر انگلیاں اٹھائیں گے۔بن ماں کے لڑکوں کو بگڑتے دیر ہی کہاں لگتی ہے۔''

''کس نے کہہ دیا کہ وہ بن ماں کا بچہ ہے؟ ہم سب ہی اس کی مائیں ہیں۔وہ تو اللہ پاک کی طرف سے خصوصی خوبیوں سے ودیعت شدہ بچہ ہے۔اسے دیکھ کر ہماری سگی اولاد اس کے خصائل اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔آیندہ ایسے شیطانی وسوسے لیے ہمارے پاس مت آیئے گا۔'' خواتین کے ایسے منہ توڑ جوابات پر مقابل اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا۔

یہ سب افواہیں خود کرنل شیر سے بھی پوشیدہ نہیں تھیں۔یہ سوچ اس کے لیے ہمیشہ مثبت تحریک ہی ثابت ہوتی۔وہ ان 'نادر خیالات' کی روشنی میں خاموشی سے اپنا محاسبہ کرتا اور کسی غلطی یا کوتاہی کی صورت میں اپنی کامیاب اصلاح کرلیتا۔اس عمل کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ اس کا کردار کندن کی طرح نکھرتا رہا۔وہ اپنے اہلخانہ کے لیے محبوب سے محبوب تر ہوتا چلا گیا۔احباب اور اہل علاقہ ایسی لائق اور فرمانبردار اولاد کی تمنا کرنے لگے۔

شیرا اپنے ہم عمر بچوں کے لیے ایک مثال بن گیا تھا۔

☆......☆

وہ ایک حسین ترین وادی میں کھڑا تھا۔

بلند وبالا پہاڑ بڑی شان سے دھرتی کے سینے پر ا... وجود تانے کھڑے تھے۔ان کی چوٹیوں نے سفید بادلو... کے آنچل اوڑھ رکھے تھے۔ہواؤں میں بے پناہ لطافت تھی۔اس وادی کے ہر ایک نظارے میں ایک ہی عنص... جھلکتا تھا، تقدس اور بے پناہ خوبصورتی۔کرنل شی... معطر فضائیں اپنے مشام جاں میں محسوس کررہا تھا۔... وہاں گھومتے پھرتے 'ثناء ادا کرتے' ہر ایک نظارے سے لطف اندوز ہورہا تھا۔پھر جانے کہاں سے کثافت کی ایک... نے گردوپیش کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کردیا۔نظارے دھندلانے لگے۔عجب بات تو یہ تھی کہ تمام مظاہر فطرت نامعلوم اذیت میں مبتلا دکھائی دینے لگے تھے۔کرنل شیر... لیے یہ سب کچھ بہت حیران کن اور کسی حد تک تکلیف دہ... تھا۔تبدیلی کی اس لہر کا ماخذ شعور گرفت میں لے ہی... پارہا تھا۔وہ الجھن کے عالم میں کچھ دیر تک آگے بڑھتا... اور پھر اس کے سامنے 'اصل سبب' آگیا۔

اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایسے افراد موجود... ...ن کی ہیئت وحشتناک اور کسی حد تک ناگوار بھی محسوس ہورہی تھی۔ان کے اطوار غیر اخلاقی تھے۔ان کی ایک سمت میں شراب کی چند بوتلیں اور بڑے بڑے سے بت رکھے تھے جن کی غیر انسانی اور خوفناک شکلیں اس وادی کا تقدس مجروح کررہی تھیں۔کرنل کے سینے میں طیش کی بلند لہر اٹھی اور دل ودماغ کو اپنے قابو میں لے کر انہیں نیست ونابود کرنے کے لیے اکسانے لگی۔اسی پل اس نے اپنے ...جلو میں چند مزید افراد بھی دیکھے جو اسی کی طرح غم وغصہ کی ...کیفیت میں مبتلا دکھائی دے رہے تھے۔ان سب کی آنکھیں ...ملتے ہی ذہن جیسے باہم مربوط ہوگئے۔اعصاب میں ایک ...برق کوندی اور وہاں ایک خونریز معرکہ کا آغاز ہوگیا۔کرنل بھی اس مہم کا بھرپور عملی حصہ تھا۔

ایک جاں گسل مرحلے کے بعد وہاں سے تمام تر ...آلائشوں کا خاتمہ کردیا گیا۔وادی میں ایک بار پھر لطافت ...کا غلبہ تھا۔کرنل شیر کو ایک چٹانی چھجے کے پاس خان گلاب ...کھڑے ہوئے نظر آئے۔ان کے ساتھ ایک ...وقار اور بارعب شخصیت بھی تھی۔چہرے پر دبدبہ ...اور شفقت کا ملاپ بہت بھلا دکھائی دیتا تھا۔اس کا دل زور ...سے دھڑکنے لگا۔کرنل نے انہیں پہچان لیا تھا۔وہ قائداعظم ...محمد علی جناح تھے۔خان گلاب کی آنکھوں میں بھی اس کے ...لیے فخر ورشک کے جذبات تھے۔

''یہ میرا پوتا ہے جناح جی!'' دادا کی آواز پر وہ بے ...اختیار آگے بڑھا اور ان کے قدموں میں دوزانو ہوکر بیٹھ ...گیا۔

''میں آپ کا وارث ہوں۔وہ وارث جس نے ...اپنے سے عہد کر رکھا ہے کہ آپ کی روح کو ماؤنٹ بیٹن ...اور نہرو ...ٹیل کے سامنے کبھی شرمندہ نہیں ہونے دے گا۔'' اس کے ...والہانہ انداز پر قائد کے لبوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔انہوں ...نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ وا کیے ہی تھے کہ ایک جھٹکے نے ...کرنل کے وجود کو ہلا دیا۔

وہ منظر اب غائب ہوچکا تھا۔کرنل شیر خان جو ایک ...وہ اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔کمرے کی کھڑکی سے تاروں ...بھرا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ خواب ...دیکھ رہا تھا پھر بھی ایک سرور کے عالم میں تھا۔اس نے ...قائداعظم کو دیکھا تھا تبھی ایک اور آواز پوری وادی میں ...گونجنے لگی۔پروردگار کی کبریائی بیان کرتے ہوئے بارگاہ ...الٰہی میں سے بلاوے کی آواز تھی۔وہ چند لمحوں تک انہی مناظر میں کھویا رہا جو اس نے کچھ دیر پہلے عالم خواب میں دیکھے تھے۔اس خواب سے کرنل کا ناتہ بہت پرانا تھا۔یہ مناظر کسی شدید ترین خواہش کی طرح اس کے دل ودماغ پر اس طرح قابض ہوچکے تھے کہ وہ اب جاگتی آنکھوں سے بھی اسی تصور میں کھویا رہتا۔

مؤذن کی اذان مکمل ہوتے ہی اس نے بستر چھوڑا اور وضو کرکے مسجد کی طرف چل دیا۔نماز فجر کی ادائیگی کے بعد وہ کتنی ہی دیر والدہ ودادا کی مغفرت، وطن کی سلامتی، اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کے علاوہ اپنے بہترین نتیجہ کے لیے سراپا عاجزی سے دعائیں مانگتا رہا۔آج کا دن اس کے لیے بہت اہم تھا۔ایف۔ایس۔سی کا رزلٹ ہی اس کے مستقبل کا کوئی رخ متعین کرسکتا تھا۔نم آنکھوں اور خشوع وخضوع سے التجائیں کرتا کرنل شیر درود ووظائف سے فراغت پاتے ہی گھر روانہ ہوگیا۔

اس روز سب معمولات زندگی اس کے لیے بہت پُرکیف تھے۔دل ودماغ پر اس خواب کی سرشاری طاری تھی۔اس کی زندگی میں درحقیقت ان خوابوں کی اہمیت بہت زیادہ تھی جن کی جزئیات اسے کئی کئی دنوں تک اپنے سحر میں گرفتار رکھتی تھیں۔اس سرور اور مسرت میں اس وقت مزید کئی گنا اضافہ ہوگیا جب اسے ایف ایس سی میں شاندار کامیابی کی خبر ملی۔'گورنمنٹ کالج صوابی' میں زیر تعلیم 'پری میڈیکل' کے اس طالب علم نے اپنے سبھی اساتذہ اور اہلخانہ کو مسرتوں سے مالا مال کردیا تھا۔

''جیتا رہ میرے شیر! تو واقعی اپنے دادا کی پیش گوئی کے مطابق ہمارے خاندان کا سچا نگینہ ہے۔'' خورشید خان نے کہا۔

''یہ سب آپ کی محبتوں اور محنت کا بھی تو کمال ہے ناں بابا!'' اس نے سر جھکایا۔

''تیری یہی تابعداری تو ہم سب کا دل موہ لیتی ہے۔یہ بتا اب آگے کا کیا ارادہ ہے؟'' چچا نے شفقت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے استفسار کیا۔

''لو بھلا! ارادہ کیا ہونا ہے جی؟ اب تو یہ شہر جاکر ڈاکٹری پڑھے گا اور بہت جلد سفید کوٹ پہنے گلے میں اور سیاہ سا آلہ لٹکائے......کیا بھلا سا نام ہے اس کا؟'' چچی نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''اسٹیتھواسکوپ۔'' کرنل نے نرمی سے لقمہ دیا۔

''ہاں وہی! جو یہ کہہ رہا ہے......وہی گلے میں

لٹکائے یہاں آئے گا اور ڈاکٹر بابو بن کے مریضوں کا علاج کیا کرے گا۔"

"نہیں چچی جان! میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا۔" اس نے ادب سے نظریں جھکائے سب کو حیران کیا۔

"تو پھر کیا کرنا چاہتا ہے بیٹا تُو؟" خورشید خان چونکا۔

"بابا جان! میں آرمی میں جانا چاہتا ہوں۔ اس دھرتی کا رکھوالا بن کر اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے آنچل کا محافظ بننا چاہتا ہوں۔ ہم نے آزادی کے بعد بڑے ہی مختصر عرصہ میں تین جنگیں برداشت کی ہیں ۔ ہمارا دشمن ظرف اور اخلاقی اصولوں سے نابلد ہے۔ وہ خطہ میں ایسے حالات ضرور پیدا کرے گا کہ چوتھی جنگ بھی ناگزیر ہو جائے۔ میں اسی جنگ میں سابقہ تمام قرض چکانا چاہتا ہوں۔"

خورشید خان نے آگے بڑھ کر اسے اپنے گلے سے لگایا اور نم آواز میں گویا ہوئے۔ "مجھے علم تھا جانِ پدر! مجھے علم تھا کہ خان گلاب کی جہاندیدہ نظریں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں اور تو اپنے مستقبل کے لیے ایسا ہی فیصلہ کرے گا۔ ٹھیک ہے میرے بچے! میری دعائیں اور تعاون ہمیشہ تیرے ساتھ رہے گا۔ اس وطن کی طرف میلی نظروں سے دیکھنے والے کو موت سے کم کوئی سزا مت دینا۔"

شیر کے لیے اس متوقع مستقبل کا تصور ہی بہت لذت آمیز سنسنی پر مشتمل تھا۔ اس نے فوج میں بھرتی کی درخواست دی تو قسمت نے پاک فضائیہ میں بطور 'ائیر مین' تقرری کروانے میں یاوری کی۔ ابتدائی تربیت مکمل کرنے کے بعد اسے مزید تربیت کے لیے 'اسکول آف ایروناٹیکل ....' میں بھیج دیا گیا۔ محنت اور لگن ہر جگہ اس کے ہمراہی تھے۔ اس کی کارکردگی بے مثال تھی۔ اسی محنت کے بل بوتے پر کرنل شیر نے 'چیف آف آرمی اسٹاف' کی ٹرافی کے علاوہ دیگر کورسز میں 'شاہین بچے' کا خطاب بھی حاصل کرلیا۔

☆......☆

نوے کی دہائی کا آغاز ہو چکا تھا۔

اپنی کامیابیوں کی بدولت بظاہر کرنل شیر کو بہت خوش اور مطمئن ہونا چاہیے تھا لیکن جانے کیوں اس کی روح ایک بے عنوان سی تشنگی محسوس کرتی تھی۔ اپنے پیشہ وارانہ اور تکنیکی امور میں مکمل خلوص اور دیانتداری کے بعد بھی وجود میں کسی خلاء کا احساس بے چین راتوں اور پریشان خوابوں میں ڈھل جاتا۔ اسے اپنے خواب کی تعبیر درکار تھی۔ وہ خواب جو ایک نامعلوم مدت سے آنکھوں میں بسیرا کیے ہوئے تھا۔ اس کی یہ کیفیت ساتھیوں سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ وہاں موجود سبھی ساتھی اس کی فطرت اور اعلیٰ کردار کے بے حد معترف تھے۔ دل و دماغ پر طاری یہ حبس نما کیفیت جب ناقابل برداشت ہونے لگی تو اس نے 'بری فوج' میں کمیشن حاصل کرنے کی درخواست دے دی لیکن پہلی کوشش میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ لمحات اس کے لیے بہت اذیت ناک تھے۔ خواب کی تعبیر دسترس میں آتے ہوئے دور ہو جانے کا کرب وہی جان سکتا ہے جو لبِ دریا آ کر بھی تشنہ لوٹ جائے۔ اپنی مثبت توانائی اور ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر کمیشن کے حصول کے لیے درخواست بھیج دی۔ اس کی لگن اور جنون نے اعانت کی اور خان گلاب کے پوتے کے لیے 'پاکستان ملٹری اکیڈمی' نے اپنی بانہیں وا کر دیں۔

اکتوبر 1992ء کا وہ مہینا کرنل شیر خان کے لیے بے حد یادگار تھا۔ ابتدائی ٹیسٹ میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد اسے 'اکیڈمی' آمد کی نوید مل گئی۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔

اکیڈمی تک پہنچنے کا رستہ بے حد دشوار گزار تھا۔ ہر قدم پر خوفناک موڑ آتے تھے جن کی ایک سمت میں اتھاہ گہرائیاں ہوتی تھیں تو دوسری جانب بلند و بالا سنگلاخ چٹانیں۔ ہر موڑ پر مخالف سمت سے آنے والی بسیں اس سے سوا تھیں۔ ا[illegible] رستے پر بس کا سفر کرنے والے سبھی لڑکے موت کو اپنے پہلو میں بیٹھا دیکھ رہے تھے لیکن شیر خان کی کیفیت ا[illegible] سب سے مختلف تھی۔ اس کے چہرے پر ایک البیلی مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ آنکھوں کی چمک بھی آج مقابل کی نظروں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔

"اتنا گم صم کیوں بیٹھا ہے بھائی؟" اس کے ساتھ بیٹھے لڑکے نے غالباً اردگرد کے خطرناک نظاروں سے نظریں چرانے کے لیے بات چیت کا آغاز کیا تھا۔

"ان سحر انگیز خوبصورتیوں کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فطرت کی اس دلکشی نے ہی میری زبان گنگ کر رکھی ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"او بھائی! کس سیارے سے آیا ہے تُو؟ یہ خوفناک کھائیاں اور جان لیوا موڑ تجھے خوبصورتی دکھائی دے ر[illegible]

ہیں؟" اس لڑکے نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"میں اسی سیارے کی مخلوق ہوں برادر! تم بھی ایک ذرا سا یہ خوف اپنے دل سے نکال کر دیکھو۔ یہ خطرناک موڑ ہمیں بتا رہے ہیں کہ ایک سپاہی کی زندگی کبھی اتنی آسان ثابت نہیں ہوا کرتی...... کیا یہ کھائیاں تمہیں ایسا کہتی محسوس نہیں ہو رہیں کہ مردِ مجاہد کے دل و دماغ میں بھی اتنی ہی گہرائی ہونی چاہیے اور ان چٹانوں کی طرح بلند، غیر متزلزل حوصلہ و جذبہ۔" شیر خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ لڑکے پر ایک ٹرانس کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

"مجھے حقیقتاً اپنے وجود اور سوچ پر شرمساری محسوس ہونے لگی ہے یار! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے دھیرے سے کہا اور ان نظاروں کی کشش اپنے اندر سمونے لگا۔

شیر خان کوئی بھی ردِعمل دیے بغیر اپنے سابقہ مشغلے میں مصروف ہو گیا۔ میس پہنچ کر چند لمحے ابتدائی کارروائی میں بیت گئے۔ کرنل شیر کو اپنا وجود اب نہایت معتبر اور ہوا بردوش محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے ایک چٹ تھما دی گئی جس پر کمپنی کا نام اور کمرا نمبر درج تھے۔ کرنل شیر خان کو 'عبیدہ کمپنی' کا حصہ بنایا گیا تھا۔

اگلے چند لمحات بھی اس کے لیے بے حد سرشار تھے۔ اس کی عمیق نگاہیں اور مشاہداتی قوت نے فوری طور پر دو باتیں محسوس کر لی تھیں کہ سینئر کیڈٹس کی جانب سے ان سبھی کو خصوصی طور پر تختہ مشق بنایا جائے گا اور انگریزی زبان میں مہارت اس کا معاون ہتھیار ثابت ہوگی۔

شیر خان اپنے ہر ہتھیار کو بہترین انداز میں استعمال کرنے کے لیے نہایت پُراعتماد تھا۔

☆......☆

پاکستان ملٹری اکیڈمی میں کرنل کی تربیت کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس اکیڈمی کی زندگی ایک عام شہری کے تصورات و سوچ کی تمام تر حدود سے بالاتر ہے۔ کیڈٹ کو سخت ترین حالات کی بھٹی سے گزارا جاتا ہے اور کسی بھی کمی یا کوتاہی کی صورت میں پروانہ رخصت تھما دیا جاتا ہے۔ 'پی ٹی' اور 'ڈرل' کے پیریڈ میں ایک لمحہ کے لیے بھی ساکت ہونا استاد کے عتاب کا باعث بن جاتا ہی سمجھیے۔ کیڈٹ کو اپنی ہر حرکت باقی ماندہ افراد کی حرکات سے ہم آہنگ رکھنی پڑتی ہے۔ موسم طوفانی ہو یا شدت آمیز، ان کے لیے اپنے بستر پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا تصور ہی اس زندگی میں ناپید ہے۔ 'میس' میں محفل کی صورت میں کھانا تناول کرنا بھی تربیتی کورس کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ کھانے کے یہ آداب بے حد جامع ہوتے ہیں۔

محفل میں بیٹھنے کا سلیقہ، میز پر اپنی جسمانی حرکات کو ایک مخصوص آہنگ میں رکھنے، چمچوں اور کانٹوں کا بغیر آواز استعمال اور گرما گرم کھانے یا چائے 'کوسی' یا 'اف' کا نعرہ لگائے بغیر نوش کرنے میں بھی کرنل شیر کی کارکردگی بلاشبہ بہت متاثر کن تھی۔ اس کے ساتھ موجود اکثر لڑکے چھری دائیں ہاتھ میں، کانٹا بائیں ہاتھ میں، دائیں جانب گلاس اور پلیٹ پر بنے ہوئے 'پی ایم اے' کے مونوگرام کا رخ سامنے کی سمت نہ رکھ سکنے پر کسی نہ کسی طرح زیرِ عتاب آ جاتے تھے، تاہم شیر خان کسی اسفنج کی طرح یہ سب آدابِ زندگی اپنے وجود میں اس طرح جذب کر رہا تھا کہ دیگر کیڈٹس کو اس پر رشک آیا کرتا۔

☆......☆

ملٹری اکیڈمی کے شب و روز سخت ترین تربیت میں گزرتے چلے جا رہے تھے۔

کرنل شیر نے زندگی میں کسی بھی موقع پر اپنے وقار اور عزت پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ کسی بھی ذاتی یا پیشہ وارانہ ضرورت کے لیے بھی اس مردِ مجاہد نے کبھی کسی کی منت سماجت نہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار یونٹ کے کوارٹر ماسٹر کو خط لکھا اور اپنی پلاٹون کے لیے تین اسٹوو کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔ اس خط میں مندرجات نہایت سادہ تھے۔ کوارٹر ماسٹر نے کرنل سے کہا؛

"اس خط میں لفظ 'پلیز' کا اضافہ ہی کر دو۔"

"میں نے درخواست تو پیش نہیں کی...... ایک مطالبہ پیش کیا ہے...... سرکاری ضرورت کے لیے جائز ڈیمانڈ دینے میں منت سماجت کیوں کروں؟"

"اچھا! تحریری طور پر نہ سہی تو زبان سے ہی کہہ دو۔ پلیز کہو گے تو اسٹوو ملیں گے ...... ورنہ نہیں۔" کوارٹر ماسٹر جانے کیوں ضد پہ اتر آیا تھا۔

کرنل شیر بھی اپنی بات پر قائم رہے اور بالآخر اسٹوو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

کرنل شیر اپنی چلبلی طبیعت' خلوص نیت' آہنی ارادوں اور صاف گوئی کی بدولت کیڈٹس میں خاصا مقبول ہو چکا تھا۔ اس کی ہر ایک ادا ہی نرالی تھی۔ جو تربیتی مراحل ان لڑکوں کو مشکل ترین لگتے' شیر خان کے لیے وہی بے حد مرغوب ہوا کرتے تھے۔

اکیڈمی میں موجود کیڈٹس کے لیے ایک جاں گسل مرحلہ 'ڈرل' بھی ہوتا ہے۔ 'ڈرل اسکیر' square کے چاروں اطراف میں چناروں کے خوبصورت شجر' پھولوں کی رنگ برنگی کیاریاں' حسین ترین روشیں بھی اس کی سختی کم نہیں کر پاتی تھیں۔ ڈرل ٹیسٹ میں ناکام ہو جانے والے کیڈٹس کو ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر واپسی کا پروانہ تھما دیا جاتا تھا اور ایسا کوئی بھی مرحلہ کرنل شیر کے لیے خود احتسابی اور سنجیدگی اپنے سنگ لے آتا۔

اس کی یہاں آمد ایک ایسے خواب کی تکمیل کی جانب روش تھی جس پر چلنا، چلنا مدام چلنا ہی اس کا مقصد حیات بن چکا تھا۔ آغاز میں ان کے لیے پورا کورس آٹھ آٹھ اور دس دس کیڈٹس میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر گروپ کو ایک عدد 'اسٹاف' کے حوالے کر کے 'دائیں مڑ' (Right Turn)' بائیں مڑ' (Left Turn) کی گردان کا تسلسل کیڈٹس کو ہڑبونگ میں مبتلا کر دیتا۔ اپنی حرکات و سکنات کا آہنگ قائم رکھنے کے لیے ان کے جسم تھکاوٹ سے چور ہو کر آرام کی دہائیاں دینے لگتے۔ ایسے مواقع پر وہ اپنے پھوڑے کی طرح دکھتے اجسام کو سکون دینے کے لیے ستانے کو ترجیح دیتے تھے لیکن کرنل شیر ڈرل اسکیر کے اردگرد لان میں یا قریب ہی واقع بٹالین میس کے برآمدے میں نماز ظہر یا عصر کی ادائیگی نہایت خشوع و خضوع سے کرتا پایا جاتا۔

''تم ایک قابل فخر کیڈٹ ہو شیر خان! تمہیں دیکھ کر توانائی و حوصلے کی غیر مرئی شعاعیں مقابل کے وجود میں بھی سرایت کرنے لگتی ہیں۔'' کرنل نے نماز عصر سے فراغت پائی ہی تھی کہ وحید الزماں نامی اس کیڈٹ کے رشک و فخر کے جذبات پر مبنی یہ الفاظ اس کی سماعت میں پڑے۔

جاء نماز نہایت احترام اور سلیقے سے تہ کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے اور ہونٹوں پر وہی مخصوص مسکراہٹ در آئی جسے باقی کیڈٹس نے 'جادوئی' کا خطاب دے رکھا تھا۔

''یہ سب پروردگار کا کرم ہے یارا! ورنہ میری کیا بساط؟'' اس نے اپنی گھنی داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''اس قدر تھکاوٹ کے بعد یہاں کوئی ہلنے کی سکت نہیں رکھ پاتا لیکن تم کتنے سکون واطمینان سے نماز ادا کر لیا کرتے ہو۔''

''اس میں عجب کیا ہے وحید؟ یہ تو وہ فریضہ ہے جسے میدان جنگ میں بھی رسول ﷺ کے نواسہؓ نے تیروں اور تلواروں کے سائے میں نبھایا تھا۔ باقی رہی ڈرل کی سختی کی بات...... تو جب قبر میں منکر نکیر کے سوالات کے جواب میں ناکامی یا پل صراط سے گذرنے کے مراحل یاد کرتا ہوں تو میرا وجود خود بخود ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔''

''تم جانتے ہو شیر خان! یہاں ایک بھی کیڈٹ تم جیسا نہیں ہے۔'' وحید نے اس کی گھنی داڑھی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

الٰہی کرم! یہ کیوں میرے دل میں وسوسے اور غرور پیدا کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے بے ساختہ خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔

وحید نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور ایک توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''میں تمہاری داڑھی کی طرف اشارہ کر رہا تھا یار! میں نے تو آج تک ایسا کوئی کیڈٹ یہاں نہیں دیکھا جو متشرع صورت ہو۔''

''مجھے یہ داڑھی صاف کرنے کے لیے کئی بار دوستوں نے کہا وحید! لیکن میرے دل اور ضمیر نے کبھی اس بات کی اجازت ہی نہیں دی۔ متشرع صورت ہونا پاکستان ملٹری اکیڈمی کے آئین یا کسی بھی قانون کے تحت جرم نہیں ہے۔ ہاں! میرے لیے یہی امر بہت ہے کہ یہ میرے نبی ﷺ کی سنت ہے جسے مجھے ہر حال میں نبھانا ہے۔''

''سبحان اللہ! پروردگار تمہاری ہر تمنا پوری فرمائے۔'' اس نے صدق دل سے کہا۔

''اپنی تو بس ایک ہی تمنا ہے یار! شہادت...... اور بس شہادت۔'' شیر خان کا جذبوں سے گندھا لہجہ وحید الزماں کو مزید متاثر کر گیا۔

☆......☆

پہلی ٹرم مکمل ہونے تک شیر خان کا کردار اکیڈمی کے جوانوں میں بے پناہ مقبول ہو چکا تھا۔

اس ضمن میں اس کا سب سے بڑا معتقد 'سید عون مرتضیٰ' تھا جو اس کا کورس میٹ بھی تھا۔ وہ معمول سے قدرے تاخیر سے اکیڈمی آیا تھا جس کی بدولت 'فوجی آداب زندگی' والے اسباق میں غیر حاضری بہت بڑا مسئلہ بن چکا تھا۔ عون مرتضیٰ کے انداز میں شہری اور غیر فوجی اطوار کی جھلک وہاں موجود اسٹاف کی عقابی نظروں سے ایک لمحہ کے لیے بھی چوک نہیں پاتی تھی۔ اس کی معمولی غلطی پر ساری پلاٹون زیر عتاب آجایا کرتی۔

''یہ دیکھیے ذرا صاب! بیلٹ بھی ایسے باندھی گئی ہے کہ ایک پورا بریگیڈ اپنارستہ بنا کر اس میں سے گذر جائے۔'' اسے اکثر اسٹاف کی ڈانٹ سننے کو ملتی۔

پریڈ گراؤنڈ میں جب 'ہوشیار' (Attention) کا حکم ملنے پر عون کا پاؤں لمحے کے کسی حقیر سے حصہ کے فرق سے بھی زمین پر پہنچتا تو اسٹاف کی توپوں کا رخ ان سب کی طرف مڑ جاتا۔ کورس کے دیگر لڑکے اس صورتِ حال سے زچ ہو چکے تھے۔

''تم یہاں لینے کیا آئے ہو صاب؟ دھیان کدھر ہوتا ہے تمہارا؟'' کوئی کیڈٹ اسٹاف کے سے انداز میں اسے کوسنے کا سلسلہ شروع کرتا۔

''یہ اپنی کند ذہنی کی بدولت ہماری بھی لٹیا ڈبونے آیا ہے۔'' ایک اور کیڈٹ دانت پیستا۔

''تم دونوں ہی کا خیال غلط ہے دوستو!'' شیر خان اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا۔ ''عون کی ذہانت تو اسی بات سے عیاں ہے کہ اسے ہمارے 'بڑوں' نے خوب جانچ پڑتال کے بعد یہاں بھرتی کیا ہے۔ 'غلطی' کوتاہی تو ہر ایک انسان سے ہو جاتی ہے۔ اپنا وقت بھی تو یاد کرو جب یہ 'آداب' سیکھتے ہوئے چھٹی کا دودھ یاد آیا تھا۔ ہمیں تو اپنے اس ساتھی کی خود تربیت کرنی چاہیے۔'' وہ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں بالآخر کامیاب ہو ہی جاتا۔ عون مرتضیٰ کی ممنون نظروں کے جواب میں اس کے لبوں پر جادوئی مسکراہٹ بکھر جاتی۔ وہی مسکراہٹ جو ہر ایک کو اس کا گرویدہ کر دیتی تھی۔

سینئر ہونے کے بعد بھی اس کی عاجزی اور نرم طبیعت میں رتی بھر کمی نہیں آئی تھی جس نے کئی جونیئر کیڈٹس کو اس کا معتقد بنا دیا۔ انہی افراد میں ایک 'علی الحسنین' بھی تھا۔ پہلی ٹرم میں اس سمیت کئی جونیئرز کو سینئرز رعب داب میں رکھنے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے۔ انگریزی میں گالیاں بھی سننے کو ملتیں۔ اکثر ناپختہ ذہن ان ناگفتہ بہ الفاظ کو اپنے حافظوں میں محفوظ کر لیتے اور اگلی ٹرم میں نو واردین پر آزماتے۔ علی

اٹھائیس مارچ 1999 کو صبح دس بجے 'گلتری' میں چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز مشرف نے دورہ کیا۔ فوجی جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''ہم دشمن پر ایسی کاری ضرب لگائیں گے جسے وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکے گا۔''

اپنے جوانوں کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے انہوں نے 'یلدرم' (12 ناردرن لائٹ انفنٹری کا عرفی نام) کے سپاہیوں کی خصوصی تعریف کی اور اس آپریشن کی تکمیل کے بعد ان کی یونٹ کو 'بیٹل آنرز' اور نشان (پاکستانی پرچم) دیئے جانے کا وعدہ بھی کیا۔

الحسنین بھی اسی 'جناتی زبان' کا کئی دفعہ نشانہ بنا۔ وہ اس زبانی کھنچائی کو سہل سمجھ کر ایک بار کرنل شیر سے کہنے لگا۔ ''بھائی شیر خان! آپ میرے ساتھ اتنی شرارتیں کر کے ناک میں دم کیے رکھتے ہو۔ اس سے تو بہتر ہے کہ سامنے کھڑا کر کے زبانی کلاس لے لیا کرو۔''

''استغفراللہ! تم جانتے بھی ہو کہ سینئر کیڈٹس اس زبان کے توسط تمہیں کیا کہتے ہیں؟'' وہ جھلایا۔

''نہیں! ہم تو صرف یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی کسی شرارت اور کھنچائی کا ہی حصہ ہے۔ اکثر کیڈٹس نے تو انہیں ذہن نشین بھی کر لیا ہے کہ اگلی ٹرم میں ہم جونیئرز پر آزمائیں گے۔''

''خدا کا نام لو یار! وہ نہایت نازیبا الفاظ ہوتے ہیں۔ اگر مجھے رتی بھر بھی اپنا سمجھتے ہو تو ان الفاظ سے کبھی اپنی زبان آلودہ مت کرنا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اسے ایک بار پھر خان گلاب کی جہاندیدگی پر رشک آیا تھا جن کی ہدایات نے اسے اس زبان میں طاق کر دیا تھا اور وہ اس ناپسندیدہ فعل سے پاک تھا۔

''آپ بہت اچھے ہو شیرو بھائی! ہم سب سچ میں آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کا ہر خواب مکمل فرمائے۔'' علی الحسنین نے خلوص سے کہا۔

''آمین...... تمہارے منہ میں گھی شکر۔'' وہ کھلکھلا اٹھا۔

☆......☆

بے لاگ اور دوٹوک رائے شیر خان کے کردار کا ایک اور لازمی جزو تھا جس کے باعث وہ اپنے سینئرز کے سامنے بھی حق گوئی سے خائف نہ ہوتا۔

ملٹری اکیڈمی کے تربیتی مراحل ختم ہونے سے قبل ایک افسر نے اسے طلب کیا۔ یہ طلبی اچانک اور غیر سرکاری تھی۔ تجسس اور حیرانی کے ملے جلے جذبات لیے جب وہ افسر کے پاس پہنچا تو ایک انوکھی حیرت اس کی منتظر تھی۔

''کرنل شیر خان! تمہارا نام بہت غیر معمولی ہے۔ ایسا کوئی نام تو پہلے کبھی کہیں نہ سنا۔'' افسر کا انداز ہلکا پھلکا اور دوستانہ تھا۔ یہ گویا اس کے لیے بھی عندیہ تھا کہ وہ اپنا مدعا بغیر کسی ہچکچاہٹ بیان کرسکتا ہے۔

''میرا نام میرے لیے بہت قیمتی ہے سر!''

''اس کی کوئی خاص وجہ جوان!''

''ایک قرض ہے جو ادا کرنا ہے سر!''

''ویل ڈن! تمہاری اسپرٹ نے اسٹاف کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس کارکردگی کی بناء پر تم ایک بہترین اپوائنٹمنٹ کے مستحق ہو لیکن اس کے لیے تمہیں ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔''

''سر!'' اس نے تعظیمی انداز اپنایا۔

''اپنی داڑھی صاف کروادو۔ یہاں کوئی بھی کیڈٹ یا افسر ایسا نہیں ہے۔''

''سوری سر! ایسا کسی آئین یا قانون میں درج نہیں ہے۔ یہ سنت ہے اور میں اسے ترک نہیں کرسکتا۔''

''بہترین جگہ اپوائنٹمنٹ کے لیے یہ سودا مہنگا نہیں جوان!''

''ترک سنت کی صورت میں ترقی پاکر میں اس مقدس پیشہ کی ابتداء ہی خیانت سے کیسے کرلوں سر؟ قسمت میں جہاں روانگی یا تقرری لکھی ہوگی وہ تو بصورت دیگر بھی مل ہی جائے گی۔'' اس کے حتمی انداز پر افسر زیرلب مسکرا اٹھا اور مزید کچھ کہنے سے گریز ہی کیا۔

کچھ عرصہ بعد کرنل شیر خان کو بٹالین کوارٹر ماسٹر کی تقرری کا پروانہ مل گیا۔ مذکورہ پوسٹ بھی ملٹری اکیڈمی میں ایک خاص اہمیت کی حامل تھی۔ بٹالین کوارٹر ماسٹر فوج کا ایک ایسا عہدہ ہے جس کا عمومی انگریزی لغت سے دور دور تک کا کوئی واسطہ نہیں اور ان کا اصل کام راشن وور دی فراہم کرنا ہے۔ وہ کیڈٹس کو Kit مہیا کرتے ہیں جس میں کمبل، چادریں، تکیے، بگ پیک، سال پیک، اسٹریپ، فیلڈ ڈریسنگ جیسی اشیاء شامل ہوتی ہیں۔

بٹالین کوارٹر ماسٹر کی حیثیت سے پاس آؤٹ ہونے کی خبر خورشید خان اور دیگر اہل خانہ کے لیے بہت خوش کن تھی۔ اکیڈمی میں اس کے تمام تر اخراجات بڑے بھائی نے برداشت کیے تھے۔ کرنل شیر کی پہلی تعیناتی '27 سندھ رجمنٹ' میں ہوئی تھی۔ اپنے خواب کی اس تکمیل پر وہ خود بھی بے انتہا خوش تھا تاہم اس خوشی میں بھی وقار اور ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا۔ اہل خانہ کی مسرتوں کا بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ شیر خان کے لیے یہ موقع زندگی کا ایک حاصل تھا۔ اسے وردی پہن کر وہ وعدہ نبھانا تھا کہ اس کی حقیقی وفائیں صرف وطن ہی کے لیے قربان ہوں گی۔

وہ تن من دھن سے اس فرض کی ادائیگی میں جت گیا۔

☆......☆

نوزائیدہ ستائیس سندھ رجمنٹ میں 'سیکنڈ لیفٹیننٹ' کی حیثیت سے چارج لیتے ہی کرنل شیر کے لیے بھرپور مصروفیات کا آغاز ہوگیا۔

وہ اپنے پیشہ وارانہ امور نہایت دیانتداری سے نبھا رہا تھا۔ اس کی شوخ طبیعت اور مزاج میں سنجیدگی کے نرالے ملاپ نے یہاں بھی بہت جلد سب کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ساتھیوں میں کیپٹن کلیم کریم اس کے بہت قریب آگیا۔ شیر خان کی شوخی طبع اور بھرپور قہقہہ اسے بہت پسند تھا۔

''کرنل شیر! ایک بات کہوں تجھ سے؟'' کلیم نے ایک روز کہا۔

''دو باتیں پوچھو جان جگر!'' وہ مسکرایا۔

''مجھے تم سے پیار ہوگیا ہے۔'' کلیم شرارت سے بولا۔

''وہ کس لیے بھلا؟''

''تیرے اس خوبصورت اور زندگی سے بھرپور قہقہے کی وجہ سے...... سچ کہتا ہوں یار! تیری شخصیت میں واقعی کوئی جادو ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔'' اسے بھی شرارت سوجھی۔

''ہاں بہت...... ایک تو خوبصورتی اس پہ وردی...... تیرے لیے تو گاؤں میں حسینائیں آہیں بھرتی ہوں گی۔ سچ بتا! کتنے عشق کیے ہیں تونے آج تک؟'' کلیم کی بات پر اس نے ایک طویل قہقہہ لگایا اور پھر سنجیدہ ہوکر کہنے لگا۔

''میری وردی ہی میرا عشق ہے...... میں نے

بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں کہ میں خوبصورت دکھتا ہوں، صنف نازک کو گھائل کرسکتا ہوں یا میری ذات میں کیا خوبیاں ہیں۔ اس وردی کا مان برقرار رکھنے کے لیے مجھے کسی خوبصورتی کی نہیں بلکہ دلیری اور بے خوفی کی تمنا ہے۔''

''اور یہ بے خوفی کی تحریک تمہیں کیسے ملتی ہے بھلا؟''

''تقوی سے...... تم اگر مجھ سے پیار کرتے ہو تو میرے لیے ایک دعا ضرور کرتے رہنا کہ پروردگار مجھے متقین کی فہرست میں شامل رکھے۔ وردی سے میرا عشق اپنی ابدی منزل تک پہنچ جائے۔'' کیپٹن کلیم کا دل اس بات کی گہرائی سے گداز ہوگیا۔

''اللہ پاک اس وطن کے ہر محافظ کو ایسا ہی متقی اور اپنے فرائض سے مخلص بنائے۔'' کلیم نے صدق دل سے کہا۔ کرنل شیر کی عزت وقدر اس کے دل میں مزید کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

☆......☆

یونٹ میں کرنل شیر کی ذمہ دارانہ طبیعت اور دیانتداری ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرتی جارہی تھی۔ افسران اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے لیکن کرنل کچھ ساتھیوں کی وجہ سے خاصا جز بز رہتا۔

یونٹ میں سینئر ہونے تک یہ معاملہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوچکا تھا۔ اصل میں معاملہ یہ تھا کہ اس کے ساتھی اور جونیئر افسران وقت گزاری کے لیے ٹی وی پر فلمیں دیکھ لیا کرتے تھے۔ شیر خان نے کسی بھی لگی لپٹی کے بغیر دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''اپنے نفس پر قابو پانا سیکھو ساتھیو! ہم انجانے میں گمراہی کی جانب لپکنے لگے ہیں۔''

''ایسا کیا ہوگیا بھئی؟ تفریح طبع کے لیے تھوڑی دیر ٹی وی دیکھ لینا کوئی جرم تو نہیں۔''

''ہرگز نہیں ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم تفریح کے لیے رقص وغیرہ ہی کیوں دیکھیں۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ دشمن کا سب سے بڑا ہتھیار ہی ثقافتی یلغار ہے۔ ہم یہاں نہایت مقدس فریضہ سرانجام دینے آئے ہیں۔ فرض کی راہ میں قربان ہونے کے لیے کیسا زادراہ اکٹھا کرنے لگے ہیں؟ اپنا دھیان عبادت کی طرف مائل کرو۔ ہماری یہ زندگی رب کی امانت ہے۔ اسے اس طرح کی آلائشوں سے آلودہ نہ کرو۔''

کارگل میں ہم پر تھوپی گئی جنگ کے وقت اسلحہ کی صورت حال بھی نہایت غیر متوازن تھی۔ فیلڈ گنز میں پاکستان کی 53 گنز کے مقابلے میں بھارت کے پاس 93 تھیں۔ 51 مارٹر کے مقابل ہندوستانی مارٹرز کی تعداد 63 تھی جبکہ میڈیم گن میں یہ فرق 45 اور 54 کا تھا۔ دشمن اسی زعم میں ہم پر چڑھ آیا تھا لیکن بھول رہا تھا کہ جنگ میں اسلحہ کے ساتھ حوصلہ بھی ضروری ہے۔

''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو شیر خان! ہم واقعی نادانستگی میں اپنے وقار و عزت کو فراموش کرنے لگے ہیں۔'' ایک ساتھی نے کہا۔

''فارغ وقت کا بہترین مصرف کیا کرو ساتھیو! اور وہ اللہ کی یاد کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے بھلا؟'' کرنل نے انہیں ایک اور راہ سجھائی۔ ''ذکر الہیٰ کی تسبیحات ہمارے لیے بہت سود مند ثابت ہوں گی۔''

''کیا تمہیں کسی خصوصی وظیفہ کی بابت علم ہے کرنل شیر؟'' ساتھی اس کی دینی معلومات اور اسلامی شعائر کی پابندی سے بہت متاثر تھے۔

''اللہ کے سبھی نام بابرکت اور مقدس ہیں۔ اسے جب بھی دل سے پکارو گے۔ وہ مدد کے لیے ہروقت تمہارے ساتھ ہوگا۔'' اس نے عاجزی سے جواب دیا۔ اپنے ساتھیوں کی جانب سے یہ مان اس کے احساس ذمہ داری میں مزید اضافہ کردیا کرتا تھا۔

☆......☆

بری فوج سے منسلک ہوئے چار سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔

کرنل شیر خان کی زندگی نہایت ہموار انداز میں جاری تھی۔ فرائض کی انجام دہی شاندار تھی، خلق خدا اس سے بے حد خوش تھی اور وہ خود حقوق اللہ وحقوق العباد میں بہترین توازن قائم رکھے ہوئے تھا۔ افسران اور جوانوں سے بھی اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ بہترین انگریزی کے باعث افسران اس سے اسکربیل کھیلنے میں بہت لطف محسوس کرتے۔ جیت اکثر کرنل ہی کا مقدر بنتی تھی۔ اگر افسروں کی صحبت میسر نہ ہوتی تو وہ جوانوں سے گھل مل کر لوڈو کھیلنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتا تھا۔

ستائیس سندھ رجمنٹ میں کرنل شیر کا نام اکثر افراد کے لیے بہت الجھن کا باعث بنا رہا۔ اگر کبھی وہ فون کے آس پاس ہوتا تو گھنٹی بجنے پر بے نیازی سے ریسیور اٹھا کر کہتا۔ ''لیفٹیننٹ کرنل شیر خان اسپیکنگ!''

اس کے انداز اور فطری اعتماد سے دوسری جانب موجود شخص کو ہمیشہ یہی مغالطہ ہوتا کہ کمانڈنگ آفیسر بذات خود فون پر موجود ہے۔ وہ اسے 'سر' کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کرنے لگتا تو وہ نہایت نرمی سے قطع کلامی کرتے ہوئے کہتا۔ ''ارے بھائی! میں لیفٹیننٹ شیر ہوں...... ذرا دم لو! کمانڈنگ آفیسر سے کال ملائے دیتا ہوں۔''

انہی روز و شب میں وقت بیتتا چلا گیا۔ کرنل شیر کے وجود میں سابقہ تشنگی اب بھی سانس لیتی تھی۔ اس کی سیمابی فطرت اور وجدان گواہی دیتے تھے کہ منزل بہت دور ہے اور اپنے گوہر مقصود تک رسائی کے لیے اسے ذاتی حیثیت میں بھی کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب شمالی سرحدوں پر بھارت کی جارحیت بہت بڑھ چکی تھی۔ بلا اشتعال فائرنگ اور دخل درانداز ی کے معاملات نے سرحدوں پر تناؤ بڑھا دیا تھا۔ کرنل شیر نے انہی علاقوں میں تقرری کے لیے اپنا نام رضا کارانہ طور پر پیش کر دیا اور بالآخر اسے '12 ناردرن لائٹ انفنٹری' میں تقرری کا پروانہ مل گیا۔ یہ لمحہ اس کے لیے بے پناہ مسرتوں کا باعث تھا۔

روانگی سے قبل اس نے اہلخانہ سے ملاقات کی تو خورشید خان نے موقع دیکھ کر ایک دیرینہ خواہش کا اظہار کر دیا۔ وہ اب اس کے سہرے کے پھول سجانے کے خواہشمند تھے۔

''ہم تمہاری شادی کر دینا چاہتے ہیں میرے بچے!'' خورشید خان نے اس سے کہا۔

''اتنی جلدی کیا ہے بابا جان!'' اس نے متانت سے جواب دیا۔

''میری زندگی کا کیا بھروسا بیٹا! تم بس یہ بتاؤ کہ ہماری پسند پہ تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟''

''جی نہیں! آپ میرے بزرگ ہیں۔ یقیناً بہتر فیصلہ ہی کریں گے۔''

''جیتا رہ میرے شیر!'' انہوں نے محبت سے کہا۔

''میری صرف ایک ہی درخواست ہے بابا جان! مجھے خوبصورتی' ظاہری دلکشی یا نزاکت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میرے لیے بیوی اور اس گھر کی بہو کا انتخاب کرتے وقت صرف کردار اور سوچ کی مضبوطی کو اپنا معیار رکھیے گا۔ وہ ایک سپاہی کی بیوی ہوگی۔ اسے اتنا شعور ہونا چاہیے کہ ہماری آیندہ نسلوں کو قومی روایات کا وارث کس طرح بنانا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہا ہے میرے بچے! یہ صدی اپنے بڑھاپے میں عجیب ہی کرشمے دکھانے لگی ہے۔ اب نئی نسل شادی کسی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے نہیں بلکہ دنیاوی رتبے میں ترقی' عیاشی اور محض تفریح کے لیے کرنے لگی ہے لیکن تو فکر نہ کر! میں تیری پھپھیوں' چچیوں' بھابیوں اور بہنوں کی سوچ سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ یقیناً تیرے لیے بہترین لڑکی کا انتخاب کریں گی۔'' والد کی بات پر اس نے سنجیدگی اور متانت سے سر ہلا دیا۔

''اتنا سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو لالہ! من میں تو اس وقت لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔'' قریب ہی بیٹھے چچازاد نے ذرا شرارت سے کہا تو اس نے مسکرا کر بات ٹال دی۔ وہ اس وقت اپنے جذبات کسی کو بھی نہیں سمجھا سکتا تھا۔ شادی بیاہ اور رومانوی معاملات کو اس نے کبھی سوچ کے کسی بھی حصہ میں جگہ ہی نہ دی تھی۔ اس کی زندگی میں صنف نازک کے لیے بھی اب تک عزت و احترام کا رشتہ رہا تھا۔ سرو قد' گھٹاؤں جیسے بال' شربتی آنکھوں یا سبک نقوش جیسے الفاظ وہ اپنے ساتھیوں سے سنا بھی کرتا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ اس کے دل میں کبھی ایسی کوئی تمنا پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ تو صرف ایک خواب کے ساتھ نتھی ہو چکا تھا۔

''اب پھر آپ کسی سوچ میں گم ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے ہونے والی شریک حیات کا ناک نقشہ سوچ رہے ہیں۔''

''ارے باپ رے! تمہیں کیسے علم ہوا؟ کہیں تم بھی تو فراغت میں یہی مشغلہ نہیں اپنائے رکھتے؟'' شیر خان کے بھرپور جوابی وار نے محفل کشت زعفران بنا دی۔

''میں تو یہ خواہش ایک عرصہ سے دل میں لیے بیٹھا ہوں لیکن وسائل کی کمی نے کبھی اظہار کی قوت نہیں دی۔'' خورشید خان نے بتایا۔ ''لیکن اب میں نے شیرو کی شادی کے لیے پانچ لاکھ کا بندوبست کر لیا ہے۔ بہت جلد اس گھر میں بہو لے آؤں گا۔''

''آپ کو بھی یہ خبر شیرا کو نہیں سنانی چاہیے تھی

بابا جان! اب تو اس کے لیے وقت گزاری مشکل ہو جائے گی۔ وہ وہاں وقت کیسے کاٹے گا؟'' بڑے بھائی نے بھی مصنوعی تاسف کا مظاہرہ کرتے ہوئے دانستہ طور پر اسے چھیڑا۔ وہ اس کی پیشہ وارانہ لگن اور جنون سے واقف تھا تاہم اس وقت محض ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کے لیے شرارت پر آمادہ تھا۔

''میں وہاں ٹھنڈی آہیں بھر کر ماحول مزید یخ بستہ کیا کروں گا لالہ! کیا کروں وقت تو گزارنا ہی ہے ناں!'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

''ہم سب جانتے ہیں بیٹا کہ تم وہاں ٹھنڈی آہیں نہیں بھرو گے بلکہ اپنے جنون کی حدت سے ساتھیوں کا خون بھی گرمائے رکھو گے۔'' اس کے چچا نے فخر سے کہا۔ ''یہ رقم بہرحال تمہاری امانت رہے گی۔ دو سال بعد واپسی پر شادی کے انتظامات مکمل ہو چکے ہوں گے۔''

''شکریہ! بس میری ایک التجا مان لیجیے۔ اگر مجھے شہادت کا رتبہ نصیب ہو جائے تو اس رقم کو نواں کلی اسکول کے لیے مختص کر دیجیے گا۔'' اس کا لہجہ اب کھویا کھویا سا تھا۔

''پروردگار تمہارے حق میں بہتری کرے۔''

اہلخانہ کی بھرپور دعائیں لیے سابقہ یونٹ میں خوشگوار اور یادگار یادیں چھوڑ کر جنوری 1998 میں وہ روانہ ہو گیا۔

☆......☆

جہاں اس کی تقرری ہوئی اس وادی کا جغرافیہ بھی غضب ہے۔ ایک جانب یخ بستہ پانی کی جھیل ہے جہاں نیلگوں پانی میں قوس قزح کے رنگ سمیٹے ٹراؤٹ مچھلیاں تیرتی ہیں۔ اس جھیل کا پانی ہی اردگرد کے علاقوں کو سیراب کرتا ہے۔ برف سے اٹی پہاڑوں سے آنے والی تین ندیاں جھیل کا پانی جوں کا توں برقرار رکھتی ہیں۔ یہاں درجہ حرارت نہایت کم ہوتا ہے۔ سرما میں تو یہ نقطہ انجماد سے اس قدر گر جاتا ہے کہ پوری وادی ہی 'ڈیپ فریزر' میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس کی دلکشی' سحر انگیز نظاروں اور خوبصورتی کے باوجود یہاں رہائش اختیار کیے رکھنا ہرگز آسان نہیں ہے۔ کیپٹن کرنل شیر اس دشوار ترین علاقہ میں آمد پر خوشی سے سرشار تھا۔ وادی کے نظارے اسے بہت شناسا معلوم ہوتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ انہیں جانے کب سے اپنے وجود میں سموئے ہوئے تھا بس بصارت کے سامنے یہ اب آئے ہیں۔ اس کا وجدان گواہی دیتا تھا کہ اب 'منزل' بہت قریب ہے اور یہاں آمد پروردگار کی نعمتوں سے ایک خصوصی رحمت اور اس کی بہت سی دعاؤں کا حاصل ہے۔

یونٹ میں آنے کے بعد کرنل شیر کو علم ہوا کہ رہائشی سہولتیں ناکافی ہونے کے باعث اسے فی الوقت الگ کمرا مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ اسے میڈیکل آفیسر' کیپٹن آصف' کے ساتھ ٹھہرایا گیا۔

کیپٹن آصف انسانی فطرت کے عین مطابق تخلیہ پسند تھا۔ اسے نئے ساتھی کی آمد اور اپنے کمرے میں رہائش قدرے ناگوار گزری تھی۔ اس پہ مستزاد یہ شخص دوسرے یونٹ سے تھا تو ذہن فوری طور پر اس سے بے تکلف ہونے پر آمادہ ہی نہ ہو رہا تھا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات کے تحت اس نے شیر خان کا رسمی سے انداز میں ہی استقبال کیا۔ کرنل کی ذہانت نے بھی کیپٹن آصف کی یہ ناگواری بھانپ لی تھی تاہم زبانی دعوے کرنے کی بجائے وہ اپنے عمل یا کردار سے ہی اس کے جذبات میں تبدیلی پیدا کر سکتا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے کرنل شیر کو کسی خصوصی محنت کی ضرورت بھی کہاں تھی۔ اس پر تو یوں بھی قدرت کا خصوصی انعام تھا جو مقابل کے دل میں خود بخود اپنے لیے محبت پیدا کر لیتا۔ کیپٹن آصف کا دل بھی اس حاضر دماغ' عاجز' دینی شعائر کے پابند' خوش اطوار' خوش باش اور گھنی داڑھی والے شخص کے لیے غیر محسوس طریقہ سے گداز ہوتا چلا گیا۔

وہ چندرہ دن ایک ساتھ رہے تھے۔ الگ کمرا الاٹ ہونے کے بعد جب شیر خان کی روانگی کا وقت آیا تو کیپٹن آصف کی سابقہ ناگواری اداسی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

''کرنل شیر! قسم خدا کی! میں نے آج تک تم جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔''

''آپ کی ذرہ نوازی ہے کیپٹن!'' اس نے خلوص اور گرمجوشی سے جواب دیا۔ ''اس ناچیز کو بس دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔''

''یاد رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی میرے دوست! تم مجھے بھولو گے ہی کب؟'' آصف نے افسردگی سے اس دلیر اور جادوئی شخصیت کے حامل شخص کو کمرے سے تو رخصت کر دیا لیکن دل سے کبھی بھی نہ نکال پایا۔

☆......☆

اس سیکٹر میں کرنل شیر کی آمد حقیقی معنوں میں ایک

دھماکا ثابت ہوئی۔

اس علاقہ میں دشمن کی کارروائیاں اور حالات و واقعات دیکھ کر اس کی سیمابی فطرت نہایت بے چین ہو چکی تھی۔ ان کی چوکیوں کے مقابل دشمن نے ایک مشاہداتی چوکی قائم کر رکھی تھی جو ان کے لیے خاصی پریشانی کا باعث تھی۔ پھر دشمن خوامخواہ اپنے گولے بارود برباد کرتا رہتا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے وہ گولے داغنے لگتے تھے۔

اس دن بھی دشمن نے فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ بات شیر خان کے غصے کو بڑھا رہی تھی۔ اس ضمن میں اس نے ایک ایسا قدم اٹھایا تھا جس نے سب کو حیران کر دیا۔ اس نے موسم کی قہرناکی کے باوجود اس چوکی پر قبضہ کرنے کا ارادہ بنا لیا۔ باہمی مشاورت اور افسران بالا کی طرف سے اجازت کے مراحل طے ہوتے ہی اس ضمن میں کوئی حتمی قدم اٹھایا جانا تھا۔ معاملات ابھی التواء کا شکار ہی تھے کہ کیپٹن شیر نے ایک دھماکا خیز اطلاع دی کہ وہ اس مشاہداتی چوکی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود ہے۔

خبر کمانڈنگ آفیسر کے لیے نہایت غیر متوقع اور حیران کن تھی۔ اس نے ذاتی حیثیت میں فیصلہ کی بجائے افسران بالا کو مطلع کرنا بہتر تصور کیا۔ افسران نے کرنل شیر کو واپس آنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل تو کی لیکن اپنی مہم جو فطرت سے مغلوب ہو کر دشمن کے بنکروں سے دستی بم، کچھ وردیوں، وائکر گن کے میگزین، گولیوں اور سلیپنگ بیگ سمیت بھی کچھ ساتھ لے آیا۔

اس کے یونٹ کو اسی روز اندازہ ہو گیا کہ کیپٹن کرنل شیر اس علاقے میں ایک نئی تاریخ ضرور رقم کرے گا۔

☆......☆

شیر خان کے اعصاب میں ایک طوفانی برق سما چکی تھی۔

موسم کی سختیوں اور جوانوں کو کسی بھی قسم کی کاہلی و تساہل سے بچانے کے لیے اس نے اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل پہلے ہی ترتیب دے لیا تھا جس کی رو سے اس نے کمپنی کے جوانوں کو مختلف کھیلوں میں مصروف کر دیا۔

''کیپٹن کرنل! تمہارے وجود میں پارہ تو نہیں بھرا ہوا؟ اتنی انرجی حقیقتاً قابل رشک ہے۔'' ایک افسر نے کہا۔

''میں جوانوں میں انگیٹھیوں اور چولہوں سے ننھی

ہو کر بیٹھنے کی خواہش ختم کر دینا چاہتا ہوں سر! ہم فوجیوں کا جوش، جنون اور جذبہ ہی اس قدر حدت آمیز ہیں کہ ان کے سامنے بیرونی موسم کی یہ سردی پانی بھرتی ہے۔''

''میں تمہاری منطق سے متفق ہوں جوان!'' افسر نے مسکرا کر اسے اپنے تعاون کی یقین دہانی کروائی۔

کرنل شیر نے موسم کی سختیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے انہیں جسمانی مشقتوں، کھیلوں، بھاگ دوڑ اور کوہ پیمائی جیسی سرگرمیوں میں مصروف کر دیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یونٹ میں توانائی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ وہ خود بھی بہترین نشانہ باز تھا۔ کچھ عرصہ اور گزرا تو این ایل آئی کے سالانہ مقابلوں کا وقت چلا آیا۔ اس موقع کے لیے بھی ایک خصوصی لائحہ عمل کرنل کے ذہن میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے کمانڈنگ آفیسر سے اجازت طلب کر کے ٹیم کے انتخاب اور تربیتی مراحل سے گزارنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ڈیلٹا کمپنی میں ہونے کے باوجود اس نے پورے یونٹ سے بہترین افراد منتخب کر کے ان کی جان توڑ تربیت کی۔ اس کی یہ محنت رائیگاں ثابت نہ ہوئی۔ ناردرن لائٹ انفنٹری سینٹر بونجی میں ہونے والے چار طرح کے مقابلوں میں سے تین میں 12 این ایل آئی نے پہلی پوزیشن حاصل کر کے خود کو ٹرافی کا مکمل حقدار ثابت کر دیا۔

☆......☆

کرنل شیر کی ذہانت و فطانت کا دائرہ کار بھی غیر محدود تھا۔

اس نے ہر ایک مقام پر اپنی صلاحیتوں کا استعمال نہایت فراست سے کیا تھا۔ کچھ وقت مزید گزرا تو پاکستانی فوج کی مخالف چوکیوں پر دشمن کی جانب سے پالے گئے 'السیشن' کتوں نے ان سبھی کی طبیعت کو خاصا مکدر کر دیا تھا۔ عبادت کے اوقات میں ان کی آوازیں روح و قلب کے لیے بہت کثیف ثابت ہوتیں۔

''ہمارے دشمن کے شوق کا بھی جواب نہیں، ایسے جانور یہاں لا کر باندھ دیئے خدائی خواروں نے۔'' ایک جوان نے نیم بیزاری سے کہا۔

''شوق کے علاوہ یہ ان کی ٹرک یا احتیاطی تدبیر بھی تو ہو سکتی ہے کہ رات کو کوئی اُدھر کا رخ بھی کرے تو وہ باخبر ہو جائیں۔'' کرنل نے جواب دیا۔

''کمال ہے سر جی! دشمن کو اپنی صلاحیتوں سے زیادہ ان جانوروں پر بھروسا ہے۔'' دوسرا جوان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''مجھے بھی ان کا بھونکنا پسند نہیں ہے جوان! ان کو نشانہ بنا کر خاموش کروانا بھی میرے لیے مشکل نہیں لیکن ہمیں بلاضرورت فائر کھولنے کی ممانعت ہے۔''

''تو پھر کوئی اور ترکیب سوچیے ناں سر جی!'' ایک اور ساتھی کے کہنے پر وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔

اگلے روز وہ کہیں سے ایک کتیا پکڑ لایا۔ ساتھی اس کے عمل پر کافی حیران تھے۔

''اس کا کیا کرو گے خان؟'' ایک قریبی رفیق نے حیرانی سے استفسار کیا۔

''اپنی چوکی کے پاس کسی نہ کسی بانس کے ساتھ باندھ دوں گا۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''کیا کرتے پھر رہے ہو یار!! ایک تو مخالف چوکی پر السیشن کتوں کی آوازیں صبر آزما ہیں اور تم بالکل ہمارے سروں پر ایک اور مصیبت باندھنے لے آئے ہو!'' کوئی دوسرا ساتھی جھلایا۔

''دشمن کے غیر معمولی کام سے خود کو ذہنی تناؤ میں مبتلا کرنے کا کیا فائدہ؟'' وہ سکون سے کہنے لگا۔ ''اصل کمال تو یہ ہے کہ ان کی چال اس طرح ناکام کی جائے کہ وہ ہماری برتری تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔''

''آپ کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے سر؟'' ایک جوان متجسس ہوا۔

''منصوبہ بہت سادہ ہے۔ جانوروں پر ملاپ کا موسم آئے تو مادہ جانوروں کے جسم سے ایک مخصوص خوشبو خارج ہوتی ہے جسے ہوائیں اپنے سنگ اڑا کر چاروں جانب پھیلا دیتی ہیں۔ نر جانور کے لیے یہی خوشبو ہی مادہ تک پہنچنے کا سراغ ہوتا ہے۔ اگر ہوا کی سمت بدلنے سے مادہ کا سراغ نہ مل سکے تو وہ ایک مخصوص لے میں آوازیں نکالنے لگتے ہیں۔ مادہ ان کا فوری جواب دیتی ہے اور وہ بالآخر ایک دوسرے تک رسائی حاصل کر ہی لیتے ہیں۔''

''بہت خوب! یعنی آپ اسے مخالف سمت میں باندھ کر انہیں یہاں آنے پر مجبور کر دیں گے۔''

''بس آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

کرنل شیر کا یہ منصوبہ ابتداء میں ہی دشمن کے لیے درد ثابت ہو گیا۔ مادہ مختلف آوازیں نکال کر انہیں اپنے پاس آنے کے لیے بے تاب کرتی رہی۔ تنگ آ کر انہوں نے بھی اپنے جانوروں کو باندھ دیا۔ تیسرے روز کرنل شیر نے مادہ کو کھول دیا۔ اس امر سے دو فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ جانور خود اپنا علاقہ چھوڑ کر اس کے پیچھے لپک آتے یا وہ سب ہی کہیں اور نکل جاتے۔

یہ حکمت عملی بالآخر کامیاب ہوئی اور دشمن کو زچ کرنے کے بعد مادہ ان کے جانوروں کو لیے کہیں اور نکل گئی۔

☆......☆

بیسویں صدی کا بوڑھا وجود اپنی عمر کے اختتام تک آن پہنچا تھا۔

اس بوڑھے شجر نے بے پناہ خونریزیاں دیکھ رکھی تھیں۔ وہ کئی جنگوں کا عینی شاہد تھا اور اب اس کی کہنہ سال آنکھیں ایک اور جنگ کے بادل منڈلاتے دیکھ رہی تھیں۔

اس علاقہ میں تاحد نگاہ برف ہی برف دکھائی دیتی ہے۔ یہاں درخت اور جھاڑیاں ناپید ہیں۔ ہزاروں فٹ بلندی پر واقع اس سرحدی علاقے میں برف کی دبیز تہوں تلے کچھ نہیں اگتا۔ برفشار تسلسل سے گرتے ہیں۔ علاقہ میں سڑکیں ناپید ہیں۔ وہ وقت نہایت کٹھن تھا۔ فوجی جوانوں کو کسی بھی نقل و حرکت کے لیے سامان خود اٹھا کر برف میں چلنا پڑتا جو ہرگز آسان نہ تھا۔ اس موقع پر 'زوہ' نامی جانور کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

شمالی علاقوں میں پایا جانے والا یہ بیل نما جانور قدرتی طور پر ہی بے پناہ ذہانت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ ان علاقوں کا اس قدر جغرافیہ شناس ہے کہ کسی بھی ایسی جگہ قدم ہی نہیں رکھتا جس کے نیچے کوئی گڑھا یا کھائی موجود ہو۔ اسے 'پریقین قدموں' والا جانور بھی کہا جاتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ برف زاروں کے ان سرحدی علاقوں میں یہ سپاہیوں کا بہترین ساتھی ثابت ہوا کرتا ہے جو سردی کی شدت با آسانی جھیل کر کھلے آسمان تلے رہنا ہی پسند کرتا ہے۔

انہی سرگرمیوں میں جنوری 1999 کا آغاز ہو گیا۔

کرنل شیر کا یہ ماہ پیدائش اس بار بہت سی حشر سامانیاں اپنے ساتھ سمیٹ لایا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصہ سے لاشعور کی اندھیری گلیوں میں اودھم مچاتا وہ خواب بھی اب تواتر سے دکھائی دینے لگا تھا۔ عالم بیداری میں بھی رگ و پے میں ہر وقت میٹھی میٹھی سی سرشاری کی لہر دوڑا کرتی جو اس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہی کیا کرتی تھی۔

موسم کے تیور شدید بگڑ چکے تھے۔ گھن گرج کے ساتھ

کڑکتی بجلیاں قرب وجوار کو ہلا دیتی تھیں لیکن اپنے سینوں میں شہادت کی تمنا اور دلوں میں ایمان کی حدت سموئے ان جوانوں کے وجود خود بھی کڑک دار بجلی بن کر دشمن کو نیست ونابود کر سکتے تھے۔انہیں بارشوں اور برفباریوں کے طوفان سے کوئی غرض ہی نہ تھی۔مواصلات کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے بچھائی گئی تاریں بار بار ٹوٹ جاتی تھیں لیکن ایک ان کا عزم وحوصلہ تھا جو ہمیشہ کی طرح اٹوٹ تھا۔پھر بھی سرفروشوں کا یہ یونٹ مادر وطن کی دفاع کے لیے تیار تھا۔

☆......☆

وقت بے حد نازک ہو چلا تھا۔

بے تاب آنکھیں اور جذبہ ایمانی سے لبریز دل آنے والی ساعتوں کی چاپ مکمل طور پر محسوس کر رہے تھے۔کرنل شیر کے احساسات بھی کم توانا نہ تھے۔خان گلاب اور ان کے مرشد قائداعظم محمد علی جناحؒ سے کیے گئے وعدوں کی تکمیل کا احساس اسے مزید بے جگری عطا کر رہا تھا۔والدین، اہل وعیال، احباب یا متوقع شادی تو اب دماغ کے کسی بھی گوشے میں موجود ہی نہ تھی۔اسے ہمہ وقت اپنے سامنے ایک دھند دکھائی دیتی تھی جس کے پار جانے کی تمنا شدت سے دل میں مچلتی تھی۔انہی جذبات واحساسات میں گھرے ماہ اپریل کے اختتامی دن چلے آئے۔

27اپریل کے اس روز کرنل شیر کو سرکاری کام سے اسکردو بھیجا گیا جہاں اس کی ملاقات کیپٹن وحید سے ہوئی۔اپنے پاس اس مختصر قیام کے دوران وحید سے شیر خان کی کیفیات پوشیدہ نہ رہ سکیں۔

”تمہیں اس قدر سنجیدہ تو پہلے کبھی نہیں دیکھا! کیا بات ہے؟“

”میرے مزاج میں آنے والی یہ تبدیلی خود میرے لیے بھی حیران کن ہے۔یہ سب کمال اس دھند کی بدولت ہے جو میرے دل ودماغ کا احاطہ کیے رکھتی ہے۔مجھے بس ایک بار اس پار دیکھنے کی تمنا ہے۔میرا دل کہتا ہے کہ دوسری جانب میں ضرور جاؤں گا لیکن کب؟ اب بس اور انتظار نہیں ہوتا۔“

”رب سب بھلی کرے گا۔واپسی پر تو یوں بھی تمہارے لیے بہت سی خوشیاں منتظر ہوں گی۔“ کیپٹن وحید نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”میری خوشی......“اس کا لہجہ سرگوشی میں ڈھل گیا۔”تم جانتے ہو وحید کہ میری خوشی اور خواہش کیا ہے؟ میں چار کندھوں پر واپس جانا چاہتا ہوں۔اس لمحہ کے لیے میں نے بہت انتظار کیا ہے۔تم دعا کرنا کہ میری کسی بھی غلطی یا کوتاہی سے یہ تعبیر مجھ سے روٹھ نہ جائے۔میں نے زندگی بھر اس ایک پل ہی سے تو محبت کی ہے۔تم دعا کرو گے ناں کہ میری محبت کا انجام ہجر نہیں بلکہ وصل ہو۔“اس کے انداز اور تڑپ نے پیشہ وارانہ تربیت کے باوجود کیپٹن وحید کا بدن سن کر دیا۔

”مجھے یقین ہے کیپٹن کرنل شیر! تمہارا یہ جذبہ صادق اپنی منزل تک ضرور پہنچے گا۔“اس نے شیر خان کا ہاتھ تھام لیا جس کی حدت اس کے دل ودماغ میں بھی ایک دھند آلود سی کیفیت برپا کرنے لگی تھی۔

☆......☆

ماہ مئی کے آغاز میں جنگی صورتِ حال نہایت تشویشناک ہو چکی تھی۔

پندرہ سے سترہ ہزار فٹ بلندی پر تعینات ان یونٹس کو دشمن کی زبردست یلغار کا سامنا تھا۔دن بھر ان کا توپخانہ آگ برساتا تھا اور رات کو پیدل فوج کے دستے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے۔سپاہیوں کو ستانے کا رتی بھر موقع نہیں مل پاتا تھا۔کرنل شیر بے جگری سے ریکی اور دشمن کے خلاف گھات لگانے کی مختلف کارروائیوں میں مصروف تھا۔

تین مئی کو اسے تین افراد کے ساتھ ریکی کے لیے بھیجا گیا۔دو روز کے اس کامیاب عمل کے بعد پانچ اور چھ مئی کو 'موسیٰ مستقر' سے کمانڈنگ آفیسر کو نتائج سے باخبر کر دیا گیا۔بعد ازاں اس کی ہدایت پر کرنل نے بارہ مئی کو مساحتی حوالے کے علاقہ میں ایک چوکی قائم کر دی۔اس کی یہ سرگرمیاں بھارتی فوج کے لیے وبال جان بن چکی تھیں۔طیش اور جھنجلاہٹ میں تیرہ مئی کو بھارتی توپ خانہ نے اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔

اس بے تحاشا بمباری کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ پاکستانی فوجی اگر زخمی نہیں ہوئے تو چوکیاں خالی کر کے واپس ضرور لوٹ چکے ہوں گے لیکن یہ ان کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔سوچ بچار کے بعد انہوں نے نو سے دس افراد کی نفری بذریعہ ہیلی کاپٹر چوکی کے عین سامنے اتار دی۔

”ہوشیار ہو جاؤ جوانو! دشمن خود اپنی موت مرنے آ گیا ہے۔“کرنل کے لہجہ میں مسرتوں کی کھنک تھی۔ان

سب نے بمباری سے بچنے کے لیے تودوں کی آڑ تو لے لی تھی لیکن خوفزدہ ہو کر وہاں سے فرار ان کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔

بھارتی فوج کے اترتے ہی اس نے چوکی سنبھالی اور ساتھیوں کے ہمراہ دشمن پر فائرنگ کی بوچھاڑ کر ڈالی۔چند آدمیوں کی ہلاکت کے بعد زخمی سپاہیوں نے بھاگنے کا فیصلہ کر کے فوری عمل بھی کر ڈالا۔

”بھارتیو! جب تک شیر خان اس جگہ موجود ہے قبضہ کرنا تو درکنار تمہارا یہاں سے گزرنا بھی موت کا پروانہ ثابت ہو گا۔“اس کی دھاڑ ان برف پوش چوٹیوں کو ہلا رہی تھی۔

☆......☆

ان عسکری سرگرمیوں میں جون کا آخری عشرہ آن پہنچا۔

تڑپتے جذبات اور مچلتی تمنائیں سوا نیزے پر پہنچنے لگی تھیں۔یہ وہ وقت تھا جب کیپٹن کرنل شیر نے ایک گشت کے دوران 'مشکوہ نالے' میں دشمن کا سراغ لگایا تھا۔کمانڈنگ آفیسر کو اطلاع دینے کے بعد اس نے مذکورہ کیمپ پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی کہ اب اور کوئی راستہ ہمیں بھی پڑھ کر دکھانے کی اجازت دی جائے۔پل پل کی رپورٹ افسران تک پہنچ رہی تھی کہ دشمن کس طرح اشتعال پھیلا رہا ہے۔اپنے جوانوں کی حفاظت کے لیے دشمن کو منہ توڑ جواب دینا ضروری ہے۔بحالتِ مجبوری انہیں جوابی کارروائی کی اجازت دینی پڑی۔

منظوری ملتے ہی نہایت ذمہ داری سے شیر خان نے چند افراد منتخب کر لیے۔

ہتھیاروں کے طور پر ان کے پاس دو بھاری مشین گنز، ایک آر پی جی، دستی بم، چار جی تھری رائفلیں اور ایک کنٹرولا سیٹ موجود تھے۔وہ بائیس جون کی نصف شب کا وقت تھا۔سرفروشوں کا یہ قافلہ اپنی تمنائے قلب سے وصل اور دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے اپنی چوکی سے روانہ ہو گئے۔صبح ساڑھے چار بجے مطلوبہ علاقے میں رسائی کے بعد دشمن کے کیمپ کی صورتِ حال ان کے سامنے عیاں تھی جہاں ہو کا عالم طاری تھا۔سردی اس قدر تھی کہ ہڈیوں میں لہو جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ اللہ کی راہ میں نکلے سرفروش تھے، انہیں اللہ ہی سے ملنے کی لو تھی اور جس وجود میں عشق حقیقی کی یہ آتش سیندھ لگا لے، اس کے لیے موسموں کی

نرمی سختی بے معنی ہو جایا کرتی ہے۔

کیپٹن شیر نے دو دو افراد کے چار گروپ تشکیل دیئے اور تین گروپس کو بھاری ہتھیار دے کر مختلف جگہوں پر تعینات کر دیا۔

”میرے حکم کے بغیر یہاں کوئی بھی فائر نہیں کھولے گا۔ہم اس وقت ایک ایسے مقام پر موجود ہیں جہاں ایک معمولی سی غلطی بھی بہت بھاری ثابت ہو گی۔“اس نے کچھ توقف کیا اور پھر گویا ہوا۔”سپاہی عرفان! تم میرے ساتھ چلو گے۔ہم دشمن کے کیمپ کی طرف اتریں گے۔“

”سر!“عرفان کی آنکھوں میں نمودار ہونے والی چمک وہاں موجود چاند ستاروں کی ضوفشانی کو بھی مات دینے لگی تھی۔

ان دونوں نے نہایت احتیاط سے کیمپ کے نکڑ پر سنتریوں کی چوکی میں جھانکا جہاں کا نظارہ کافی حوصلہ افزا تھا۔اندر صرف دو سپاہی تھے جو اس وقت خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔رات بھر کی فائرنگ کے بعد وہ دونوں آرام کر رہے تھے۔دو مشین گنز فکس لائن پر لگی نظر آ رہی تھیں۔ایک کا رخ اسی مشکوہ نالے کی طرف ہی تھا جہاں وہ اپنے سپاہی تعینات کر کے آیا تھا۔دوسری مشین گن کسی اور سمت متعین تھی۔کیپٹن شیر نے بجلی کی سی تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں گنز کے میگزین نکال کر اپنے 'پٹھو جھولے' میں ڈالے اور سپاہی عرفان کو گردن وزبان کی طرف مخصوص اشارہ کر کے بتایا کہ ان دونوں سنتریوں کا گلا گھونٹ کر اس طرح مارا جائے گا کہ کوئی بھی آواز نہ نکلنے پائے۔

وہ دونوں آہستگی سے سنتریوں کے پاس پہنچ گئے۔کرنل شیر نے اپنے شکار کو دبوچ کر ہلنے کا کوئی موقع ہی نہ دیا لیکن دوسرا سنتری بے پناہ پھرتیلا اور چوکس ثابت ہوا۔وہ اپنی تمام تر جسمانی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے عرفان کی گرفت سے نکلا اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔یہ صورتِ حال ناپسندیدہ تھی۔کیپٹن شیر کو مجبوراً اپنا پستول استعمال کرنا پڑا۔رات کے گھمبیر سناٹے میں پستول کی آواز نے کیمپ میں ہلچل برپا کر دی۔

”کون ہے؟ کون ہے ادھر تکارام؟ سب کچھ ٹھیک تو ہے وہاں؟“ ایک صدا بلند ہوئی۔

”کہیں پاکستانی سینا تو نہیں آ پہنچی ادھر؟“ دوسرے شخص کی آواز آئی۔وہ اب نزدیک تر آتے محسوس ہو رہے

تھے۔

”اوئے ان کی ایسی کی تیسی......ان کا میں کریا کرم کردوں گا آج میں۔“

وہ دونوں کیمپ سے نکلے ہی تھے کہ ایک اچٹتے ہوئے فائر نے سپاہی عرفان کو نشانہ بنالیا۔ وہ شدید زخمی ہو کر گر گیا۔ کیپٹن شیر نے پھرتی سے اسے گھسیٹ کر ایک تودے کے پیچھے کیا اور اپنے تینوں گروپس کو فائرنگ کرنے کا اشارہ کردیا۔ دوطرفہ بارود اب بارش کی طرح برسنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد فائرنگ کا یہ سلسلہ رکا تو کرنل شیر نے تین ساتھیوں کو نیچے آنے کے لیے کہا تاکہ عرفان کو سہارا دے کر واپس لے جایا جاسکے۔

”سر امیری......فکر......نک......کیوں......کرتے ہیں؟ ان......و......دشمنوں کی......اینٹ......سے اینٹ......بب......بجا دیجیے......مم......میرا آ......خر......ی......وقت......بہت......ان......تظار......کیا......تھا......لا......الہ......الا اللہ......محمد......رسول......اللہ......“ اٹک اٹک کر کہتے ہوئے عرفان نے کلمہ طیبہ کا ورد مکمل ہوتے ہی آخری ہچکی لی اور اپنی آخری منزل کی طرف اڑان بھر گیا۔

اس کی خوش بختی پر کرنل شیر اور دیگر ساتھیوں کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اسی دوران بھارتی توپ خانہ نے گولہ باری کا آغاز کردیا۔

”سپاہی عرفان کا پٹھو جھولا اتار کر نالے میں پھینک دو اور سب اپنے ہتھیار سنبھال لو۔“ اس کا چٹانی لہجہ پہاڑوں کی سختی کو بھی شرمارہا تھا۔

”سر!“ غلام محمد نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ہدایات کے موجب ایک بھارتی مشین گن کو بھی نالہ برد کردیا۔

اس وقت تک چوٹیوں کے عقب سے سورج کا تھال اپنی جھلک دکھانے لگا تھا۔ اس روز مطلع بھی بالکل صاف تھا اور خلاف معمول دور دور تک سب کچھ واضح نظر آرہا تھا۔ اسی اثناء میں دشمن کے طیارے سر پر آن پہنچے اور ایک ہولناک بمباری کا آغاز ہوگیا۔ کرنل شیر اور ساتھیوں نے بحالتِ مجبوری عرفان کو ایک تودے کے پیچھے لٹا کر کیمپ سے دور ہٹنا شروع کردیا۔ بمباری اور توپ خانہ کی گولہ باری ختم ہوئی تو وہ اپنے شہید سپاہی کا جسد خاکی اٹھانے کے لیے ایک بار پھر سابقہ مقام پر آئے لیکن دشمن کے سپاہی اس کی نعش اپنے ساتھ لے جاچکے تھے۔

وہ سب ہی افراد دلوں میں ایک بوجھل کیفیت لیے اپنے کیمپ سے واپس لوٹ آئے۔ ان کے سینوں میں آتش مزید توانا ہوچکی تھی۔ کرنل شیر کی حالت ان سب سے سوا تھی۔ اس کی محبت آج دو قدم کے فاصلے سے عرفان کو اپنی بانہوں میں بھر کر اپنے ہمراہ لے گئی تھی۔ شیر خان کو اس کج ادائی پر بھی ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔

”سر! آپ کی وردی دھو دوں؟“ ایک مؤدبانہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کے سامنے کھڑا اردلی لہو آلود وردی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفسار کررہا تھا جس پر سپاہی عرفان کا لہو دھبوں کی صورت میں جابجا پھیلا تھا۔

”رہنے دو گل خان!“ اس نے نرمی سے ان دھبوں کو انگلیوں سے چھوا اور محبت و عقیدت سے نم انگلیوں کو بوسہ دے کر آنکھوں سے لگالیا۔ ”یہ ایک شہید کا لہو ہے۔ جانتے ہو ناں! روز قیامت جب شہید بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوگا تو اس وقت بھی اس کے زخم تازہ اور ان سے رستے ہوئے لہو میں مشک و عنبر کی خوشبوئیں ہوں گی......ذرا تصور تو کرو کہ سپاہی عرفان اپنے اس لہو میں پروردگار دو عالم کے سامنے حاضر ہوگا تو رحمت الٰہی کس قدر مسرت و جوش میں ہوگی۔“

اس نے ایک بار پھر اپنی انگلیاں وردی سے رگڑیں اور بوسہ دیتے ہوئے آنکھوں سے لگالیں۔ دل میں ایک کسک نے شدت سے سر اٹھایا۔ گل خان کا دل بھی گداز ہوگیا تھا۔ وہ سر جھکائے آنکھوں میں نمی لیے خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔

☆......☆

جولائی کا آغاز بہت ہنگامہ خیز تھا۔

دوطرفہ بارود اور لہو کا کھیل شدت اختیار کرچکا تھا۔ چار جولائی 1999 کو کیپٹن شیر کو 'ٹائیگر ہلز' جانے کا حکم دیا گیا جہاں تین دفاعی چوکیاں قائم کی گئی تھیں۔ ان چوکیوں کو اے' بی اور سی کا کوڈ نیم اور کلیم چوکی' کاشف چوکی' وکیل چوکی کے عرفی نام دیے گئے تھے۔

”دشمن اے اور بی کے درمیان گھسنے میں کامیاب ہوگیا ہے کیپٹن شیر!“ افسر نے اسے بریفنگ دیتے ہوئے کہا۔

”آپ حکم کیجیے سر! ان کی اس جسارت کا بھرپور تاوان وصول کرنے کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔“

”دیٹس دی اسپرٹ مائی بوائے! بی پر افسر بھی موجود ہیں۔ اس سے قبل ایک افسر وہاں زخمی ہوچکے ہیں۔ انہیں دونوں بازوؤں اور ٹانگوں میں چار گولیاں

ہیں۔“ افسر نے حقائق سے مختصراً آگاہ کیا۔ ”اس چوکی کو بہرصورت دشمن سے واپس لینا ہے۔“

”سر!“ اس نے تعظیمی انداز میں کہا۔

”کوئی شک؟“ بریفنگ کے اختتام پر حسب ...تور اس سے پوچھا گیا۔

”نو سر! مجھے کوئی شک نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اصل نجات شہادت ہی میں پوشیدہ ہے۔ جہاد اور شہادت پر یقین نہ رکھنے والا ایمان ہی سے محروم ہے۔ میں ایمان سے محروم نہیں ہوں سر!“ فرط جوش سے اس کا رواں رواں ...نارہا تھا۔

☆......☆

اس روز کرنل شیر شام چھ بجے مطلوبہ مقام پر پہنچا اور اپنی عمیق نگاہوں' ذہانت اور فراست سے تمام تر صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ دشمن پر عین سامنے علی الصبح حملہ کرنا ہی بہترین حکمت عملی ثابت ہوگی ورنہ ...زعم میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔

اس رات شیر خان کا وجود ساتھیوں کے لیے عجیب ...مرئی اعتماد اور مثبت تحریک کا سبب بنا ہوا تھا۔ اس کے ...ے پر معمول سے زیادہ اجالا اور آنکھوں میں مقابل کی نظروں کو خیرہ کردینے والی چمک تھی۔ رات کے اختتامی پہر میں اس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور حتمی منصوبہ دہرانے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجہ میں گویا ہوا۔ ”آج اس مقام پر اپنی موجودگی اور اس سعادت پر میرا ہی نہیں بلکہ یقینی طور پر آپ سب کی جبینوں میں بھی سجود شکر مچل رہے ہوں گے۔ ایسے مواقع کا انتظار تو ہم ہمیشہ کیا کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں میرے داداجان نے ایک بار بتایا تھا کہ اللہ پاک ان لوگوں کو بہت محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں ایسے لڑتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ اس بات سے آگاہی کے بعد میرے دل میں ایک ایسی آتش روشن ہوئی ہے جو آج تک اپنی حدت سے میرا وجود گرمائے رکھتی ہے۔“

”ہم بھی انہی جذبات و کیفیات میں مبتلا رہے ہیں سر!“ ایک جوان نے کہا۔ ”دل مچلتا ہے کہ میدان جنگ میں فوری شہادت پاکر اپنے سب خوابوں کی تعبیر پالیں۔“

”میں تمہارے ان جذبات کی قدر کرتا ہوں جوان! لیکن ہم اکثر ایک نازک سی حقیقت فراموش کرجاتے ہیں۔ شوق شہادت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میدان جنگ

میں آتے ہی موت کی آرزو کرنے لگیں۔ شہادت کی اصل روح تو یہ ہے کہ ہم اللہ کے ان دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ قتل کر کے اس دھرتی کا بوجھ ہلکا کر سکیں۔ ایک سپاہی کو ایسی جذباتیت سے گریز کرنا چاہیے۔" وہ نرمی سے کہتا چلا گیا۔ "ہم اللہ کے سپاہی ہیں۔ ہمیں اس مقدس فریضہ کی ادائیگی بھی مکمل حقوق سے کرنی ہے۔"

"ہم ایسا ہی کریں گے سر!" جوان بیک وقت بولے۔

"خلوص نیت سے اللہ کی رضا کی خاطر ہتھیار اٹھانے والے پر اس کی خصوصی رحمتیں نازل ہوتی ہیں میرے ساتھیو! یہ اس ذات اقدس کا کرم ہی تو ہے کہ سچے سپاہی کی جانب سے ملا کوئی بھی زخم یا 'نقصان' دشمن کو اصل ماخذ سے کئی گنا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ قدرت ہی کی جانب سے ایک نامعلوم دباؤ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج ان تاروں بھرے آسمان کو گواہ بنا کر مجھ سے ایک وعدہ کرو...... اپنی زندگی اتنی آسانی سے نہیں ہارو گے...... اس برف زار کو دشمن کے لہو سے رنگین کر دو گے...... لاتعداد ہی مدت سے ایستادہ ان پہاڑوں کو ثابت کر دو گے کہ امت محمدی ﷺ کا سپاہی جب اپنے نبی کی تعلیمات سے دل میں جذبہ لیے میدان جنگ میں اترتا ہے تو اس کا وجود ان سے بھی زیادہ سنگلاخ بن جاتا ہے۔ ہمارے ارادے ان کی ہزاروں فٹ بلند چوٹیوں سے بھی بلند تر ہیں۔ ہم مصطفوی ہیں...... ہمیں اپنے نبی ﷺ کی شفاعت کا حق ادا کرنا ہے۔ وعدہ کرو مجھ سے کہ اس میدان جنگ میں دلیری کی وہ مثال قائم کرو گے کہ روز آخرت یہ مظاہر فطرت بھی ہمارے حق میں گواہی دیں۔ وعدہ کرو کہ اپنا ہر وہ عہد نبھاؤ گے جو اس وردی کو پہننے سے قبل ہم نے کیا تھا۔ یاد رکھو پہل ہم نے نہیں کرنی ہے۔ دشمن کو منہ توڑ جواب بھی دینا ہے۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں سر!" جوانوں کے لہجے میں بے پناہ آتش تھی۔

اس کے لب و لہجہ کے آہنگ اور گفتگو کی تاثیر نے پل بھر میں ہی ساتھیوں کے جذبات میں ہلچل برپا کر دی تھی۔ ان سے ذرا فاصلہ پر 'بریو و کمپنی' کا ایک کمپنی حوالدار میجر بھی بیٹھا یہ گفتگو سن رہا تھا۔ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر وہ کرنل شیر کے پاس چلا آیا۔ "مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں کیپٹن! میں اس سعادت سے محروم رہ کر اپنی زندگی میں دائمی کسک پیدا نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے التجا کی۔ "میں بھی ان دشمنوں پر قہر بن کر ٹوٹنا چاہتا ہوں۔"

"تمہارے جذبات قابل ستائش ہیں جوان! لیکن تمہاری ضرورت اس وقت ہمارے عقب میں رہ کر کورنگ فائر مہیا کرنے میں زیادہ ہے۔ میدان کارزار میں مخلص اور سچے سپاہی کا تو ہر آتا جاتا سانس بھی عبادت ہے۔ تمہاری یہ خدمت بھی یقیناً اللہ کے ہاں بہت مقبول رہے گی۔" شیر خان نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔"

☆......☆

اگلی صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔

کیپٹن عمار کی آمد کے بعد انہوں نے نماز فجر کی ادائیگی کی اور شوق شہادت سے سرشار ہو کر دشمن پر قیامت کی طرح ٹوٹ پڑے۔ چار بھارتی سپاہیوں کے زخمی ہونے کے بعد باقی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

'اے' اور 'بی' کے درمیان رکاوٹ ختم ہوتے ہی کیپٹن عمار اور کرنل شیر آگے جا کر میجر ہاشم سے ملے۔ انہوں نے موجودہ صورت حال پر گفتگو کا آغاز کیا ہی تھا کہ دشمن نے ایک بار پھر بھرپور قوت سے جوابی حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں 8 سکھ رجمنٹ شامل تھی۔ شیر خان اور سب ساتھی پوزیشن بدل بدل کر حملہ کرتے رہے۔ ان کی حکمت عملی سے بھارتی سپاہیوں کی جھنجلاہٹ عروج پر تھی لیکن اسلحہ اور افرادی قوت میں فی الوقت وہ ان سے بازی لے چکے تھے۔

اس صورت حال کا فوری جائزہ لے کر میجر نے نہایت کڑا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے توپ خانہ کو خود اپنی ہی پوزیشن پر گولہ باری کرنے کا حکم دے دیا۔ عسکری نقطۂ نظر سے یہ ایک انتہائی قدم تصور کیا جاتا ہے جس کا مقصد بہرحال یہی ہوتا ہے کہ دشمن ان کے مورچوں پر قبضہ کر کے مزید پیش قدمی نہ کر سکے۔

ذرا سی دیر میں ہی وہاں گھمسان کا رن پڑ گیا تھا۔ ایک جانب توپ خانہ کے سماعت شکن گولے برس رہے تھے تو دوسری سمت میجر ہاشم، کیپٹن شیر، کیپٹن عمار اور دیگر سپاہی دشمن کی کثیر سپاہ سے دست بدست جنگ کر رہے تھے۔ تھوپی گئی اس جنگ میں وہ بھارتی سپاہیوں کو زخم زخم کرتے ہوئے پاکستانی فوجی یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کرتے رہے۔ دشمن کی فرعونیت سوا نیزے پر پہنچی تھی۔

"مر گئے سارے کے سارے!" ایک سکھ سپاہی نے نفرت سے کہا۔

"مر ہی گئے ہوں گے۔ آپاں دے سامنے ٹھہر سکدے نیں بھلا ایہہ؟" ایک اور سپاہی نے حقارت کا مظاہرہ کیا۔

زخم خوردہ شیر خان کی رگوں میں خون کھولنے لگا تھا۔ اس سے قدرے فاصلہ پر پگڑی پوش افراد نہایت کروفر سے شہدا کی لاشوں کو ٹھوکریں رسید کرتے مغلظات بک رہے تھے۔

"وڈے آئے تھے جنگ لڑنے!" ان کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

"سنا ہے کہ ان پاکستانی سیکیوں کو مرتے وقت کلمہ پڑھنے کی بہت اچھا ہوتی ہے۔" ایک سپاہی نے معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"آئے ہائے! بے چارے...... پتا نہیں ہماری گولہ باری سے انہیں اپنی آخری اچھا پوری کرنے کا سمے ملا ہوگا کہ نہیں......"

"چل ایسا کرتے ہیں کہ ان کی لاشوں کو کلمہ پڑھا کر پوچھتے ہیں کہ کہاں ہے ان کا اللہ؟" ایک سکھ نے اپنے سامنے موجود لاش کے چہرے پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی! پڑھ کلمہ...... دکھا ہمیں کہاں ہے تیرا خدا؟ کہاں ہے تیرا وہ سورگ؟"

اس اثناء میں زخمی شیر خان نے اپنا لہولہو وجود سنبھال کر نہایت احتیاط سے رینگتے ہوئے ایک جانب پڑی مشین گن اٹھالی تھی۔

"اوئے بلبیر سنگھا! تجھے کہیں دکھا ان کا خدا جس سے ملاقات کے لیے اتاؤلے ہو کر یہ یہاں چلے آئے تھے۔" ایک اور زہریلا فقرہ اس کی سماعت میں پڑا۔ دشمن سپاہی اب نزدیک تر آنے لگے تھے۔

کرنل شیر نے ایک نظر ہر سو بکھری پاکستانی سپاہ کی لاشوں پر ڈالی اور مشین گن سے دشمن کو فائرنگ کی زد میں لے لیا۔ اطمینان اور بے فکری سے پاکستانی سپاہیوں کے اجسام کی بے حرمتی کرتے سکھ رجمنٹ کے ان فوجیوں کی پل میں ہی سٹی گم ہو گئی۔ کرنل شیر خان کی نشانہ بازی میں مہارت تو پہلے ہی مسلمہ تھی۔ اس کے تاک تاک کر لگائے ان نشانوں سے بھارتی فوج کو ایسا محسوس ہوا کہ پاکستان کی جانب سے کوئی تازہ دم لشکر کمک لیے ان کی مدد کرنے چلا آیا ہے۔ آناً فاناً وہ سبھی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

"اب ڈر کیوں رہے ہو کافرو؟ میں زندہ ہوں...... آؤ کلمہ پڑھاؤ مجھے...... مڑو ادھر آؤ...... میں تم کو دکھاتا ہوں کہ اللہ کہاں ہے...... پاک سرزمین کا یہ شیر خان تمہیں بتاتا ہے کہ جنگ کسے کہتے ہیں......" اس کی آواز میں شعلوں کی سی لپک تھی۔

مشین گن سے ان پر فائرنگ کرتے ہوئے شیر خان کو علم ہی نہ تھا کہ اس کے آگے بھاگنے والے بھارتی فوجیوں کے دل و دماغ اسے ایک 'مکمل لشکر' تصور کیے ہوئے تھے۔ جان بچانے کی فطری خواہش میں بھاگتے ہوئے وہ اپنے کیمپ تک جا پہنچے تھے۔ انہیں گمان تھا کہ پاکستانی لشکر ان کے علاقہ میں داخل ہونے کی غلطی نہیں کرے گا لیکن انہیں بھی کہاں علم تھا کہ شیر خان اپنی منزل تک پہنچنے کی تمنا اور اپنے ساتھیوں کی بے حرمتی دیکھ کر ایک جنون میں مبتلا ہو چکا ہے۔ مشین گن سے فائرنگ کرتا ہوا وہ ان کے پیچھے ہی کیمپ میں داخل ہو گیا۔ اس کی بہترین نشانہ بازی سے کئی دشمن سپاہی جہنم واصل ہو چکے تھے۔

کیمپ کی حدود میں داخل ہونے کے بعد سکھ رجمنٹ کو اندازہ ہوا کہ ان کے عقب میں صرف ایک ہی شخص تھا جو قابل شرم انداز میں انہیں دوڑاتا ہوا یہاں تک لے آیا تھا۔ یہ حقیقت ان سپاہیوں کی انا کے لیے بڑی کاری ضرب تھی۔ انہوں نے اس پاکستانی سپاہی کو گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ بے خوف و خطر آگے بڑھنے والوں پر فائر کھول کر موت کے منہ میں دھکیل دیتا۔ بری طرح زخمی ایک سپاہی شیر خان کی آواز سن بھی رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا مگر اس میں اب اتنی قوت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ شیر خان کا ساتھ دے سکتا۔

یہ کشمکش کچھ دیر یونہی جاری رہی اور پھر وہ جاں گسل لمحہ بھی چلا آیا جب کرنل شیر کی مشین گن کا میگزین بالکل خالی ہو گیا۔ بھارتی فوجیوں کے تناؤ زدہ اعصاب یک لخت ہی پرسکون ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بھارتی کمانڈنگ آفیسر اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ باہر آ کر محتاط انداز میں اسے گھیرنے لگا۔ شیر خان کی عقابی نظریں اب بھی چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ اس کے گرد گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"اپنے ارد گرد دیکھ لو سیک! تم ہر طرف سے گھر چکے ہو۔ اب تم کوئی پاکھنڈ نہیں مچا سکتے...... ہتھیار ڈال

وہ......'' کمانڈنگ آفیسر نے کہا۔

شیر خان اس کے اعلان سے قبل ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کے گرد کم و بیش پچاس افراد موجود ہیں جو اسے 'پوائنٹ بلینک رینج' پر کسی بھی لمحہ گولیوں سے چھلنی کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس کی آنکھوں میں گہری چمک بیدار ہوگئی با آواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اس نے ایک ہی سیکنڈ میں اپنی حکمت عملی مرتب کرلی تھی۔

کمانڈنگ آفیسر کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش تو وہ کسی صورت بھی قبول نہیں کرسکتا تھا۔ سی۔او اس کے قریب ترین ہی کھڑا تھا۔ شیر خان نے اپنے زخمی وجود میں بھرپور قوت مجتمع کی اور اس کے سر پر خالی مشین گن کا بھرپور وار کرکے زمین بوس ہونے پر مجبور کردیا۔

''فائر!'' اپنے افسر کی یہ زخمی دھاڑ سنتے ہی سکھ رجمنٹ کے سپاہیوں نے بیک وقت اپنی بندوقوں کا بارود اس کے جسم میں داغنا شروع کردیا۔

کرنل شیر اس قدر زخمی ہوجانے کے باوجود تن کر کھڑا خود سے پانچ فٹ دوری سی۔او کو ایک بار پھر نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا۔ اسی لمحہ چند مزید گولیاں اس کے جسم میں آلگیں۔ پگھلا ہوا سیسہ بدن میں اترنے کی اسے رتی بھر بھی اذیت محسوس نہیں ہورہی تھی۔ حسیات محض دشمن کو مزید نقصان پہنچانے اور اپنے دین وملت پر میلی نظر ڈالنے پر سبق سکھانے کے لیے مرکوز تھیں۔ بھارتی سپاہیوں کی مزید فائرنگ کے بعد اس کی یہ پیش قدمی بالآخر رک گئی۔

''شیر خان! اگر تجھے شہادت نصیب ہو تو کبھی دشمن کے سامنے اپنا سر اور سینہ جھکنے نہ دینا!'' اس کی سماعت میں شاید بچپن میں خان گلاب کی دی ہوئی ایک ہدایت گونجی۔

وہ ایک جھٹکے سے گھٹنوں کے بل بیٹھا اور ہاتھ میں تھامی مشین گن کو برفانی زمین کے ساتھ ٹکادیا۔

''یا اللہ...... تیرا...... شکر...... لا...... الہ...... الا...... اللہ...... محمد...... رسول...... اللہ۔'' اس کے وجود نے آخری ہچکی لی اور مشین گن ہاتھ میں تھام کر اسی طرح بیٹھے ہوئے اپنی 'محبت' سے دائمی وصل حاصل کرلیا۔

☆......☆

اس برف زار میں کرنل شیر خان کی روح جسد خاکی سے پرواز کرچکی تھی۔

بھارتی فوجی اور کمانڈنگ آفیسر اس وقت مختلف جذبات میں گھرے تھے۔ سپاہی طیش سے مغلوب ہوکر اسے ٹھوکروں کی زد میں رکھتے ہوئے اپنے قدموں میں جھکانا چاہتے تھے لیکن سی۔او کی صدا نے کسی کو بھی اس ارادے پر عمل نہ کرنے دیا۔

''رک جاؤ! اس جوان کے شریر کو کوئی نہیں چھوئے گا۔'' وہ آگے بڑھ کر کرنل شیر کے عین مقابل آکھڑا ہوا۔ وقت شہادت اس کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ نے ہی اسے سحر زدہ کر رکھا تھا۔

''بہت جی دار فوجی تھا یہ...... سچ کہوں تو اس کی بہادری نے میرا دل جیت لیا ہے۔ اس کے دیش سے میرا کرودھا اپنی جگہ لیکن ایسے دلیر فوجی کے شریر کا اپمان میں کسی کو بھی نہیں کرنے دوں گا۔''

''سر!'' سپاہیوں نے تعظیمی انداز میں کہا۔ ''لاش کا کیا کرنا ہے؟''

''اسے عزت کے ساتھ سری نگر پہنچادیں گے۔'' کمانڈنگ آفیسر مکمل طور پر کسی ٹرانس کے عالم میں تھا۔ کرنل شیر خان کی اس آخری مسکراہٹ نے بعداز شہادت بھی دشمن کے قلعوں میں سیندھ لگالی تھی۔

بھارتی کمانڈنگ آفیسر نے دشمن ملک کے اس فوجی کپتان کی نعش پیشہ وارانہ عزت واحترام کے ساتھ اپنی اعلیٰ انتظامیہ تک پہنچاتے ہوئے تحریری طور پر اس کی بہادری کا اعتراف پاکستانی حکومت تک پہنچانے کی درخواست کی جسے بعدازاں منظور کرلیا گیا اور اس کا تحریری اعتراف مذکورہ الفاظ میں شیر خان کے ورثاء تک پہنچادیا گیا۔

''آپ کا یہ بہادر افسر یقیناً آپ کی فوج کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ اس نے سخت ترین حالات میں جس جرأت، بہادری اور جوانمردی کا مظاہرہ میدان جنگ میں کیا، وہ ہمارے لیے متاثر کن ہی نہیں، قابلِ تقلید بھی ہے۔ ہماری فوج کیپٹن کرنل شیر خان کو مدتوں تک فراموش نہیں کرپائے گی۔''

☆......☆

18 جولائی 1999ء کی وہ رات نصف سے زیادہ سفر طے کرچکی تھی۔

ملیر چھاؤنی کراچی میں متعین سینکڑوں فوجیوں کے علاوہ شہریوں اور سیاسی کارکنان کی بہت بڑی تعداد کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر جمع ہوچکی تھی۔ انہیں بھارتی دارالحکومت 'دہلی' سے آنے والی اس فلائٹ کا انتظار تھا جس میں قوم کے بہادر سپوت کیپٹن کرنل شیر کی میت لائی جانی تھی۔

اس جم غفیر میں نواں کلی سے آئے کرنل شیر کے دونوں بھائی بھی موجود تھے۔ آنکھیں نم تھیں، دل محبتوں سے معمور اور زبان شکرانہ ادا کرتے نہ تھک رہی تھی۔

''پاکستان زندہ باد...... پاک فوج زندہ باد۔'' سیاسی کارکنان اور شہری فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔ رن وے کی طرف آتے ہی فوجی نہایت نظم وضبط سے قطار در قطار کھڑے نظر آئے تو وہ بھی یکدم خاموش ہوکر ان کے عقب میں ہی قطاریں بنا کر کھڑے ہوگئے۔

گھڑی کی سوئیاں ایک اور پانچ کے ہندسوں تک سفر طے کرگئیں تو ایک طیارہ رن وے پر اتر آیا۔ مخصوص مراحل سے گزارنے کے بعد اس کے عقبی حصہ سے دو تابوت باہر نکالے گئے۔ ان میں سے ایک تابوت نواں کلی کے اس ہردلعزیز کرنل شیر کا تھا جبکہ دوسرے نامعلوم سپاہی کی شناخت ہونا ابھی باقی تھی۔ صف بندی کرکے کھڑے فوجیوں اور شہریوں کے پاس تابوت ایک ایمبولنس میں رکھ کر لائے گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے ایک دستے نے انہیں ایمبولنس سے اتارا اور سلو مارچ کرتے صفوں کے سامنے تابوت زمین پر رکھ دیئے۔

وہ لمحہ اشکوں اور فخر میں ڈوبا ہوا تھا۔ شہریوں کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبانے لگیں۔ ان کے دلوں میں ایک بار پھر یقین مستحکم ہوگیا تھا کہ جب تک دھرتی کے یہ سپوت اپنی وردی سے کیا گیا وعدہ وفا کرتے رہیں گے شہری اپنے گھروں میں سکھ چین اور آزادی سے زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ یونٹ ہی کے ایک خطیب نے نماز جنازہ پڑھا دینے کے بعد تابوت پاک فضائیہ کے خصوصی طیارے میں رکھ کر کور کمانڈر، گورنر اور فوجی دستوں کی جانب سے بھرپور سلامی دی گئی۔ اسلام آباد ائیر پورٹ پر ایک بار پھر نماز جنازہ کی ادائیگی کی گئی اور ایک ہیلی کاپٹر سے نواں کلی پہنچادیا گیا۔

اس روز وہاں ہزاروں افراد اپنے سپوت کو محبتوں اور عقیدتوں کا نذرانہ ادا کرنے کے لیے موجود تھے۔ ضلع صوابی میں اتنا بڑا مجمع اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس جنازے میں صوبہ سرحد کے گورنر، صوبائی وزراء اور وزیر اعلیٰ کے خصوصی معاون بھی شامل تھے۔ محبتوں کے پھول نچھاور کرتے ہوئے اس جواں العمر سپاہی کو سپرد خاک کردیا گیا۔

بے شک ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

☆......☆

شہر خموشاں میں روح وقلب پر رقت طاری کردینے والا سناٹا طاری تھا۔

خورشید خان اپنے بیٹے 'انور شیر' کے ساتھ کرنل شیر کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آیا تھا۔ انور شیر ابوظہبی کے شہر 'العین' میں کاروبار کرتا تھا اور ان دنوں آبائی گاؤں میں ہی موجود تھا۔

''چھوٹا ہم سب پر بازی لے گیا بابا جان!'' اس کی آنکھوں میں نمی نے چمک دکھائی۔

''نہ بیٹا نہ! شہیدوں کو روتے نہیں، ان پر فخر اور شکرانہ بجالاتے ہیں۔'' خورشید خان نے بڑے وقار سے کہا۔

''یہ تو خوشی اور حسرت کے آنسو ہیں بابا جان! ہم سب شمالی علاقوں سے واپسی پر اس کی شادی کے لیے تیاریاں کررہے تھے لیکن اس کی دلہن تو شہادت تھی۔''

''ہاں بیٹا! اس کے سر پر سہرا نہیں بلکہ نشان حیدر کا جھومر سجا تھا۔ میں گناہ گار، حقیر بندہ بھلا اس اعزاز کا حقدار تھا کہ ایک شہید اور نشان حیدر پانے والے بیٹے کا باپ کہلاسکتا۔'' اس کا لہجہ بھی گلوگیر ہوا۔

''شیرے کی شادی کے لیے جمع کی گئی رقم میں نے نواں کلی میں ایک اسکول کھولنے پر وقف کردی ہے۔ پروردگار ہماری آیندہ نسلوں کو بھی یہ سعادت نصیب فرمائے۔'' انور شیر نے کہا۔

''آمین...... ثم آمین......'' خورشید خان نے بڑے جذبے سے کہا۔

قبرستان سے باہر آتے ہوئے اس کی نہارتی نظریں بیٹے کی قبر کو دیکھتے ایک ہی بات کہہ رہی تھیں۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ماخذات

جنٹلمین بسم اللہ از کرنل (ر) اشفاق حسین
جنٹلمین استغفر اللہ از کرنل (ر) اشفاق حسین
اخبار و رسائل اور انٹرنیٹ کے مضامین

پہلا سیاسی لوٹا

عقیل عباس جعفری

سیاست کی بازی گری بھی عجیب ہے۔ عوام اس اُمید پر اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں کہ ترقی کی راہ کھلے گی، علاقے کی قسمت جاگے گی لیکن یہ بازی گرانِ سیاست ایوان میں پہنچتے ہی تمام وعدے بھلا کر اپنی جھولیاں بھرنے لگتے ہیں۔ ان کی تمام تر توجہ اپنے مفاد پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ عوام نے جس منشور پر یقین کرکے انہیں ووٹ دیا تھا وہ اسے پامال کرتے ہوئے ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں چھلانگ لگانے سے دریغ نہیں کرتے۔ کل تک جس پارٹی کو برا کہتے تھے اسی پارٹی کی گود میں جا بیٹھتے ہیں۔ اس طرح ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں چھلانگ لگانا نئی بات نہیں ہے۔ قیام پاکستان سے قبل بھی ایسا ہوا کرتا تھا اسی لیے تو لوٹا سیاست دان کا لقب ایجاد ہوا۔

معلومات حاصل کرنے والوں کے لیے ایک مختصر سی تحریر

گزشتہ دنوں پاکستان کے معروف سیاستدانوں نے وفاداریاں تبدیل کرنے کا ریکارڈ قائم کرنا شروع کیا تو سیاسی جماعتوں کے کارکنوں نے ان کے اعزاز میں لوٹا بردار جلوس نکالنا شروع کردیا۔ اس نوع کے متعدد مظاہرے ہوئے اور سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے اور قلابازیاں کھانے والوں کے لیے ''لوٹا'' کی اصطلاح عام ہوگئی۔ کئی اخبارات اور جرائد نے لوٹوں پر خصوصی مضامین شائع کیے۔ سیاسی مبصرین اور کالم نگاروں کے وارے نیارے ہوگئے، انہوں نے لوٹوں کی تاریخ کھنگالنی شروع کردی اور پھر سب ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کی تاریخ میں اس ''اعزاز'' کے پہلے سزاوار کا نام ڈاکٹر شیخ محمد عالم تھا جس کی عرفیت لوٹا اتنی مشہور ہوئی کہ آج بھی تاریخ میں انہیں ڈاکٹر عالم لوٹا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس وقت جب ہر گلی کوچے میں سیاسی بازیگروں کا کرتب شروع ہو چکا ہے۔ سیاست دان سے زیادہ ان کے حامی ''ایکٹو'' ہوگئے ہیں۔ ان سیاست دانوں کے حامی بھی بڑھ چڑھ کر بول رہے ہیں جن کا نمائندہ پہلے سے ''لوٹا'' مشہور ہے۔ ان کی معلومات میں اضافہ کے لیے بتاتا چلوں کہ ڈاکٹر عالم لوٹا کون تھے؟ انہیں لوٹا کا خطاب کب، کس نے اور ان کی کن اداؤں کی وجہ سے دیا گیا یہ معلوم کرنے کے لیے ہم نے تاریخ کے اوراق کھنگالنے شروع کیے تو ان حوالوں کے جوابات کے علاوہ ان کے بارے میں اور بھی بہت سی ''مفید'' معلومات حاصل ہوئیں۔

ڈاکٹر عالم لوٹا کا تعلق سرگودھا سے تھا، وہاں وہ 1887ء میں پیدا ہوئے۔ عبدالمجید مالک اپنی کتاب ''دو ڈاکٹر'' میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے کچھ دنوں لاہور گورنمنٹ کالج میں بھی تعلیم پائی ہے۔ لیکن بی اے آکسفرڈ سے کیا۔ بیرسٹری کی ڈگری لندن سے لی۔ چلتے چلتے ڈبلن سے ایل ایل ڈی ڈپلوما بھی لے آئے اور لاہور آکے مزے سے بیرسٹری کی پریکٹس شروع کردی۔ جنگ سے پہلے کا زمانہ تھا اور ڈاکٹر صاحب کی اٹھتی جوانی اور جوانی چنانچہ افتدائی اگرچہ ان کی پریکٹس دنوں میں ہی چمک گئی لیکن لاہور کی آب وہوا راس نہ آئی اور وہ جہلم اٹھ گئے اور پھر وہاں سے اپنے شہر سرگودھا آکر ڈیرے ڈال دیے۔ دنیا کے نزدیک سرگودھا کے ایک وکیل کی کیا حیثیت ہے؟ اس علاقے سے باہر کتنے لوگ اسے جانتے ہیں۔ سرگودھا میں وکالت ہی کرنا تھا تو بیرسٹری کیوں پاس کی؟ آکسفرڈ سے بی اے کی





ڈگری کیوں لی؟ ایل ایل ڈی کا ڈپلوما آخر کس کام آئے گا؟ مجبوری کی اور بات ہے لیکن یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اس گوشہ گمنامی میں ساری عمر گزار دی جائے، عمر گزارنا تو درکنار اس تصور سے خفقان ہونے لگتا ہے۔

ڈاکٹر عالم کے ذہن میں خلافت کانگریس، چرخہ، ستیا گرہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ مذہب سے انہیں چنداں شغف نہ تھا۔ مسلمانوں کی اجتماعی سرگرمیوں سے بھی وہ الگ تھلگ رہتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے گھر کا ماحول کسی حد تک مذہبی تھا لیکن آکسفورڈ اور لندن کے قیام نے اس برائے نام سی مذہبیت کو بھی بالکل دبا دیا تھا۔ بایں ہمہ خلافت کا مسئلہ اور چیز تھا اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس دور میں جب کہ خلافت کانفرنس اور کانگریس کی تحریکوں کی باگ ڈور مشہور وکیلوں اور قانون دانوں کے ہاتھوں میں ہے ان کا ان تحریکوں سے علیحدہ رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔

ایک دن ڈاکٹر عالم بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ دفعتاً انہیں خیال آیا کہ لوگ بڑے بڑے عہدے چھوڑ کے کانگریس اور خلافت کی تحریکوں میں شامل ہو رہے ہیں، میں بھی کیوں نہ پریکٹس ترک کردوں۔ انہوں نے اسی وقت مولانا محمد علی کو خط لکھا چند دن کے بعد جواب آیا کہ سیدھے علی گڑھ چلے آؤ۔

سرگودھا کے اسٹیشن پر دوست احباب کے علاوہ بہت سے کانگریسی اور خلافتی کارکن انہیں چھوڑنے آئے۔ ڈاکٹر صاحب شدھ کھدر کا لباس پہنے ہوئے تھے گلے میں پھولوں کے ہار تھے جن کے بوجھ سے ان کی گردن خم ہوئی جارہی تھی۔ انجن نے سیٹی دی اور وہ گاڑی میں جا بیٹھے۔ اسٹیشن بندے ماترم، اللہ اکبر اور زندہ باد کی صداؤں سے گونج اٹھا۔

علی گڑھ میں مولانا محمد علی اور دوسرے لیڈر جامعہ ملیہ کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کر رہے تھے۔ اس نئی یونیورسٹی کے پاس نہ روپیا تھا نہ اپنی عمارت، صرف اللہ کا نام تھا۔ پہلے خیموں میں تعلیم دی جاتی رہی پھر گھاس پھوس کے چند جھونپڑے تعمیر کرلیے گئے۔ مسلم یونیورسٹی کے بہت سے طلبہ جو ترک موالات کی تحریک سے متاثر تھے۔ ادھر سے ٹوٹ کے جامعہ ملیہ میں شامل ہوگئے تھے۔ باہر کے طلبہ بھی برابر چلے آرہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو اگرچہ ملک میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں تھی لیکن ان کے پاس ولایت کی ڈگریاں تو تھیں۔ پھر ان کی قربانی سے سب متاثر تھے کیونکہ وہ اچھی خاصی پریکٹس چھوڑ کر آئے تھے اس لیے جب وہ علی گڑھ پہنچے تو انہیں نائب شیخ الجامعہ مقرر کردیا گیا۔

ڈاکٹر عالم جب تک خلافت کی تحریک میں شامل نہیں ہوئے تھے ولایتی سوٹ پہنتے تھے داڑھی روز اس طرح گھٹتی تھی کہ کھونٹی تک باقی نہیں چھوڑتے تھے لیکن جامعہ پہنچتے ہی ان کی وضع قطع بدل گئی، کھدر کا پاجامہ اور اس پر کھدر کی ایک عبا، سر پر کھدر کی ایک سرخ ٹوپی جس پر چاند تارا کڑھا ہوا۔ انہیں اگر یہ یقین ہوتا کہ وہ مستقل طور پر جامعہ کے پرنسپل رہیں گے تو وہ شاید وہیں پڑے رہتے لیکن اس کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ جامعہ کی پرنسپلی کے لیے جس قسم کی قابلیت اور استعداد کی ضرورت تھی وہ ان میں سرے سے نہیں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے پاس بہت سی ڈگریاں بھی تھیں، شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ تقریریں بھی کرلیتے تھے۔ قانون اچھی طرح جانتے تھے خصوصاً بین الاقوامی قانون میں سند الوقت سمجھے جاتے تھے۔ لیکن ادبیات سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ درس و تدریس کے نئے طریقوں کے متعلق بھی ان کا علم بہت محدود تھا، نظم و نسق کی صلاحیت بھی بہت کم تھی اور جامعہ کے انداز کی درس گاہ چلانے کے لیے سب سے زیادہ اسی قسم

ڈاکٹر شیخ محمد عالم وفات پا گئے

سرحد مسلم لیگ کی تحریک تین شباب پر عظیم الشان جلوس جلسے مظاہرے۔ عدالتوں پر پکٹنگ اور گرفتاریاں

ناگپور، پٹیرو اور کلکتہ کے رنگا جگر نہیں کو ایک کروڑ روپے تک ٹیکس لگا

اسلام صرف نماز روزہ ہی نہیں بلکہ سترا یا اصول زندگی ہے

بنگال اسمبلی میں ریلیف منسٹر کا اعلان

لاہور کے مشہور بیرسٹر ڈاکٹر محمد عالم کا انتقال پر ملال

پاکستان خالص اسلامی نظام پر قائم کیا جائے

لارڈ ویول سے کی وزرائے کابینہ سے گفت گو

تقسیم ہند کے مسئلہ پر بحث و تمحیص

بمبئی کے مسلم لیگی اکابر کی وزیر اعظم سندھ سے ملاقات

گورنمنٹ کے متعدد رکارا اور لیگ کا بس گزر

کی چیزوں کی ضرورت تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کام میں کوئی خاص مالی نفع بھی نہیں تھا اس لیے تھوڑے عرصہ میں ہی ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان سے یہ کھکھیڑیں نہیں اٹھ سکیں گی چنانچہ وہ جامعہ سے مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے اور یہاں آتے ہی پریکٹس شروع کر دی۔"

عبدالمجید نے ڈاکٹر عالم کے لفظی تصویر کشی کر دی پھر بھی ان کے بارے میں مزید جاننے کی جستجو کم نہ ہوئی۔ یہاں تک یعنی لاہور واپسی کا ذکر تو انہوں نے کر دیا اب آگے احوال سنیں۔

ڈاکٹر عالم سیاست کے افق پر طلوع تو ہو ہی چکے تھے اب انہوں نے اسمبلی کی رکنیت کے لیے ڈول ڈالنا شروع کیا۔ 1926ء میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے تو وہ خاکسار پارٹی کی طرف سے پنجاب بار کونسل کی رکنیت کے امیدوار ہوئے۔ انہوں نے مغربی پنجاب میں راولپنڈی کے حلقہ سے انتخاب لڑا اور خان بہادر شیخ عبدالقادر کو شکست دے کر اسمبلی تک رسائی حاصل کر لی۔

اس کامیابی سے ڈاکٹر عالم کے حوصلے مزید بلند ہوئے۔ اب انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ دسمبر 1928ء میں جب مسلم لیگ کے اجلاس دہلی اور کلکتہ دونوں جگہ بیک وقت منعقد ہوئے تو وہ کلکتہ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر مسلم لیگ، شفیع لیگ اور جناح لیگ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ڈاکٹر عالم لیگ کے اس حصے میں شامل تھے جو جناح لیگ کہلانے لگی تھی مگر جلد ہی ڈاکٹر عالم نے قائد اعظم سے بھی اختلاف کی راہ ڈھونڈھ نکالی۔ مارچ 1949ء میں قائد اعظم نے نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں طلب کیا۔ نور احمد اپنی کتاب مارشل لاء سے مارشل لاء تک میں لکھتے ہیں:

"حالات پر غور کرنے کے بعد مسٹر جناح نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے درمیان اختلافات ختم کرنا اور مسلم لیگ کو پھر مسلم اتحاد کی ترجمان بنانا ضروری ہے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر انہوں نے لیگ کا ملتوی شدہ اجلاس مارچ 1949ء کے آخر میں دہلی میں بلایا اور لیگ کے اجلاس سے پہلے ان لیڈروں کے ساتھ جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد کی حمایت میں پیش پیش تھے گفت وشنید کی۔ اس گفت وشنید میں یہ فیصلہ ہو گیا (۱) کہ وہ صاحبان جنہوں نے لیگ سے علیحدہ ہو کر اپنے آپ کو سر محمد شفیع کے زیر صدارت ایک متوازی لیگ کی صورت میں منظم کر لیا تھا اس علیحدہ تنظیم کو ختم کر دیں اور (۲) متحدہ مسلم لیگ ان تمام مطالبات کو اپنا لے جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد میں شامل کیے گئے تھے۔

اس گفتگو میں جو حکیم اجمل خاں کے مکان پر ہو رہی تھی کچھ دیر لگ گئی۔ ادھر مسلم لیگ کا کھلا اجلاس شروع ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ لیگ کے پنڈال میں لوگ جمع ہو چکے تھے اور کرسی صدارت مسٹر جناح کی منتظر تھی۔ کچھ نیم مسلم لیگ، نیم کانگریسی حضرات لیگ کے پنڈال میں یہ منصوبہ بنا کر آئے تھے کہ جلسے پر قبضہ کر کے اس سے نہرو

پورٹ کے حق میں قرارداد پاس کرالیں۔ مسٹر جناح کی یف آوری میں دیر ہوئی تو ان لوگوں نے آپس میں کانا پھوسی کی اور ایک شخص نے تجویز پیش کر دی کہ صدر جلسہ کی مد تک ڈاکٹر محمد عالم کرسی صدارت سنبھال لیں اور کارروائی وع کرا دیں یہ تجویز پیش ہوئی تو ایک طرف اس کی رسمی ائید ہوئی اور دوسری طرف پنڈال میں "نہیں نہیں، ہرگز ہیں" کا شور بلند ہوا۔ اسی شور میں ڈاکٹر عالم نے کرسی صدارت پر قبضہ جما لیا اور کرسی پر بیٹھتے ہی غازی عبدالرحمٰن کو تقریر کی اجازت دے دی۔ غازی صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اسٹیج کی طرف بڑھے لیکن اور لوگ بھی اسٹیج کی جانب بڑھ رہے تھے۔ غازی عبدالرحمٰن صاحب نے ایک منٹ کے اندر اپنی قرارداد پیش کر دی جس کا مطلب تھا کہ یہ جلسہ نہرو رپورٹ میں پیش کردہ اصولوں کی تائید کرتا ہے۔

اسٹیج پر اور اس کے گرد لوگوں کا ہجوم ہو گیا جو شور مچا رہا تھا پنڈال میں دھکم پیل ہو رہی تھی، کرسیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ تصدق احمد خاں شیروانی صرف اتنا کہہ سکے کہ میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں، کچھ لوگوں نے دھکے مار کر انہیں اسٹیج سے نیچے گرا دیا۔ کچھ لوگوں نے ڈاکٹر عالم کو پکڑ کر کرسی سے اٹھا لیا اور پنڈال سے باہر نکالنا چاہا جب انہیں "پا بہ دست ے، دست بہ دست دگرے" پنڈال سے باہر کشاں کشاں لے جایا جا رہا تھا تو وہ بلند آواز سے پکار رہے تھے قرارداد منظور ہو چکی ہے میں جلسے کو برخواست کرتا ہوں"۔

اتنے میں مسٹر جناح کی کار آئی راجا غضنفر علی خاں اور دوسرے لوگوں نے جو ان کے انتظار میں باہر کھڑے تھے آگے بڑھ کر ان سے کہا آپ ابھی اندر نہ جائیں پنڈال میں جوتے پاپے اور مکے چل رہے ہیں۔ مسٹر جناح نے پروانہ کی اور پنڈال کے اندر چلے گئے۔ انہیں دیکھتے ہی مسٹر جناح زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا اور پنڈال میں سکون ہو گیا۔ ان کے ساتھ ڈائس پر پہنچے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے ایک مختصر تقریر کی اور اگلے دن کے لیے ملتوی کر دیا۔"

مسلم لیگ میں ڈاکٹر عالم کو منہ کی کھانی پڑی تو جولائی میں انہوں نے آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی دی۔

پارٹی کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری منتخب پارٹی کے بانیوں میں ڈاکٹر عالم کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، چودھری خلیق الزماں اور تصدق احمد خاں شیروانی جیسے اکابر شامل تھے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد ڈاکٹر عالم کی تلون مزاجی نے ایک کروٹ لی۔ اب وہ کانگریس کی صفوں میں نظر آنے لگے۔ مارچ 1931ء میں جب کانگریس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو مہاتما گاندھی نے خواہش ظاہر کی کہ پنجاب کے کسی مسلمان کو کانگریس کی مجلس عاملہ میں شامل کیا جائے۔

انہوں نے ابوالکلام آزاد سے درخواست کی کہ کسی موزوں آدمی کی سفارش کیجیے۔ مولانا نے مولوی عبدالقادر قصوری سے ذکر کیا اور مولوی عبدالقادر نے جھٹ اپنے دوست ڈاکٹر محمد عالم کا نام تجویز کر دیا۔ یوں ڈاکٹر عالم کانگریس کی مجلس عاملہ میں شامل کر دیے گئے۔

جواہر لال نہرو اپنی خودنوشت "میری کہانی" میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر عالم کی نامزدگی سے پنجاب میں کانگریس کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ وہ رہنما جنہوں نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر مجلس احرار بنائی تھی زیادہ تر نچلے، درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عام مسلمانوں پر بڑا اثر تھا۔

مگر ڈاکٹر عالم کو یہ عزت بھی راس نہ آئی۔ کچھ ہی دنوں بعد مولانا ظفر علی خاں نے مجلس اتحاد ملت کی تنظیم نو کی تو انہوں نے ڈاکٹر عالم کو اس جماعت میں شمولیت کی دعوت دی اور ڈاکٹر عالم بغیر کچھ سوچے سمجھے فوراً اس جماعت میں بھی نہ صرف شامل ہو گئے بلکہ مجلس عاملہ کے رکن بھی بن گئے۔ 1936ء میں لاہور میں مسجد شہید گنج کا غلغلہ بلند ہوا تو ڈاکٹر عالم کو ایک مرتبہ پھر منظر عام پر آنے کا موقع مل گیا۔

شام کو موچی دروازہ کے باغ میں جلسہ تھا، ڈاکٹر عالم بھی پہنچے اور اس زناٹے کی تقریر کی کہ ڈاکٹر عالم زندہ باد کے نعروں سے سارا موچی دروازہ گونج اٹھا۔ چونکہ مسلمانوں کے اجتماع میں اس قسم کا نعرہ مدت سے نہیں لگایا گیا تھا اس لیے لوگ راستہ چلتے چلتے ٹھٹک گئے۔ اکثر لوگ حیران ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے یہ کون ڈاکٹر عالم تقریر کر رہے ہیں؟

اب تک تو خیر آئینی جدوجہد کے ذکر و اذکار تھے۔ سب یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ بڑے زناٹے کا مقدمہ چلے گا اور نہیں برس چھ مہینے میں فیصلہ ہوگا۔ ڈاکٹر عالم بار بار کہتے تھے کہ مسلمانوں کے مطالبہ میں بڑا وزن ہے۔ خدا نے چاہا

تو ہم مقدمہ جیتیں گے اور برسرِ عدالت مسجد لے کے رہیں گے۔ ایک دن دفعتاً خبر ملی کہ رات کو مسجد گرا دی گئی۔ جس نے سنا سن ہو کے رہ گیا۔ اب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی جو لوگ اس تحریک میں پیش پیش نظر آتے تھے انہیں گرفتار کر کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا گیا۔ ڈاکٹر عالم اس موقع پر بھی صاف بچ گئے یعنی مسجد کے انہدام سے ایک دن پہلے وہ اپنی کوٹھی میں پڑے تھے اور بخار سے سارا جسم پھنک رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا بخار اس وقت اترا جب ہر طرف امن و امان ہو گیا۔ پیر جماعت علی شاہ امیر ملت بن کے لاہور آئے اور شاہی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں مسجد کے گنبد یا مینار پر چڑھ جاؤں تو پولیس مجھے کیسے پکڑے گی؟ بعض لوگوں نے کہا کیا نکتہ ارشاد فرمایا ہے۔ بعض لوگ کہنے لگے یہ عالم اسرار کی باتیں ہیں انہیں اہل تصوف ہی سمجھ سکتے ہیں اگرچہ حضرت امیر ملت کے عقیدت مند ہزاروں تھے لیکن بحمد اللہ کہ ڈاکٹر عالم ان کی عقیدت کے معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔

پیر جماعت علی شاہ حج کو سدھارے اور واپس آ کے گوشہ نشین ہو گئے۔ مسٹر محمد علی جناحؒ آئے نظر بندوں اور قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ مجلس اتحاد ملت قائم ہوئی۔ مولانا ظفر علی خاں نے نیلی پوش تحریک شروع کی اور عالم تو عالم ملک لال خاں تک نیلا کرتہ پہن کے نیلی خاں بن گئے۔ ساتھ ہی شہید گنج کا مقدمہ شروع ہوا۔ اگرچہ بہت سے دوسرے وکلا بھی اس مقدمہ کو ناموری کا ذریعہ بنانے کے لیے بے تاب تھے لیکن ڈاکٹر صاحب نے کسی کو پاس نہ پھٹکنے دیا اور تو اور ملک برکت علی بھی اس قضیہ میں پھسڈی رہ گئے۔ غرض شہید گنج کی تحریک میں ڈاکٹر صاحب کا نام مولانا ظفر علی خاں کے نام کے ساتھ لیا جاتا تھا اور اتحاد ملت کے جلسوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس برات کے دولہا وہی ہیں۔

ادھر مسٹر سیل کی عدالت میں شہید گنج کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی ادھر ”انقلاب زندہ“ کے ساتھ ساتھ ”انتخاب زندہ باد“ کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ڈاکٹر عالم کے دعوے تو بڑے بڑے تھے لیکن عدالت میں مقدمہ ہارے اور بہت بری طرح ہارے۔ دوپہر کو فیصلہ سنایا گیا، سہ پہر کو مولانا ظفر علی خاں کے ہاں مختصر سا اجتماع ہوا جس میں چودھری افضل بھی موجود تھے۔

مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ کچھ جوشیلے نوجوان کہہ رہے تھے کہ آج سے سول نافرمانی شروع کر دی جائے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی کچھ تذبذب سے معلوم ہوتے تھے۔ لوگوں نے ڈاکٹر عالم کی رائے دریافت کی تو وہ کہنے لگے کہ ہائی کورٹ میں اپیل ہونی چاہیے۔ کسی نے پوچھا اور اگر ہم اپیل میں ہار گئے پھر کیا کریں گے۔ ڈاکٹر عالم صاحب کہنے لگے اسمبلی میں پہنچ کے مسجد کی واگزاری کا قانون بنوائیں گے۔ ایک صاحب نے پوچھا کیوں ڈاکٹر صاحب آپ میں اتنی ہمت ہے کہ اسمبلی میں جا کے قانون بنوائیں؟

ڈاکٹر صاحب کے منہ میں سگریٹ تھا۔ دیا سلائی تلاش کر رہے تھے۔ میں نے بڑھ کے دیا سلائی پیش کی، ڈاکٹر صاحب نے سگریٹ سلگایا اور کہنے لگے جب تک میں کانگریس کے ساتھ تھا آپ مجھے کافر کہتے تھے اب میں مسلمان ہو گیا ہوں جب بھی آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آتا۔

یقین عشق کن واز سرگماں برخیز

شام کو شاہی مسجد میں جلسہ ہوا ڈاکٹر صاحب نے بڑے معرکے کی تقریر کی۔ یہاں بھی وہی اسمبلی کی ممبری ٹیپ کا بند تھی یعنی ڈاکٹر صاحب بار بار کہہ رہے تھے کہ آپ میرے ساتھ تقریباً بیس آدمی اسمبلی میں بھجوا دیجیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے اگرچہ اسی دن مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا تھا اور دلوں پر ناکامی کا داغ تازہ تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کی باتوں سے ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں، سب بھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے چلا اٹھے، ڈاکٹر عالم زندہ باد۔

ڈاکٹر عالم پہلے بھی دو مرتبہ راولپنڈی کے شہری حلقے سے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اس دفعہ کے انتخابات میں بھی انہوں نے یہی حلقہ پسند فرمایا۔ سید حبیب ان کے مدمقابل تھے اگرچہ دونوں اتحاد ملت میں شامل تھے اور مسجد کی واگزاری کے لیے پہلو بہ پہلو کام کرتے چلے آئے تھے لیکن انتخابی جدوجہد شروع ہوئی تو ساری مجلس اتحاد ملت ڈاکٹر عالم کی پشت پر تھی اور سید حبیب ”یوسف بے کارواں“ بنے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اسمبلی میں پہنچے تو ان کے حامیوں کو فکر ہوئی کہ کسی طرح انہیں وزارت مل جائے۔ غالباً سر سکندر حیات خاں سے اشاریوں کنایوں میں یہ ذکر بھی کیا گیا مگر انہوں نے بات ہنسی میں ٹال دی ”اتحاد ملت والے اس خیال میں مگن تھے کہ اسمبلی میں کم از کم ہمارا ایک ممبر موجود ہے۔ اتنے میں خبر آئی کہ ڈاکٹر عالم کانگریس پارٹی میں شامل ہو گئے اور یہ لوگ گھبرا کے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب سے جواب طلبی ہوئی۔ وہ الفاظ کی گیندوں کو اچھالتے ہوئے بولے ”کانگریس میں ضرور شامل ہوا ہوں لیکن میرا انتخاب شہید گنج کے ٹکٹ پر ہوا ہے اب کانگریس مجھے اپنا ممبر بناتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کانگریس اس ٹکٹ کو تسلیم کرتی ہے جس ٹکٹ پر میں نے نشست حاصل کی ہے“ گویا کانگریس نے اصولاً شہید گنج کی بازیابی کا اصول مان لیا ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ ان شاء اللہ مسلمانوں کے مؤقف کی حمایت کرے گی۔

مسلم لیگ کے پٹنہ اجلاس میں سردار سکندر حیات شہید گنج پر مسلمانوں کا حق تسلیم کر چکے ہیں اب اسمبلی میں قرارداد پیش کرنا ان کی پارٹی کا فرض ہے۔ اکثریت ان کی وزارت کی حامی ہے۔

ڈاکٹر عالم ابھی تک مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ قائداعظم نے ان سے کہا ”عالم! اسمبلی میں لیگ کی باقاعدہ پارلیمانی پارٹی بن چکی ہے۔ اس میں شامل ہو جاؤ اب تو تم قراردادِ پاکستان کی حمایت بھی کر چکے ہو۔“

ڈاکٹر صاحب نے جواباً عرض کی ”سوچ کر جواب دیا جا سکتا ہے۔“

قائداعظم نے چمک کر فرمایا ”عالم! کسی پارٹی میں آنے جانے کے لیے کیا تمہیں بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔“

شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس شدید ملامت سے گھبرا گئے اور اپنا سا منہ لے کر لوٹ آئے اور اس کے بعد ان کی مسلم لیگ میں شمولیت کی ہمت نہ پڑی۔

1945ء کے انتخابات میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر خاکسار پارٹی کے ٹکٹ پر راولپنڈی کے حلقہ سے انتخاب لڑنے کی ٹھانی مگر اب حالات یکسر بدل چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ روز روز پارٹیاں بدلنا راس نہ آیا اور ان کا نام ڈاکٹر لوٹا پڑ گیا۔

شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ اس پھبتی کے خالق عطاء اللہ میر کاشمیری تھے وہ ”زمیندار“ میں ملازم تھے اور صوبائی محکمہ اطلاعات کی معرفت لاہور ریڈیو کے لیے پنجابی پروگرام بھی تیار کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی بات پر برافروختہ ہو کر انہیں ریڈیو سے نکلوا دیا۔ عطاء نے زمیندار میں فوراً ڈاکٹر صاحب کے خلاف مضمون لکھا جس کا نام تھا ”ڈاکٹر لوٹا“ اور یوں ڈاکٹر لوٹا ”آناً فاناً“ زبان زدِ عام ہو گیا۔ ڈاکٹر عالم جہاں جاتے ان کا استقبال لوٹوں سے کیا جاتا حتیٰ کہ پولنگ اسٹیشنوں پر بھی لوگوں نے لوٹے سجا دیے۔ لاہور میں مزنگ روڈ پر ڈاکٹر صاحب نے نئی کوٹھی بنائی، یار لوگوں

شذرات

ڈاکٹر شیخ محمد عالم کا انتقال

[illegible]

نے اس پر بھی لوٹوں کو جھنڈیوں کی طرح سجا دیا۔

1945ء کے انتخابات میں ڈاکٹر صاحب کو مسلم لیگی امیدوار سر فیروز خاں نے شکست سے ہمکنار کیا۔

ڈاکٹر عالم کی رسوائی بھی ہوئی اور شکست بھی، وہ اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے اور تھوڑے ہی دنوں بعد 9 مئی 1947ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

فلم نگری

باپ بیٹا پوتا

انور فرہاد

پاکستان کی فلمی دنیا کئی معنوں میں بہت اہم ہے۔ اس چھوٹی سی دنیا میں ہنرمندوں کی بہتات رہی ہے، وسائل کی کمی کبھی ان کے آڑے نہیں آئی۔ وہ قلیل سرمایہ سے بھی اعلیٰ درجے کی، بے مثال وشہکار تخلیق کرتے رہے۔ اتنے تھوڑے سے وقت میں بھی وہ کمال دکھائے کہ دیگر ممالک بھی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔

فلمی دنیا کی تین اہم شخصیات کا تذکرہ

اللہ کی شان کہ بادشاہ کی اولاد بادشاہ اور فقیر کی اولاد فقیر ہوتی ہے، بچوں کی باپ کے نقش قدم پر چلنے کی یہ ریت بہت پرانی ہے جواب تک جاری وساری ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر کا بیٹا یا بیٹی ڈاکٹر ہوتے ہیں اور وکیل کا بیٹا وکیل مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس رجحان میں کمی آنے لگی ہے۔ بہت سے بچے بڑے ہوکر باپ کا پیشہ اختیار نہیں کرتے۔ کسان کا بیٹا بھی اپنی کوششوں اور صلاحیتوں سے ملک کا صدر بن جاتا ہے۔ خروشیف کی طرح اور بھی کئی مثالیں ہیں جب کہ بہت سے بااثر اور بڑے لوگوں کی اولاد اپنی نالائقی کی وجہ سے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ بقول الطاف حسین حالی

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے
بری ان کی حالت بری ان کی لت ہے

باپ کے نقش قدم پر چلنے والے کبھی کامیاب ہوتے ہیں کبھی ناکام۔ اس حوالے سے اگر جائزہ لیں تو جواہر لعل نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی کامیاب رہیں مگر ان کا بیٹا راجیو گاندھی وہ کامیابی حاصل نہ کرسکا جو اس کی ماں کو حاصل ہوئی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے نقش قدم پر چل کر ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو کامیاب سیاستداں ثابت ہوئیں اور اب ان کا بیٹا بلاول بھٹو زرداری، سیاست کے میدان میں اتر چکا ہے۔ اگر شوبز کے حوالے سے پیڑی در پیڑی کا جائزہ لیا جائے تو سب سے زیادہ کامیاب راجکپور کا خاندان نظر آتا ہے۔ ان کی طرح ان کے بیٹے بھی اداکاری کے میدان میں کامیاب ہوئے اور ان کے بیٹے بیٹیاں آج بھی ہالی ووڈ پر راج کررہے ہیں۔ اسی طرح دھرمیندر کے بعد ان کے بیٹے کامیاب اداکار بنے۔ دوسرے شعبوں سے وابستہ افراد کی بھی کچھ کامیاب مثالیں ہیں۔

ہمارے ہاں اداکاروں اور اداکاراؤں کی اولادوں نے قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کی۔ کئی اداکاروں نے اپنے بیٹوں کو اداکار بنایا مگر وہ باپ کی طرح کامیاب نہ ہوسکے البتہ اے ایس ڈار کے بیٹے اسلم ڈار نے باپ کی طرح ہدایت کاری کے میدان میں کامیابی حاصل کی، اس طرح ایس ایم یوسف کے بیٹے اقبال یوسف نے ہدایت کاری میں باپ کی روایت قائم رکھی جب کہ لقمان جیسے ہدایت کار اور شاہد جیسے کامیاب اداکار کے بیٹوں نے شوبز کی بجائے ٹی وی اینکر کی حیثیت سے ناموری حاصل کی۔ مبشر لقمان اور کامران شاہد نے ثابت کردیا کہ وہ باپ کا پیشہ اختیار نہ کرنے کے باوجود کامیاب زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

پشت در پشت کی مثال ہمارے ہاں موسیقاروں میں





نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے موسیقار رشید عطرے کی ... عام پر نظر آئی۔ ان کے فرزند ارجمند وجاہت عطرے ... باپ کی طرح موسیقی کی فیلڈ میں کامیابی حاصل کی۔ ... نے پنجابی فلموں کی موسیقی ترتیب دینے میں اپنی جگہ بنائی جب کہ قومی زبان کی سب سے زیادہ ... کی موسیقی مرتب کرنے والے ایم اشرف کے ... ادے ایم ارشد بھی مقبول میوزک ڈائریکٹرز کی صف ... شامل ہوئے۔ میوزک ورلڈ میں سیکنڈ جنریشن کی مثال ... نا شاد کی صورت میں بھی سامنے آئی اور پھر ان کی اولاد ... واجد ناشاد نے بھی اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ اس طرح ... کے بعد واجد ناشاد اور واجد ناشاد کے بعد ان کی اولاد ... ناشاد نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔

نغمہ نگار تسلیم فاضلی کے متعلق لکھتے ہوئے جب ... ناشاد کا نام آیا تو ان کی سرپرستی اور رہنمائی کی صورت ... کمسن شاعر نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ... ان ناشاد صاحب کے بارے میں بھی اپنی معلومات ... نے کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں جو بیش بہا معلومات ... ہوئیں اس میں آپ کو بھی شریک کرنے کو جی چاہا۔ لہٰذا ... کے بیٹے واجد ناشاد اور واجد کے بیٹے نوید واجد کے بارے میں چشم کشا تحریر پیش خدمت ہے۔

ناشاد

موسیقار ناشاد کا تعلق دہلی سے تھا۔ ان کا اصل نام شوکت علی تھا۔ وہ بنیادی طور پر بانسری نواز تھے۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے وہ دہلی سے بمبئی گئے جہاں انہوں نے موسیقار اعظم نوشاد اور ماسٹر غلام حیدر کے ساتھ خصوصی طور پر کام کیا اور مختلف سازوں کی کمپوزیشن میں مہارت حاصل کی۔ چنانچہ فن موسیقی میں ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر ہدایت کار شیوراج نے اپنی فلم ''دلدار'' کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں۔ یہ ایک نیم ایکشن فلم تھی جس میں سکندر، دیپک، رادھا، یشونت، ڈیوڈ پٹیل وغیرہ نے اداکاری کی۔ فلم ''دلدار'' 1947ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے کریڈٹ میں موسیقار کے طور پر ان کا نام شوکت دہلوی درج کیا گیا تھا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی ابتدائی فلموں میں شوکت دہلوی اور شوکت علی کے نام سے موسیقی دی۔

''دلدار'' کے بعد ناشاد نے 1948ء میں پائل، مجھے جینے دو، ٹوٹے تارے میں بطور موسیقار اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جس کا یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ''دلدار'' میں موسیقار کی حیثیت سے شوکت دہلوی کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگلے سال یعنی 1949ء میں آئینے اور دادا میں بھی شوکت دہلوی سے موسیقی کمپوز کروائی گئی۔

کبھی کبھی بہت سی باتیں توقعات کے برخلاف ہوتی ہیں۔ ایسی ہی باتوں میں ایک بات یہ تھی کہ یہ فلمیں تماشائیوں میں پسندیدگی حاصل نہ کرسکیں اور ان کے کامیاب نہ ہونے کا نمایاں نقصان نئے موسیقار کی ساکھ پر بھی پڑا۔ ان کی شہرت آگے بڑھنے کی بجائے ریورس گیئر پر چلنے لگی۔ وہ فلم انڈسٹری سے آؤٹ ہونے کے قریب تھے کہ ان کو نامور فلم ساز وہدایت کار اور نغمہ نگار نخشب جارچوی نے نام بدلنے کا مشورہ دیا۔

''یارا میرا تو خیال ہے یہ سارا فساد تمہارے نام کا ہے۔''

''کون سا فساد؟''

''تم بلاشبہ ایک باصلاحیت کمپوزر ہو۔ اس کے باوجود تمہاری فلمیں کامیاب نہیں ہورہی ہیں اور ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے، کے مصداق اپنے ساتھ تمہارے کیریئر کو بھی نقصان پہنچارہی ہیں۔ یہ فساد نہیں تو اور کیا ہے؟''

''مگر...... نخشب صاحب! اس میں میرے نام کا کیا قصور ہے؟''

''نام کا قصور ہے۔ نام کا اثر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی نام راس نہیں آتے۔''

''مگر میں نے تو سنا ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے؟''

''سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔'' نخشب نے کہا۔ پھر بولے۔ ''اگر تم اپنا نام بدلنے پر تیار ہو جاؤ تو میں تمہیں اپنی اگلی فلم میں موسیقار لینے کو تیار ہوں۔''

شوکت دہلوی نے شوکت علی سے دل ہی دل میں پوچھا۔ ''کیوں بھئی! تمہارا کیا خیال ہے؟''

''سوچنے کا موقع نہیں، فوراً ہاں کردو۔ یہ ڈوبتے کو تنکے کا نہیں پورے لائف بوٹ کا سہارا ہے۔''

''کیا سوچنے لگے؟'' نخشب نے ٹوکا۔

''سوچنا کیا ہے نخشب صاحب! آپ تجربہ کار ہیں۔ جہاں دیدہ ہیں اگر میرے موجودہ نام کو فساد کی جڑ تصور کرتے ہیں تو ماریں گولی اس نام کو۔''

''گڈ!'' کہہ کر نخشب نے زور سے ہاتھ میز پر مارا۔ ''یہ ہوئی نا بات!'' ذرا رک کے پھر گویا ہوئے۔ ''میری اگلی فلم کا نام نغمہ ہے۔ تمہارا نیا نام بھی نون سے ہی شروع ہونا چاہیے اور میرے خیال میں ناشاد سے بہتر کوئی نام نہیں ہوسکتا کیونکہ ان دنوں تم شاد نہیں، ناشاد ہو۔''

شوکت علی یا شوکت دہلوی نے اس نام پر غور نہیں کیا۔ انہیں تو بس اس بات کی خوشی تھی کہ انہیں اس شخص (نخشب) نے ایک موقع دیا ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ شوکت علی نہ سہی، شوکت دہلوی نہ سہی، ناشاد سہی۔

لیکن اس نام بدلنے کے پیچھے بھی ایک کہانی تھی۔ ایک راز تھا جس کا انکشاف بہت بعد میں ہوا۔

نخشب صاحب موسیقار نوشاد سے اپنی فلموں کی موسیقی ترتیب دلوایا کرتے تھے۔ نوشاد صاحب اچھے موسیقار ہی نہیں بہت اچھے انسان بھی تھے۔ دھیمی طبیعت کے آدمی تھے۔ ان کے کچھ اصول تھے جن کے خلاف وہ کام نہیں کرتے تھے۔ نخشب صاحب کا کسی بات پر ان سے اختلاف ہوگیا۔ نخشب تیز و تند مزاج کے آدمی تھے زود رنج تھے، ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے تھے۔ اختلاف رائے کا ہونا برا نہیں ہوتا مگر اس پر الجھنا اور لڑ پڑنا برا ہوتا ہے۔ نوشاد صاحب سے ناراضی کے بعد غالباً انہوں نے ان سے کسی طرح کا انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا اور پھر شوکت دہلوی کو نوشاد سے ملتا جلتا نام ناشاد دے کر فلم انڈسٹری میں پیش کردیا۔ اس بات کا اندازہ فلم انڈسٹری کے لوگوں کو اس وقت ہوا جب نخشب صاحب کی نئی فلم ''نغمہ'' نمائش پذیر ہوئی۔ اس کے کریڈٹ میں جب اسکرین پر موسیقار کے نام کی باری آئی تو وہ کچھ اس طرح تحریر کروایا گیا تھا۔

NAUSHAD
NOT
NASHAD

اگرچہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ محض نوشاد صاحب سے پنگا لینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس سے نوشاد صاحب کی صحت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔ انہوں نے کبھی اس کا اظہار بھی نہیں کیا۔

نغمہ کی تکمیل کے دوران ناشاد صاحب کو بھی پتا نہیں تھا کہ ان کا نیا نام ناشاد کیوں رکھا گیا ہے۔ انہوں نے تو بس یہ سمجھا کہ ناشاد اس لیے رکھا گیا ہے کہ میں ناخوش تھا۔ کامیابی کی خوشیاں نصیب نہیں تھیں۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ نوشاد صاحب کو جلانے کے مقصد سے انہیں ناشاد بنا کر پیش کیا جارہا ہے تو وہ ہرگز یہ نام اختیار نہ کرتے۔ نوشاد صاحب تو ان کے استاد تھے۔ ان کی سرپرستی میں انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ بھلا ان کی شان میں کسی طرح کی بھی گستاخی کرتے؟

ناشاد صاحب سیدھے سادے آدمی تھے۔ انہیں تنکا لیا ڈوبتے وقت جو فلم ملی، اس کی موسیقی ترتیب دینے میں بہت زیادہ محنت کی۔ بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔ نیک نیتی سے کی ہوئی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی رب کریم اس کا انعام ضرور دیتے ہیں۔ ان کی یہ فلم ''نغمہ'' ریلیز ہوئی اور کامیاب ثابت ہوئی۔ تماشائیوں نے اسے پسندیدگی کی سند عطا کی۔ اس کامیابی میں ناشاد صاحب کا بھی بڑا کردار تھا۔ اس کی موسیقی اور گیتوں نے بھی شائقین فلم کو متاثر کیا تھا بعض گیت تو امر سنگیت کا حصہ بن گئے۔

☆ بڑی مشکل سے دل کی بے قراری کو قرار آیا (شمشاد بیگم)

☆ او تیر چلانے والے ذرا سامنے آکر تیر چلا (طلعت محمود)

☆ مجھ کو اتنا بتا جادوگر بالما (شمشاد بیگم)

''نغمہ'' 1953ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس میں فلم میں اشوک کمار اور نادرہ نے مرکزی رومانوی کردار ادا کیا تھا۔

فلم انڈسٹری میں چلتی کا نام گاڑی سمجھا جاتا ہے۔

''نغمہ'' کی کامیابی نے ناشاد کی کامیابیوں کے سارے دروازے کھول دیئے۔ ناشاد بھی کامیاب موسیقاروں کی صف میں شامل ہوگئے۔ وہ حقیقتاً ایک باصلاحیت کمپوزر تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت موسیقار اعظم نوشاد اور ماسٹر غلام حیدر سے حاصل کی تھی جو موسیقی کے مہان کلاکار تھے۔ جب انہیں اپنے فن کے مظاہرے کا موقع ملا تو انہوں نے نہایت دیانتداری سے ہر فلم کی موسیقی ترتیب دیتے وقت محنت اور لگن سے کام کیا۔ نغمہ کے بعد انہوں نے جن فلموں کی دھنیں کمپوز کیں ان میں چار چاند، شہزادہ، جلاد، قاتل، دروازہ، ٹیکسی ۵۵۵ (؟)، مایا محفل، ہتھکڑی، محفل، سب سے بڑا روپیہ، پیار کی داستان، بڑا بھائی، بارہ دری اور زندگی یا طوفان کے نام قابل ذکر ہیں۔

دیکھا آپ نے فلمی دنیا کی ریت۔ ایک فلم فلاپ ہو جائے تو ناکامی کا طوق گلے میں ڈال دیا جاتا ہے اور ایک فلم ہٹ ہو جائے تو اسے کامیابی کی ضمانت سمجھ کر سب اس کی خدمات حاصل کرنا شروع کردیتے ہیں۔

جب وہ شوکت علی تھے تو ان کی شان و شوکت محض نام کی تھی مگر جب وہ اپنے نام کے لحاظ سے ناشاد ہو گئے تو کامرانی کے جھولے میں جھولنے لگے۔ ناشاد بن کر وہ شاد و آباد ہو گئے۔

جب ناشاد نے بمبئی فلم انڈسٹری میں اپنا ایک مقام بنا لیا تو فلم فیلڈ سے وابستہ افراد کو متعارف بھی کرانے لگے۔ اس سلسلے میں سمن کلیان پور ان کی بہترین دریافت تھیں۔ اسے انہوں نے اپنی فلم ''دروازہ'' میں بطور گلوکارہ روشناس کرایا۔ اس کی آواز لتا منگیشکر سے ملتی جلتی تھی۔ اس نے آگے چل کر بہت گیت گائے اور بڑی شہرت حاصل کی۔

گلوکاری کی بات چلی ہے تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ ناشاد نے بھی گلوکاری کی۔ فلم ''بارہ دری'' میں انہوں نے اپنی آواز کا جادو جگا کر ثابت کیا کہ وہ خود بھی گا سکتے ہیں لیکن اس طرف انہوں نے زیادہ توجہ نہیں دی کیونکہ موسیقی کی دھنیں بنانے کا کام زیادہ توجہ طلب تھا جس پر انہوں نے اپنی توجہ مبذول رکھی۔

پسندیدگی کے لحاظ سے ناشاد کی بھارتی فلمیں نغمہ، چار چاند، بارہ دری، محفل، زندگی یا طوفان کے گانے زیادہ مقبول ہوئے۔ اچھا موسیقار اچھی آوازوں کی پہچان میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ کون سا گیت کون سی گلوکارہ یا گلوکار بہتر طور پر گا سکتا ہے۔ کس آرٹسٹ پر پکچرائز ہوگا اس پر کتنا سجے گا۔ انہوں نے اپنی فلموں میں محمد رفیع، لتا منگیشکر، آشا بھوسلے، منا ڈے، طلعت محمود، شمشاد بیگم، جیسے بڑے اور نامور سنگرز کو بھی گوایا اور نئی اور ابھرتی ہوئی آوازوں کو بھی آزمایا۔

انڈین فلموں میں ناشاد کی موسیقی میں ترتیب دیئے ہوئے کچھ مقبول گیت دیکھیے۔

☆ ہے یہ وہی آسماں اور ہے وہی زمیں۔ پر مری تقدیر کا اب وہ زمانہ نہیں (آواز طلعت محمود، فلم چار چاند)

☆ تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی (آواز طلعت محمود فلم بارہ دری)

زندگی نامہ

اصل نام: شوکت علی

تعلق: دہلی (انڈیا)

ابتداء میں: بانسری نواز تھے

بمبئی روانگی: اکتساب فن کے لیے دہلی سے بمبئی گئے اور موسیقار اعظم نوشاد اور ماسٹر غلام حیدر سے موسیقی کے اسرار و رموز حاصل کیے۔

پہلی فلم: بطور ہدایت کار ''دلدار'' جس کے ہدایت کار شیوراج تھے۔ یہ فلم 1947ء میں ریلیز ہوئی۔

فلمی نام: بمبئی کی ابتدائی فلموں میں شوکت دہلوی کے نام سے کام کیا۔ فلمساز و ہدایت کار نخشب نے ان کا نام بدل کر ناشاد رکھ دیا۔

پہلی کامیاب فلم: نخشب کی فلم ''نغمہ'' سپرہٹ کامیاب ہوئی۔ جب کہ اس سے پہلے کوئی نصف درجن فلمیں فلاپ ہو چکی تھیں۔

پاکستان آمد: 1963ء میں وہ بال بچوں سمیت پاکستان آگئے۔

شادی: نوشاد نے شادی بمبئی کے دوران قیام کی تھی۔

اولاد: 8 بیٹے، 7 بیٹیاں۔

فلموں کی تعداد: ''نغمہ'' کے بعد ممبئی کی مزید 13 فلمیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ جب کہ پاکستان میں انہوں نے 62 فلموں کی موسیقی ترتیب دی جن میں زیادہ تر کامیاب ثابت ہوئیں۔

انتقال: 3 جنوری 1981ء

آخری فلم: بدنام ریلیز 13 اکتوبر 1980ء

☆ اے دل والو پیار نہ کرنا۔اس پاپی سنسار سے ڈرنا
(آواز آشا بھوسلے فلم زندگی یا طوفان)
☆ بھلا نہیں دینا جی بھلا نہیں دینا۔زمانہ خراب ہے
(آواز لتا منگیشکر فلم بارہ دری)
☆ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔ہم تو اس جینے کے
ہاتھوں مر چلے (آواز محمد رفیع، فلم زندگی یا طوفان)
☆ پیار جگانے والا نیند چرانے والا آ گیا (آوازیں،
لتا اور منا ڈے فلم ذرا بچ کے)
☆ زلفوں کی چھاؤں تلے۔مت پوچھ کہ دل پر کیا
گزری (آواز طلعت محمود فلم زندگی یا طوفان)

نخشب جار چوی جنہوں نے شوکت دہلوی کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچا کر ناشاد کے نام سے شاد اور آباد کیا اور پھر اپنی ہر فلم میں ان کی فنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا، 1962ء میں بمبئی سے کراچی آ گئے۔ اگرچہ اس وقت کی پاکستانی فلم انڈسٹری بھارتی فلمی دنیا سے بہت پیچھے تھی، بہت کمزور تھی۔ جانے کون سا جذبہ انہیں پاکستان لایا تھا۔ بہرحال یہ پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے بڑی خوش آیند بات تھی کہ ایک بڑا بھارتی فلم ساز و ہدایت کار پاکستان آیا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد انہوں نے یہاں اپنی پہلی فلم ”فانوس“ بنائی جو 1963ء میں نمائش پذیر ہوئی مگر بری طرح ناکام ہو گئی۔ اس فلم کے فلاپ ہونے کے جو بھی اسباب رہے ہوں، لیکن نخشب صاحب کے خیال میں اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس کے موسیقار ناشاد نہیں تھے۔ لہٰذا جب اپنی دوسری فلم ”میخانہ“ شروع کی تو اس کی موسیقی ترتیب دینے کے لیے ناشاد کو بمبئی سے کراچی بلوایا۔

نخشب صاحب نے اس فلم ”میخانہ“ کی پبلسٹی پر خصوصی توجہ دی اور اس کے نغمات کی پبلسٹی ریڈیو سیلون سے کروائی۔ یہ پہلی پاکستانی فلم تھی جس کے گانے سری لنکا کے ریڈیو سیلون سے بجوائے گئے۔ یہ وہ دور تھا جب ریڈیو سیلون برصغیر میں بڑی تعداد میں لوگ سنتے تھے۔ خاص طور پر زیر تکمیل یا زیر نمائش بھارتی فلموں کے گیت بجائے جاتے تھے اور پھر ان کی عوامی مقبولیت کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی جاتی تھی۔ ریڈیو سیلون میں شمولیت کی وجہ سے میخانہ کے بیشتر گانے مقبول ہوئے مگر جب یہ فلم اسکرین کی زینت بنی تو باکس آفس پر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ نخشب جار چوی بہت مایوس ہوئے اور انہوں نے سوچا۔ ”فی الحال پاکستان فلم سازی کے لیے مناسب ملک نہیں۔“

لہٰذا وہ واپس بمبئی چلے گئے۔ انڈیا چونکہ پاکستان کے مقابلے میں بہت بڑا ملک ہے اس لیے وہاں گئی گزری فلمیں بھی اتنا کما لیتی ہیں کہ فلم ساز کا سرمایہ واپس آ جاتا ہے جب کہ پاکستان میں مختصر سرکٹوں کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا۔

نخشب تو واپس چلے گئے مگر ناشاد جنہیں نخشب نے ... تھا وہ یہیں رہ گئے۔ انہیں یہاں بڑی پذیرائی اور عزت ملی۔ یہاں کے فلم میکر ان کی فنی صلاحیتوں سے باخبر تھے۔ ان کے سدابہار گیتوں نے یہاں پاکستان میں بھی لاکھوں لوگوں کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔

یہاں کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے گویا ان کے پیروں میں اپنی محبت کی زنجیر ڈال دی۔ ان سے درخواست گزار ہوئے کہ ہماری فلم کی موسیقی ترتیب دے دیں پھر جانا چاہیں تو چلے جائیے گا۔

اور وہ محبت کا مارا، ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری فلم کی موسیقی کمپوز کرتا رہا۔ اس طرح وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی مصروفیت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔ انہوں نے انڈیا کی طرح یہاں بھی اچھی آوازوں کو پروموٹ کیا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں مقبول سنگر بنایا۔

رونا لیلیٰ جیسی ابھرتی ہوئی گلوکارہ کو انہوں نے اپنی فلم ”ہم دونوں“ میں ایک نہایت مسحور کن گیت گانے کا موقع فراہم کیا جو آج بھی روزِ اوّل کی طرح دلوں کے تار چھیڑتا ہے۔

ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا
دل یہ سمجھا کہ چھلکتا ہوا اک جام ملا

ریلیز کے اعتبار سے یہ رونا لیلیٰ کی پہلی فلم تھی جو اگست 1966ء میں نمائش پذیر ہوئی، اسی سال کی ایک اور فلم ”جلوہ“ میں ناشاد نے گلوکار مجیب عالم کی آواز میں نہایت اثر انگیز نغمہ ترتیب دیا جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

وہ نقاب رخ الٹ کر ہمیں یوں نہ آزمائیں
کوئی جا کے ان سے کہہ دے ہمیں یوں نہ آزمائیں

سقوط ڈھاکا کے بعد جب سابق مشرقی پاکستان کے مقبول گلوکار بشیر احمد پاکستان آ گئے تو ناشاد صاحب نے اپنی فلم ”دل ایک شیشہ“ میں گلوکاری کا موقع دیا۔ اس فلم کے بشیر احمد کے گائے ہوئے اس نغمے نے آج بھی اپنی مقبولیت برقرار رکھی ہے۔

میرا دل نہ جانے کب سے تیرا پیار ڈھونڈتا ہے
جو خزاں میں کھو چکی ہے وہ بہار ڈھونڈتا ہے

1975ء میں ناشاد نے اپنے ایک صاحبزادے عمران علی کو فلم ”شکوہ“ کے ذریعے بطور گلوکار متعارف کرایا جس نے پہلا گیت ناہید اختر کے ہمراہ گایا۔

کلیوں پہ بھنورا کیوں ڈولے

عمران علی نے اس کے بعد بھی کچھ فلموں کے لیے نغمے گائے جن میں ضمیر، چوری چوری اور میرا انصاف شامل ہیں۔

جس پاکستان میں نخشب دو فلمیں بنا کر کامیابی حاصل نہ کر سکے اسی پاکستان میں ناشاد کی یکے بعد دیگرے کامیاب فلموں کی لائن لگ گئی۔ جن کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ... ہے جب کہ ان کی تین فلمیں
1۔ منچلی
2۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں
3۔ میرے جیون ساتھی
مکمل ہونے کے باوجود ریلیز نہ ہو سکیں۔ ان کے علاوہ ... فلمیں بھی ہیں جو نامکمل رہیں۔ انہیں مکمل نہیں کیا جا سکا۔ گانے چونکہ پہلے ریکارڈ کر لیے جاتے ہیں جو فلم کی عدم ... کے باوجود نشر ہو کر عوامی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ ... کار محمد جاوید فاضل کی فلم ”میرے جیون ساتھی“ کے ... ناشاد نے لیجنڈ اداکارہ صبیحہ خانم اور گلوکار آصف جاوید کی ... میں ایک ڈوئیٹ کمپوز کیا تھا جو بے حد پسند کیا گیا

چاند کی نگری تاروں کا انگنا
جیون اپنا ایسا ہو سجناں

ناشاد اچھے موسیقار ہی نہیں، اچھے اور بااصول انسان بھی تھے۔ ان کی بہت سی اچھائیوں میں ایک اچھائی یہ بھی تھی انہوں نے کبھی کوئی چربہ دھن نہیں بنائی۔ فلم بڑے فلم ساز کی ہو یا چھوٹے کی، سب کے لیے دیانتداری سے کام کیا۔ ... فلم کے لیے اوریجنل دھنیں بنائیں۔ ان کے کریڈٹ پر کوئی پنجابی فلم نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پنجابی زبان سے کماحقہ واقف نہ تھے۔ موسیقار ہی نغمہ نگار سے فلم کی ... کے مطابق گیتوں کی تخلیق کرتا ہے اگر وہ زبان سے ... واقف ہو تو وہ گیتوں کے تخلیقی عمل میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے۔

ناشاد نے جہاں کئی گانے والوں اور والیوں کو فلم ... سے متعارف کرایا وہاں ایک نغمہ نگار کو بھی فلم انڈسٹری ... کا جھومر بنایا۔ یہ نغمہ نگار کوئی اور نہیں تسلیم فاضلی تھا اور ... انتہائی کمسنی کے دور میں ان کے پاس گیا تھا اور کہا

بمبئی میں ناشاد کے ٹاپ گیت

1۔ بڑی مشکل سے دل کی بے قراری کو قرار آیا (انڈین)
2۔ مجھ کو اتنا بتا جادوگر بالما (انڈین)
3۔ ہے یہ وہی آسماں اور ہے وہی زمیں (انڈین)
4۔ تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی (انڈین)
5۔ اے دل والو پیار نہ کرنا (انڈین)
6۔ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے (انڈین)
7۔ میرے دل کی ہے آواز کہ بچھڑا یار ملے گا

پاکستان کے ٹاپ گیت

☆۔ جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
☆۔ آپ کو بھول جائیں ہم ایسے تو بے وفا نہیں
☆۔ رفتہ رفتہ وہ مری ہستی کا ساماں ہو گئے
☆۔ اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم
☆۔ زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
☆۔ محبت زندگی ہے اور تم میری محبت ہو
☆۔ یہ گھر میرا گلشن ہے گلشن کا خدا حافظ
☆۔ میں ہوں راستے کا پتھر
☆۔ کرتے ہیں محبت سبھی مگر
☆۔ میری زندگی ہے نغمہ میری زندگی ترانہ
☆۔ دیا رے دیا کانٹا چبھا، پاؤں میں
☆۔ یوں کھو گئے تیرے پیار میں ہم
☆۔ میں نے اک آشیاں بنایا تھا

بیٹوں کی فنی کارکردگی

ناشاد کے بیٹوں میں شاہد علی، اکبر علی اور واجد علی کمپوزر بنے۔ اکبر علی نے 1996ء کی ایک فلم ”چوروں کے گھر چور“ کی موسیقی ترتیب دی جب کہ اس نے زیادہ تر ٹی وی ڈراموں کی کمپوزیشن کی۔ واجد علی کے کریڈٹ میں 40 فلمیں ہیں۔ ناشاد کے بیٹے عمران اور امیر علی نے گلوکاری کی۔ واجد علی نے فلموں کی کمپوزیشن کے ساتھ کچھ فلموں میں گلوکاری بھی کی۔

تھا۔ ”میں فلموں کے گیت لکھنا چاہتا ہوں، مجھے چانس دیجیے۔“

ناشاد نے اس لڑکے کو دیکھا۔ سر سے پاؤں تک گھور کر اس کا جائزہ لیا اور اسے ڈانٹ کر بھگانے یا سمجھا بجھا کر اس سے پیچھا چھڑانے کی بجائے، بے حد محبت کا سلوک کرتے ہوئے اس کا امتحان لیا کہ وہ شاعری کر بھی سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے کچھ اشعار سنے اور پھر اس سے اپنی بنائی ہوئی ایک دھن پر، فلم کی سچویشن بتا کر اس پر گیت لکھنے کو کہا اور اس کمسن لڑکے نے ذرا ہی دیر بعد ایک مکھڑا لکھ کر ان کو تھما دیا۔ ناشاد نے مکھڑے کو دیکھا۔ پھر اس لڑکے کو دیکھا اور دل ہی دل میں کہا

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ نے اس میں شاعرانہ صلاحیت دی ہے اگر اس کی تراش خراش کی جائے تو ایک انمول ہیرا بن سکتا ہے اور اس دن کے بعد سے وہ اس کی سرپرستی کرتے رہے اور اپنی آخری فلم تک اس سے گیت لکھواتے رہے۔ یہ ناشاد ہی تھے جنہوں نے اپنی جہاندیدہ نگاہوں سے دیکھ لیا تھا کہ یہ آنے والے دنوں میں بڑے بڑے نغمہ نگاروں کو پیچھے چھوڑ دے گا۔

ناشاد نام کے ناشاد تھے مگر اپنے کام کے حوالے سے بہت شادکام تھے۔ اپنے ساتھ ساتھ انہوں نے دوسروں کو بھی بہت شاد کیا۔ آیئے ان کی سحر انگیز دھنوں سے آراستہ کچھ نغمات سے آپ کی خوشیوں اور خوش ذوقی کا سامان بہم کریں۔

☆ زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں۔ میں تو مر کر بھی مری جان تمہیں چاہوں گا (آواز مہدی حسن، فلم عظمت)

☆ جان کہہ کر جو بلایا تو برا مان گئے (آواز سلیم رضا، فلم میخانہ)

☆ مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں۔ جینے کی تمنا کون کرے (آواز حبیب ولی محمد)

☆ رفتہ رفتہ وہ مری ہستی کا ساماں ہو گئے (آواز مہدی حسن، فلم زینت)

☆ گوری کے سر پہ سج کے۔ سہرے کے پھول کھیں گے (آواز احمد رشدی، فلم تم ملے پیار ملا)

☆ اک بار چلے آؤ پھر آ کے چلے جانا (آواز مہدی حسن فلم ایک رات)

☆ لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے (آواز نور جہاں، فلم سالگرہ)

☆ وعدے کر کے صنم کیوں نہ آئے (آواز رونا لیلیٰ فلم ایک سپیرا)

☆ محبت زندگی ہے اور تم میری محبت ہو (فلم تم سلامت رہو)

☆ اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم۔ زمانے بھر سے رشتہ توڑ دیں گے ہم (تصور خانم۔ فلم ایماندار)

☆ یہ گھر مرا گلشن ہے۔ گلشن کا خدا حافظ (آواز نور جہاں، فلم بہارو پھول برساؤ)

☆ کرتے ہیں محبت سب ہی مگر۔ ہر دل کو صلہ کب ملتا ہے (آواز غلام علی، فلم تم سلامت رہو)

☆ میں دیوانہ مجھے نہ چھیڑو۔ چھیڑ کے پھر پچھتاؤ گے (آواز مہدی حسن، فلم میخانہ)

☆ ہم پہ الزام تو ویسے بھی ہے۔ ایسے بھی سہی (آواز نور جہاں، فلم الزام)

☆ میں ہوں راستے کا پتھر۔ میرا نصیب ٹھوکر (آواز اخلاق احمد فلم راستے کا پتھر)

☆ چہرے پہ بناوٹ کا غصہ۔ آنکھوں سے چھلکتا پیار بھی ہے (فلم بہاروں کی منزل)

☆ میرے دل کی ہے آواز۔ کہ بچھڑا یار ملے گا (آواز مسعود رانا، فلم بہارو پھول برساؤ)

☆ آپ کو بھول جائیں ہم۔ اتنے تو بے وفا نہیں (فلم تم ملے پیار ملا)

☆ مری زندگی ہے نغمہ۔ مری زندگی ترانہ (آواز نور جہاں، فلم سالگرہ)

☆ شکستہ دل ہے کسی نے لیا، لیا، لیا (آواز احمد رشدی، فلم جلے نہ کیوں پروانہ)

☆ دیا رے دیا کانٹا چبھا پاؤں میں (آوازیں رونا لیلیٰ رفیق چوہدری، فلم پھر صبح ہوگی)

☆ یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جایئے (عمران علی ناشاد، فلم چوری چوری)

ناشاد کے اچھے اور مقبول گیتوں کی ایک طویل فہرست ہے جس وقت ناشاد پاکستان آئے تھے اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی پاکستانی موسیقاروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان کی موجودگی میں اپنی ساکھ کو برقرار رکھنا ناشاد جیسے کمپوزر کا ہی خاصا تھا۔ ان پر کبھی یہ وقت نہیں آیا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔ ان کے پاس کوئی فلم نہ ہو۔ یہ ان کی محنت، لگن اور

ایمانداری کا نتیجہ تھا کہ وہ ہمیشہ مصروف رہے۔ ان کی آخری فلم ”بدنام“ 13 اکتوبر 1980ء کو ریلیز ہوئی۔ یہ ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم تھی جس میں محمد علی، رانی، وحید مراد اور بابرہ شریف نے کلیدی کردار کیے تھے اگلے برس یعنی 14 جنوری 1981 کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خداوند قدوس انہیں غریق رحمت کرے، آمین۔

میرا ایک شعر ہے

اس سے پہلے کہ مر جاؤ کچھ ایسے کام بھی کر جاؤ
اندر ہر دل کے اتر جاؤ سب رکھیں تم کو یاد میاں

اس کلیے پر ناشاد مرحوم پورے اترتے ہیں۔ انہوں نے بلاشبہ ایسے کام کیے کہ آج بھی وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ مر کر بھی زندہ ہیں اور لوگ ہمیشہ ان کے کمپوز کیے ہوئے گیتوں کے حوالے سے انہیں یاد رکھیں گے۔ ان کے ایسے نغمے بھلا کیسے بھلائے جا سکتے ہیں۔

☆ مجھے کر دیں نہ دیوانہ۔ تیرے انداز مستانہ (آواز مہدی حسن فلم نیا راستہ)

☆ آ بھی جاؤ ساجناں ارمانوں کے گلزار میں (آواز نور جہاں، فلم چاند سورج)

☆ خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے۔ کسی کا نام لوں لب پر تمہارا نام آئے (فلم افشاں)

☆ محبتوں کے قدرداں نہ شہر میں نہ گاؤں میں (آواز نسیم، فلم جلے کیوں پروانہ)

☆ آج تک یاد ہے وہ پیار کا منظر مجھ کو (آواز مہدی حسن، فلم سہرے کے پھول)

☆ بڑا مزہ آیا لڑائی میں۔ ٹوٹ گئی چوڑی کلائی میں (آواز ناہید اختر، فلم گمراہ)

☆ یوں کھو گئے تیرے پیار میں ہم۔ اب ہوش میں آنا مشکل ہے (آواز مجیب عالم، فلم افسانہ)

☆ دل توڑ کے مت جیو برسات کا موسم ہے (آواز ناہید اختر، فلم وقت)

☆ جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ (آواز مہدی حسن، فلم سزا)

☆ دن ڈھل گیا سورج کا کہیں نام نہیں ہے۔ او وعدہ شکن اب بھی تری شام نہیں ہے (آواز مالا، فلم افشاں)

☆ دامن سے لپٹ گیا دیوانہ۔ دامن کا چھڑانا مشکل (آواز مہدی حسن، فلم شکوہ)

☆ اس خط کو مری آخری تحریر سمجھنا (آواز نور جہاں، فلم

زاہد علی ناشاد کے مزید ٹاپ گانے

1۔ زندگی کے کسی موڑ پر۔ میں تجھ کو بھلا دوں یہ ممکن نہیں
2۔ دل چاہے آنکھوں میں قید کر کے تجھے۔ پلکوں کی چلمن گرا لوں
3۔ تیرے سر کی قسم تو ملا تو صنم
4۔ صبح و شام تیرا نام ہونٹوں پر
5۔ میں تجھے بھول کر بھی بھولوں۔ تو بھولوں کیسے؟
6۔ نی کڑیئے پنجاب دی اے۔ نی پتے گلاب دی اے
7۔ چہرہ وہی ہے آنکھیں وہی ہیں۔ ہم بھی وہی ہیں تم بھی وہی ہو
8۔ جانے سے پہلے سوچ لو اتنا۔ اک دن واپس آ ؤ گے
9۔ راستے وہی رہتے ہیں۔ مسافر بدل جاتے ہیں
10۔ پیار کسی پہ آئے رہا نہ جائے۔ روگ بڑا اٹھے دا

ناشاد کی فلمیں

انڈین فلمیں ”دلدار، پائل، مجھے جینے دو، ٹوٹے تارے، آئینے، دادا“ یہ فلمیں شوکت دہلوی کے نام سے مرتب کیں۔ ناشاد کے نام سے نغمہ، چار چاند، شہزاد چندر، قاتل، دروازہ، ذرا بچ کے، بابا علی، ہتھکڑی، محفل، سب سے بڑا روپیہ، پیار کی داستان، بڑا بھائی، بارہ دری، زندگی یا طوفان جب کہ پاکستانی فلموں کی تعداد 62 ہے۔

واجد علی ناشاد

1953ء میں بمبئی میں پیدا ہوئے۔ 1963ء میں والدین کے ساتھ پاکستان آ گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے کیا۔ 20 سال کی عمر میں فلم دلہن رانی کا بیک گراؤنڈ میوزک بطور موسیقار دیا جو 1973ء میں ریلیز ہوئی۔ 1977ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”پرستش“ پہلی مکمل فلم بطور موسیقار ہے جب کہ آخری فلم ”طلب گار“ ہے جو ان کے انتقال کے بعد 2009ء میں ریلیز ہوئی۔ واجد علی ناشاد کا انتقال 12 جون 2008ء کو ہوا۔ وہ برین ٹیومر کے شکار تھے۔ انہوں نے چند فلموں اور ٹی وی ڈراموں کے لیے گلوکاری بھی کی۔ انہوں نے 40 فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔

سہاگ)

☆ اب کس کو سنائیں گے اس درد کا افسانہ (آوازیں نور جہاں، مہدی حسن، فلم نیا راستہ)

☆ پیار ہوتا نہیں زندگی سے جدا (آواز رونا لیلیٰ، فلم پھر صبح ہوگی)

☆ میں نے اک آشیاں بنایا تھا۔ اب بھی شاید وہ جل رہا ہوگا (آواز نور جہاں، فلم رم جھم)

موسیقار ناشاد نے انڈیا کے دورانِ قیام شادی کی تھی۔ وہ کثیر العیال تھے ان کے ماشاء اللہ آٹھ بیٹے اور سات بیٹیاں ہیں۔ اس بات سے کم از کم اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فلمی دنیا کے رنگین ماحول میں رہتے ہوئے بھی گھر سے باہر کی موج مستی کا خود کو حصہ نہیں بنایا۔ جب وہ ممبئی میں تھے جب بھی ان کا کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا اور جب پاکستان کے صف اول کے موسیقار کی حیثیت سے زندگی بسر کی، اس دور میں بھی ایک شریف النفس شخص کی حیثیت سے رہے، اپنے گھر اور بیوی بچوں پر ہی توجہ دی۔ شوبز کی دنیا اپنی رنگینی اور سنگینی کے لحاظ سے بہت خطرناک ہوتی ہے۔ یہاں اچھے، اچھوں کو ایمان سلامت رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ ناشاد کی یہ خوبی بھی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی کہ انہوں نے اس رنگینی اور سنگینی سے اپنے دامن کو پاک رکھا۔

ان کے بیٹوں میں شاہد علی اور اکبر علی کمپوزر بنے۔ عمران علی اور امیر علی گلوکاری کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔ ارشد علی امریکا چلے گئے۔ احمد علی کرکٹر اور اجمل علی سپروائزر بنے جب کہ واجد علی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے اور پاکستان فلم انڈسٹری کے کامیاب موسیقار بنے۔

باپ کے بعد موسیقی کا شعبہ اپنانے والوں میں سب سے پہلے لیجنڈ موسیقار رشید عطرے کے صاحبزادے وجاہت عطرے کا نام آتا ہے۔ وجاہت عطرے کی پہچان پنجابی فلمیں ہیں۔ ان کا موسیقی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے موسیقاروں میں شمار ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ قومی زبان کی فلموں کی موسیقی ترتیب دینے والے موسیقار ایم اشرف کے فرزند ارجمند ایم ارشد نے بھی میوزک ڈائریکٹر کے طور پر بڑی شہرت حاصل کی۔ موسیقی کی دنیا میں سیکنڈ جنریشن کی کامیاب مثال واجد علی ناشاد کی بھی ہے۔

واجد علی ناشاد

واجد علی ناشاد 1953ء میں ممبئی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ 1963 میں ناشاد اپنے بال بچوں سمیت پاکستان آگئے۔ واجد علی نے ابتدائی تعلیم ممبئی میں حاصل کی۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے پاس کیا۔

چونکہ والد محترم نامور اور کامیاب موسیقار تھے۔ اس کا اثر ان پر بھی ہوا۔ موسیقی سے رغبت پیدا ہوگئی اور صرف 20 سال کی عمر میں اس ابھرتے ہوئے نوجوان موسیقار نے فلم ''دلہن رانی'' کا بیک گراؤنڈ میوزک ترتیب دیا۔ اس فلم کے ہدایت کار سید شوکت حسین رضوی اور موسیقار ناشاد تھے۔ ''دلہن رانی'' 1973ء میں اسکرین کی زینت بنی۔ اس کے چند سال بعد ناشاد نے اپنی فلم ''محبت مر نہیں سکتی'' کا ایک نغمہ اپنے اس ہونہار فرزند کی کمپوزیشن میں ریکارڈ کیا۔ باقی گیت خود مرتب کیے۔ واجد علی ناشاد نے جس گیت کی دھن تیار کی تھی اسے احمد رشدی کی آواز میں صدا بند کیا گیا تھا جس کے بول تھے۔

اس کی بزم میں جانے کیا کیا کہتے ہیں آوازیں لوگ

''محبت مر نہیں سکتی'' کے ہدایت کار عزیز الحسن تھے۔ عزیز الحسن کو اس نوجوان میں بڑی صلاحیتیں نظر آئیں لہٰذا انہوں نے اپنی ڈائریکشن میں بننے والی اگلی فلم ''پرستش'' کے لیے واجد علی ناشاد کو میوزک ڈائریکٹر منتخب کرلیا۔ یہ فلم ''پرستش'' جو 4 جنوری 1977ء کو نمائش پذیر ہوئی بطور موسیقار واجد علی ریلیز ہونے والی پہلی فلم قرار دی گئی جب کہ ''محبت مر نہیں سکتی'' اسی سال 22 نومبر کو منظر عام پر آئی یہ عجیب اتفاق تھا کہ جس فلم کے ایک نغمے سے متاثر ہوکر اسے مکمل موسیقار لیا گیا وہ بعد میں ریلیز ہوئی۔ ''پرستش'' کے عام گانے پسند کیے گئے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

☆ صبح شام تیرا نام ہونٹوں پر ہے۔ ہورے سانو (مہناز اور ساتھیوں کی آواز میں)

☆ چھوڑ نہ دینا میرا ہاتھ ساجن۔ ساتھ نبھانا دن رات ساجن (آواز مہناز)

☆ او مجھے لے چل یہاں سے دور۔ ان وادیوں (آواز مہناز)

☆ آنکھوں سے جانا نہیں تم دور۔ میرے پاس رہنا ضرور (آواز احمد رشدی)

''پرستش'' میں ممتاز، وحید مراد، ندیم، دیبا، نیر سلطانہ، منور سعید، ننھا، خالد سلیم موٹا اور ساقی نے نمایاں کردار ادا کیے تھے۔

3 جنوری 1981ء کو واجد علی ناشاد اپنے مشفق باپ کے سائے سے محروم ہوگئے۔ ہدایت کار ظفر شباب نے اپنی فلم ''فاصلے'' کی موسیقی کے لیے ناشاد کو سائن کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ ان کا انتقال ہوگیا تو ظفر شباب نے مرحوم کے بیٹے واجد علی ناشاد کو اس فلم کی موسیقی ترتیب دینے کی ذمہ داری سونپ دی۔ ''فاصلے'' 18 ستمبر 1981ء میں ریلیز ہوئی۔ واجد علی ناشاد کی کارکردگی کو اس فلم میں بھی پسند کیا گیا، سراہا گیا، اسی کے نتیجے میں ہدایت کار اقبال کشمیری نے بھی اپنی فلم ''مقدر کا سکندر'' میں اسے موسیقار لیا جو 1984ء میں ریلیز ہوئی۔

اتفاق سے ''مقدر کا سکندر'' کے نام سے بھارت میں بھی ایک فلم بنی تھی۔ جس میں امیتابھ بچن نے ریکھا کے ساتھ مرکزی کردار کیا تھا۔ پاکستانی ہدایت کار جہانگیر قیصر نے بھارتی فلم ''مقدر کا سکندر'' کا چربہ ''پروانہ'' کے نام سے بنایا یہ 198… میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم میں ندیم، بابرہ شریف اور آصف رضا نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم میں بھی واجد علی ناشاد کو موسیقی ترتیب دینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کے کئی کامیاب گیتوں کو بھارت میں بھی پسند کیا گیا۔ فلم کی نمائش کے بعد جب واجد علی ناشاد کو معلوم ہوا کہ ''پروانہ'' بھارتی فلم کا چربہ ہے تو انہیں افسوس ہوا تھا اور انہوں نے کہا تھا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ چربہ فلم ہے تو میں ہرگز اس کی موسیقی کمپوز نہیں کرتا۔ میرے پاپا نے بھی کبھی کسی چربہ فلم میں کام نہیں کیا تھا۔''

''پروانہ'' کے بعد میڈم شمیم آراء نے اپنی بیرونی ملک میں بننے والی فلم ''لیڈی اسمگلر'' کے لیے واجد علی کو میوزک ڈائریکٹر لیا۔ یہ فلم 1987ء میں ریلیز ہوئی۔ شمیم آراء، واجد علی ناشاد کے کام سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اپنی آخری فلم ''بڈھا بگڑا جائے'' تک واجد علی کو موسیقار لیا۔ یہ فلم 2004ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ جن فلموں میں مادام شمیم آراء نے واجد علی ناشاد کی خدمات حاصل کیں وہ یہ ہیں۔ لیڈی اسمگلر، ہاتھی میرے ساتھی، بیٹا، آخری … 9…، مس استنبول، ہم کسی سے کم نہیں۔ کبھی ہاں کبھی ناں، بنے گا کروڑ پتی اور ان کی آخری فلم بڈھا بگڑا جائے۔

میڈم سنگیتا نے پہلی بار واجد علی ناشاد کو اپنی فلم ''عاشقی … '' میں موسیقار لیا جو 1997ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ 1999ء میں سنگیتا کی بنائی ہوئی فلم ''قسمت'' میں

باپ بیٹے کے ٹی وی ڈرامے

واجد علی ناشاد اور ان کے بیٹے نوید علی نے فلموں کے علاوہ ٹی وی ڈراموں کے لیے بھی موسیقار کے طور پر کام کیا۔ واجد علی ناشاد نے جن ٹی وی ڈراموں کے لیے موسیقی ترتیب دی وہ درج ذیل ہیں:

ڈراما سیریل دشت، دوسرا آسمان، لنڈا بازار، کانچ کے پر، ہوا پہ رقص، مہندی والے ہتھ، سدا سہاگن، جب کہ نوید واجد کے دیگر ڈرامے یہ ہیں۔

بس اک تیرا انتظار، دل کی باتیں دل ہی جانے، دیوانے کا نغمہ، دل کو منانا آیا نہیں، سورج مکھی، وجود، زندگی مجھے تیرا پتا چاہیے، دل میرا چھپ چھپ کر روئے، پھر کب ملوگی۔

نوید علی ناشاد کا سفر جاری ہے

نوشاد کے پوتے نوید واجد ناشاد کو دادا کی رہنمائی اور سرپرستی نصیب نہیں ہوئی لیکن والد واجد ناشاد نے جہاں تک ممکن ہوا، بیٹے کی فنی تربیت کی۔ واجد نے پہلے پہل اپنے بیٹے نوید علی کو اپنی فلموں ''فائر'' اور ''پیار ہی پیار میں'' گلوکاری کا موقع دیا۔ پھر اسٹار بن کر جرار رضوی کے اصرار پر نوید کو ان کی فلم ''سن آف پاکستان'' کی موسیقی کمپوز کرنے کی اجازت دے دی جس کے بعد نوید نے مزید تین فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ اب وہ موسیقی کی دنیا میں اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔ نوید مشرقی موسیقی میں ہلکی سی مغربی موسیقی کی آمیزش سے نئی نسل کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کی ایک فلم جیک پورٹ جولائی 2018ء میں ریلیز ہوگی۔

وقت وقت کی بات

ناشاد کے دور میں زیادہ فلمیں بنتی تھیں۔ جب کہ ان کے بیٹے اور پوتے کے زمانے میں ٹی وی ڈرامے زیادہ بنتے ہیں اس لیے انہیں فلموں میں اپنی کارکردگی کے مظاہروں کا موقع کم ملا۔ ٹی وی پر کام کرنے پر انہیں توجہ دینی پڑی اس لیے ناشاد کی طرح بہت زیادہ اچھی فلمیں ان کے کریڈٹ میں نہیں۔ ویسی مقبولیت اور شہرت بھی انہیں نصیب نہیں ہوئی۔

واجد علی ناشاد کا کمپوز کیا ہوا ایک نغمہ

گلاں گوریاں دے وچ
ٹوٹے اسی مر گئے نی ہوئے

جسے عارف لوہار کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا خاصا پسند کیا گیا۔ واضح رہے کہ اس فلم کے موسیقار ایم اشرف تھے۔

اسی سال ہدایت کار سعید رانا کی فلم "سالا بگڑا جائے" میں واجد علی ناشاد کے شریک موسیقار علی افضل تھے۔ قبل ازیں 1998ء میں شمیم آراء کی فلم بھی "ہاں بھی ناں" کے دو نغمے واجد علی ناشاد اور بقیہ نغمات امجد بوبی نے کمپوز کیے تھے۔ علاوہ ازیں فلم گھرانا، میرے محبوب، جانور، دیور دیوانے، واپسی، انہونی وغیرہ میں بھی واجد علی ناشاد کے ہمراہ دوسرے موسیقاروں کی کارکردگی شامل تھی۔ فہیم برنی کی فلم "پیار ہی پیار میں" کے صرف دو نغمے واجد علی ناشاد نے مرتب کیے تھے بقیہ نغمے انڈین تھے۔ 2006ء میں واجد علی ناشاد نے ہدایت کارہ سنگیتا کی فلم "تڑپ" اور مجید عبدالرزاق کی فلم "واپسی" میں میوزک دیا۔ اس دور میں اردو فلموں کی پروڈکشن بہت ہی کم ہو گئی تھی۔

واجد علی ناشاد کو اس دور میں ٹی وی پروڈیوسروں کی آفر ہوئی تو انہوں نے انکار نہیں کیا اور ٹی وی ڈراما سیریلز کی پس پردہ موسیقی ترتیب دینے لگے۔ اس ضمن میں ان کے کریڈٹ پر ڈراما سیریل دشت، دوسرا آسمان، لنڈا بازار، کانچ کے پر، ہوا پہ رقص، مہندی والے ہتھ اور 2007ء کی سیریل "سدا سہاگن" شامل ہیں۔

واجد علی ناشاد نے بطور گلوکار بھی اپنی آواز کا جادو جگایا۔ 1989ء میں ڈاکٹر مسعود الرحمٰن نے ایک پنجابی فلم "روگی" بنائی تھی۔ اس فلم میں ڈاکٹر مسعود الرحمٰن نے اپنے تحریر کردہ اس دلچسپ نغمے کی کمپوزیشن واجد علی ناشاد سے کروائی اور واجد علی ناشاد کی آواز ہی میں اسے ریکارڈ کروایا۔ جس کے بول تھے۔

پولیو پالیسی وی فارمی
KILL THEM WHO KILL ME

1997ء میں فلم "چاند گرہن" میں واجد علی ناشاد نے اپنی موزوں کی ہوئی دھن پر حمیرا چنا کے ساتھ گلوکاری کی جس کے بول تھے

تو آجا منا لیں جشن بہار
اف توبہ اللہ میری توبہ

واجد علی ناشاد نے کچھ ڈبل ورژن فلموں میں شریک موسیقار کے طور پر حصہ لیا تھا۔ مثلاً 1971ء کی ڈبل ورژن فلم "آنسو" کے لیے واجد علی ناشاد نے پنجابی نغمہ کمپوز کیا جو تھا

سانبھ کے دکھ پنجواں دی مالا

اسی طرح موسیقار واجد علی ناشاد نے 1993ء پنجابی فلم "فقیرا" کے صرف دو نغمے ترتیب دیے۔

☆ ہوڈھولا ہوڈھولا بن کلیاں نہیں (آواز نور جہاں)
☆ تیرا جادو ویکھیوں چلنا او سپیرے (آواز حمیرا چنا)

واجد علی ناشاد نے شمیم آراء کی فلم "ہاتھی میرے ساتھی" میں اپنے چھوٹے بھائی مقبول گلوکار امیر علی کے علاوہ علی رضا بھی بطور گلوکار متعارف کرایا جب کہ فلم "بیٹا" میں واجد ناشاد نے مزید دو گلوکار ظفر رامے اور فاروق شاد کو فلم انڈسٹری سے روشناس کروایا۔ اسی طرح فلم "یہ وعدہ رہا" میں ظہیر عباس، فلم "چاند گرہن" میں محمد اسلم، فلم "لوان ہالینڈ" میں ندیم سے گلوکاری کروا کر انہیں پلے بیک سنگر ہونے کا اعزاز دلوایا۔

1996ء میں ریلیز ہونے والی جرار رضوی کی "جیتے ہیں شان سے" میں مقبول گلوکارہ حدیقہ کے عرفان کیانی نے بھی واجد علی ناشاد کی موسیقی میں گا کر فلم میں فرسٹ انٹری دی تھی۔

2002ء کی فلم "فائر" کے ذریعے واجد علی ناشاد اپنے صاحبزادے نوید واجد کو بطور گلوکار پہلا چانس دیا۔

واجد علی ناشاد کی فلمی سرگرمیاں ان کے دماغ میں ... کی موجودگی کا انکشاف ہونے کے بعد موقوف ہو گئیں بالآخر اس برین ٹیومر کی وجہ سے وہ 12 جون 2008ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تبارک تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے، آمین۔

واجد علی ناشاد مرحوم نے اپنے فنی کیریئر میں کم و بیش چالیس فلموں کی موسیقی ترتیب دی جن کے کچھ چیدہ پسندیدہ گیت پیش خدمت ہیں۔

☆ میں نہ بھلاؤں گا وعدے قسمیں۔ میں بھی نبھاؤں گی وفا (آوازیں مہدی حسن، مہناز، فلم پروانہ)
☆ چہرہ وہی ہے آنکھیں وہی ہیں۔ ہم بھی وہی تم بھی وہی ہو (آوازیں عمران، ناشاد ناہید اختر، فلم میرا انصاف)
☆ نی کڑیے پنجاب دی اے۔ نی پتے گلاب اے (آواز علی رضا، فلم ہاتھی میرے ساتھی)
☆ اب تھام لو جگر کہ غزل ہم سنائیں گے (آواز ... آخری مجرا)
☆ پھول کا بہار سے آنکھ کا خمار سے جو رشتہ ہے (آواز ... یں، فلم انتقام ہم لیں گے)
☆ جانے سے پہلے سوچ لو اتنا۔ اک دن واپس آؤ (آوازیں مہناز، اے نیر الگ الگ، فلم پروانہ)
☆ راستے وہی رہتے ہیں۔ مسافر بدل جاتے ہیں (آواز مہناز، فلم میرا انصاف)
☆ ہو گیا ہے تری دھڑکن میں بسیرا میرا (آوازیں ... غلام عباس، فلم آخری مجرا)
☆ موسم جوانی کا ہر موسم سے بڑھ کے سہانا (آواز ... فلم لیڈی کمانڈو)
☆ آنکھوں سے دل میں آیا۔ سانسوں میں تو سمایا (آوازیں ناہید اختر، شمسہ کنول، فلم مقدر کا سکندر)
☆ دل ہوا دیوانہ جب سے۔ تیری میری، میری تیری ... ہے (آواز مہناز، فلم فاصلے)
☆ زندگی کی ہر گھڑی دکھ ہی دکھ ریت کے دائرے (... طلب گار)
☆ پیار کسی پر آئے رہا نہ جائے۔ روگ بڑا عشقے دا (آواز مہناز، فلم مقدر کا سکندر)
☆ کیوں لوگ مجھے حد سے گزرنے نہیں دیتے (... نلور، فلم ڈریم گرل)
☆ کچھ کچھ ہوتا ہے میرے دل میں تجھے دیکھ کے (... جاوید، فلم ہم کسی سے کم نہیں)
☆ جب تک ہیں یہ چاند ستارے۔ اپنا پیار سلامت (... ظفر رامے، امیر علی، فلم بیٹا)
☆ جان من او جانِ جاناں زندگی ہے جواں (آواز ... انی، فلم جیتے ہیں شان سے)
☆ پیار نے پیار کو پہچانا۔ گر گئی ہر دیوار (آوازیں مہناز ... ناشاد، فلم مسکراہٹ)
☆ آپ سے تم ہوئے تم سے تو ہو گئے۔ اک دوجے ... ہو گئے (فلم تڑپ)
☆ دل میں بسا لے آنکھوں میں چھپا لے (آوازیں ... حمیرا چنا، فلم مس استنبول)
☆ شعلوں کو ہوا دیتا ہے۔ برسات کا موسم (آواز حمیرا ... چاند گرہن)
☆ چلا ہے جو یہ سلسلہ، عمر بھر ختم نہ ہو (آواز شازیہ ... میرے محبوب)

نخشب اور ناشاد

موت و حیات، کمال اور زوال سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔ ہاں مگر وہ یہ سب کچھ اپنے بندوں کے ذریعے کرواتا ہے۔ ناشاد کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اگر فلم ساز و ہدایت کار نخشب جارچوی، ان کے (ناشاد) ابتدائی دور میں ان کا سہارا نہ بنتے تو ان کی فنی ساکھ بن کھلے مرجھا جاتی۔ بمبئی میں ناشاد کی نصف درجن ابتدائی فلمیں باکس آفس پر فلاپ ہو گئیں تو وہ فلم انڈسٹری سے آؤٹ ہونے کے قریب تھے کہ نخشب نے انہیں نام بدل کر اپنی فلم "نغمہ" میں چانس دیا۔ یہ فلم سپرہٹ ہو گئی۔ اس کے گانے بھی ہٹ ہو گئے اور ان کی ڈوبتی ہوئی موسیقی کی نیا پار لگ گئی۔

ناشاد کی نظر انتخاب

ناشاد اچھے موسیقار ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے گلوکار بھی تھے۔ انہیں اچھی آوازوں کو پرکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ہنر آتا تھا۔ انہوں نے بمبئی میں سمن کلیان پور کو متعارف کرایا اور پاکستان میں کئی ابھرتی ہوئی آوازوں کی سرپرستی کی جن میں رونا لیلیٰ، بشیر احمد اور ان کے صاحبزادے عمران علی کے نام قابل ذکر ہیں۔ فلم انڈسٹری سے روشناس کرانے کے سلسلے میں نغمہ نگار تسلیم فاضلی کا نام خصوصی طور پر لیا جاتا ہے۔ ایسا فلمی شاعر جس نے مختصر مدت میں دھوم مچا دی، اس کا کریڈٹ ناشاد کو ہی جاتا ہے جنہوں نے ایک کمسن لڑکے کو موقع دیا۔ جس کے اندر چھپی خوبیوں کو انہوں نے ڈھونڈ نکالا۔

واجد علی ناشاد کو اپنے والد گرامی کی طرح بہتر وقت اور بہتر دور نہیں ملا۔ ناشاد کے دور میں پاکستانی فلمی صنعت اپنے عروج پر تھی۔ لاہور کے علاوہ کراچی میں بھی اچھی معیاری اور خوب صورت فلمیں بنا کرتی تھیں۔ اس لیے انہیں اپنے فلمی کیریئر میں زیادہ فلمیں ملیں اور ان فلموں نے باکس آفس پر توقعات کے عین مطابق اپنے تخلیق کاروں کو فائدہ پہنچایا لیکن واجد علی ناشاد نے جس زمانے میں فلموں کی موسیقی کا شعبہ سنبھالا، فلم انڈسٹری پہلے کی طرح مستحکم نہیں رہی تھی۔ نہ بڑے ہدایت کار رہے نہ بڑے فنکار رہے۔ باکس آفس پر فلموں کی آمدنی بھی متاثر ہونے لگی تھی۔ یہ تو اس انڈسٹری کی خوبی ہے

کہ برے سے برے وقت میں بھی کچھ سر پھرے لوگ اسے زندہ رکھنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے رکھتے ہیں، بہرحال واجد علی ناشاد کے کارنامے ناشاد کی طرح نہ سہی۔ انہوں نے جو کام کیا انہیں بھلایا بھی نہیں جاسکتا۔ ان کے کمپوز کیے ہوئے کچھ گیت پیش خدمت ہیں۔

☆ پل دو پل کا ساتھ نہیں ہے۔ ساتھ رہیں گے جب تک دم ہے (آواز امیر علی، فلم عاشقی کھیل نہیں)

☆ دل کی دھڑکن پھول بنا کے راہوں میں بکھرائیں
(آواز مہناز، فلم میرا انصاف)

☆ آئی ملن کی رت آئی۔ بجنے لگی پھر شہنائی
(آوازیں ناہید اختر، اے نیر، فلم لیڈی اسمگلر)

☆ ساون کی پہلی پھوار۔ دل میں جگاتی ہے پیار
(آواز مہناز، فلم دل بھی تیرا ہم بھی تیرے)

☆ دل چاہے آنکھوں میں قید کر کے تجھے۔ پلکوں کی چلمن گرالوں (آواز شازیہ منظور، فلم بازیگر)

☆ یہ جو چار دنوں کا ساتھ ہے۔ اتفاق کی بات ہے
(آواز حمیرا اچنا، فلم لوان استنبول)

☆ ایسے نہ مجھ کو دیکھو سجناں۔ میں اک لہر ہوں تو ہے ساگر (آواز مہناز۔ فلم انہونی)

☆ ڈرنا مرنا ہم کیا جانیں۔ چھوٹے ہیں پر بڑے سیانے (آوازیں شازیہ منظور اور بچے، فلم کبھی ہاں کبھی ناں)

☆ زندگی کے کسی موڑ پر۔ میں تجھ کو بھلا دوں یہ ممکن نہیں (آوازیں شازیہ منظور، امیر علی، فلم ڈریم گرل)

☆ میں ناچوں سنگ ہواؤں کے۔ یہ گھنگرو پاؤں میں کیا کہتے ہیں (آوازیں حمیرا اچنا، فاروق شاد، فلم بیٹا)

☆ تیرے سر کی قسم تو ملا تو صنم جانے کیا سوچ کر (آواز امیر علی، فلم عقابوں کا نشیمن)

☆ گورے گورے گال ہیں۔ کیا لڑکی ہے کمال ہے
(آواز وارث بیگ، فلم دلدل)

☆ یہ دل ہے تیرا دیوانہ۔ سن لے یہ سارا زمانہ
(آوازیں عاصمہ، لتا، ظہیر عباس، فلم یہ وعدہ رہا)

☆ میں تجھے بھول کر بھی بھولوں تو بھولوں کیسے
(تحسین جاوید، فلم بندش 2003)

☆ چاند زمیں پر گر سکتا ہے۔ سورج الٹا چل سکتا ہے
(آوازیں ظہیر عباس، حمیرا اچنا، فلم یہ وعدہ رہا)

☆ اے میری زندگی آ میرے پاس آ۔ چلنے دے یہ پیار کا سلسلہ (آواز شازیہ منظور، فلم عاشقی کھیل نہیں)

☆ میں کیا سوچتی ہوں تمہارے لیے۔ تم نہیں جا
(آواز حمیرا اچنا، فلم فائر)

لیجنڈ موسیقار ناشاد کے بیٹے واجد علی ناشاد کے بعد ا
کے پوتے نوید واجد کو بھی موسیقی کی دنیا میں اپنی فنی صلاحیتو
کے مظاہرے کا موقع ملا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ایں خانہ ہم آفتا
است۔ تو کچھ ایسی ہی بات ناشاد صاحب کے گھرانے کی
تھی۔ ان کے بیٹوں اور پوتوں نے بھی باپ دادا کے نقش قد
پر چلتے ہوئے گلوکاری موسیقاری میں اپنا کردار ادا کیا مگر ج
کہ عرض کر چکا ہوں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
انڈسٹری کی حالت پہلے جیسی نہیں رہی اس لیے بعد کی نسل کو
کامیابیاں نہ مل سکیں جو پہلی نسل کو ملی۔ بہرحال نوید واجد نا
نے گلوکاری کے علاوہ بطور موسیقار بھی اپنا کردار ادا کیا۔

نوید واجد ناشاد کی پاکستانی فلمی دنیا میں فرسٹ ان
2002ء کو ہوئی۔ اس سال ریلیز ہونے والی فلم ''فائر'' میں ا
جواں سال لڑکے نے بطور گلوکار اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ ف
پروڈیوسر اور رائٹر آصف علی پوتا کی بطور ہدایت کار فلم تھی۔ نوید
اپنے والد واجد علی ناشاد کی موسیقی میں گلوکارہ شبنم مجید کے س
ایک کورس سانگ میں گلوکاری کی تھی۔ جس کے بول تھے۔

دنیا کی ہر شے سے ظلم کو مٹا دیں گے

اس کے بعد واجد علی ناشاد نے اپنے اس بیٹے
2003 میں ریلیز ہونے والی فلم ''پیار ہی پیار میں''
ٹائٹل سونگ ''پیار ہی پیار میں'' میں حمیرا اچنا کے سا
گلوکاری کا موقع دیا۔ یہ فہیم برنی کی فلم تھی۔ واجد علی نا
نے اپنے اس بیٹے کو جسے موسیقی سے رغبت تھی، آہستہ آ
تربیت دینا شروع کر دیا تھا۔ گلوکاری کے ساتھ ساتھ
موسیقی کی ترتیب بھی دینے لگے تھے۔ اپنی فلموں
کمپوزیشن کے وقت اپنے اس بیٹے نوید کو بھی ساتھ ر
لگے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی طرح ان کا بیٹا
موسیقار بنے۔ اس لڑکے کو شوق بھی تھا کہ باپ کی ط
موسیقار بنے۔ اس نے اپنے کئی چچاؤں کو گلوکاری کر
دیکھا تھا جو زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

فلم ساز و ہدایت کار جرار رضوی جو نئے لوگو
متعارف کرانے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں
جب اپنی فلم ''سن آف پاکستان'' شروع کی تو اس کی
کے لیے انہوں نے واجد علی ناشاد کے بیٹے سے کام
ارادہ کیا اور واجد علی سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ میری فلم ''سن آف پاکستا

موسیقی تمہارا ابن نوید ترتیب دے۔ مجھے یہ لڑکا ٹیلنٹڈ نظر آتا ہے۔"

"اچھی طرح سوچ لیجیے۔ ابھی تک اس نے کسی فلم کی میوزک کمپوز نہیں کی ہے۔"

"ارے بھئی! اس نے گلوکاری بھی تو نہیں کی تھی۔ تم نے اسے چانس دیا تو اس نے مایوس نہیں کیا۔"

"ٹھیک ہے اگر آپ چاہتے ہیں تو......"

"مجھے اللہ رب العزت پر بھروسا ہے کہ نوید اپنی پہلی کوشش میں کامیاب ہوگا۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ تمہاری فلموں کی کمپوزیشن میں تمہارا ہاتھ بٹاتا ہے۔ یہ اس کی پہلی فلم ہوگی تو تم بھی اس کی مدد کرنا۔"

اور جرار رضوی کے اصرار پر نوید واجد ناشاد نے "سن آف پاکستان" کی موسیقی ترتیب دینا شروع کردی۔ کوئی بھی کام مشکل نہیں ہوتا اگر محنت اور لگن سے کیا جائے تو آسان ہو جاتا ہے۔

"سن آف پاکستان" کی کاسٹ میں ثناء، شامل خان، بابر علی، میرا، غلام محی الدین، صلہ حسن، شفقت چیمہ، لیلیٰ زبیری وغیرہ شامل تھے۔ اس فلم کی تکمیل میں خاصا وقت لگ گیا۔ بالآخر 16 دسمبر 2011ء کو فلم ساز و ہدایت کار جرار رضوی کی یہ فلم نمائش پذیر ہوئی جو نوید واجد کی بطور موسیقار پہلی فلم قرار دی گئی۔

یہ فلم تاخیر سے مکمل ہونے اور کمزور کہانی اور ہدایت کاری کی وجہ سے فلاپ ہوگئی۔ اس فلم کے لیے نوید واجد ناشاد نے جن گانوں کی کمپوزیشن کی ان میں کچھ یہ ہیں۔

☆ سن آف پاکستان (آواز امیر علی)

☆ بھنگڑا پنجابی پا ذرا (آوازیں امیر علی، صائمہ جہاں، ندیم عباس)

☆ کالی کالی تیری آنکھیں (آواز احمد جہانزیب)

☆ یہ موسم (آوازیں صائمہ ندیم عباس)

☆ بی بی شیرنی (صائمہ جہاں)

☆ توبہ توبہ (آواز ماریہ شوکت)

☆ ہم تم سے ملے (آوازیں صائمہ جہاں، امیر علی)

"سن آف پاکستان" باکس آفس پر کامیاب نہ ہو سکی مگر اس کے گانوں اور گانوں کی موسیقی کو پذیرائی ملی۔ فلم انڈسٹری نے اس نئے میوزک ڈائریکٹر کے بارے میں اچھی توقعات وابستہ کردیں۔ یہ سوچ غلط بھی نہیں تھی۔ نوید واجد کو بطور موسیقار اگلی فلم "بھائی لوگ" ملی۔ یہ ہدایت کار سید فیصل بخاری کی فلم تھی۔ اچھے ڈائریکٹر نے اچھی کہانی پر محنت کی تھی۔

ان کی بہترین ٹریٹمنٹ کی وجہ سے ان کی فلم سپرہٹ ہوگئی۔ اس کامیابی میں موسیقار نوید واجد ناشاد کی بہترین موسیقی کا بھی نمایاں کردار تھا۔ برصغیر میں اچھی موسیقی اور اچھے گانوں کی وجہ سے فلموں کی کامیابی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ "بھائی لوگ" نے 2011ء کو عیدالفطر کے موقع پر ریلیز ہو کر سپرہٹ کامیابی کا تاج اپنے سر پر سجایا۔ نوید واجد نے اس فلم کے لیے بڑی دلکش دھنیں بنائی تھیں اور گلوکاری بھی کی تھی۔ اس فلم کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا نغمہ یہ تھا۔

☆ میرے جیون میں جب سے تم آئے۔ بڑھنے لگیں دلچسپیاں

یہ اداکارہ نور اور اداکار شمعون عباسی پر فلم بند ہوا تھا۔ ان دونوں کی خوب صورت پرفارمنس نے بھی اسے بہترین بنا دیا تھا۔

اس کے علاوہ ببرک شاہ پر فلمایا ہوا گیت بھی خوب رہا۔

چنگا منگا لگتا ہے۔ اپنا اپنا لگتا ہے

دیگر گانوں میں

☆ آج ساری رات جھومے گی

☆ جھنکارے سر پہ نیناں۔ سجناں دل بے قرار

☆ اپن کے پاس کون؟

نوباڈی

اپن سے آگے کون؟

نوباڈی

بھائی لوگ بھائی لوگ

یہ ٹائیٹل سانگ تھا جو کہانی کی مناسبت سے بہت پسند کیا گیا۔ اس فلم کی کامیابی نے نئے موسیقار نوید واجد کو کامیاب موسیقاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

سید فیصل بخاری کی اگلی فلم "سلطنت" تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نوید واجد ہی اس فلم کے بھی موسیقار ہوتے مگر ہدایت کار کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ غالباً فلم ساز کی پسند پر انہیں ساجد حسین کو موسیقار لینا پڑا۔ پھر بھی انہوں نے نوید واجد علی سے اس فلم کے لیے ایک گانے کی کمپوزیشن کروائی۔

☆ جے میں ہوندی ڈھولنا ہو ڈھولنا سونے دی تو بجڑی۔

جسے شاہدہ منی کی آواز میں نئے انداز سے ترتیب دیا۔

"سلطنت" کے باقی سارے گانے ساجد حسین نے کمپوز کیے تھے۔ یہ فلم 2014ء میں عیدالفطر کے موقع پر ریلیز ہوئی تھی مگر "بھائی لوگ" کی طرح پسند نہیں کی گئی۔

"سلطنت" کے بعد سید فیصل بخاری کی اگلی فلم "بلائنڈ لو" تھی۔ فیصل بخاری نے اس فلم کی موسیقی کی مکمل ذمہ داری نوید واجد ناشاد کو سونپ دی۔ نوید نے اس فلم کی موسیقی بہت سوچ سمجھ کر، محنت اور لگن کے ساتھ کمپوز کی۔ اب اس کی رہنمائی کے لیے واجد موجود نہیں تھے۔ ان کی باتیں اور مشورے یاد تھے اور باپ کے علاوہ دادا کے کارنامے بھی اس کے سامنے تھے۔ انہی کو رہنما بنا کر نوید نے اپنی کارکردگی کا سفر جاری رکھا۔ "بلائنڈ لو" 5 اگست 2016ء کو ریلیز ہوئی اور اس فلم کے ساتھ اس کی موسیقی کو بھی سراہا گیا۔ نوید نے اس فلم میں بھی مناسب جگہ گلوکاری کی۔ "بلائنڈ لو" کے یہ گیت خاصے پسند کیے گئے۔

☆ پیار میں کھویا ہوں اس قدر
جب سے تو آئی دل کے گھر
میری رات تو۔ تو میری سحر
تیری عاشقی میری زندگی بن گئی (آوازیں امیر فاروق، نوید واجد)

☆ جانیا جانیا لے کے تیری سانسیں۔ میری سانسیں چلتی ہیں

☆ ہٹر جوانی (آئٹم سونگ)

ہدایت کار شعیب خان کی فلم "جیک پوٹ" موسیقار نوید واجد ناشاد کی عنقریب ریلیز ہونے والی فلم ہے۔ اس کی نمائش جولائی 2018ء کو ہوگی۔ ان کے ریکارڈ کیے ہوئے گانے فلم کی ریلیز سے پہلے ہی پسند کیے جانے لگے ہیں۔ اس فلم کی ہیروئن ماڈل و اداکارہ صنم چوہدری ہیں جب کہ جاوید شیخ نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس فلم کے حوالے سے بھی نوید کی کامیابی کی زبردست توقعات ہیں۔

نوید واجد نے اپنے والد گرامی واجد علی ناشاد کی طرح فلم انڈسٹری کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن انڈسٹری میں بھی ایک قابل اعتبار مقام بنایا ہے۔ ٹی وی ڈراموں کے لیے گلوکاری کے ساتھ ڈراموں کے ٹائیٹل سونگ اور بیک گراؤنڈ میوزک ترتیب دینے کی ذمہ داری احسن طریقے پر انجام دی ہے۔ ان کی موسیقی میں ڈراما "بس اک تیرا انتظار" کا ٹائیٹل سونگ راحت فتح علی نے گایا ہے۔ اس طرح "دل کی باتیں دل ہی جانے" کا ٹائیٹل سونگ نوید واجد ناشاد اور صائمہ جہاں نے گایا ہے۔ ڈراما دیوانے کا نغمہ، عشق سن (آواز فرید ایاز)، دل لوٹنا تا آیا نہیں (آواز امانت علی) بھی قابل ذکر ہیں۔

"سورج مکھی، وجود، زندگی مجھے تیرا پتا چاہیے، دل میرا چھپ چھپ کر روئے اور پھر کب ملوگی" نوید واجد کے دیگر ڈرامے ہیں۔ جن میں ان کی موسیقی کا حصہ ہے۔

علاوہ ازیں شاہدہ منی شو میں بھی نوید واجد ناشاد کی کارکردگی شامل رہی ہے۔ جب کہ جواں سال موسیقار نوید واجد نے محمد جواد کی آواز میں پاکستان کرکٹ ٹیم کے لیے ہدایت کار احسن طالش کے تیار کردہ نغمے کی کمپوزیشن بھی کی ہے۔ ابھی اس باصلاحیت موسیقار کے آگے اس کا مستقبل ہے جو انشاء اللہ اسے مزید کامیابیوں سے سرفراز کرے گا۔

ہماری فلم انڈسٹری میں بھارتی فلم انڈسٹری کی طرح اداکاری کے شعبے میں باپ کے بعد بیٹے اور بیٹوں کے بیٹوں کا سلسلہ کامیاب نہیں ہوا۔ اگرچہ باپوں نے بیٹوں کو آگے بڑھانے کی کوشش ضرور کی۔ سدھیر نے اپنے بیٹے کو اپنی فلم کے ذریعے ہیرو بنایا مگر وہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اسی طرح ہرفن مولا رنگیلا نے بھی اپنی فلم میں اپنے ایک بیٹے کو ہیرو بنا کر پیش کیا، وہ بھی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وحید مراد کا بیٹا عادل مراد بھی لوگوں کی بڑی جدوجہد کے باوجود کامیاب اداکار نہ بن سکا۔ ندیم صاحب کے بیٹوں میں ایک شوبز سے وابستہ ہے مگر اداکاری کی بجائے ٹی وی پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے، اداکار کمال کے بیٹے غالب کمال نے بھی اداکاری کے میدان میں قدم رکھا مگر وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا تب اس بطور "اینکر" ٹی وی پر اپنے جوہر دکھائے۔ یہاں بھی اسے وہ کامیابی نہ ملی جس کی توقع تھی۔ ایک دو کے علاوہ ان کے تمام شو ناکام رہے ہیں۔ نشو کی ایک بیٹی نے کچھ فلموں میں کام کیا مگر شادی کے بعد گھر بیٹھ گئی۔ دیگر بڑی اداکاراؤں کے بچوں میں کسی نے بھی پرفارمنگ آرٹ پر توجہ نہیں دی۔ جاوید شیخ کے بعد اس کے بیٹے اور بیٹی نے اداکاری کے شعبے میں قدم رکھا ہے۔ ان کے بعد ان کی اولادوں کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ فلم انڈسٹری کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی اولادوں نے بھی اداکاری میں۔ باپ کے پیشے میں دلچسپی نہیں لی۔ البتہ موسیقی کے شعبے میں رشید عطرے کے بعد ان کے فرزند وجاہت عطرے اور ایم اشرف کے بعد ایم ارشد اور ناشاد کے بعد ان کے ہونہار بیٹے واجد علی ناشاد اور واجد ناشاد کے بعد ان کے فرزند نوید واجد علی ناشاد نے موسیقار کی حیثیت سے باپ دادا کے شعبہ موسیقی کی مشعل کو روشن رکھا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ نوید کی اولاد بھی اس شعبے سے وابستہ ہو کر اس پشتنی سلسلے کو اور آگے بڑھائے، آمین۔

قاتل

سید جاذب

وہ ایک معصوم سی لڑکی تھی اور وقت گزاری کے لیے پارک میں گئی تھی، اسے کیا خبر کہ وہاں اس کی ملاقات دو ایسے افراد سے ہو جائے گی جو کھیل ہی کھیل میں بڑا قدم اٹھا لیں گے۔ انہوں نے یہ قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ قانون ان تک پہنچ نہیں پائے گا مگر ایک زیرک آفیسر نے تانے بانے اس طرح بُنے کہ مجرم گرفت میں آ ہی گیا۔

ایسے جرائم اور ایسی تفتیش یورپ میں ہی ہوتی ہیں

آج گشتی پولیس آفیسر پیٹر کی ڈیوٹی قدرے نرم تھی۔ وہ کاؤنٹی پارک میں تنہا اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ لوگ ایسے خراب موسم میں پارکوں میں نہیں آتے تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بارش کے آثار تھے۔ فضا میں ایک عجیب سی بے کیفی اور سوگواری رچی ہوئی تھی۔ کھلے میدانوں اور جنگلوں میں یخ ہوائیں سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ ریسٹ روم کی عمارتوں کو چیک کرنے کے دوران پیٹر کو کئی بار ان شوریدہ... یخ ہواؤں کا مزہ چکھنا پڑا اور پھر اس نے اپنی گشتی کار میں پناہ لینے میں ہی عافیت سمجھی جس کا اندرونی ٹمپریچر گرم اور سکون بخش تھا۔ دوپہر میں اس نے گھر سے لایا ہوا لنچ کھایا اور ریڈیو سے اپنی رپورٹ پیش کی۔

پارک بالکل خالی تھا۔ اس کے دونوں پھاٹک اندھیرا چھانے تک کھلے رہتے تھے۔ کاؤنٹی کے ٹیکس دہندگان چاہتے تھے کہ پارک وقت مقررہ تک کھلا رہے۔ چاہے موسم کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ایک بجے سے کچھ ہی پہلے ایک کار پارک میں داخل ہوئی۔ پیٹر نے کچھ دوری پر واقع ایک پہاڑی پر سے اپنی دوربین کے ذریعے اس کار کو دیکھا۔ وہ پارک میں کوئی سو گز تک اندر آئی اور رک گئی۔ اس میں سے ایک مرد اور ایک عورت برآمد ہوئے۔

وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سرسبز گھاس پر آگے بڑھ رہے تھے۔ دیوانے پیٹر نے سوچا۔ میری ڈیوٹی نہ ہوتی تو میں ایسے موسم میں کسی آرام دہ بار کو ترجیح دیتا۔ اس نے اپنا گشت جاری رکھا۔ اسے سات ہزار ایکڑ میں واقع بہت سے پارکوں کو کنٹرول کرنا پڑتا تھا۔ موسم گرما کے کسی ویک اینڈ میں ان پارکوں میں بے پناہ ہجوم ہوتا تھا اور کم سے کم تین گشتی پولیس آفیسر ڈیوٹی پر ہوتے تھے لیکن آج اس کا کام سڑکوں کی بھول بھلیوں میں صرف گشت لگا کر لوگوں کو اپنا یونیفارم اور اپنی کار دکھانا اور ان پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ ان کی حفاظت کی جا رہی ہے۔ حالانکہ ایک گشتی آفیسر ایک ہی وقت میں ہر جگہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک اور کار وہاں آ گئی تھی اور وہ اسے آتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔ کار خالی تھی اور سڑک کے بالکل قریب ہی چہل قدمی کے لیے بنے ہوئے بجری کے پختہ راستے کے ایک سرے پر کھڑی تھی۔

☆......☆

اس نے کار کا نمبر نوٹ کیا۔ اس پر اسی ریاست کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ کار نمبر پلیٹ سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ ایک کھٹارا سی زنگ آلود شیری جسے دیکھ کر کوئی اچھا تاثر نہیں ابھرتا تھا۔ غنڈے شہدے ایسی ہی کاروں میں دندناتے پھرتے ہیں لیکن آج غالباً اس میں ایک ہی جوڑا آیا تھا۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی اور وہ یقیناً کسی اچھے مقصد سے نہیں آئے تھے مگر اسے لوگوں کی جاسوسی کرنے کی تنخواہ دی جاتی تھی اور نہ ہی یہ اس کے فرائض میں شامل تھی۔ اس نے کار کو ذہن نشین کیا اور آگے بڑھ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ وہاں لوٹا، اس دوران اس نے اس جوڑے کو روک کر ان سے گپ شپ کی تھی جن کی کار اس نے اپنی دوربین سے دیکھی تھی۔ وہ جوڑا ادھیڑ عمر کا تھا۔ دونوں میاں بیوی سیر و تفریح کے دلدادہ تھے۔ وہ ان نئے درختوں اور پودوں کے متعلق اظہار خیال کرتے رہے تھے جو پارک میں لگائے گئے تھے۔ سرخ رنگ کی وہ کھٹارا شیری اب تک وہیں پارک



تھی لیکن اب اس کے قریب زرد رنگ کی ایک اور مستانگ کھڑی نظر آ رہی تھی لیکن دونوں کاروں کے ڈرائیوروں اور مسافروں کا کوئی پتا نہ تھا۔

پیٹر تھوڑا سا پریشان ہوا۔ ساتھ ہی وہ خالی کار کی موجودگی پر محظوظ بھی ہوا۔ ممکن ہے ہر کار میں ایک ہی مسافر ہو اور انہوں نے پارک کے کسی دور افتادہ گوشے میں ملاقات طے کی ہو لیکن ایسا لگتا نہیں تھا۔ دونوں کاریں آپس میں مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ زرد مستانگ کے لوگ کھٹارا شیری والوں کے لیے اجنبی لگتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ کیا مستانگ کے لوگ شیری والوں کی خلوت میں مخل ہو رہے تھے؟ پیٹر نے سوچا یہ ایک دلچسپ منظر ہوگا اور اس نے اپنی کار آگے بڑھا دی۔ بڑا ہی اداس اور بے کیف دن تھا مگر وہ ہنسنا چاہتا تھا۔

☆......☆

کیرول تنہائی چاہتی تھی۔ چنانچہ جب اسے وہاں سرخ رنگ کی ایک کھٹارا سی شیری کھڑی نظر آئی تو وہ ہچکچا گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے پارک کا کوئی اور حصہ چننا چاہیے لیکن اسے یہ حصہ بہت پسند تھا۔ لہٰذا اس نے سوچا اگر گاڑی کے مالکان سے اس کی مڈبھیڑ ہو بھی گئی تو وہ اس کے قریب سے گزر جائیں گے اور پھر اسے تنہائی میسر آ جائے گی۔ پہلے پہل اس نے اس خیال سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ کہیں وہ لوگ آس پاس نہ ہوں لیکن کئی سو گز تک کسی متنفس کا نام و نشان نہ تھا۔ جنگل اور اس کا سکوت اسے اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ وہ درختوں کی پتیوں کا جائزہ لیتے ہوئے دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگی۔ کچھ پتیاں اب بھی زرد تھیں۔ فضا میں بھی خزاں جیسی ویرانی رچی ہوئی تھی۔ اگرچہ موسم سرد تھا۔ ''دیکھو۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''درخت بھی خود کو نئے موسم سے ہم آہنگ کر رہے ہیں۔ تم خود کو ہم آہنگ کیوں نہیں کر سکتیں، کیرول؟''

انسانی زندگی بھی رُتوں کا شکار ہوتی ہے، کبھی بہار آتی ہے اور دل کی شاخ پر پھول کھلتے ہیں اور کبھی خزاں کی رُت ان پھولوں کا چہرہ نوچ لیتی ہے۔ اس صبح اس نے اپنی جان لینا چاہی تھی۔ اسے ایک ایسی حقیقت کا سامنا کرنا پڑا تھا جسے وہ پہلے نظر انداز کرتی رہی تھی لیکن مزید نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا محبوب اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ شاید اس نے کبھی اس سے محبت کی ہی نہیں تھی۔ وہ کسی اور لڑکی کو چاہتا تھا اور کیرول اس درد کو فراموش کرنا چاہتی تھی لیکن فراموش کرنے کی بجائے وہ بھاگ کر یہاں آ گئی تھی۔ اس گوشۂ عافیت میں اور یہ امید لے کر کہ یہ گوشۂ عافیت اس کی محبت کا جواب محبت سے دے گا۔ اسے یہاں آ کر بہت سکون مل رہا تھا۔ یہ فضا اور اس پر چھایا ہوا سکوت گویا اس کے حواس کو تھپکیاں دے رہے تھے۔ رخصت ہوتے ہوئے موسم خزاں کی ہلکی ہلکی بو بھی اسے بھلی لگ رہی تھی۔ یہ جذباتی کیفیت

بلوچ کا مفہوم

پنجاب میں لفظ "بلوچ" جن افراد کی نشاندہی کرنے کے لیے مختلف انداز میں استعمال ہوتا ہے ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

1۔ خاص بلوچ، ایک قوم جو اپنا ماخذ مکران سے ملاتی ہے اور اس وقت کوہ سلیمان کی ترائی میں آباد ہے۔

2۔ ایک قبیلہ جو تھانیسر کے نیچے گھنے جنگلوں میں مقیم ہے۔

3۔ پنجاب کے انتہائی مشرق اور انتہائی مغرب کے علاقوں کے علاوہ کوئی بھی اونٹ سوار مسلمان۔

4۔ ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک پٹھان قبیلہ زیادہ تر بلوچ (بل+اوچ-Baluch) کہلاتا ہے۔

یہ امکان بھی ہے کہ یہ محض حقیقی بلوچیوں کا ہی ایک چھوٹا سا گروہ ہو جو پٹھانوں کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ لیکن مغربی میدانوں کی بالائی چراگاہوں میں بلوچ پناہ گزینوں نے کاشت کاری کی بجائے اونٹ پالنے اور چرانے کا کام اپنا لیا ہے اور یوں لفظ بلوچ اونٹوں کی پرورش کرنے کے لیے مخصوص ہو گیا۔ یہاں تک کہ سارے پشاور، راولپنڈی، لاہور، امرتسر اور جالندھر اضلاع میں لفظ بلوچ کا استعمال صرف مسلمان اونٹ سوار کے لیے ہی ہوتا ہے۔ چاہے اس کی ذات کچھ بھی ہو۔ ہر بلوچ کا اونٹ سوار ہونا اور ہر مسلمان اونٹ سوار کا بلوچ ہونا فرض کر لیا گیا ہے۔ سرسا میں ملتان سے آنے والے

کچھ اس طرح اس کے حواس پر طاری تھی کہ وہ پہلے پہل کچھ فاصلے پر ہونے والی حرکت اور قدموں کی آہٹ کو محسوس کرنے یا سننے سے قاصر رہی۔ کئی پیچ و خم کے عقب میں شوخ سرخ اور نیلا رنگ فطرت کے سبز، زرد اور بھورے رنگوں کے درمیان انہی کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ حالانکہ قدموں تلے جھاڑیوں کے چرمرانے اور ٹوٹنے کی آوازیں حقیقت کا مظہر تھیں کہ یہ قدم کسی خرگوش یا پرندے کے نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جب بجری والی خمیدہ پختہ روش کا موڑ مڑتے ہی اس نے اچانک خود کو دو اجنبیوں کے سامنے پایا تو یکلخت بوکھلا اٹھی۔ دونوں لڑکے تھے۔ ایک کے جسم پر سرخ اونی قمیص تھی اور دوسرے کے جسم پر شوخ کپڑوں کے اوپر نیلے رنگ کی جیکٹ۔ اس غیر متوقع مڈبھیڑ کے پہلے لمحے میں یہ اس کا پہلا ردِعمل تھا۔ جیسے ننھی سی مخلوق کے سامنے اچانک کوئی درندہ آ گیا ہو۔ اسے اپنے رگ و پے میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ راستہ تنگ تھا پھر بھی اتنا کشادہ تھا کہ مخالف سمت سے آنے والا بہ آسانی سے گزر سکتا تھا لیکن وہ ایک طرف یوں سمٹ گئی جیسے وہ راستہ صرف ان اجنبیوں کے لیے بنا تھا اور پھر وہ اس تیزی سے گزر گئی کہ جس پر بھاگنے کا گمان ہو۔ اس کے اس عجیب و غریب رویے کا سبب یقیناً خوف تھا۔ یہ وہ خوف تھا جو وہ اس وقت ہر بشر سے محسوس کر رہی تھی۔ انسانیت نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ کسی کو بھی اس سے محبت نہیں تھی۔ اب کوئی بھی اس سے محبت نہیں کر سکتا تھا، کبھی نہیں۔ چنانچہ وہ ان دونوں لڑکوں سے ڈر کر بھاگی تھی جن کا وہ نام تک نہیں جانتی تھی۔

☆......☆

اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ دوڑنے لگتی۔ بالآخر اس نے اپنی رفتار کم کر دی اور مڑ کر دیکھا اور جو کچھ دیکھا، اس سے اور بھی حواس باختہ ہو گئی۔ وہ دونوں موجود تھے۔ سرخ قمیص اور نیلی جیکٹ والے...... اس سے تقریباً پچاس فٹ دور تھے اور مسکرا رہے تھے۔ وہ چلنے لگی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور خوف کی لہر اس کے دل ہی میں نہیں خون میں بھی رواں تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اپنی کار کی طرف لوٹ رہے تھے لیکن اب انہوں نے اپنا رخ بدل دیا تھا اور اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ ایسے سرد موسم میں اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس گھنے جنگل میں دنیا والوں کی نگاہوں سے دور اس بیلی پارک میں جہاں کوئی کسی کی آواز تک نہیں سن سکتا تھا۔

وہ کیا کرے، مڑ کر پھر ان کے قریب سے گزرنے کی کوشش کرے یا سیدھے ان کے سامنے پہنچ جائے۔ وہ اسے جانے دیں گے۔ پھر وہ کیا کرے، کیا آگے اور آگے، جنگل کی طرف دوڑنے لگے یا پُرسکون رہ کر ان کی چھیڑ خانی کو قطعی نظر انداز کر کے چلتی رہے؟

چھیڑ خانی! ہاں وہ یہی کر رہے تھے۔ بے شک

اور راجپوت صرف اونٹ پالنے کی وجہ سے بطور بلوچ جانے جاتے ہیں۔

پنجاب کے جٹ

پنجاب کے لوگوں میں جٹ ہر اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ تعداد کے معاملے میں وہ راجپوت کو بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے جو اس کے ساتھ 3:1 کی نسبت رکھتا ہے، جب کہ یہ دونوں مل کر پورے صوبے کی کل آبادی کا 27 فیصد ہیں۔ نسلیاتی اعتبار سے وہ پنجاب کی پانچ دریاؤں والی سرزمین کی مخصوص اور انتہائی مختار پیداوار ہے اور معاشیاتی و انتظامی نکتہ نظر سے وہ صوبے کا بہترین کاشت کار، کسان اور مالیہ ادا کرنے والا ہے۔ اس کے آداب و اطوار میں وحشی آزادی والی ان نسلوں کا تاثر نہیں ملتا جو سرحدی پہاڑوں کی نسلوں کی شناختی علامت ہیں لیکن وہ زیادہ ایماندار، زیادہ محنت کرنے والا، زیادہ قوی الجثہ اور ان کے مقابلے میں کسی بھی طرح کم مردانہ نہیں۔ درحقیقت پختہ خود مختاری اور صابرانہ محنت اس کی مضبوط ترین خصوصیات ہیں۔ پنجاب کی تمام نسلوں میں جٹ قبیلوں، برادرانہ بندھنوں اور تنظیم سے نہایت بیزار انفرادی آزادی کا زبردست حامی ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں / از: سر ڈینزل ابٹسن
مرسلہ: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

رہے تھے، اگر وہ چاہتے تو اب تک اس کے قریب پہنچ جاتے لیکن انہوں نے اس کا تعاقب کرنا پسند کیا تھا۔ وہ اس کے خوف سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

وہ چلتی رہی۔ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ انہیں اپنے تعاقب میں آتے ہوئے محسوس کر سکتی تھی۔ ابھی وہ لڑکے اس کھیل سے اکتائے نہیں تھے۔ اس پگڈنڈی کا دوسرا سرا بہت دور تھا۔ اگر وہ تعاقب جاری بھی رکھتے تو وہ ایک مرتبہ جنگل سے نکل جانے کے بعد ان سے امان پا جائے گی۔ وہ چاہتے کیا تھے؟ اسے چھیڑنا، اس نے خود کو یقین دلایا۔ دو لڑکوں کو ایک لڑکی تنہا مل گئی تھی اور وہ اسے ڈرانا چاہتے تھے۔ اگر وہ بعد میں پارک کے کسی گشتی آفیسر سے ان کی شکایت بھی کرتی تو وہ نہایت سچائی سے یہ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ پھر بھی وہ ان سے خائف تھی۔ وہ ان کی نگاہوں کو اپنے جسم پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے چہل قدمی کے خیال سے پتلون اور سویٹر پہن رکھی تھی، پتلون بے حد چست تھی۔ اس نے اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی کہ وہ اسے کس طرح دیکھ رہے ہوں گے۔ شاید وہ اس کے پرس کو گھور رہے تھے جو اس کے شانے سے لٹک رہا تھا۔ اگر وہ اس کا پیچھا چھوڑنے پر راضی ہو جاتے تو وہ بڑی خوشی سے اپنا پرس ان کے حوالے کر دیتی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پرس گرا دے اور آگے بڑھ جائے تاکہ ان کی توجہ اس طرف مبذول ہو۔

اس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ خوف اور دہشت نے ایک بار پھر کسی ناگ کی طرح اس کے اندر پھن کاڑھ لیا تھا۔ اس نے پھر مڑ کر دیکھنے کی غلطی کی اور گر پڑی۔ اسے ٹھوکر لگی تھی اور وہ پگڈنڈی پر چاروں خانے چت ہو گئی تھی۔ تعاقب کرنے والے بھی رک گئے تھے۔ کیرول کا منہ کھل گیا تھا اور اس کے چہرے نے گویا خوف کی تصویر کھینچ لی تھی۔

کئی سیکنڈ گزر گئے۔ وہ اپنی نگاہیں ان کے متبسم چہرے سے ہٹانے کے قابل نہیں ہو سکی تھی لیکن اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے کچھ کرنا تھا۔ انہوں نے اس پر غلبہ پا لیا تھا۔ وہ اس کے قریب آنے کی جسارت کر چکے تھے۔ اب نہ تو وہ ان سے بھاگ سکتی تھی اور نہ ہی چیخ سکتی تھی۔ اگر چیختی بھی تو کون سنتا اور ممکن ہے یہ چیخ انہیں گھبراہٹ میں کچھ کر گزرنے پر مجبور کر دیتی۔ نہیں اسے پُرسکون رہنے کی ضرورت تھی پُرسکون اور دلیر۔

وہ بہ آہستگی اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلی بار ان سے ہمکلام ہوئی۔ "تم کیا چاہتے ہو؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

وہ بدستور مسکراتے رہے۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دوسرے کو دیکھا اور شانے اچکا کر رہ گئے۔

"تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟" اس نے قدرے جرأت سے کام لے کر کہا اور غور سے انہیں دیکھا۔ دونوں اٹھارہ بیس سال کے تھے۔ نہ طالب علم نہ ملازم ورنہ دن کے

اس پہر وہاں پارک میں نہ ہوتے۔ وہ وہاں کیوں تھے؟ اس جیسی کسی تنہا اور بے بس لڑکی کی تلاش میں تھے۔ وہ غنڈے تھے، شہدے تھے، اٹھائی گیرے تھے مگر بہت ذہین اور خطرناک نہیں تھے۔

''پلیز میرا پیچھا کرنا چھوڑ دو۔'' وہ بولی۔ اس کے لہجے میں التجا بھی تھی اور دھمکی بھی لیکن الفاظ بالکل واضح تھے۔

سرخ قمیص والا مخاطب ہوا۔ ''خاتون یہ ایک پبلک پارک ہے۔''

گویا وہ اس کا پیچھا کرتے رہیں گے۔ ''بھاگو۔'' اس نے سوچا۔ پگڈنڈی پر نہیں کیونکہ یہ تمہیں آسانی سے پکڑ لیں گے بلکہ سیدھے جنگل میں۔ اپنا پرس گرا دو اور جنگل میں بھاگتی چلی جاؤ۔ ممکن ہے یہ تعاقب کرنے کی زحمت نہ کریں۔ سرخ قمیص والے نے ایک قدم بڑھایا صرف ایک قدم اور وہ اپنا پرس گرا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

☆......☆

وہ جنگل جو کبھی اس کا غم گسار تھا، اچانک ایک خطرناک دشمن بن گیا۔ شاخیں اور ٹہنیاں اس کے اڑتے ہوئے لمبے بالوں کو جکڑنے لگیں۔ ان الجھے ہوئے بالوں کو چھڑانا خاصا تکلیف دہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت طلب تھا۔ شاخیں اس کے چہرے پر کوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ اس کی جیکٹ اور پتلون پھٹ گئی تھی۔ جھاڑیاں اس کے جسم سے لپٹ رہی تھیں، اسے بری طرح جکڑ رہی تھیں اور وہ ان کے حلقوں سے نکلنے کی جدوجہد کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی حالانکہ وہ پوری قوت سے بھاگنا چاہتی تھی لیکن جھاڑیوں اور درختوں کی ٹہنیوں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی تھی۔ اس کی کیفیت اس شخص کی سی تھی جو خواب میں پوری رفتار سے بھاگنا چاہتا ہو اور بھاگ نہ پا رہا ہو۔ اسے اپنے پیر کسی دھات کے بنے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی سماعت سے اپنے رونے اور سسکنے کی آواز ٹکرا رہی تھی لیکن ایک آواز اور بھی تھی جو اس آواز پر حاوی تھی۔ وہ تھی بھاری قدموں کی دھمک اور بھاری جسموں سے ٹکرا کر ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز۔

وہ بھاگتی رہی۔ اس کی ہمت اور طاقت دونوں ہی جواب دے رہی تھیں پھر بھی اسے بھاگتے رہنا تھا۔ وہ گرتی پڑتی، ہانپتی کانپتی، روتی اور سسکیاں لیتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ قدموں کی دھمک اب بھی اس کا تعاقب کر رہی تھی اور قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

جنگل کی حد اچانک ختم ہو گئی۔ اس کے سامنے اداس اداس سی تاریک اور شفاف سطح تھی جو روٹھے روٹھے سے اودے اودے آسمان کو منعکس کر رہی تھی۔ تالاب وہ بھول گئی تھی کہ یہاں ایک تالاب بھی تھا جو جھکی ہوئی شاخوں اور ٹہنیوں سے گھرا ہوا ہونے کے باعث پگڈنڈی سے نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے کئی بار پرندوں کو اس تالاب کے کنارے پانی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے ایک بار اس کے یخ پانی میں اپنی انگلی ڈبو دی تھی۔ اس تالاب میں تیرنا منع تھا کیونکہ اس میں سانپ پائے جاتے تھے پھر بھی وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہچکچائی۔ وہ ایک اچھی پیراک تھی، لہٰذا اسے پانی سے کوئی خوف نہیں آتا تھا۔ اگر وہ پیراک نہ بھی ہوتی۔ اگر تالاب کی چوڑائی سو گز سے بھی زیادہ ہوتی اور گہرائی نامعلوم پھر بھی وہ اتنی دہشت زدہ نہ ہوتی جتنی وہ ان تعاقب کرنے والوں سے تھی جن کے چہرے پر مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

اس نے تالاب میں یوں چھلانگ لگائی گویا وہ تالاب ہی اس کا مسکن ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سطح آب پر ابھری اور آگے کی طرف تیرنے لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ تالاب عبور کرنے کے بعد وہ کیا کرے گی۔ اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ سرخ قمیص اور نیلی جیکٹ والے لڑکے بھی شاید اسی کے جتنے اچھے پیراک تھے۔ اس نے بے بسی کے عالم میں گھبرا کر تالاب میں چھلانگ لگائی تھی مگر جب اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ لڑکے تالاب کے کنارے رک گئے تھے اور چہرے پر وہی مسکراہٹ سجائے اسے گھور رہے تھے۔ اس نے اپنے چہرے کو جھٹکا۔ لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگے۔ ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ وہ ایک لفظ بھی سننے سے قاصر رہی۔ اس نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو آہستہ سے حرکت دی اور ان سے تھوڑی دور ہو گئی۔ اسے امید تھی کہ وہ واپس پگڈنڈی کی طرف لوٹ جائیں گے اور وہ تالاب کے اس پار نکل کر جنگلوں میں سے مختصر راستہ اختیار کر کے کسی قریبی سڑک پر پہنچ جائے گی۔ وہ دوبارہ دونوں کا سامنا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ یخ پانی نے اس کے دماغ پر اچھا اثر ڈالا تھا اور پانی کے ماتھ احساس نے اس کے اندر تحفظ کا ایک نیا احساس جگا دیا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دیتی ان سے مزید دور ہونے لگی۔

☆......☆

سرخ قمیص والا اپنے ساتھی سے الگ ہو گیا تھا اور تالاب کے گرد چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچ رہا تھا۔ کیرول ان سے بھاگ نہیں سکی تھی بلکہ پھنس گئی تھی۔ تب وہ پہلی بار چیخی۔ یہ دہشت آمیز بے بسی کی بھیانک چیخ تھی لیکن جنگل نے اس کی چیخوں کو تالاب تک محدود کر دیا۔ وہ چیختی چلی گئی یہاں تک کہ اس کے پھیپھڑوں میں ہوا نہ رہی اور وہ نڈھال ہو گئی۔ اس کی ناک پانی میں ڈوب گئی۔ اسے سانس لینے کے لیے دوبارہ سطح پر ابھرنا پڑا۔ اسے اذیت پہنچانے والے تالاب میں اترنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ پیراک نہیں لگتے تھے۔ موسم سرد تھا اور تالاب کا پانی یخ تھا۔

وہ کب تک تیر سکتی تھی؟ اگر کوئی اور موقع ہوتا اور پانی گرم ہوتا تو وہ گھنٹوں تیرتی رہتی لیکن اب وہ یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ تالاب کا یخ پانی اس کی توانائی چوس رہا تھا۔ اگر وہ کہیں بیٹھ کر اپنے پیروں کو ذرا آرام دے تو کیا بہتر محسوس کرے گی؟ اپنے ہاتھوں اور پیروں کی جنبش سے اسی طرح پانی کو کاٹتے ہوئے اس نے ان دونوں کو دیکھا۔ وہ تالاب کے دونوں طرف ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں ہاتھ جیب میں ٹھونسے، سردی کی شدت سے شانے سکیڑے کھڑے تھے اور بدستور مسکرا رہے تھے۔ اسے اس تالاب میں قید رکھنا ان کے لیے کتنا آسان تھا۔ انہیں صرف وہاں کھڑے رہنا اور انتظار کرنا تھا۔

انہوں نے کوئی دھمکی اور لفظ تک ادا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اس کا تعاقب کیا تھا اور مسکراتے رہے تھے لیکن وہ پوری طرح ان کے قابو میں تھی۔ کافی دیر تک کچھ بھی بدلا ہوا نہ لگا۔ دونوں تالاب کے دونوں اطراف کھڑے اسے گھور رہے۔ اوپر آسمان مٹیالا تھا۔ بارش کے آثار تھے۔ اگر بارش شروع ہو جاتی تو کیا وہ دونوں چلے جاتے؟ کیرول کا جسم اس یخ پانی میں شل ہو رہا تھا اور وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ اسے اپنا دورانِ خون برقرار رکھنے کے لیے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دیتے رہنا تھا۔

''اے۔'' سرخ قمیص والے نے پکارا۔

کیرول نے اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور پہلی بار اس کی آنکھوں پر غور کیا۔ وہ پانی کی طرح ہم رنگ تھیں لیکن انسانی جذبات سے عاری۔

''باہر آ جاؤ۔'' وہ بولا۔

کیرول نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تمہیں کبھی نہ کبھی تو باہر آنا ہی پڑے گا۔'' وہ دوبارہ بولا۔

وہ اب بھی خاموش رہی۔ اس کے ذہن نے اس دلیل کو پسند نہیں کیا تھا۔

وہ جھکا اور اپنی ایک انگلی پانی میں ڈبو کر بولا۔ ''پانی بہت ٹھنڈا ہے۔''

کیرول چپ رہی۔ وہ یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اب ہم کیا کریں؟'' سرخ قمیص والے نے پکار کر اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''انتظار۔'' نیلی جیکٹ والے نے کہا۔

ہاں انتظار کم از کم تاریکی پھیلنے تک انتظار کر سکتے تھے۔ پارک تاریکی پھیلنے تک بند ہوتا تھا۔ اگر پارک کا کوئی گشتی پولیس آفیسر پگڈنڈی کے اس سرے پر کھڑی ہوئی دو خالی کاروں کو دیکھ لیتا تو تفتیش ضرور کرتا لیکن ابھی تاریکی چھانے میں بہت دیر تھی۔ اس سے بہت پہلے ہی وہ یا تو شل ہو جاتی یا ڈوب جاتی۔

سرخ قمیص والا مضطرب لڑکا اپنے پنجوں کے بل تالاب کے کنارے بیٹھ گیا اور اسے گھورنے لگا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی مسکراہٹ بے معنی تھی۔ یہ نہ تو دوستانہ تھی اور نہ ہی سنگدلانہ۔ وہ محض متجسس

کئی فلموں میں آپ نے ہیروز کو انسانی زندگیاں بچاتے ہوئے دیکھا ہوگا مگر 77 سالہ جیمز ہیریسن حقیقت میں ایک سپر ہیرو ہے جس نے بیس لاکھ سے زائد بچوں کو موت کے ہولناک جبڑوں سے بچایا ہے۔ آسٹریلیا میں پیدا ہونے والے جیمز کے خون میں قدرت نے ایک نایاب صفت رکھی ہے۔ اس کے خون میں ایسے اینٹی باڈیز پائے جاتے ہیں جو بچوں کو RHESUS (نمونیا کی شدید قسم) سے بچاتے ہیں۔ اٹھارہ برس کی عمر سے وہ ہر چند ہفتے کے بعد خون کا عطیہ دیتا چلا آ رہا ہے اور اس کے عطیہ شدہ خون کی بدولت لاکھوں بچے موت کے منہ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆☆☆

تھا۔ جیسے کوئی ظالم لڑکا تجسس کی خاطر کسی کیڑے کو پن میں پرودیتا ہے۔ کیا اس کا مقصد اسے نقصان پہنچانا تھا؟

سرخ قمیص والا لڑکا تالاب کے کنارے کی سیاہ گیلی مٹی پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ پھر اس بے معنی حرکت نے اس کے ذہن میں ایک خیال کو جنم دیا۔ وہ ارادتاً مٹی کریدنے لگا اور ایک لمحے کے بعد وہ مٹی کا ایک گولا بنا چکا تھا۔ پھر اس نے وہ گولا کیرول کی طرف اچھال دیا۔ کیرول گھبراہٹ میں غوطہ لگانا بھی بھول گئی۔ وہ گولا اس سے تقریباً ایک گز کے فاصلے پر گرا اور پانی کا چھینٹا اس کے منہ پر پڑا۔ اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں اور سرخ قمیص والا زور سے ہنس پڑا۔ پھر اٹھ کر اپنے ساتھی کو آواز دی۔ ''چاند ماری کریں۔''

اب انہیں ایک نیا شغل ہاتھ آگیا تھا۔ دونوں مٹی کے گولے بنا بنا کر اس کی طرف پھینکنے لگے۔ ایسے میں وہ قہقہے لگا رہے تھے اور ایک دوسرے کو چیلنج کرکے نشانہ باندھ رہے تھے۔ ان کا بیشتر نشانہ خطا کر جاتا۔ کیرول کا سر ان کا ہدف تھا۔ جیسے ہی کوئی گولا اس کے قریب آتا وہ ڈبکی لگالیتی اور جب سطح پر ابھرتی تو وہ دونوں قہقہے لگانے لگتے۔ اب یہ کھیل بہت سنجیدگی سے کھیلا جانے لگا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے مٹی کے بڑے بڑے گولے بنا رہے تھے اور ٹھیک ٹھیک نشانہ لے رہے تھے۔ کیرول کا چہرہ نرم گیلی مٹی سے لتھڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی متاثر ہوئی تھیں اور وہ اندھی ہوگئی تھی۔ اس نے ڈبکی لگائی اور چہرے اور آنکھوں سے مٹی صاف کرکے سطح پر ابھری تو وہ دونوں اس سے زیادہ شور کر رہے تھے۔

اب وہ تھک چکی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بے جان سے ہو رہے تھے پھر بھی اس کے پیر جبلی طور پر پانی کاٹ رہے تھے اور جس وقت بھی اس کی توانائی ختم ہو جاتی، ان کی حرکت خودبخود رک جاتی۔ وہ پہلی بار یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اگر ایسا وقت آگیا تو وہ کیا کرے گی؟ کیا وہ مرنے سے پہلے اپنی بچی کھچی توانائی استعمال کرتے ہوئے کنارے پر پہنچ کر ہتھیار ڈال دے؟ اس خیال پر اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ موت یا سپر اندازی...... ان لفنگوں سے بچنے کا کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا۔

یہ کھیل سنسنی خیز تھا۔ اس نے ان لفنگوں کے اندر ایک نیا جوش پیدا کردیا تھا اور اب وہ اس سے اعلیٰ پیمانے پر کھیلنا چاہتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں۔

''رے۔'' نیلی جیکٹ والے نے اپنے ساتھی کو پکارا۔ ''یہاں پتھر ہوں گے؟''

وہ ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گیا اور کچھ ہی دیر کے بعد اس کے ہاتھوں میں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ انہیں ایک ایک کرکے کیرول کی طرف پھینکنے لگا۔ کیرول شل جسم پھر سے حرکت میں آگیا۔ یہ نیا کھیل مہلک تھا۔ کیرول کے آس پاس برس رہے تھے۔ ایسے میں جب اس کا سر نشانہ بنا ہوا تھا، اسے تیرنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ نیلی جیکٹ والا جب بھی اسے نشانہ بناتا، اسے میں ڈبکی لگانی پڑتی۔

اب نیلی جیکٹ والے نے اپنی حکمت عملی بدل دی اس نے بیک وقت دو پتھر اٹھالیے۔ ابھی کیرول اس پہلے پتھر سے بچنے کے لیے ڈبکی لگا کر ابھری ہی تھی کہ دوسرا پتھر اپنی طرف دکھائی دیا۔ وہ گھبرا گئی۔ اسے ڈ لگانے کی مہلت نہیں ملی۔ اس نے ڈھیر سارا پانی نگل لیا اگلے ہی لمحے وہ پتھر اس کی دائیں کنپٹی پر پڑا ایک شدید سی اٹھی اور اس کے رگ وپے میں پھیلتی چلی گئی، آنکھوں سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے ہاتھ غیر ارادی طور مضروب کنپٹی پر پہنچ گیا اور اس کی ہتھیلی خون سے بھر گئی۔ جیکٹ والے نے ایک فتح مندانہ قہقہہ لگایا۔ ''میں چیم ہوں۔'' وہ چیخا۔ ''میں چیمپئن ہوں۔''

اس نے خون نکال دیا تھا۔ وہ خوش تھا۔

☆......☆

''رک جاؤ۔'' کیرول چیخی۔ ''پلیز جاؤ...... میں......'' یہ ایک گھٹی گھٹی سی چیخ تھی جوان لفنگ کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اب وہ سمجھ گئی کہ اگر نے ہتھیار نہیں ڈالے تو مر جائے گی۔ اس خیال کے آ ہی وہ کنارے کی طرف تیرنے لگی۔ وہ اس طرف بڑھ تھی جدھر نیلی جیکٹ والا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے دشواری سے تیر رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سرخ قمیص تالاب کے گرد بھاگتا ہوا اپنے ساتھی کی طرف بڑھ ر پھر دونوں تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر اس کا ا کرنے لگے۔ کیرول کے پیروں نے تالاب کی تہہ کو دیا۔ وہ ان بے جان پیروں کو گھسیٹنے لگی۔ اب پانی اس تک تھا۔ وہ اور آگے بڑھی اور گر گئی۔ پھر کیچڑ میں ہا اور گھٹنوں کے بل رینگنے لگی۔ مضروب کنپٹی سے رستا ہو اس کی دائیں آنکھ میں چلا گیا۔ اس نے کیچڑ سے لتھ ہوئے ایک ہاتھ سے خون صاف کرنا چاہا۔ تالاب

تارے کھڑے ہوئے لفنگوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اوپر کھینچ لیا۔

''بہت خوب صورت تو نہیں ہے۔'' ان میں سے ایک بولا۔

☆......☆

گشتی پولیس آفیسر پیٹر نے پارک کا پھر ایک چکر لگایا۔ سرخ رنگ کی وہ شیری اور زرد رنگ کی مستانگ کار اب بھی وہیں کھڑی تھیں۔ اس کی دستی گھڑی ساڑھے چار بجا رہی تھی۔ ان دونوں کاروں کو وہاں کھڑے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی لیکن پارک کی وہ پگڈنڈی بھی تو تین میل لمبی تھی۔ اگر کاروں کے مالکان دوسرے سرے تک چلے گئے تھے تو ان کی واپسی میں مزید ایک گھنٹا لگتا۔ وہ ایک نوع کا اضطراب محسوس کرنے لگا۔ اس نے اپنی کار روکی اور اتر کر ان کاروں کے قریب گیا۔ دونوں کاریں خالی تھیں۔ کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آرہی تھی۔ پھر یہ اضطراب کیسا؟ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر ان کاروں کی لائسنس پلیٹوں پر نظر ڈالی۔ دونوں مقامی تھیں، یہ محض اتفاق تھا یا طے شدہ ملاقات تھی؟ عاشقوں کے لیے یہ کوئی سہانا دن تو نہ تھا۔ کسی کے لیے بھی سہانا نہ تھا۔ کوئی بھی اس موسم میں تفریح کرنا پسند نہ کرتا۔ اس نے ایک سگریٹ نکالی اور مستانگ سے ٹیک لگا کر کش لگانے لگا۔ اس کے چاروں طرف پارک خاموش اور ویران تھا۔ صرف ہوائیں درختوں کی شاخوں کے درمیان آہیں بھر رہی تھیں۔ اسے امید تھی کہ کار کے مالکان یہ جانتے ہوں گے کہ پارک اندھیرا چھانے پر بند ہو جاتا ہے۔ اسے انہیں پکارنے یا ان کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا پگڈنڈی پر پھینک دیا اور واپس اپنی کار میں سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔

☆......☆

''اے ڈیوک، اسے کیا ہوا؟''

ڈیوک چند لمحے خاموش رہا۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں خوف تھا جس کا احساس کھلا ہوا تھا۔

''میرے خیال میں یہ مر گئی۔'' اس نے بالآخر کہا اور کندھے اچکائے۔

''مر گئی؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تم جانتے ہو کہ مرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے یہ

سانس نہیں لے رہی ہے۔''

دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ ان کے درمیان کیرول کیچڑ میں لت پت تھی۔ وہ دونوں بھی تھوڑا بہت بھیگے ہوئے تھے۔ ان کے کپڑوں پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ ''یہ کیسے مرگئی؟''

''کیونکہ یہ سانس نہیں لے رہی ہے۔''

''میرا مطلب ہے یہ سانس کیوں نہیں لے رہی ہے؟''

''کیونکہ اسے ہلاک کردیا گیا ہے۔''

''یہ کس چیز سے ہلاک ہوئی ہے؟''

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ انہوں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کا سینہ پھول اور پچک نہیں رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لب ادھ کھلے تھے۔ کنپٹی کے سرخ چمکیلے زخم سے خون رسنا بند ہوگیا تھا۔

''تمہارے خیال میں کہیں یہ اس پتھر سے تو ہلاک نہیں ہو گئی؟'' ڈیوک نے دہشت آمیز سرگوشی میں پوچھا۔

''وہ پتھر اسے ہلاک نہیں کرسکتا تھا۔'' رے گھٹنوں کے بل کیچڑ میں بیٹھ گیا اور لاش کو شانے سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔ ''جاگو، جاگو......تم بن رہی ہو۔ تم مری نہیں ہو۔''

''شٹ اپ رے، یہ مر چکی ہے۔''

رے دھیرے سے کیچڑ میں بیٹھ گیا۔ پھر اپنے کیچڑ سے آلودہ ہاتھ جیکٹ سے صاف کیے۔ ''اس کے سوا یہ اور کس چیز سے مری ہوگی؟'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''ہم نے اس کے ساتھ اور کیا کیا تھا کہ مرگئی۔''

''ہم نے کچھ نہیں کیا تھا۔ یہ ایک حادثہ تھا۔'' ڈیوک گھٹنے کے بل لاش کی دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے کرب جھانک رہا تھا۔ نیلے پتھر جیسی اس کی بے جان آنکھیں ایسا کوئی اشارہ نہیں دے رہی تھیں مگر وہ سوچ رہا تھا۔ ''ممکن ہے اس کا ہارٹ فیل ہوگیا ہو۔''

''یا ممکن ہے یخ پانی اس کی موت کا سبب بن گیا ہو۔'' اچانک رے مسکرایا۔ ''یہ بہت دیر تک پانی میں رہی تھی۔''

ڈیوک بھی جواباً مسکرایا۔ ''بالکل۔'' وہ بولا۔ ''یہ نمونیہ سے مری ہے۔''

مذاق مت کرو۔'' رے بولا۔

''میں مذاق نہیں کررہا۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ کیسے مری۔ بس مرگئی۔'' اس کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔

''تمہیں کس نے یہاں آنے کو کہا تھا؟''

''کسی نے بھی نہیں۔'' ڈیوک بولا۔ ''مجھے تازہ ہوا اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھی میں اپنے گندے محلے سے نکل کر کسی پُرفضا مقام پر اپنی ٹانگیں پھیلا کر لیٹنا چاہتا ہوں اس میں کیا برائی ہے۔''

رے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

''اس کا کیا کریں؟'' ڈیوک نے پوچھا۔

''تمہارا مطلب؟''

''کیا ہم اسے یہیں چھوڑ کر چلتے بنیں؟''

''اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟''

''کوئی اس کی لاش دریافت کرلے گا، احمق۔''

''تو کیا ہوگا؟''

''تمہیں معلوم ہے کہ جب پولیس کوئی لاش دریافت کرتی ہے تو کیا کرتی ہے؟ وہ قاتل کو ڈھونڈنے لگتی ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ یہاں اس موسم میں کون دیکھنے آئے گا۔''

''ممکن ہے، کسی پولیس والے نے ہماری اور اس کی کار وہاں کھڑی ہوئی دیکھی ہو۔ پولیس والوں کا حافظہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کاروں کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور خاص قسم کی کاروں پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کا لائسنس نمبر نوٹ کرلیتے ہیں۔''

''اچھا، تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ وہ لوگ اسے دریافت کرلیں۔'' ڈیوک بولا۔ ''ہمیں اس کو چھپانا پڑے گا۔''

''کہاں؟'' رے کے چہرے پر پسینا چمکنے لگا۔ پھر مسکرایا۔ ''تالاب میں......ایں؟''

ڈیوک نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ ایک عام آئیڈیا ہے۔''

دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ پولیس والے کب تک کسی کار کا نمبر یاد رکھ سکتے ہیں۔ نئی کاروں کے نمبر پرانی کاروں کی جگہ لے لیتے ہیں اور کچھ عرصے کے بعد پرانے نمبر فراموش کردیتے ہیں۔ چنانچہ انہیں لاش کو اس وقت تک چھپائے رکھنا تھا جب تک کوئی پولیس والا اگر اس نے ان کی کار دیکھی تھی، اس کے بارے میں بھول نہ جائے۔ ممکن ہے ایک ہفتہ، ایک مہینا یا ایک سال بعد اور اگر کسی کو

خیال نہ آتا کہ تالاب کی تہ میں کوئی لاش ہے تو یہ کبھی بھی دریافت نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ لاش اچھی طرح تہ تک پہنچا دی جائے تاکہ وہ وہیں رہے۔ ممکن ہے تالاب میں مگرمچھ اور کچھوے ہوں اور لاش کو اپنا لقمہ بنالیں۔ اگر کوئی پولیس والا کسی کار کا نمبر یاد رکھ بھی سکتا ہے تو لاش کے بغیر کسی کو قاتل نہیں ثابت کرسکتا۔

''قتل۔'' رے نے یہ لفظ آہستہ سے دہرایا۔

''وہ لوگ اسے یہی کہیں گے۔'' ڈیوک نے اسے یقین دلایا۔

اسی ٹیلے میں پتھر دستیاب تھے جہاں سے رے نے اس کے ٹکڑے حاصل کیے تھے۔ انہیں اس کے حصول میں وقت لگتا۔ انہیں بڑے بڑے پتھر چاہیے تھے تاکہ لاش ان کے وزن سے بالکل تہ میں پہنچ جائے اور وہیں رہے، سطح پر نہ ابھرنے پائے۔ انہیں اس امر کو یقینی بنانا تھا وہ جلدی جلدی اس ٹیلے سے پتھر کھود کر نکالنے لگے کیونکہ تاریکی چھانے والی تھی۔ ان کی انگلیاں زخمی ہوگئیں لیکن وہ کافی پتھر نکال چکے تھے۔ انہوں نے وہ پتھر لڑکی کی جیبوں میں اور کپڑوں کے اندر رکھ دیے۔

''اتنا کافی ہے؟'' رے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہورہا تھا۔

''کافی ہے۔'' ڈیوک نے جواب دیا۔ اب لاش کو گہرائی میں رکھنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ ''اسے گہرائی میں پہنچانا ہے۔'' وہ بولا۔

''کتنی گہرائی میں؟''

''پانچ یا چھ فٹ۔'' ڈیوک نے کہا۔

دونوں میں سے کوئی بھی تیرنا نہیں جانتا تھا۔ دونوں کو پانی سے خوف آتا تھا۔ انہیں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر وہ کنارے پر کھڑے ہوکر لاش کو پانی میں پھینکیں گے تو لاش زیادہ دور تک نہیں جاسکے گی۔ لہٰذا انہیں اسے اٹھا کر پانی میں ڈالنا ہوگا اور اس کے لیے انہیں اپنے کپڑے اتارنے پڑیں گے کیونکہ اگر وہ گیلے کپڑے پہنے رہے تو سردی سے مر جائیں گے۔ اس کے علاوہ کیچڑ سے لتھڑے ہوئے گیلے کپڑے انہیں مشکوک بنادیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کپڑے اتار دیے۔ رے نے لاش کو بغلوں سے تھام لیا اور ڈیوک نے ٹانگیں پکڑ لیں۔ پانی اتنا سرد تھا کہ ان کے دانت بجنے لگے تالاب کی تہ خطرناک حد تک عمودی اور اس کی تہ کی مٹی بے حد نرم، بھربھری اور چکنی تھی۔ لاش پتھروں کی وجہ سے اتنی وزنی ہوگئی تھی کہ وہ اسے سنبھال نہ سکے اور لڑکھڑا کر گر پڑے۔

''یہ تو ہم دونوں کو ڈبو دے گی۔'' رے ہانپتا ہوا بولا۔

''ذرا اور دور۔'' ڈیوک نے اصرار کیا۔

وہ دس فٹ دور گئے ہوں گے لیکن دونوں گھٹنوں تک کیچڑ میں لت پت ہوگئے تھے اور پانی ان کے سینے تک پہنچ چکا تھا۔ لاش ڈوب چکی تھی۔ وزنی پتھر اسے نیچے کھینچ رہے تھے۔ انہوں نے لاش کو جانے دیا اور واپس کنارے پر آگئے۔ انہوں نے اپنا جسم خشک کرنے کی کوشش کی لیکن یخ ہوائیں کچھ زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوئیں۔ انہوں نے بھیگے جسم پر ہی کپڑے پہن لیے اور سردی سے تھرتھر کانپنے لگے۔ ابھی دوسرے مسائل بھی تھے مثلاً ان کے قدموں کے نشانات، اب ان میں یہ حجت شروع ہوگئی کہ قدموں کے نشانات کو مٹا دیا جائے یا یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔

''قدموں کے نشانات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' ڈیوک نے بالآخر کہا۔ ''ان میں سے بعض تو ہمارے ہیں بھی نہیں۔ کسی بھی لمحہ بارش ہوجائے گی اور سارے نشانات کو مٹا دے گی۔''

پھر لڑکی کے پرس کا مسئلہ بھی تھا۔ وہ انہیں پگڈنڈی پر اس جگہ مل گیا جہاں وہ اسے گرا کر بھاگی تھی۔ انہوں نے اسے کھولا۔ اندر کار کی چابیاں تھیں اور سولہ ڈالر تھے جو انہوں نے اپنے قبضے میں کرلیے۔ باقی چیزیں ان کے کام کی نہیں تھیں، لپ اسٹک وغیرہ جن سے چھٹکارا پانا ضروری تھا۔

''زیادہ حسین تو نہیں تھی مگر حسین نظر آنے کی کوشش ضرور کرتی تھی۔'' رے نے تبصرہ کیا۔

''بھول جاؤ۔'' ڈیوک نے سولہ ڈالر چھوڑ کر باقی چیزیں دوبارہ پرس میں ٹھونس دیں پھر واپس تالاب کے کنارے پہنچ گیا۔ اس نے چرمی ہینڈل پکڑ کر اسے تالاب کی طرف اچھال دیا۔ پرس فضا میں کھل گیا اور اس کے اندر کی چند چیزیں سطح پر گر گئیں اور پھر آہستہ آہستہ پانی میں ڈوب گئیں۔ صرف ایک ٹشو پیپر پانی پر تیرتا رہ گیا، دونوں کچھ دیر تک اسے تکتے رہے اور پھر کار کی سمت روانہ ہوگئے۔

☆......☆

تقریباً چھ بج رہے تھے۔ پارک کے بند ہونے کا وقت ہوگیا تھا۔ اندھیرا بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ پیٹر اپنی کار سے ٹیک لگائے کھڑا، اس کھٹارا شیری اور زرد چمکیلی مستانگ کو

دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اسے جنگل کے اندر جا کر انہیں باہر نکالنا پڑے گا۔ چنانچہ جب اس پگڈنڈی پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پتوں کے درمیان شوخ سرخ اور نیلے رنگ نظر آئے جو قریب آتے جا رہے تھے تو وہ بے چینی سے ان کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جیسا کہ اس کا اندازہ تھا وہ دونوں لفنگے تھے۔ ایسے ہی لفنگے اس شیری کے مالک ہو سکتے تھے۔

جب ان دونوں کی نظر پیٹر پر پڑی تو وہ ٹھٹکتے ہوئے سے لگے لیکن یہ بھی تعجب خیز نہیں تھا۔ پولیس اور غنڈے ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہے ہیں لیکن جس امر نے پیٹر کو حیرت میں ڈال دیا، وہ ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا۔ صرف سرخ قمیص والا شیری کی طرف بڑھا جب کہ نیلی جیکٹ والا سیدھے مستانگ کی طرف، پھر اس نے ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھولنا چاہا نہیں کھل سکا تب اس نے ایک چابی اس کے قفل میں داخل کر دی۔ پیٹر کا ماتھا ٹھنکا۔ اس قسم کے لفنگے شیری میں تو زیب دیتے ہیں لیکن ان کا الگ الگ کار میں پارک پہنچنا، یہاں ایک دوسرے سے ملنا اور نیلی جیکٹ والے لڑکے کا مستانگ کار ڈرائیو کرنا۔ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔ نیلی جیکٹ والا قفل میں دھیرے دھیرے چابی گھما کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"طویل چہل قدمی سے لطف اندوز ہوئے؟" پیٹر نے براہِ راست کوئی سوال کرنے کے بجائے پوچھا۔

نیلی جیکٹ والا اس کی طرف گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں کا تاثر سپاٹ تھا لیکن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ "ایں؟"

"میں نے پوچھا تھا کیا طویل چہل قدمی سے لطف اندوز ہوئے؟"

"اوہ، ہاں...... بالکل......" لہجہ دھیما تھا اور جواب مختصر۔

پیٹر نے غور کیا، وہ کانپ رہا تھا۔ شاید خوف سے؟ پولیس کے سوال و جواب کے خوف سے؟ مجرم ضمیر؟ شاید ہاں کیونکہ مجرم پولیس کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں لیکن نہیں اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے، کیا بات ہو سکتی ہے سوچتے ہوئے پیٹر نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا جو چابی گھما رہا تھا۔ وہ سردی سے سرخ ہو رہا تھا لیکن سردی اتنی شدید بھی نہیں تھی۔ ہاتھ گیلا تھا۔ پسینے سے لیکن وہ تو سردی سے کانپ رہا تھا۔ پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ تالاب کے پانی سے، ایسے موسم میں؟ درحقیقت وہ سر سے پیر تک نم تھا۔ اس کی پتلون پر نمی کے دھبے تھے، اس کے موزے جو پتلون اور جوتوں کے درمیان سے جھانک رہے تھے۔ تقریباً گیلے تھے۔ پارک کے اندر کسی بھی جھیل یا تالاب میں نہانا منع تھا۔ یہ لفنگا یقیناً تالاب میں نہا رہا تھا۔

لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا، سوال کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اس لڑکے نے مستانگ کا دروازہ کھول لیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا پھر اس نے دائیں ہاتھ سے سیٹ کے لیور کو ٹٹولا۔ لیور اسے مل گیا۔ اس نے اسے اٹھا کر سیٹ کو پیچھے کیا تاکہ آرام سے بیٹھ سکے پھر بدستور مسکراتے ہوئے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔

پیٹر کے دماغ میں سوالیہ نشان تھا، اس کی چھٹی حس کچھ کہہ رہی تھی۔ کوئی شے بھی جو اپنی جگہ موزوں نہیں تھی۔ یہ لفنگے تالاب میں کیا کر رہے تھے؟ لفنگے ہاں یہ لفنگے ہی تھے۔ یہ لفنگا کس نوعیت کی جاب کرتا تھا کہ اس کے پاس مستانگ خریدنے کے پیسے آ گئے تھے؟ وہ جاب پر کیوں نہیں تھا۔ شیری کا انجن اسٹارٹ ہو گیا تھا اور بے حد شور کر رہا تھا۔ مستانگ کا انجن بھی اسٹارٹ ہوا۔ اس کی آواز شیری کے انجن کے شور میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر شیری میانہ روی سے نکل گئی۔ مستانگ اس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ پیٹر کھڑا دیکھتا رہا۔ دونوں کاریں غائب ہو گئیں۔ شیری کے انجن کی آواز مرکزی پھاٹک کی طرف بڑھتی ہوئی لگ رہی تھی اور تب پیٹر کو خیال آیا کہ اس نے ایک لمحے پہلے دیکھا تھا۔ اس لفنگے نے کار کی سیٹ لیور کی مدد سے پیچھے کی تھی۔

☆......☆

پیٹر کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس لفنگے نے کار کی سیٹ پیچھے کیوں دھکیلی تھی کیا وہ مستانگ اس کی نہیں تھی۔ کیا وہ اس میں وہاں نہیں آیا تھا۔ پھر کون آیا تھا، کیا کوئی اب بھی جنگل میں ہے؟ کوئی ایسا شخص جس کی ٹانگیں اس لفنگے سے چھوٹی تھیں۔ کوئی لڑکی۔

وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ پھر رک گیا۔ کار کی سیٹ پیچھے کرنا کسی بات کا ثبوت نہیں تھا جس طرح گیلے موزے اس کا ثبوت نہیں تھے کہ وہ تالاب میں نہایا تھا لیکن اگر کوئی فرد کوئی لڑکی اس جنگل میں ہوئی تو بندھی ہوئی یا شاید بے ہوش یا جاں بہ لب اگر کوئی پارک میں موجود تھا تو وہ اسے وہاں چھوڑ کر پارک بند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پگڈنڈی پر دوڑتا چلا گیا۔ پچاس گز دور جا کر رک گیا اور چیخا۔

"کوئی ہے؟"

کوئی جواب نہیں ملا۔ جنگل کا سناٹا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ پھر دوڑنے لگا۔ اس دوران اس نے کئی بار رک کر آواز دی لیکن جنگل کے سناٹے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ بھاگتا چلا گیا۔ تالاب اسے اچانک ہی وہ بھیگے ہوئے موزے یاد آ گئے۔ وہ پگڈنڈی کو چھوڑ کر جنگل کی نشیب میں دوڑنے لگا۔

تالاب وہیں کہیں واقع تھا۔ وہ سمت بدل بدل کر دوڑنے لگا اور...... وہاں پہنچ گیا۔ تالاب کے کنارے کیچڑ میں اسے قدموں کے نشان نظر آئے۔ ان کے علاوہ اور کون آیا تھا، قدموں کے نشان ہر طرف تھے اور تازہ تھے۔ مردوں کے جوتے کے نشان لیکن کسی لڑکی کے نہیں۔ پھر ان میں خلط ملط اسے ننگے پیروں کے نشان نظر آئے۔ یہ مردانہ پیروں کے نشان تھے۔ بڑے بڑے گویا وہ دونوں نہا رہے تھے یا پھر پانی میں چل رہے تھے لیکن ایسے یخ پانی میں نہانا یا چلنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

وہ کانپنے لگا۔ یہ تھکن اور پُرجوش کیفیت کا نتیجہ تھا۔ اس نے قدرے مشکل سے ایک سگریٹ سلگا لی اور سکون سے کچھ سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں کسی لڑکی کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ صرف دو وحشی لفنگے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے ایک دوسرے کو تیرنے کا چیلنج کیا ہو۔ یہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ان سے کچھ بعید نہیں تھا لیکن اس کار کی سیٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا، تالاب کی سطح کو گھورنے لگا۔ وہاں کوئی چیز تھی۔ اس نے اور قریب ہو کر دیکھا۔ وہ ٹشو پیپر لگتا تھا یا پھر کاغذی تولیہ۔ اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ لوگ الٹی سیدھی چیزیں پھینکتے رہتے ہیں۔ پھر اس نے جھک کر دیکھا پانی پر کوئی چھوٹی سی سیاہ چیز تیر رہی تھی۔ شاید کوئی ٹہنی۔

وہ بہت دوڑا تھا تھک گیا تھا لیکن اس کا ذہن مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اسے تجسس نے آ گھیرا تھا۔ اس نے سگریٹ کو پانی کی طرف اچھال دیا اور قریبی جھاڑیوں میں کوئی شاخ ڈھونڈنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اسے کوئی پندرہ فٹ لمبی ایک شاخ مل گئی۔ وہ اس شاخ کی مدد سے اس ٹہنی کو قریب لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن ناکام رہا، شاخ اتنی لمبی نہیں تھی۔ وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا۔ وہ پارک کا محض ایک گشتی آفیسر تھا لیکن تھا تو پولیس آفیسر۔ اس کے اندر پولیس والوں کی خاصیت موجود تھی۔ سب پر شک کرنا خاص طور سے نوجوان لفنگوں سے تو اسے لازمی بیر تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ان سب کو الٹا لٹکا دیتا۔

اس نے جوتے اور موزے اتارے، پتلون اوپر چڑھائی اور پانی میں اتر گیا۔ اسے اس شاخ کی مدد سے پانی پر تیرتی ہوئی اس ٹہنی کو کنارے لانے کے لیے کمر تک پانی میں جانا پڑا لیکن وہ کامیاب ہو گیا اور جب اس نے اس شے کو ہاتھ میں لیا تو وہ کوئی ٹہنی نہیں بھنویں بنانے کی پینسل تھی۔

وہ کافی دیر تک پانی میں ویسے کا ویسا ہی کھڑا رہا۔ ایک ویران تالاب کے بیچ میں بھنویں بنانے کی پینسل تیر رہی تھی۔ یہ کسی لڑکے کی بھی ہو سکتی تھی لیکن اس قماش کے لڑکوں کی نہیں جنہیں اس نے دیکھا تھا، وہ اس ٹائپ کے نہیں لگتے تھے۔ چنانچہ ہو نہ ہو یہ کسی لڑکی ہی کی تھی۔ یہ پینسل لکڑی کی تھی اس لیے تیر رہی تھی اور زیادہ عرصے سے نہیں ورنہ پینسل پر کائی ہوتی۔

☆......☆

وہ واپس اپنی کار تک آیا اور ریڈیو کے ذریعے ڈپٹی شیرف سے بات کرنے لگا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے بیان کرے۔ "بہتر ہے کہ تم پہلے مستانگ کو چیک کرو۔" اس نے ڈپٹی شیرف سے کہا۔ "لائسنس نمبر J 15788۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کس کی کار ہے۔ پھر ایک نہایت کھٹارا سی سرخ رنگ کی شیری بھی ہے۔ 59 کی ماڈل...... لائسنس نمبر 203354......"

"پیٹر۔" ڈپٹی نے مداخلت کی۔ "آخر جرم کیا ہے؟"

"پارک میں نہانا۔"

"نہانا؟"

"ہاں یہ جرم ہے۔" وہ غرّایا۔ "ان دونوں کو فوراً اٹھا لو اور فی الحال تیرنے کے جرم میں بند کر دو۔ میں تالاب کو اچھی طرح کھنگالنے جا رہا ہوں۔ میری واپسی تک انہیں بند رکھو۔"

اس نے ریڈیو آف کر دیا اور ایک نئے عزم کے ساتھ تالاب کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسی دن رات گئے تک تالاب کو کھنگالا گیا اور جرم مجسم ہو کر سامنے آ گیا۔ شیری کے نمبر سے پولیس ریسے تک بہ آسانی پہنچ گئی پھر ڈیوک کو بھی دبوچ لیا گیا، دونوں نے بہ آسانی اقرار بھی کر لیا کہ وہ صرف مذاق کر رہے تھے اور مذاق ہی مذاق میں اس لڑکی کے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

اٹھائیسواں حصہ

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس نے سفر ناموں کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ سفر نامہ نگاری میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا اور ان خرافات کو یکسر نظر انداز کردیا جو خشک تھے۔ سفر نامہ پر کہانی کا گمان ہو اس جانب مکمل توجہ رکھی۔ سفر نامے میں تاریخ و جغرافیہ اور دیگر معلومات بھی ہوں۔ اس کا بھی خیال رکھا۔ ندیم اقبال کے سفر نامے میں بھی ایسا سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذوقِ مطالعہ کی خاطر بالکل الگ انداز کا سفرنامہ

کسی نے سچ کہا ہے کہ آدمی مسافر ہے، آتا ہے جاتا ہے، آتے جاتے رستے میں یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ مسافر ہم بھی تھے اور وہ لڑکیاں بھی تھیں۔ ہم ان سے ملے، وہ ہم سے ملیں۔ بہت سارا وقت ساتھ گزارہ اور پھر الگ ہوگئے۔

ان سے الگ ہوکر ہم اپارٹمنٹ پہنچے تو تھکن سے برا حال تھا۔ ہر ایک نے اپنی جگہ سنبھالی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں نے بھی خود کو بستر پر گرالیا تھا مگر ذہن سونے پر تیار نہ تھا، خیالات کی اک یلغار تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔

زندگی کبھی بھی پھیکی نہیں ہوتی۔ خود ہی کچھ نہ کچھ رنگ اس میں بھرنا پڑتے ہیں۔ خوشیاں کوئی خوامخواہ سے آپ کی جھولی میں ڈالنے نہیں آتا بلکہ یہ وہ موتی ہیں جو چننے پڑتے ہیں۔ پڑھنے والے شاید یہ تصور کرتے ہوں کہ زندگی صرف اسی طرح گزاری ہے جس طرح سے وہ پڑھ رہے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں، کئی مشکل راستے بھی آئے اور کئی بار دکھوں کے کانٹے بھی پاؤں میں چبھے۔ مگر ہمیشہ ان کو زندگی کے پیکیج کا ایک حصہ سمجھا۔ اس پیکیج میں سب کچھ تھا۔ خوشیاں بھی تھیں اور غم بھی تھے۔ آسانیاں بھی تھیں اور مشکلات بھی بے شمار تھیں۔ مگر مشکلوں ہی نے سکھوں..... کا احساس دیا۔ دکھوں کی شدت نے ہی خوشیوں کو جلا بخشی۔ غم و مصائب نہ ہوتے تو اچھے دنوں کا مجھے پتا کیسے چلتا۔ دکھ اور سکھ دونوں میرے ساتھی ہیں جو شروع سے میرے ساتھ رہے ہیں جو اتنا عرصہ ساتھ رہے وہ اچھا بھی لگنے لگتا ہے۔ مجھے میرے دکھ اور سکھ دونوں بہت عزیز ہیں کیونکہ میرا رب بہت مہربان ہے۔ وہ خود قرآن کی صورت ''انشرح'' میں کہتا ہے کہ ہر تکلیف کے ساتھ راحت ہے۔ ایک بار نہیں بلکہ دو بار اسی صورت میں کہا ہے.... دکھ اور تکلیفیں کہاں کہاں آئیں، ان کو ذرا سائیڈ پر رکھتے ہیں اور ان لمحوں کی باتیں کرتے ہیں جو مسرتیں لے کر آئے تھے۔

سرجی ڈاؤن ٹاؤن کے تھکا دینے والے ٹرپ کے بعد مغموم تھے۔ کہتے کچھ نہ تھے مگر ہم محسوس کرتے تھے۔ کوئی بھی ہم میں سے انہیں چھیڑتا نہ تھا پھر سب کے سب اپنی ہی زندگی کی موجوں میں پھنسنے لگے۔

مجھے فکر یہ لاحق تھی کہ ابھی میری فیملی کو لینڈنگ پیپرز کینیڈین ایمبیسی سے موصول کیوں نہیں ہورہے۔ جتنا وہ لیٹ ہورہے تھے میں اتنا ہی ادھر بے چینی میں مبتلا تھا۔ وہ نیویارک بھی آجاتے تو میں پھر بھی مطمئن ہوجاتا۔ نیویارک یہاں ٹورنٹو سے جانا میرے لیے آسان تھا۔ درمیان میں یہ خوشخبری ملی تو تھی کہ ہم بس فلائی کرنے والے ہیں مگر پھر کاغذات میں کمی کا رولا آگیا اور کہانی وہیں کی وہیں رہ گئی اسی بات کی فکر پریشان کررہی تھی۔ اتنے ماہ سے بچوں کے چہرے نہیں دیکھے تھے۔ ہر وقت ان کی تصویریں رات کو دیکھتا اور دعائیں دے کر سو جاتا تھا۔

ایک دن میں نے پاکستان فون کیا تو میری تین سالہ بیٹی قندیل نے فون اٹھایا۔ میری آواز سنی تو چہکنے لگی۔ بولی۔ ''بابا میں دریا پر جارہی ہوں۔''

میں نے پیار میں ڈوب کر کہا۔ ''بیٹا! گرمی ہے، موسم اچھا ہو تو جانا۔''

''بابا جانے دیں ناں، آجاؤں گی فکر مت کیا کریں۔'' پھر خود ہی کہنے لگی۔ ''میرا ویزا آگیا ہے مما کا نہیں آیا۔'' لگتا تھا کہ یہاں سے اس نے ڈانٹ کھائی ہوگی۔ تبھی تو اسے میرے پاس آنے کی لسٹ سے فارغ کررہی تھی۔

مجھے اُمید تھی کہ چند ہفتے میں پیپرز آجائیں گے پھر ان کے پاسپورٹ امریکن ایمبیسی میں جمع کروانے تھے اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی لینے تھے۔ بہت سا کام کرنا باقی تھا اور میں وقت کا انتظار کررہا تھا۔

میں نے قندیل سے کہا۔ ''بیٹا! تو آپ اکیلے آئیں گے۔''



توتلی زبان میں بولی۔ ''میں اور اریبہ۔ دونوں آجائیں گے بابا آپ فکر نہ کریں ناں۔''

میں اس کی یہی معصوم باتیں سن کر خوش ہو جایا کرتا تھا۔ تادیر اس کی باتوں کو دہراتا رہتا اور اکثر ان میں اپنی جانب سے اضافہ کرکے زیادہ خوش ہولیتا۔ بیٹیاں بھی کیا چیز ہوتی ہیں، یہ تو باپ ہی جانتا ہے۔ باپ گھر میں تھکا ہارا آتا ہے اور جب بیٹی بابا بابا کی گردان کرتی ہے تو وہ دیوانہ وار اسے سینے سے چمٹا لیتا ہے۔ بیٹی جب باپ کے سینے سے لگتی ہے تو ایک ٹھنڈک سی سینے میں بھر جاتی ہے۔ میری دونوں بیٹیاں بڑی ہوگئی ہیں۔ جب بھی تھکا ہارا کہیں سے آتا ہوں تو لپک کر باپ کا سر دبانے آجاتی ہیں۔ ان کے نرم اور پیار بھرے ہاتھوں کا لمس میرے ماتھے پر پڑتا ہے تو قسم پیدا کرنے والے کی محسوس بھی نہیں ہوتا کہ کبھی مجھ میں تھکاوٹ بھی تھی۔ میرے لیے آسماں پر رنگ دیکھتی ہیں۔ جب شفق کے رنگ افق پر پھیلتے ہیں تو بھاگ کر آتی ہیں اور بتاتی ہیں۔ ''بہت غروب صورت رنگ نظر آرہے ہیں، جلدی سے کیمرا لے آئیں۔''

میں کیمرا لاتا ہوں اور افق کے نہیں بلکہ ان کے چہروں کے رنگ اپنے کیمرے میں اتارتا ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ سب کی بیٹیاں سکھی رہیں، آمین۔ میں نے ڈرائیونگ کا تحریری امتحان پاس کرلیا تھا۔ مفتی نے مجھے ڈرائیونگ کے اصولوں اور قاعدوں کا کتابچہ تھماتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہ تحریری امتحان تو تم پاس کرلو گے مگر یہاں ڈرائیونگ ایک طرح سے پل صراط پر گزرنے کے مترادف ہے۔''

وہ ایک بار ڈرائیونگ ٹیسٹ میں فیل ہو چکا تھا۔ جب روڈ ٹیسٹ کے دوران ایک کتا معلوم نہیں کیسے اس کی گاڑی تلے کچلنے سے بچ گیا تھا۔ اب وہ ہر ایک کو حسب عادت یہی مشورہ دیتا کہ جب اتنی بسیں اور انڈر گراؤنڈ ٹرینیں چل رہی ہیں تو گاڑی کی مصیبت سر لینے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے بھی یہی مشورہ دیا تو میں نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔

میرے پاس پاکستان میں گاڑی نہیں تھی مگر گاڑی چلانے کا لائسنس میرے پاس تھا۔ میں پاکستانی لائسنس اور کتابچہ لے کر ایک دن منسٹری آف ٹرانسپورٹ تحریری امتحان دینے پہنچ گیا۔ راستے میں بس کے سفر کے دوران میں کتابچہ پڑھتا رہا۔ وہاں پہنچا تو عجیب مناظر دیکھنے کو ملے۔

ڈرائیونگ ٹیسٹ کے امیدوار پریشان اور ہراساں چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ ڈرائیونگ ٹیسٹ کا ممتحن وردی میں آتا اور پسنجر سیٹ پر بیٹھ جاتا۔ امیدوار آسمان کی جانب نظریں اٹھا کر رحم اور کامیابی کی دعا مانگتا اور ڈرائیونگ سیٹ

پر بیٹھ جاتا۔ درجنوں دوسرے امیدواروں کی نظریں اسی پر ہوتیں۔ وہ گاڑی لے جاتا اور کچھ ہی دیر میں شاید پانچ دس منٹ بعد واپس آتا۔ ممتحن یعنی ایگزامنر واپسی پر پاس یا فیل ہونے کی خبر دیتا۔ دونوں صورتوں میں ایک پرچہ اس کے حوالے کرتا۔ فیل ہوتا تو ناکامی کی غلطیاں بتاتا۔ پاس ہوتا تو مبارک باد دیتا۔ فیل ہونے پر امیدوار چہرہ لٹکائے ڈرائیونگ اسکول کے انسٹرکٹر کی جانب افسردہ چلا آتا اور پاس ہونے والا قلانچیں بھرتا اور پُرمسرت چہرے سے نعرے لگاتا واپس لوٹتا۔ ہر ایک کی ایسی حالت تھی کہ جیسے روزِ محشر لگا ہو۔

میں نے کمپیوٹر پر تحریری ٹیسٹ دیا اور پاس ہوگیا۔

مجھے خان قیصر سمیت دوسرے دوستوں نے یہ کہا تھا کہ کبھی کبھار وہ پاکستان کے لائسنس پر آپ کا ڈرائیونگ کا تجربہ نہیں مانتے اور یہ منحصر کرتا ہے کہ آگے کاؤنٹر پر کون اور کس موڈ میں بیٹھا یا بیٹھی ہے۔

اگر آپ کا پاکستانی ڈرائیونگ کا تجربہ نہیں مانتے تو روڈ ٹیسٹ دینے کے لیے دس مہینے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اسی دوران آپ دو سالہ تجربے کے حامل کسی بھی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر ڈرائیونگ سیکھتے رہیں۔ اگر وہ پاکستانی تجربہ مان لیتے ہیں تو آپ اسی دن ہی روڈ ٹیسٹ دے سکتے ہیں۔

میں اب لائن میں اپنا پاکستانی لائسنس اور تحریری امتحان پاس ہونے کا کاغذ لیے اپنی باری کے انتظار میں کھڑا تھا۔ آگے چند لوگ تھے اور کاؤنٹر پر ایک سیاہ فام فربہ لڑکی منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ مجھے خان قیصر کا وہ فقرہ یاد آتا تھا کہ اگر کاؤنٹر کلرک کا موڈ ٹھیک نہیں اور بدمزاج ہے تو پھر ڈرائیونگ ٹیسٹ کے لیے دس مہینے انتظار کرنا ہوگا مگر دس ماہ کا انتظار مجھے ہرگز ہرگز گوارا نہ تھا۔ خان قیصر نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ جاتے ہی دانت نکال کر اور باچھیں پھیلا کر اسے ایک مسکراہٹ دینا اور خوشگوار باتوں سے اس کا دل موم کرنے کی سعی کرنا۔

میں لائن میں کھڑا اس پر درود شریف پھونک رہا تھا۔

اس سیاہ فام موٹی اور کرخت لڑکی کا دل موم کرنا کم از کم میرے بس میں نہ تھا اور مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں اس کا دل موم ہو ہی نہ جائے لیکن میں نے یہ رسک لینے کا بھی فیصلہ کرلیا۔ میرے آگے تقریباً نئے آئے امیگرنٹس یعنی تارکین وطن تھے۔

میری باری آئی تو میں اپنے اندر کی سب مسکراہٹیں، خوشیاں، محبتیں اپنے چہرے پر لایا اور وہی چہرہ آگے کر کے کھڑا ہوگیا۔

مجھے بے تحاشا مسکراتے دیکھ کر وہ مجھے چبھتی نظروں سے دیکھنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میری حرکت اچھی نہیں لگی مگر میں اپنے تاثرات میں اتنا آگے نکل چکا تھا کہ واپسی بہت مشکل تھی۔

اس نے جب یہ دیکھا کہ میں باز آنے والا نہیں تو تنک کر بولی۔ ”کیا ہے؟“

میں نے ٹپٹا کر پوچھا۔ ”کیسی ہیں آپ؟ How are you“۔

وہ دھاڑ کر بولی۔ ”کیا؟“

میں نے بھی سوچا کہ دیکھا جائے گا اور بولا۔ ”موسم بہت خوشگوار ہے؟“ دراصل مجھے گاڑی کی اتنی ضرورت تھی کہ میں حماقتوں پر اتر آیا تھا۔

اس نے اب مجھے سنجیدگی سے دیکھا اور میرے ہاتھوں سے کاغذ چھین لیا۔ پاکستانی ڈرائیونگ لائسنس نے خود اس کے حوالے کیا۔ وہ میری باتوں سے اتنی ہوئی یا الجھی تھی کہ پاکستانی لائسنس کے بارے میں سوال ہی نہ کیا۔ بینائی چیک کرنے والے آلے سے میری دونوں آنکھوں کی بینائی چیک کی۔ کچھ کاغذوں پر دھڑ دھڑام سے مہریں لگائیں اور میری جانب بغیر دیکھے سندیسہ دیا کہ میرا کینیڈین ڈرائیونگ کا ابتدائی لائسنس کے ایڈریس پر آجائے گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا نے صرف ہوں میں جواب دیا۔

میں خوشی خوشی باہر آگیا۔ اب اس لائسنس پر میں بھی روڈ ٹیسٹ دے سکتا تھا مگر مجھے اب کسی ڈرائیونگ اسکول سے رابطہ کرکے گاڑی چلانا سیکھنا بھی تھا۔ میں گاڑی چلانے سے بالکل نابلد تھا۔ مجھے روڈ پر ایک گھنٹے کی کم بیس کلاسیں لینی تھیں۔

میرے تحریری امتحان اور ابتدائی لائسنس لینے اور ٹیسٹ دینے کے درمیان تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ کا وقفہ اس دوران کے واقعات کو ذرا ایک جانب رکھ کر ڈرائیونگ ٹیسٹ کی روداد بیان کرتا ہوں جو پڑھنے والوں کے لیے ضرور دلچسپ ہوگی۔

میں نے ایک دیسی اردو اخبار میں پاک ڈرائیونگ اسکول کا اشتہار دیکھا اور اسے فون کیا۔ اسکول کا انسٹرکٹر ارشاد تھا۔ اس کے ساتھ بیس کلاسوں

بات ہوئی اور میں نے اس سے ڈرائیونگ سیکھنا شروع کردی۔ اسی دوران اس سے گپ شپ بن گئی اور ایک طرح سے دوستی ہوگئی۔

ارشاد ہر روز آتا اور مجھے ڈرائیونگ سکھلانے ٹورنٹو کی سڑکوں پر لیے پھرتا۔ یہاں ڈرائیونگ پاکستان کی نسبت آسان اس لیے تھی کہ تقریباً ہر گاڑی آٹومیٹک ہے، دوسری وجہ یہ کہ عام سڑک ہو یا ہائی وے، ہر گاڑی اپنی لائن میں چلتی ہے۔ لہٰذا چلانے والوں کو صرف لائن تبدیل کرتے وقت دھیان دینا پڑتا ہے۔ بیس کلاسوں کے بعد میرے علاوہ ارشاد بھی خاصا مطمئن تھا کہ ڈرائیونگ ٹیسٹ کے لیے میں تیار ہوں۔ اسی طرح ایک دن وہ مجھے ویسٹرن روڈ والے منسٹری آف ٹرانسپورٹ کے دفتر لے گیا۔

ڈرائیونگ اسکول کی گاڑی میں مجھے ٹیسٹ دینا تھا۔ ڈرائیونگ اسکول کی گاڑیوں میں ڈرائیور سائیڈ کے علاوہ آگے والے پسنجر سائیڈ کے پاؤں میں بھی بریک ہوتی ہے کہ امیدوار کی کسی غلطی کی صورت میں انسٹرکٹر یا ایگزامنر بھی بریک دبا سکے۔

اس دن ایگزامنر نیلی وردی اور حد سے زیادہ بنائے گئے سنجیدہ اور درشت چہرے کے ساتھ اگلی سیٹ پر آبیٹھا۔ میں نے گھوم پھر کر قواعد کے مطابق سب ٹائروں کا پریشر چیک کیا اور اپنے اندر کے خوف کو دباتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ بیک اور سائیڈ مررز کو قانون کے مطابق سیٹ کیا اور گیئر ہینڈل کھینچ کر ڈرتے ڈرتے گاڑی کو روڈ پر لایا۔ میں ایک اعتماد کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

اسی دوران ایگزامنر مجھے ایک اسٹریٹ پر لایا جس کے دونوں جانب مکانات تھے۔ ہر گھر کے آگے لان تھے جن میں درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ ان کے آگے سڑک کے دونوں جانب فٹ پاتھ تھے۔ ایک جگہ مجھے ایگزامنر نے کہا کہ تھری پوائنٹ ٹرن کروں، تھری پوائنٹ ٹرن یہ ہوتا ہے کہ آپ اسٹریٹ پر ایک سمت جا رہے ہیں اور آپ نے گاڑی کو واپس موڑنا ہوتا ہے۔ پہلے گاڑی کو ریورس کرتے ہیں پھر آگے اسے اسٹریٹ کے کنارے تک لاتے ہیں پھر ریورس کر کے اسے سیدھا کرتے ہیں۔ میں نے گاڑی ریورس کی اور پیچھے درخت کے ساتھ ٹکرانے سے پہلے روک لیا۔ پھر اسٹیئرنگ گھما کر اسے آگے لے آیا اور سامنے گھر کے ساتھ فٹ پاتھ کنارے گاڑی کو روک لیا۔ اب مجھے گاڑی کو ریورس کرنا تھا تاکہ اسے الٹی سمت میں سیدھا کرسکوں۔

وہاں ریورس کرنے کی بجائے میں نے ایکسیلیٹر پر دباؤ ذرا سا بڑھایا تو اگلے پہیے فٹ پاتھ سے جا ٹکرائے۔ اتنے میں ایگزامنر چیخا اور چیخ کر بولا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

میں اس کی چیخ سن کر گھبرایا اور بجائے ریورس کرنے کے اپنے پاؤں کا پورا زور ذرا ایکسیلیٹر پر ڈال دیا۔ سامنے گھر کا لان تھا، ارد گرد باڑ لگی تھی اور متعدد پرانے بوڑھے درخت ہواؤں سے جھوم رہے تھے۔ میں نے ایکسیلیٹر پر جیسے ہی پوری قوت سے دباؤ بڑھایا تو اسے آخری حد تک دباتا چلا گیا اور پھر...... گاڑی نے ٹیک آف کیا..... گویا بلند ہوئی اور پرواز بھرتی ہوئی ایک جھومتے درخت کے تنے سے شاید ایک دو انچ ادھر ہی سے گزرتی باڑ کو توڑتی اور ساتھ والے گھر کے لان میں لینڈ کر گئی۔ اسی دوران ایگزامنر نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا اور میں نہ جانے کیوں مکمل طور پر اپنے حواس میں تھا۔

اب ہم دوسرے گھر کے لان میں گاڑی کے اندر بیٹھے تھے۔ میں اس حادثے سے تو پریشان نہ ہوا تھا مگر اس کم بخت کی چیخوں سے ہراساں تھا۔ میں اسے اور اس کی نیلی وردی کو دیکھتا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اپنی سیٹ پر تھیں اور دونوں ہاتھوں سے اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا چلّانا بند ہوا۔ جیسے ہی اس کا چلّانا بند ہوا تو اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگائی۔ اس کی وردی تر بتر ہوچکی تھی۔ نوٹ پیڈ پاؤں کی جگہ پڑا تھا۔ منہ سے جھاگ اڑاتا میری جانب کھڑکی کے ساتھ آیا اور غصے سے حکم دیا۔

”گاڑی کو سڑک پر لاؤ۔“ یہ کہہ کر پولیس کو فون کرنے لگا۔

دو گھروں کے لان، پودے اور باڑ تک تباہ ہوگئی تھی۔ گاڑی آگے سے پچک چکی تھی تو یقینی طور پر یہ پولیس کیس تھا۔ اب انشورنس کیس کو بھی بیچ میں آنا تھا کیونکہ گاڑی کی مرمت اور دونوں گھروں میں ہوئے نقصان کو اسی کمپنی نے بھرنا تھا۔ میں گاڑی کو سڑک پر لے آیا اور باہر نکلنے لگا تو وہ چیخ کر بولا۔ ”تم تو اندر بیٹھے رہو اور گاڑی بند کردو۔“

اس نے اب پولیس کو کال کردی تھی اور ہراساں وجود کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ کھول کر اسے اشارے سے اپنی جانب بلایا۔ وہ آیا تو میں نے پوچھا۔ ”میں ٹیسٹ میں پاس ہوں یا کہ......؟“

وہ خونخوار نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم نے تو مجھے قتل کر ہی دیا تھا اور پوچھتے ہو کہ میں پاس ہوں۔''

میں افسردہ ہوگیا تھا۔ آج کا ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد میں نے گاڑی خریدنی تھی مگر میری ناکام امیدوں پر اوس پڑ چکی تھی۔ وہ اب بے چینی سے ٹہلتا پولیس کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پاس سے گزرتا تو غصے بھری نظروں سے دیکھتا جاتا تھا۔

اتنے میں پولیس کی گاڑی آئی جس میں ایک لیڈی آفیسر بیٹھی تھی۔ گو جوان نہ تھی مگر چہرے سے ہوشیار اور جسامت میں چست نظر آتی تھی۔ ایگزامنر بھی نیلی پولیس جیسی وردی میں تھا اور حکومتی افسر بھی تھا وہ گاڑی میں بیٹھی آفیسر کے پاس گیا۔ اتنے میں، میں بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

وہ آفیسر سے کہہ رہا تھا۔ ''اس نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گاڑی کے علاوہ گھر کے لان کو بھی کچل ڈالا۔ اسے کم از کم ڈرائیونگ سے ایک دو سال کے لیے نااہل قرار دے دینا چاہیے۔''

یہ سن کر تو میں حواس باختہ ہوگیا کہ یہ بندر کیوں مجھے اپاہج کر دینا چاہتا ہے۔ وجہ تو تھی مگر روڈ ایکسیڈنٹ پر کسی کا آج تک لائسنس کبھی منسوخ ہوا ہے۔

پولیس آفیسر نے اس کی بات سنی تو اسی پر چڑھ دوڑی اور طیش میں آکر کہا۔ ''وہ تو ابھی انڈر ٹریننگ ہے۔ یہ تمہارا بھی قصور ہے کہ تمہارے ساتھ ہونے پر بھی یہ حادثہ ہوگیا۔ تم کو اپنی سائیڈ پر پہلے ہی بریک لگا دینی چاہیے تھی۔''

اس نے کچھ کہنے کی کوشش بھی کی مگر پولیس والی نے اسے کہا۔ ''تم خاموش رہو۔''

کھڑکی سے سر نکال کر مجھ سے کہا۔ ''کیا ہوا تھا؟''

میں نے اس کے چیخنے، اپنے گھبرانے اور اس کے سیٹ پر سے ٹانگیں اٹھانے تک سب داستان مختصر الفاظ میں سنا دی۔

اس دوران وہ اسے گھورتی رہی۔

اتنے میں کسی اور گاڑی پر ارشاد بھی آ پہنچا۔ منسٹری آف ٹرانسپورٹ میں یہ بات پھیل چکی تھی۔ ڈرائیونگ ٹیسٹ کے دوران ایک ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے لہٰذا ارشاد نے میرا ہی قصور سمجھا اور ایک دوست کے ہمراہ آ پہنچا اور کھڑا حسرت بھری نظروں سے اپنی نئی ٹیوٹا کرولا کو زخمی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی لان اور باڑ کی حالت زار دیکھ کر دائیں ہاتھ سے اپنا سر پکڑے ہوئے تھا۔

پولیس آفیسر نے اپنا کارڈ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''رکھ لو، اگر یہ ایگزامنر تمہیں کوئی پرابلم کرے تو مجھے فون کرنا۔'' یہ کہہ کر ایک بار پھر ایگزامنر کو گھورا اور گاڑی ڈرائیو میں ڈال کر چلتی بنی۔

اب ارشاد کہہ رہا تھا۔ ''میری نئی گاڑی ہے جو دو ماہ پہلے زیرو میٹر نکلوائی تھی۔'' پھر کہا۔ ''مجھے تو یہ باڑ اور لان بھی ٹھیک کروا کر دینا پڑے گا۔''

اس کی پریشانی بجا تھی مگر میں نے کہا کہ تمہارے پاس انشورنس بھی ہے تو پریشانی کس بات کی ہے۔

''اگر انشورنس کو کلیم کرتا ہوں تو پریمیم بڑھا دیں گے۔'' گاڑی میں بیٹھ کر سوچتے ہوئے بولا۔ ''ندیم! اب تم کو لائسنس دلوانا میرے لیے چیلنج بن گیا ہے اور یہ میں دلوا کر رہوں گا۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر میں بھی مطمئن ہوگیا۔

بعد میں اس نے چار ہزار سے زائد ڈالر دے کر گاڑی ٹھیک کروائی۔ گھر والوں کے باڑ اور لان بھی مرمت کر کے دیا۔ کچھ دن بعد اس نے مجھے فون کیا اور بولا۔ ''تیار ہو جاؤ، مارکھم میں آج تمہارا روڈ ٹیسٹ بک کروایا ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

مارکھم ٹورنٹو کے انتہائی مشرقی کونے پر ہے جہاں مفتی کی بہن رہتی تھی۔

ہم ذیلی سڑکوں سے ہوتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے میں مارکھم کے منسٹری آف ٹرانسپورٹ آفس پہنچے۔ میں سارا راستہ ڈرائیونگ کرتا رہا اور راستہ بھر ارشاد میرے دماغ کو اپنی جانب سے ہلکا رکھنے کے لیے گندے لطیفے سناتا رہا۔ مارکھم جانے کی وجہ ارشاد یہ بتا رہا تھا کہ وہاں سڑکوں پر زیادہ رش نہیں ہوتا اور اسی لیے ڈرائیونگ ٹیسٹ آسان رہتا ہے۔

مجھے خوشی یہ بھی تھی کہ پہلی بار میں نے اتنی لمبی ڈرائیو کی تھی۔

ہم وہاں پہنچے تو آفس کے باہر وہی سماں تھا جو ویسٹرن میں مجھے نظر آیا تھا۔ میں اور ارشاد اندر گئے تاکہ ٹیسٹ کے کاغذات لے سکوں۔ میں کاؤنٹر سے کاغذات لے کر مڑا ہی تھا کہ سامنے دیکھا تو بہت سی نیلی وردیوں میں وہی انسٹرکٹر اپنی یونیفارم پہنے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا کہ یہ کم بخت یہاں بھی پہنچ گیا۔ ہم شاید دونوں دل میں ایک دوسرے سے جان چھڑوانے کی دعا مانگ رہے تھے۔ اسے اپنی جان عزیز تھی اور مجھے اپنے لیے گاڑی بنی تھی۔ میں نے ارشاد کو یہ مصیبت دکھائی تو اس کا رنگ بھی فق ہوگیا۔ ارشاد نے بعد میں مجھے یہ بتایا کہ میں اس لیے بھی نہیں کامیاب و کامران دیکھنا چاہتا تھا کہ اخبار کے اشتہار میں یہ بتا سکوں کہ ایک نااہل شخص جو میری نئی گاڑی کے پرخچے اڑا چکا تھا اس کو بھی میں نے ڈرائیونگ ٹیسٹ میں کامیاب کر دکھایا۔ بعد میں اخبار میں اس کا اشتہار دیکھا تو اپنے بارے میں اتنے ہلکے فقرے پڑھ کر مجھے قطعاً مسرت نہ ہوئی تھی۔

میں گاڑی کے پاس کھڑا ایگزامنر کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ باہر نکلا میری جانب غصے سے دیکھا اور پھر دوسری گاڑی کی جانب بڑھ گیا پھر اس کے ساتھ میں نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا۔ میرے حصے میں ایک خاتون ایگزامنر آئی۔ مجھے اندرونی سڑکوں پر لے گئی۔ متوازی پارکنگ کروائی، تھری پوائنٹ ٹرن بھی کروایا اور پھر ایک پارکنگ لاٹ میں گاڑیوں کے بیچ بھی پارکنگ کروائی اور گھماتے گھماتے واپس آفس میں آگئی۔ اسی دوران ٹیسٹ کے کاغذ پر نشانات لگاتی رہی تھی۔ گاڑی روکی اور مجھے میری غلطیاں بتانے لگی اور ادھر میرا دل ڈوبنے لگا۔ آخر میں بولی۔ ''مسٹر! تم پاس ہو مگر احتیاط سے ڈرائیونگ کرنا۔'' میں نے فرمانبردار بچے کی طرح سر ہلایا۔ وہ چلی گئی تو میں گاڑی سے باہر نکلا۔ دور درخت تلے ارشاد کھڑا میری جانب امید اور ناامیدی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دور سے وکٹری کا نشان بنایا اور اس نے وہیں بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔

میری حالت یہ تھی کہ جیسے کوئی پھندا میرے سر پر لٹکا ہوا اور وہ اچانک غائب ہوگیا ہو۔ آس پاس کے لوگوں کے چہرے بھی مسکرانے لگے تھے اور چلتی ہواؤں کا لمس بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ یہاں کسی کے لیے بھی ڈرائیونگ لائسنس اس طرح ضروری ہے جیسے کہیں بھی کسی انسان کے چلنے کے لیے ٹانگیں۔ میں ہمبو سال سے چند گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ واپسی میں مجھے ارشاد نے ہمبو سال ڈراپ کیا۔ میں اندر آیا تو لنچ ٹائم تھا۔ سبھی وہیں موجود تھے۔ ہمارا سپروائزر فریڈ بھی کھڑا کافی بنا رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی سب دیسی بدیسی پوچھنے لگے کہ کیا ہوا، پاس یا فیل۔

میں نے پاس ہونے کی نوید سنائی تو سب تالیاں بجا رہے تھے اور مفتی بے یقینی سے بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ فریڈ میری جانب ایک گہرا سانس لے کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''City is no more safe.'' یعنی اب شہر میں میری ڈرائیونگ سے سب کو خطرہ ہی خطرہ ہے۔

☆......☆

ہم ڈاؤن ٹاؤن کے ٹرپ سے واپس آکر اس طرح سے تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے کہ جیسے کسی دوسرے شہر سے ہو کر آئے ہوں۔ کئی دن اسکاٹش لڑکیوں کا ذکر چلتا رہا۔ سر جی میگی کے بارے میں بالکل خاموش تھے جیسے کوئی عزت دار دوستوں میں بیٹھ کر ہر وقت بیوی کی باتیں نہیں کرتا۔ کچھ دنوں میں ہمارے اپارٹمنٹ کا ماحول نارمل ہوگیا اور پھر سے وہی فساد جھگڑا بھی چلنے لگا۔ میں نے سوچا بہت دن ہو گئے اور نسرین سے بات نہیں ہوئی۔

میں ہمبو سال سے تین بجے اپارٹمنٹ پہنچا کوئی موجود نہ تھا اور اپنے میٹریس پر لیٹے لیٹے میں نے اسے فون ملایا۔ فون اسی نے اٹھایا۔ خفا خفا لگ رہی تھی۔ لڑکی تھی تو روٹھنا اس کا بنتا بھی تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''مجھ سے اسٹور کی جاب چھڑوا کر مجھے گھر میں قید کر دیا اور خود بھی غائب ہو گئے۔''

''ڈاؤن ٹاؤن میں تھکا دینے والا دن گزارا اور پھر جاب کے ساتھ ڈرائیونگ کی کلاسیں بھی چل رہی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''فون تو کر سکتے تھے۔ کیا اس کا ٹائم بھی نہ تھا؟''

''نہیں تھا۔'' میں نے کہا تو صدمے سے بولی۔

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''فون نہیں کر سکا مگر ابھی تمہارے پاس آ رہا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

اسی دوران خان قیصر کے ساتھ کالج جا کر اس کی پڑھائی کے لیے بہت ساری معلومات لے آیا تھا۔ ہیومن ریسورس ڈپلوما کے لیے پراسپیکٹس بھی منگوا لی تھی۔ اب میرے پاس بہت ساری معلومات تھیں جس کا اس سے ذکر کرنا بہت اہم تھا۔

میں جب اس کے فلیٹ پہنچا تو سعد نہا دھو کر نئے کپڑے پہن کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے آپ کو حسب ذوق سنوارا ہوا تھا۔ سعد میرے گلے سے لگ گیا۔ اس کا پیار دیکھ کر وہ مجھے اور زیادہ پیارا لگنے لگتا تھا۔ میں نے ڈاؤن ٹاؤن سے خریدے گئے انجیر کے جام کی بوتلیں سعد کو

دیں تو وہ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ نسرین نے بیٹے کو بتایا کہ یہ Fig (انجیر) کا جام ہے تو وہ خوش ہو گیا اور پھر سے میرے گلے لگ گیا۔

میں نے نسرین سے کہا کہ لیونگ روم کی کھڑکی تازہ ہوا کے لیے کھول دو۔ وہ بڑھی اور بڑھ کر دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ کچن کی جانب لپکی اور بولی۔ ''جلدی سے چائے بنا دیتی ہوں۔''

میں اس کے پیچھے کچن میں گیا اور اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ بولا۔ ''آرام سے میری تابعداری اور خدمت میں اپنی توانائیاں خرچ مت کرو۔ کچھ نخرے دکھاؤ، کچھ مجھے بھی تڑپاؤ۔ کبھی ادا اور کبھی بے رخی سے، کبھی انکار اور کبھی لڑ کر مجھے بھی اپنے پیچھے مجنوں بناؤ۔''

حیران ہو کر بولی۔ ''مجنوں کیوں؟''

''کیوں نہیں؟'' میں بولا۔

''مجنوں تو ہم فارسی میں پاگل کو کہتے ہیں۔''

میں ہنس پڑا اور بولا۔ ''مطلب کہ اپنا دیوانہ بنا کے رکھو۔''

''معلوم نہیں دل کیوں نہیں کرتا کہ تمہیں تڑپاؤں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ تڑپانا میں نے کبھی سیکھا ہی نہیں اور نہ ہی مجھے کبھی موقع ملا۔ اگر تمہیں تڑپانے لگوں تو کہیں مجھ سے بددل ہی نہ ہو جاؤ۔ مجھے یہ خدشہ بھی تو رہتا ہے۔''

میں نے اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیے اور بولا۔ ''تم چائے بناؤ۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ کیسے بناتی ہو۔''

وہ چائے بنانے لگی۔ میں حیران تھا کہ اتنی جلدی اتنی اچھی چائے بنانے لگی ہے۔

ہم دونوں چائے لے کر لیونگ روم میں آ بیٹھے۔ سعد جام کی دونوں بوتلیں گود میں رکھے اسکول کا ہوم ورک کر رہا تھا۔ میں صوفے پر اپنی مخصوص جگہ پر آ بیٹھا اور وہ ساتھ پڑی کرسی پر ہمیشہ کی طرح پاؤں میز پر رکھے بیٹھ گئی۔

ہم دونوں چائے پینے لگے۔ میں اسے ڈاؤن ٹرپ کا احوال سنانے لگا۔ جب اسکاٹش لڑکیوں کی بات آئی تو چونک کر اٹھ بیٹھی۔ سرجی اور میگی کی کہانی بھوت سے لے کر آخر تک سنائی، میرا خیال تھا کہ وہ ہنسے گی مگر وہ خاموش بیٹھی ماتھے پر شکنیں ڈالے سنتی رہی۔ مجھے محسوس ہوا کہ لڑکیوں کے ہمراہ اسے میرا گھومنا پھرنا برا لگا ہے۔ جب جاناں اور اس کی ہنسی کا بتایا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''تم سعد سے باتیں کرو، میں کھانا بناتی ہوں۔'' مجھے بھی مزہ آنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''کھانا بن جائے گا۔ تم بیٹھو تو سہی جاناں کے بارے میں بتاتا ہوں۔''

''نہیں دیر ہو جائے گی۔ صبح تمہیں جاب پر بھی جانا ہے۔''

''ابھی تو بہت وقت پڑا ہے۔ تمہیں مزے مزے کی باتیں سناتا ہوں فکر نہ کرو، کھانا میں تم کو آدھے گھنٹے میں تیار کر کے دے دوں گا۔''

''ابھی میرے پاس باتیں کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ تمہارے لیے ایک نہیں دو کھانے تیار کرنے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئی۔

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن میں چلا گیا اور بولا۔ ''میں کس سے باتیں کروں۔ سعد تو پڑھائی کر رہا ہے۔''

وہ مڑی اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی، بولی۔ ''اچھا جلدی جلدی سناؤ۔ ویسے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں کہ تمہاری ان لڑکیوں سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔''

''وہ جاناں۔''

وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ''تم اپنے آپ کو ہیرو کب سے سمجھنے لگ گئے۔ سانولا رنگ، کمزور چہرہ اور بڑھے ہوئے بے ترتیب بال، جاناں جیسی حسین لڑکی کو کیا پڑی کہ تمہارے پیچھے مرتی۔''

''میں نے کب کہا کہ وہ مرتی تھی۔ میں تو ویسے ہی اس کی باتیں بتا رہا تھا۔ بہت دلچسپ تھیں اور وہ دوسری لڑکیاں بھوتوں کی کہانیاں بڑے مزے سے لے کر سنتی تھیں۔''

اس کی آواز بھرّا گئی، بولی۔ ''آخر تم چاہتے کیا ہو؟ سنانا کیا چاہتے ہو اور اتنے دن بعد آ کر مجھ سے میری نہیں اوروں کی باتیں کرتے ہو جن کا تم سے کوئی تعلق بھی نہیں۔''

میں سنجیدہ ہو گیا، بولا۔ ''تم سے تمہاری ہی باتیں کرنے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اچھا نہیں لگ رہا، اسی لیے سنا رہا تھا۔ وہ لڑکیاں نہ بھی ہوتیں تب بھی ہم اتنا ہی انجوائے کرتے جتنا ان کے ساتھ کیا ہے۔ تم کو اتنا تو میرے بارے میں معلوم ہونا چاہیے کہ میں جنس مخالف دیکھ کر اس کی جانب بہہ نہیں جاتا۔'' یہ کہہ کر میں نے جیکٹ کی جیب سے ہار نکالا جو اس کے لیے ایٹن سینٹر سے لایا تھا۔ اسے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا تو نسرین کی آنکھوں کی چمک کے سامنے ہار کے موتی ماند پڑ گئے۔ میں بولا۔ ''یہ تمہارے لیے لایا ہوں ابھی پہن لو۔''

اس نے ہار کی جانب نہیں دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے

بولی۔ ''تم اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہو تو اچھا لگتا ہے۔ دوسروں کی تعریفیں کرتے ہو تو خون کھول اٹھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم ایسے نہیں ہو مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ میں ایسی ہی ہوں۔ میں تمہارے اور تمہاری بیوی کے بیچ نہیں آئی اور تم میرے اور اپنے بیچ کسی کو مت لانا۔''

''کبھی نہیں! یہ ڈر اپنے دل سے نکال دو لیکن میں جانتا ہوں کہ تم کبھی نہیں نکال سکو گی۔ جب یہ ڈر نکلا تو میں سمجھ جاؤں گا کہ میں بھی دل سے نکل گیا۔''

اس نے میرے ہاتھ تھام لیے، بولی۔ ''تمہیں اپنے دل سے نکالنے کے معاملے میں تو میں بے بس ہوں اور اللہ سے میری دعا ہے کہ ہمیشہ بے بس ہی رہوں۔''

پھر ہار دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔ ''اتنا خوب صورت ہار تم نے پسند کیا ہے یا جاناں نے؟''

''تمہیں پسند ہے تو میں نے کیا ہے اور اگر نہیں تو جاناں نے۔''

''بہت زیادہ خوب صورت ہے مگر مہنگا ہوگا، کیوں خریدا، میں تو ایسے بھی خوش ہوں، بچت کیا کرو۔ بچے آنے والے ہیں بہت خرچے ہوں گے...... وغیرہ وغیرہ۔''

''میری کمائی پر کچھ حق تمہارا بھی ہے جو بھی تمہارے لیے لاؤں خوشی سے لے لیا کرو۔''

''چلو مجھے اپنے ہاتھوں سے پہنا دو۔''

''نہیں سعد بیٹھا ہے اچھا نہیں لگتا تم جا کر پہن آؤ۔''

اس نے چولہا بند کیا اور خوشی خوشی ہار لے کر کمرے میں چلی گئی۔

واپس ایک والہانہ پن سے آئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ چاندی کے ہار میں چمکتے سبز موتی ایسے لگ رہے تھے کہ اس کی گردن پر جھک رہے ہوں اور ہار کہیں کھو گیا ہو۔ سنورنا اور موقع کی مناسبت سے سنورنا اس کو آتا تھا اور خوب اس پر جچتا تھا۔ میں کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ آئی تو میں نے اس کی خوب صورت ناک اپنی دونوں انگلیوں سے پکڑی اور اسے اپنے قریب لا کر آہستگی سے بولا۔ ''ہر بار پہلے سے زیادہ خوب صورت کیوں لگتی ہو؟ کون سا منتر پڑھتی رہتی ہو؟''

''تمہارے نام کی مالا جپتی رہتی ہوں میرا تو یہی ایک منتر ہے۔'' پھر بولی۔ ''دور ہٹو سعد لیونگ روم میں ہے۔''

میں ہنستا ہوا واپس صوفے پر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور وہ کچن میں مصروف ہو گئی۔

شام تیزی سے اتر آئی۔ تازہ خنک ہوا کھڑکی کے سفید پردے ہولے سے ہلا رہی تھی۔ جب ہم کھانا کھا رہے تھے۔ وقت رک سا گیا تھا۔ فضا تھم گئی تھی اور میں جیسے کسی کشتی کو دریا کی پُرسکون لہروں کے حوالے کر کے اس پر دراز تھا۔ وہ بہت ہنسی جب اسے یہ بتایا کہ ڈرائیونگ کا ابتدائی لائسنس لینے کے لیے کاؤنٹر پر سیاہ فام لڑکی کے سامنے میں نے کیسی احمقانہ حرکتیں کی تھیں۔ اب وہ ڈاؤن ٹاؤن کے قصے دلچسپی سے سنتی تھی۔ مطیع اللہ کی بھوت والی من گھڑت کہانی پر خوب ہنسی تھی۔ سرجی کو تو وہ جانتی تھی اور جب میگی کے ساتھ ان کے عشق کی داستان سنائی تو وہ اپنی ہنسی روک نہ سکی تھی۔ مجھے صرف اسے ہنستے دیکھنا تھا۔ اس لیے سنا رہا تھا۔

ہم قہوہ پینے صوفوں پر بیٹھے اور میں نے اسے کالج کی پراسپکٹس دی۔ فارم دیے کہ انہیں بھر کر پہلے مجھے دکھائے گی۔ اس نے رضامندی سے لے لیے۔ وہ میری باتیں مان رہی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ میرا ہر کام میرے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ میں اسے آگے بڑھتے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں کی تعلیم حاصل کر لیتی تو خود مختار ہو جاتی۔ کم از کم اسے سعد کے لیے کسی اور جانب دیکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ میرے سہارے کے بغیر زندگی گزار سکتی تھی۔ اسے کسی اچھے مقام پر لانا میرا ایک اہم ٹارگٹ تھا۔ میں یہ سب اس لیے کر رہا تھا کہ اس نے مجھے بے پناہ محبت دی تھی۔ کچھ اور نہ دے سکا تو اس کے لیے یہ کام تو کر جاؤں، میں یہ سوچتا تھا۔ وہ سعد کی ماں تھی اور میرے سامنے ایک بچی بن جاتی۔ ہر بات مجھ سے پوچھتی۔ ہر بات جو میں کہتا اس پر عمل کرتی اور اس طرح اس نے اپنے ساتھ مجھے جوڑ رکھا تھا۔

میں نے جانے سے پہلے اس سے کہا کہ کسی ویک اینڈ پر میں اتوار کو سیکیورٹی کی جاب سے چھٹی کروں گا۔ شاید ہم سینٹرل آئی، لینڈ جائیں۔ اس سے کہا کہ چائے کے علاوہ کچھ بھی ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ڈے ٹرپ اور یہ کھانا بنانے کی زحمت نہ کرنا۔ وہ کھڑی مسکراتی رہی۔ میں واپس چلا تو وہ دائیں ہاتھ سے پہنے ہوئے ہار کو انگلیوں سے چھو رہی تھی۔ جیسے اس میں چھپی محبت کو خلوص کو محسوس کرنا چاہ رہی ہو۔

☆......☆

ہیو سال میں ہمارا لنچ بریک ہوا۔ میں کراس لنکنگ میں خلائی لباس پہنے مشینوں سے الجھا کھڑا تھا۔ منظر جو فلنگ ڈپارٹمنٹ میں تھا، وہ ہر وقت فارغ رہتا تھا۔ دس دن میں

کسی ایک دن ہم انسانی خون کو بیگز میں بھرتے تھے اور وہی دن اس کے کام کا ہوتا ہے۔ فطیمہ اس کے ساتھ فلنگ میں تھی۔ دونوں نو دن اپنی مشینوں کے کوئی نہ کوئی پرزے ہاتھوں میں لے کر اِدھر اُدھر گھومتے رہتے۔ کبھی انہیں غور سے دیکھ رہے ہیں اور کبھی اسے ناپ رہے ہیں اور کبھی تول رہے ہیں۔ مطمع نظر صرف یہ تھا کہ مصروف نظر آئیں۔ یہ سمجھیں کہ دوسرے تو اکثر مصروف رہتے ہیں مگر یہ بھی کسی سے کم نہیں۔ ادھر ہمارے مینیجرز بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کے پاس بھی کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور وہ بھاگ دوڑ اس لیے کرتے کہ آگے ڈائریکٹرز کو مصروف نظر آئیں۔ ہمارا ایک گورا مینیجر تھا جو کانوں میں بالیاں پہنا کرتا۔ اس کا نام کرس تھا۔ نکمے کا کام اس کو نہیں آتا تھا۔ زنانہ انداز میں ہنستا اور زنانہ انداز میں شرماتا اور چلتا بھی اسی انداز میں تھا۔

میں اندر کام کر رہا تھا اور کرس مجھے کھڑکی کے شیشے سے دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے آواز تو ایک دوسرے کی سنائی نہیں دیتی تھی۔ لہٰذا میں نے اشارہ کیا کہ باہر جا کر سگریٹ پینی ہے تو وہ شرما گیا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں لباس تبدیل کر کے فوراً باہر نکلا اور اس سے بولا۔ ”میں نے کیا اشارہ کیا تھا؟“

شرما کر جواب دیا۔ ”یہ کہ سگریٹ پینے جانا ہے۔“

مجھے اکثر اس پر غصہ آ جاتا تھا۔ مینیجر تھا تو مجھے خاموش ہی رہنا تھا مگر اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے طیش آ جاتا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نااہل شخص کو ہمارا باس بنا دیا گیا تھا۔ میرے اکثر بھڑک جانے پر اب وہ بھی دشمنی پر اتر آیا۔ ایک بار ہماری انسپکشن ہونی تھی۔ ہم سب مل کر پلانٹ کی صفائی کر رہے تھے۔ منہ پر ماسک اور ہاتھوں میں ربڑ کے گلوز چڑھائے ہم ہر مشین کو چمکا رہے تھے۔ اب میں جو بھی مشین صاف کر کے جاؤں تو وہ میرے سر پر پہنچ جاتا۔ پوچھتا۔ ”کس مشین کو کلین کیا ہے؟“

میں اسے بتاتا تو پھر مجھے اس مشین کی طرف لے جاتا اور اس میں نقص نکالنے شروع کر دیتا۔ دو تین بار اس نے ایسا کیا پھر میں کسی دوسرے ایکوپمنٹ کو صاف کر رہا تھا تو دیکھا کہ کرس میرے سر پر کھڑا ہے۔ میرا غصہ آسمان سے جا لگا۔ بپھر کر بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ بوکھلا کر بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ تم میرا ہی پیچھا کیوں کر رہے ہو؟“ معلوم نہیں وہ کیوں ڈر گیا۔ میں نے پھر کہا۔ ”مجھے میرا کام کرنے دو، اگر تم کو کوئی اور کام نہیں تو دفتر میں جا کر بیٹھ جاؤ۔“

میں غصے میں کہہ تو گیا مگر منظر میرے پاس آیا اور سمجھایا کہ مینیجر ہے۔ ایسی کوئی بات نہ کرو کہ نوکری سے ہی نکال دے۔

میں نے کہا کہ کم از کم یہ مجھے نوکری سے کبھی نہیں نکال سکتا۔ جو خود نااہل ہو وہ ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔

میں بتا رہا تھا کہ میں اپنے سیکشن میں کام کر رہا تھا، منظر نے مجھے کھڑکی سے باہر آنے کے لیے اشارے کرنا شروع کر دیے۔ میں باہر آیا تو بولا۔ ”لنچ روم میں سب ایک پاکستانی خاتون کا ذکر کر رہے ہیں اور اخبار میں اس خاتون کی تصویریں بھی آئی ہیں۔“

منظر نے مجھے تفصیل یہ بتائی کہ فنچ کے علاقے میں ایک مال پر عورت کو اس وقت پولیس نے گرفتار کیا جب وہ اپنی تین سالہ بیٹی کو گاڑی میں چھوڑ کر مال کے اندر شاپنگ کرنے چلی گئی تھی۔ سیکیورٹی والوں نے دیکھا تو انہوں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور عدالت لے گئی۔

میں نے منظر سے پوچھا۔ ”مگر تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کیا اس عورت کو جانتے ہو؟“

گہرا سانس لے کر بولا۔ ”سبھی بیٹھے پاکستان کا ذکر کر رہے ہیں یعنی بدنامی پاکستان اور سب پاکستانیوں کی ہو رہی ہے۔“

مجھے اب لنچ روم میں جا کر صورتِ حال دیکھنی تھی ورنہ منظر میرا پیچھا نہ چھوڑتا۔

میں لنچ روم میں منظر کے ہمراہ آیا تو ایک میز پر کوئی اخبار پڑا تھا۔ صفحہ اوّل پر ایک بوکھلائی ہوئی عورت کی بڑی تصویر تھی۔ اس عورت کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ جان نہیں پائی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔

میں نے اخبار کی خبر پڑھی، تصاویر دیکھیں اور گہرا سانس لے کر بیٹھ گیا۔

سن نیوز پیپر ہمیشہ سے امیگرینٹس اور مسلمانوں کا مخالف چلا آ رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ ٹورنٹو اسٹار ایک متوازن اخبار تھا۔

ڈائنا پہلے بہت زیادہ ہلی اور پھر مجھ سے پوچھا۔ ”

”عورت کو جانتے ہو؟“

ان کی نظر میں جتنے پاکستانی کینیڈا یا ٹورنٹو میں بستے ہیں وہ سب ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں۔

”میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔ اس عورت نے غلطی کی تو اب یہ جانے اور عدالت جانے۔“ میں نے کہا۔

”کیا سب پاکستانی ایسے ہوتے ہیں؟“ فلپائنی چیٹو بول کر بولا۔

میں نے تنک کر پوچھا۔ ”کس طرح کے؟“

”اسی طرح کے بچوں سے مکمل بے پروا۔“

”منیلا میں بہت زیادہ قحبہ خانے ہیں تو کیا وہاں کی لڑکیاں دھندا کرتی ہیں؟“ میں نے چوٹ کی۔

وہ مجھے گھورتا رہ گیا۔ میں نے کہا۔ ”پھر ایک اور بات پوچھتا ہوں۔ وہاں کتوں کا گوشت بکتا ہے تو کیا سب فلپائنی کھاتے ہیں؟“

باقی سب ہنس پڑے اور چیٹو غصے سے سرخ ہو گیا مگر خاموش بیٹھا رہا۔

میں نے بات آگے بڑھائی۔ ”ایک پاکستانی کی غلط حرکت سے سب لوگ غلط نہیں ہو سکتے جس طرح بہت سے فلپائنو کے کتے کھانے سے سارے کتے خور نہیں ہو جاتے۔“

کیٹی جو چینی نژاد تھی وہ مجھ سے متفق ہوتے ہوئے بولی۔ ”ندیم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے اور ہم ایک فضول بحث کر رہے ہیں۔“ سب نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور چیٹو وہاں سے چلا گیا۔

اختر میرے کان میں بولا۔ ”تم کو اس طرح سے نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ہم پاکستانی پہلے ہی لڑاکے اور مشہور ہیں۔“

”بدتمیز اور غیرت مند میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کسی سے گالیاں سن کر ہم بھی اچھے نہیں بن سکتے۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

وہ بھی چپ ہو گیا۔ میں نے لنچ بھی نہ کیا اور اٹھ کر واپس اپنے سیکشن میں کام پر لگ گیا۔

ہم باہر کے ملکوں میں پاکستان کے سفیر ہوتے ہیں۔ اپنے ملک میں تو ہم سب ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہم ٹریفک دھکم پیل اور کہیں قطار بنانی ہے تو وہاں بھی نہ ... راہ چلتے کسی کو کندھا مار دیا تو بے پروائی سے چلتے ... جھوٹ تو من حیث القوم ہمارے اندر رچ بس گیا ہے۔ کسی بھی معاملے پر جھوٹ بولنا تو ہمارے لیے کوئی مسئلہ بھی نہیں رہا مگر یہاں پر جھوٹ بولنے پر ہم وقتی فائدہ تو حاصل کر سکتے ہیں مگر جب پکڑے گئے تو آگے والا حیرت اور صدمے کی کیفیت میں آپ کو دیکھے گا۔ ایک بات کھلے دل سے کہتا ہوں کہ بہتر مسلمان بن کر رہنا یہاں آسان ہے یہاں کے قوانین سے ہمیں مکمل آگاہی ہونی چاہیے ورنہ اپنے طور پر ایک معمولی غلطی کر کے اپنی اور ملک کی بدنامی کا باعث بن سکتے ہیں جیسے اس خاتون نے اپنی بیٹی کو گاڑی میں سوتا چھوڑ دیا تھا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ بچے کو گاڑی میں سوتا چھوڑ کر چلے جانا جرم ہے۔ میں نیویارک میں تھا اور تمنا بھابی کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے بینک جانا تھا۔ ان کا بیٹا ارشیان جو آٹھ نو ماہ کا تھا، وہ پیچھے بے بی سیٹ پر کار میں سو رہا تھا۔ تمنا بھابی بینک جانے کے لیے باہر نکلیں۔ پیچھے ٹرنک سے اسٹرولر نکالی، سوتے بچے کو اٹھا کر اسٹرولر میں لٹایا۔ میں بولا کہ اسے سونے دیں۔ ابھی دس منٹ میں واپس آ جائیں گے۔ تو وہ چلا کر بولیں۔ ”تم تو چاہتے ہو کہ مجھے جیل ہو جائے، ہتھکڑیاں لگیں اور قید ہوں۔“

میں حیران ہوا اور بولا۔ ”کہیں بینک میں ڈاکا تو ڈالنے نہیں جا رہی جو جیل جانے کی بات کر رہی ہو۔“

اس نے بعد میں بتایا کہ سوتے بچے یا پالتو کتے کو گاڑی میں چھوڑ جانا جرم ہے اور قید کے ساتھ جرمانہ بھی ہوتا ہے۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ کینیڈا میں کوئی مسلمان اپنے آپ کو بہترین مسلمان بنا کر رہ سکتا ہے۔ یہاں ہر ایک کے پاس ہمیشہ دو راستے ہوتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ آپ کے پاس چوائس بھی نہ ہو۔ آپ حلال کما کر اپنی زندگی آسانی سے گزار سکتے ہیں۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت آپ کو کبھی نہیں پڑتی ہے۔ وہ اور بات ہے کہ جھوٹ آپ اپنی فطرت اور عادت کی وجہ سے بولتے ہیں۔ رشوت کا نام و نشان خاص کر عوام کی سطح پر بالکل نہیں ہے۔ میں نے ایک سیاہ فام مسلمان سے پوچھا تھا کہ یہاں یعنی کینیڈا میں یا امریکا میں رہنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے بڑا خوب صورت جواب دیا کہ جو ہمیں اسلام سکھاتا ہے اب صرف وہی کریں تو آپ یہاں باعزت طور پر رہ سکتے ہیں۔ مسلمان کے لیے یہاں عبادات پر عمل کرنا بھی آسان ہے۔ نمازیں آپ پڑھیں تو لوگ عزت و تکریم دیتے ہیں۔

ندیم حیدر بلوچ

(1945ء۔2006ء)

علمی وادبی حلقوں میں ندیم حیدر بلوچ کے نام سے مشہور شاعر 1945 میں معروف صحرائی وریگستانی گاؤں جمالی بلوچ تحصیل نورپور تھل ضلع خوشاب کے ایک بااثر معزز جاگیردار اور معروف جنگ جوزند بلوچ قبیلہ کی ایک شاخ شاہی خیل کے تعلیم یافتہ سردار عالمگیر خان بلوچ تحصیل دار کے باثروت گھرانے میں پیدا ہوئے جن کی سخاوت کا دور دور تک شہرہ تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کی مسجد میں قرآن مجید ناظرہ سے ہوئی اور بنیادی تعلیم پرائمری مڈل میٹرک تک گورنمنٹ ہائی اسکول جمالی بلوچ سے حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج جوہرآباد (خوشاب) سے بی اے کیا، بعدازاں پبلک کمیشن سروس کا امتحان پاس کرلینے کے بعد انسپکٹر ایکسائز کے ممتاز عہدے پر میانوالی میں تعینات ہوئے۔ نوکری کا زیادہ تر حصہ میانوالی میں گزار 2004ء میں ایڈمن آفیسر انسپکٹر ایکسائز کے عہدے پر نون شوگر ملز بھلوال (سرگودھا) سے ریٹائرڈ ہوئے اور جوہرآباد میں مستقل سکونت پذیر ہوئے۔ علمی وادبی ثقافتی سرگرمیوں میں باقاعدگی کے ساتھ حصہ لیتے۔ ملک بھر کے شعراء وادباء

... انی اور دوستی ہوئی۔ دیانت داری، امانت داری، احساس فرض ذمہ داری، اصول پسندی میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ فرائض ... احسن طریقے سے سرانجام دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود قادر مطلق رزاقِ مطلق مانتے تھے۔ کم گو تھے، مردانہ ... وجاہت وسیم وجسیم پیکرِ حسن تھے۔ ایک معمولی مکان میں عمر عزیز کنوارہ رہ کر گزار دی۔ ہمیشہ کرائے کی کار پر دوست واحباب ... اقارب سے ملنے آیا جایا کرتے تھے۔ مہمان نواز تھے، دوستوں کی میزبانی کر کے خوش ہوتے تھے۔ اردو اور سرائیکی ... زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے علم عروض پر عبور رکھتے تھے کوئی استاد شاعری میں نہ تھا، ... شعراء سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ ندیم حیدر بلوچ نے اردو شاعری میں پانچ شعری مجموعہ کلام، سرائیکی شاعری میں چار ... کلام اور نثر نگاری میں تین یادگار کتب چھوڑی ہیں۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ لوک گلوکاروں عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی، گل ... بلوی، ایوب نیازی، طاہر ساقی، مظہر علی ملک، عطاء محمد خان نیازی، داؤد خیلوی نے ندیم حیدر بلوچ کا اردو وسرائیکی کلام گا ... امر کردیا ہے۔ 6 نومبر 2006ء کو جوہرآباد خوشاب میں انتقال ہوا۔ علامہ سید محمد تقی نقوی البخاری نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ... آہوں کے ساتھ سپرد خاک کردیا گیا۔

مرسلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

روزے آپ رکھیں تو آپ کو متبرک سمجھتے ہیں۔ مسلمان کے لیے صفائی نصف ایمان ہے اور یہاں صفائی اپنی اور گھر دونوں کی رکھنا آپ کی مجبوری ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کی معیشت کمزور ہو تو وہاں رشوت، بدعنوانی، جھوٹ، ڈاکا زنی کے علاوہ سب معاشرتی برائیاں عام ہوتی ہیں۔ یہاں کی معیشت مضبوط ہے تو یہ بیماریاں بہت کم ہیں۔ معیشت کو مضبوط عوام نہیں بلکہ حکمران اور ان کی پالیسیاں کرتی ہیں۔ اسی کی دہائی میں معیشت بہتر تھی تو ایک عام کلرک اپنے تین چار بچوں کا بوجھ باآسانی اٹھالیتا تھا۔ آج کی حالت سب کے سامنے ہے۔ گھر میں سفرنامے لکھتا ہوں، کہانیاں لکھتا ہوں مگر ایک پاکستانی دل بھی میرے اندر دھڑکتا ہے۔ جب دل کڑھتا ہے تو اپنے بے شمار پڑھنے والوں کے سامنے ایک تقابلہ رکھتا ہوں کہ انہیں بھی معلوم پڑے کہ عزت نفس کے ساتھ کیسے جیا جاتا ہے اور ان کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ ان کے پاس ووٹ کی طاقت ہے تو اسے سوچ سمجھ کر اختیار کریں۔

☆......☆

جمعہ کا دن تھا۔ ہم سب دوست ہیموسال کے لنچ روم میں بیٹھے تھے۔ کام کوئی خاص نہ تھا اور فارغ بیٹھے تھے۔ یہودی فزیکا کے علاوہ انڈین شریش اور پرتیک بھی ساتھ تھے۔ مفتی کو بھوک لگی تھی اور وہ لنچ روم کے فریج کھول کر اندر جھانک رہا تھا۔ منظر مجھے آنکھوں آنکھوں میں مسکرا کر اشارے کر کے مفتی کی جانب متوجہ کررہا تھا۔ مفتی لنچ کے لیے اپنی ازلی کاہلی کی وجہ سے کچھ نہیں لاتا اور پھر فریج میں کسی کا فروٹ جب بھی ہاتھ لگتا، ہڑپ کر جاتا۔ پرتیک سبزی خور تھا مگر شریش چکن وغیرہ بڑے مزے لے کر لیتا۔ ایک اور پاکستان مسلمان بھی بھرتی ہوا تھا۔ اس کا ... عظیم تھا۔ چھوٹی سی داڑھی اور بھرپور شخصیت تھی۔ ہم لوگ نارتھ امریکا میں نئے تھے مگر وہ امریکا سے کینیڈا شفٹ ... تھا۔ وہ سارے نظام کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ ہمارے ... پہلے چند روزہ تصور کو اس نے خود ہی پاش پاش کردیا تھا ... اسے انتہائی سنجیدہ، متین اور باصلاحیت انسان سمجھتے رہے ... اپنی بہت سی شخصی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک نظریہ ہمارے ... دل میں اس کا یہ بیٹھتا گیا۔ یار یہ تو بہت چھوڑو ہے۔ ... متانت اور آہستگی سے وہ اتنا بڑا جھوٹ چھوڑ دیتا کہ ہم ... کر بھی اسے سچ مان لیتے۔ اس عادت کے علاوہ بقایا ... اس میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں مگر وہ سب دب گئی تھیں ...

منظر نے مولویوں والے انداز میں کہا۔ ''مسلمانوں کے لیے جمعہ کی نماز پڑھنا انتہائی ضروری ہے۔ اگر آپ لوگ نہیں چل رہے تو میں اکیلا ہی جارہا ہوں۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''حضرت جی! آپ کیسے اخذ کرلیا کہ ہم نہیں جانا چاہتے؟''

عظیم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں تو ... بھی کیے بیٹھا ہوں۔''

اختر خوف کے عالم میں آہستگی سے بولا۔ ''گورے ... اعتراض تو نہیں کریں گے؟''

مفتی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''وڈبائن ... سال میں فوڈ کورٹ سے کھانا بھی کھالیں گے۔''

سب کے تبصرے ختم ہوئے اور ہم یہودی فزیکا کو ... اس پریشان چھوڑ کر منظر کی وین میں جمعہ کی نماز پڑھنے ... گئے۔ ایکس ڈیل پر IMO مسجد میں نماز جمعہ کے لیے ... بڑی تعداد میں نمازی جمع ہوتے ہیں۔ آج ایک ... امام صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ یہ امام صاحب ... اک نگر تھے۔ گورے امریکی نے جب اسلام قبول کیا ... پر ہلکی بھوری داڑھی رکھ لی۔ سرخ وسفید رنگت، ... ی داڑھی اور چہرے کے اوپر نور نے ہمیں فوراً ہی اپنی ... متوجہ کرلیا۔ تقریر کا ایسا پُرکشش انداز کہ اس نے مجھے ... روبرو لا کھڑا کردیا۔ جو بات کی اس نے قرآن کے ... سے کی۔ سیرت نبی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ مجھے مکہ مدینہ ... نے لگا۔ دین سے ایسی محبت کہ میرا سر شرم کے مارے ... گیا۔ عبادتوں کی ایسی تاثیر کہ اپنے سجدے زیاں لگے۔ ... میں ایسی للکار جیسے مجاہد کی اذان ہو۔

جو بھی عیسائی مذہب سے دین اسلام میں داخل ... اور پھر ثابت قدم رہے، انہوں نے مسلمان ہونے کا ... ادا کردیا۔ انہوں نے آنکھیں اور دماغ کھول کر اسلام کو ... قبول کیا۔ عبادتوں میں خلوت اختیار نہیں کی بلکہ ... گزارنے کو عبادت سمجھا۔ اندر کی بے چینی نے انہیں ... اسلام کے مطالعے کی جانب راغب کیا۔ جب پڑھا تو اپنے ... سے بغیر کسی جھجک کے مقابلہ کیا۔ خوب جانچا اور پھر ... حق ادا کر کے شہادت دی کہ اللہ واحد ہے اور محمد اللہ کے ... رسول ہیں۔

ہم نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلے تو خاصی دیر اس کی تقریر کے زیر اثر رہے۔

ہم ہائی وے 27 پر تھے وڈبرائن مال میں لنچ کرنے کے لیے مڑے تو پی آئی اے کے جہاز کو نچلی پرواز کرتے دیکھا تو فوراً ہم سب کے دل دھڑکنے لگے۔ منظر سے میں نے کہا کہ گاڑی سائیڈ پر لگادے۔ اس نے گاڑی روکی اور ہم تیزی سے اتر کر باہر نکلے تو ہماری نظریں جہاز پر تھیں جو اب پیرسن ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والا تھا۔ ایئرپورٹ قریب تھا اور ہر وقت جہاز اترتے اور پرواز بھرتے نظر آتے رہتے تھے لیکن آج ہم نے سبز ہلالی پرچم والا پاکستانی جہاز دیکھا تو ہم بے قابو ہوگئے۔

اب ہم سڑک پر کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے جذبات کا اظہار کررہے تھے۔ عظیم تو پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔ جب سے میں آیا تھا تب سے پاکستان دل کے تو قریب تھا مگر نظروں سے دور تھا۔ آج پی آئی اے کا جہاز دیکھا تو بے اختیار پاکستان نظروں کے سامنے آگیا۔ میں یہی سوچتا اور اداس ہوتا رہا کہ سولہ گھنٹے پہلے اسی جہاز نے پاکستان کی ہواؤں سے پرواز بھری ہوگی۔ پاکستان کے لوگوں نے اس جہاز کو اپنی نظروں سے دیکھا ہوگا۔ میرے لیے یہ بات بھی بڑی تھی کہ اس پر پاکستان کا جھنڈا پینٹ کیا گیا ہے۔ جہاز جب تک نظروں سے غائب ہو کر رن وے پر نہیں اترا ہم وہیں کھڑے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔

ہم دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر وڈبائن مال جارہے تھے۔ ہر ایک اداس تھا ماسوائے مفتی کے۔

مفتی نے کہا۔ ''ہم لوگ بھی یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو

سکتے جب تک پاکستان کی یاد اپنے ساتھ لگائے رکھیں گے۔ کینیڈا میں کیا کچھ نہیں ہے؟ موسم ہے، امن اور عزت ہے، کھانے پینے کی فراوانی ہے، نہ کوئی کرپشن ہے اور نہ لوگوں کے ہجوم نظر آتے ہیں۔ سب کو اچھی جاب ملی ہوئی ہے گھر اور گاڑی بھی کسی کے لیے لینا زیادہ مشکل نہیں۔ کیا پاکستان میں آپ لوگوں کو یہ سب مل سکتا ہے؟''

مفتی کی باتیں سن کر سب کو طیش آیا مگر خاموش رہے سوائے میرے۔ فرط جذبات سے میرا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ صرف احساس کی بات ہے۔ کئی لوگوں میں نہ تو وطن کی محبت ہوتی ہے اور نہ ہی اپنے بچوں کی۔ ان کا محور صرف اپنی ذات ہوتی ہے۔ اگر اپنے ملک کو بھول کر ایڈجسٹ ہونا شرط ہے تو یہ شرط مجھے کیا کسی ملک کے باشندوں کو قبول نہیں۔ اگر آگے بڑھنے میں ماضی کو بھولنا یا ترک کرنا ہی ترجیح ہوتی تو ہر ملک کے لوگوں نے اپنے بازار نہ بنائے ہوتے جہاں وہ اپنے ہوم کنٹری کی ثقافت، مصنوعات اور کھانے وغیرہ آپ کو پیش کرتے ہیں، جیسے گریک ٹاؤن، لٹل اٹلی، چائنا ٹاؤن، ڈچ کمیونٹی وغیرہ پھر میں نے مفتی کو براہ راست مخاطب کیا۔ ''ہم پاکستانیوں پر تم یہ شرط کیوں رکھ رہے ہو کہ پاکستان کو بھول کر آگے دیکھیں۔'' مفتی اب بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں میں نے کئی ایک ایڈجسٹ دیکھیں ہیں جن کو آئے چالیس چالیس سال ہو گئے ہیں۔ سب کچھ ہے مگر ذہن ایڈجسٹ نہیں ہے۔ بوڑھے ہو گئے اور اب رو رو کر کہتے ہیں کہ یا اللہ مرنے کے بعد دفن اپنے وطن کی مٹی میں کرنا۔''

ہم وڈبائن مال کے وسیع وعریض پارکنگ لاٹ میں پہنچے۔ مال میں بڑی بلکہ بہت بڑی پارکنگ تھی۔ رش نہ تھا اسی لیے بیشتر پارکنگ لاٹ خالی پڑی تھی۔ دھوپ نکلی تھی مگر چبھتی ہوئی ہرگز نہ تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکوروں نے ہمیں ہشاش بشاش کردیا تھا۔

یہ وہی مال تھا جہاں ہمیں مفتی ان دنوں لایا تھا جب ہمیں آئے ہوئے ایک دو ہفتے ہی ہوئے تھے۔ شہباز اور میں نے یہاں Payless shoes سے سیفٹی بوٹ خریدے تھے۔ وہ بھی عجیب دن تھے اور یہ بھی عجیب دن ہیں۔ ان دنوں میں ٹورنٹو کی ہر چیز کو آنکھ کے علاوہ چھو کر بھی دیکھتا تھا گو وہ سات ماہ پہلے کی باتیں تھیں مگر لگتا کہ سالوں بیت گئے۔ جو لوگ میرا سفرنامہ شروع سے پڑھتے چلے آرہے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ میں کن تکلیف کیفیتوں سے گزر رہا تھا۔ پھٹی آنکھوں اور بجھے دل ساتھ ہراساں پھرتا تھا۔ میرے تکیے..... اور کمفرٹر کی خوشبو مجھے آزردگی میں گھیرے رکھتی تھی۔ لیبر کے فیکٹریوں کے دروازے کھٹکھٹاتا تھا۔ بچوں کی یاد آتی تو یوں لگتا کہ دل کو کسی نے تیز دھار خنجر سے چیر کے رکھ دیا ہو۔ گھر بار یاد آتا تھا۔ اپنا پاکستان میری آنکھوں کے سا ایک ایک زاویے سے دکھائی دیتا۔ جب کمرے کا درو کھول کر اندر داخل ہوتا تو سامنے میری دو سالہ بیٹی کی تص نظر آتی۔ میں آسودگی سے اپنے بیڈ پر سیدھا لیٹا ہوتا خیالوں میں وہ بابا بابا کرتی میرے سینے سے لپٹ جاتی سات رکھے جگ سے پانی گلاس میں میرے لیے انڈیلنے کوشش کرتی۔ اکثر گرا دیتی اور اپنا منہ میرے سینے میں چ لیتی۔ بیٹی کے وجود کا ننھا سا لمس دل کو خوشیوں سے بھر دیت بیوی کھانا لا کر سامنے رکھتی اور بیٹی کو اٹھا لیتی۔ وہ دوبارہ لپک کر میرے پاس پلٹتی۔

مجھے یہ سب کچھ یاد آتا تھا اور ان دنوں بہت ج مفتی مجھے اس مال میں لے آیا تھا۔

ہم مال میں داخل ہوئے تو سب ایک دوسرے فقرے کس رہے تھے۔ وڈبائن مال بھی سب مالوں ج تھا۔ دو منزلہ مال بہت بڑے رقبے میں پھیلا تھا، بچوں لیے جھولے اور دوسری تفریحات تھیں۔ چھوٹی ٹرین چلتی جس پر بچے جو ہمیشہ خوش شکل ہوتے ہیں وہ بیٹھے ہنستے جا تھے۔ بچے کہیں لڑھک رہے تھے، کہیں لڑکھڑا رہے تھے گر رہے تھے تو کہیں گر کر اٹھ رہے تھے۔ کہیں بھاگ ر تھے تو کہیں بھاگتے بھاگتے تھک کر بڑوں کی گود میں رہے تھے کسی رائیڈ کے انتظار میں لائن لگائے کھڑے اور ان کا سائز ناپا جا رہا تھا کہ یہ اس رائیڈ کے لیے فٹ کہ نہیں، اگر نہیں تو رو رہے ہیں، دھاڑیں مار رہے ہیں مائیں روتے بچوں کو اٹھائے انہیں پاپ کارن دلا رہی اور وہ غصے میں نم آنکھوں سے ہاتھ مار کر انہیں گرا رہے ہیں

اس پلے ایریا کی گرد دوسری منزل پر رنگ برنگی چھ چھوٹی لکڑی کی کھڑکیاں ہیں جیسے وہاں فیری ٹیل کہانی کے کرداروں کے چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ یہ سنڈر ہے اور یہ سنو وائٹ کا ہے۔ اس گھر میں تو بونے اپنے کے ہمراہ رہتی ہے۔

وڈبائن سینٹر میں میرا پسندیدہ مقام یہ ایریا ہے ج

کی بنچ پر بیٹھ کر میں دنیا سے بے پرواہو کر بچوں میں کھو جاتا ہوں۔ میرا نسرین سے قریب ہونا بھی زیادہ تر اس کے بیٹے سعد کی وجہ سے تھا۔ اتنا پیارا اور معصوم کہ جیسے کوئی تازہ پھول ہو۔ ایسا پھول جسے آپ بے خودی میں گلے بھی لگا سکتے ہیں۔ اپنے بچے دور تھے تو سعد کے روپ میں اپنے بچوں کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ نسرین کو بھی سعد سے میرے پیار کی حد کا ادراک تھا۔ وہ میری غیر موجودگی میں سعد سے میرے بارے میں باتیں کرتی تھی تاکہ وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہو جائے۔ وہ بچہ تھا اور مانوس ہوگیا۔ میں بچہ تو نہ تھا مگر پھر بھی نسرین سے مانوس ہوتا چلا گیا۔

میرے پڑھنے والے میری تحریر کی تعریف کرتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے اور جب تنقید کرتے ہیں تو بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ ایک قاری نے لکھا کہ کیا میرا نسرین سے رشتہ غیر اخلاقی یا ناجائز تو نہیں کہلایا جائے گا۔ میں نسرین سے اپنے تعلق کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کروں گا۔ میں انسان ہوں اور انسانی دل لکھتا ہوں اور میں نے اکثر دل کی سنی ہے اور آگے بھی اس کی سنوں گا کیونکہ خالق نے مجھے بنایا ہی ایسا ہے۔ آپ نسرین سے رشتے کو کوئی بھی نام دے دیں مگر مجھ پر الزام کرتے ہوئے اسے ناجائز نہ کہیں۔ ناجائز اور غیر اخلاقی وہ رشتہ ہوتا ہے جس میں ہوس اور لالچ ہو۔ میرا یقین اگر چاہیں تو کرلیں کہ یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔

ہم فوڈ کورٹ میں آ بیٹھے تھے۔ ایک بہت بڑا مستطیل ہال تھا۔ چاروں جانب فوڈ شاپس تھیں اور درمیان میں صاف و شفاف فرش پر رنگین کرسیاں میزوں کے گرد رکھی تھیں۔ کرسیوں کے ساتھ جگہ جگہ پر چھوٹی میز رکھی تھیں جن پر کیچ اپ، مسٹرڈ ساس اور ٹشو پیپر رکھے تھے۔ لوگ پیٹ بھر کر لاتے اور کھا کر گاربیج میں خالی کر کے قرینے سے ٹیبل پر رکھ دیتے۔ کے ایف سی اور میکڈونلڈ کے علاوہ بے اور کئی اقسام کی فوڈ شاپس تھیں۔ کھانے کی کوالٹی کے علاوہ ماحول بہت دلنشیں تھا۔ صاف ستھرے لوگ، مسکراتے چہرے، دکانوں پر کام کرتیں حسین لڑکیاں اور پکوانوں کی خوشبو تھی۔

پاکستان میں تو یہ ہر کسی کے بارے میں معلوم ہوتا تھا کہ فلاں کتنا امیر ہے اور فلاں کس حد تک مفلس ہے۔ ہوتے تھے تو امیر ترین لوگ صرف لکھ پتی ہوتے ہیں کروڑ پتی تو ہماری گنتی ختم ہو جاتی تھی پھر کروڑ پتی خال خال نظر آنے لگے پھر لوگوں کے پاس پیسا آنا شروع ہوا۔ ایک

کچھ بلنڈرز یا غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آگے چل کر فائدہ پہنچا دیتی ہیں۔ خاص طور پر ایجادات کے شعبے میں ایسی مفید غلطیاں بہت ہو چکی ہیں۔ قدرت جان بوجھ کر ان لوگوں کے لیے غلطیوں کے مواقعے فراہم کردیتی ہے کہ ان کی غلطیو سے کچھ فائدہ ہو جائے۔ ایسی ہی ایک غلطی الیگزینڈر فلیمنگ سے ہوئی۔ وہ ایک سائنس دان تھا اور اپنے کام خود ہی کیا کرتا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں کام کے دوران سوچتا رہتا ہوں اور اس سوچ بچار میں کوئی روشنی میرے سامنے آجاتی ہے۔ اسے بہت سارے برتن دھونے تھے۔ یہ اس کے مزاج میں شامل تھا۔ صفائی کا خبط رکھنے والا شخص۔ اگر گھر میں ذرا سی بھی گندگی دیکھ لیتا تو اس کو الرجی ہو جاتی۔ اس نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ سینک میں گندے برتن چھوڑ کر تفریح کے لیے شہر سے باہر چلا گیا۔ اسے برتنوں کی صفائی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ واپس آیا تو ان برتنوں میں گندگی کی وجہ سے پھپھوندیاں لگ چکی تھیں سوائے ایک حصے کے۔ وہ حصہ بالکل محفوظ رہا تھا۔ اس نے اس حصے کو کیمیکل کا مشاہدہ کیا۔ اس پر ریسرچ کیا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس غلطی کی وجہ سے کتنی بڑی دوا ہمارے سامنے آگئی۔

جی ہاں پنسلین۔ اس کامیاب اینٹی بائیک کی ایجاد اسی طرح ہوئی تھی۔ مرسلہ: نذہت ایاز، کراچی

جانب سے ہیروئن اور اسلحے کی کمائی آنا شروع ہوئی تو دوسری جانب ملکی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کا مکروہ دھندا شروع ہوگیا۔ پھر ارب یا دو ارب روپے پر ہاتھ صاف کرنا ایک معمولی بات بن کر رہ گئی۔ پیسے کی دوڑ لگی تو پھر جس کے ہاتھ جو لگا وہ ڈکار گیا۔ جو لوگ بزنس سے پیسا بناتے ہیں وہ بہر حال پھر بھی جائز ہے۔ لوگوں کو نوکریاں تو ملتی ہیں ملک کی ترقی کا پہیا تو چلتا ہے مگر جب گورنمنٹ آفیشلز اور سیاستدان کرپشن کرتے ہیں تو ملک کا نظام بیٹھ جاتا ہے۔

یہاں کینیڈا میں ہمیں معلوم نہ تھا کہ لوگوں کے پاس زیادہ سے زیادہ کتنا پیسا ہو سکتا ہے۔ امیر لوگ کون ہوتے ہیں اور ان کی امارت کا پیمانہ کیا ہے۔ سمجھنے کے لیے یہ بات بتاتا چلوں کہ یہاں اگر کسی آدمی کے اکاؤنٹ میں تیس چالیس ہزار ڈالر ہیں تو وہ بہت مطمئن اور صاحب ثروت کہلاتا ہے ورنہ یہاں گورے جو نوکریاں کرتے ہیں ان

کے اکاؤنٹ میں چار یا پانچ ہزار ڈالر بھی شاید بمشکل ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ معلوم ہوتا گیا کہ یہاں کے امراء کون ہیں، ہم جس جدید خوب صورت مال میں بیٹھے تھے جہاں کی پارکنگ کا دوسرا کنارہ صاف نظر نہیں آتا تھا، ایسے چالیس سے زیادہ مالوں کا ایک ہی مالک ہے۔ یہ مال امریکا اور کینیڈا میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ آدمی یہاں کے امیر آدمیوں کی لسٹ میں شامل ہی نہیں۔ بل گیٹس دنیا کا امیر ترین آدمی کہلاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ اربوں ڈالر اس کی کمپنی کے اثاثہ جات ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ امیر لوگ امریکا اور یورپ میں ہیں۔ کئی امیر خاندان ایسے بھی ہیں کہ اگر دنیا کے ہر آدمی کو ایک ایک گھر بنا کر بھی دیں تو ان کی دولت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

پیسے کی ریل پیل کا عالم یہ ہے کہ صرف امریکا میں ہر سال لوگ سات سو ارب ڈالر کی گروسری کرتے ہیں۔ آبادی اس کی تیس کروڑ ہے ہم بائیس کروڑ پاکستانی ہیں اور ہمارے پورے ملک کا سالانہ بجٹ ساٹھ ارب کے نیچے ہے اور اس میں سے آدھا تو ہم اپنے بینکوں سے اور آئی ایم ایف سے قرضہ لیتے ہیں اور تب جا کر ملک کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ ایک آدمی اگر اسی سال کی زندگی بھی پالے تو وہ زیادہ سے زیادہ اپنے پر کتنا خرچ کرسکتا ہے؟ اگر دو تین گاڑیاں بھی ہوں۔ گھر بھی بہترین ہو۔ کھانے پینے اور پہننے پر اچھا خرچ کرے اور ہر سال ایک دو بار تفریحی سفر بھی کرے تو زیادہ سے زیادہ پوری زندگی میں ساٹھ لاکھ ڈالر ہی خرچ کر پائے گا اور اگر اس کے اثاثے ساٹھ لاکھ ڈالر سے زیادہ ہیں تو باقی کی رقم اس کے کس کام آئے گی؟ وہ یا تو سونے کی اینٹیں ہیں یا کاغذ کے پرزے۔ جب تک وہ انہیں کسی کی بہبود کے لیے خرچ نہیں کرتا تو وہ اس کے لیے چند نمبرز ہیں جنہیں وہ صرف یاد کر کے مر سکتا ہے۔

میں یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس دن وڈبائن سینٹر میں ہم دوستوں کی بحث کا موضوع دولت اور اس کی اہمیت تھی مفتی نے ایک مشہور فوڈ چین کے آگے لوگوں کی لائن دیکھ کر کہا۔ ''میرے پاس ایسی فوڈ کی ایک شاپ ہو تو پوری زندگی میں آرام سے گزار لوں۔ کون خوش نصیب اس کا مالک ہوگا جو ہر ماہ دس بارہ ہزار ڈالر بنا لیتا ہے۔''

اختر ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ ''معلوم نہیں کون اس چین کا مالک ہوگا۔ وہ پورا دن گھر میں بیٹھا رہتا ہوگا۔ نہ اسے کام کرنے کی ضرورت اور نہ کوئی تردد کرنے کی۔''

عظیم جو اپنے آپ کو نارتھ امریکا کے نظام کا ایکسپرٹ مانتا تھا۔ وہ عقل مندی کی لکیریں اپنے ماتھے پر لا کر بولا۔ ''یہاں ٹیکس بھی تو بہت زیادہ ہوتے ہیں کم از کم دو فوڈ چین ہونی چاہئیں۔''

منظر نے اپنی دائمی حقارت سے کہا۔ ''پہلے کچھ کھانے پینے کا آرڈر دے دیں۔ خالی پیٹ تو میں کوئی بات بھی نہیں کر سکتا۔'' عظیم نے جا کر فش برگر اور فرائز کا آرڈر دیا۔ کچھ دیر بعد ہر ایک ٹرے میں اپنا آرڈر لے آیا۔ ساتھ ہی گتے کے گلاسوں میں اپنی پسندیدہ ڈرنکس بھریں۔ ادائیگی ہر ایک نے اپنی اپنی کی اور واپس کرسیوں پر آ بیٹھے۔

حیرت ہوتی تھی کہ چالیس پچاس فوڈ شاپس ہوں گی اور ہر ایک پر رش تھا مگر مجال ہے کہ کوئی تنکا بھی چمکتے فرش پر پڑا نظر آ جائے۔ ہم اس صاف ستھرے اور تازہ ماحول میں برگر کھاتے اپنی بحث کو وہیں سے شروع کرتے تھے جہاں ہم نے اسے بریک لگائی تھیں۔

منظر بولا۔ ''زندگی میں بس اتنا ملتا رہے کہ گزر بسر آسانی اور عزت سے ہوتی رہے۔ تین بیڈروم کا چھوٹا سا گھر ہو، گاڑی اچھی سی ہو، بغیر خواہشیں دبائے وقت گزرتا رہے۔''

اختر سے پوچھا گیا تو وہ پہلے کسی نامعلوم وجوہ پر ہنسی روکنے کی تادیر کوشش کرتا رہا پھر کسی نے کہا کہ پہلے اس ناکام ہنسی کی وجہ بتا دو تاکہ بعد میں مل کر ہنس سکیں۔ ایک دم سنجیدہ ہو کر آئس کریم شاپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ بہت خوب صورت بچی ماں کے ساتھ کھڑی ہے اس نے پہلے ونیلا آئس کریم لی اور پھر ماں سے کہا مجھے ونیلا نہیں اسٹرابیری آئس کریم چاہیے۔''

ہم سب نے ادھر دیکھا تو بچی سے زیادہ ماں خوب صورت دکھتی تھی۔ گھٹنوں سے اوپر تنگ سیاہ اسکرٹ میں خوب صورت لڑکی ایک خوب صورت بچی کے ساتھ کھڑی تھی۔ سب نے خوب صورت لڑکی کا بھرپور جائزہ لیا اور اختر سے پوچھا۔ ''اب بتاؤ کہنا کیا چاہتے تھے؟''

یہ سن کر اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کس کے بند کیا اور زور زور سے جھٹکے کھا کر مطلب یہ تھا کہ اب باقاعدہ ہنس رہا تھا۔ عظیم نیا تھا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ سمجھا کہ اس کے گلے میں برگر پھنس گیا ہے۔ جلدی سے اس نے اختر کو اسی کی ڈرنک پکڑاتے ہوئے کہا ''جلدی سے دو گھونٹ بھر لو۔'' اس کے بعد اختر اپنی ہنسی

بے قدری پر خفا ہو گیا۔ غصے کی حالت میں اپنا بقایا برگر جلدی جلدی سے چبا گیا۔

اختر کے سامنے سب نے مل کر یہ سوال دوبارہ رکھا تو پہلے اس نے جواب سے انکار کر دیا۔ ہم نے منتیں کیں تو زیادہ اکڑ گیا۔ جب میں نے یہ دھمکی دی کہ میں سپروائزر سے تمہاری شکایت کردوں گا کہ بغیر گاؤننگ کے تم اپنے ...ن میں کل شام گئے تھے تو کہنے لگا۔ ''زندگی میں پیسے کی اہمیت نہیں جتنی اہمیت بہت سے پیسے کی ہے۔''

ہم نے سمجھا کہ مذاق کر رہا ہے مگر جب دیکھا تو انتہائی سنجیدہ ہونے کے علاوہ قدرے غصے میں بھی تھا، بولا۔ ''ہم سب یہاں پیسا بنانے اور معیار زندگی بہتر بنانے آئے ہیں۔ پیسا جتنا بھی ہو کم ہے۔''

میں نے اس کے غصے اور سنجیدگی کو ہمیشہ کی طرح نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں زندہ رہنے کے لیے بلکہ باعزت زندہ رہنے کے لیے کتنی رقم چاہیے۔''

''ہر ماہ آٹھ ہزار ڈالر ملتے ہیں تو ساری زندگی مزے میں پڑے گزار لوں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

پھر مجھ سے یہی سوال پوچھا گیا۔

جب میں کینیڈا نیا نیا آیا تھا تو شدید ڈپریشن کا شکار تھا۔ ان دنوں کہتا تھا کہ اگر میرے پاس تیس ہزار ڈالر جمع ہو جائیں تو واپس پاکستان چلا جاؤں گا۔ اپنا گھر بناؤں گا۔ اپنی گاڑی لوں گا اور یونیورسٹی میں اپنی جاب دوبارہ شروع کر کے آرام سے اپنے ملک میں زندگی گزاروں گا۔ شروع میں کوئی جاب نہ تھی تو تیس ہزار ڈالر بہت رقم تھی میرے لیے۔ اب جاب تھی تو میری خواہش تیس ہزار ڈالر سے بڑھ کر ایک لاکھ ڈالر ہو چکی تھی۔ میں نے یہی کہا کہ اگر ایک لاکھ ڈالر میرے پاس جب اکٹھے ہو گئے تو پاکستان چلا جاؤں گا اور یہ بھی کہ اپنے ملک سے بہتر رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

پھر میں ترقی کرتا گیا اور میری خواہش ایک لاکھ ڈالر سے بڑھتی چلی گئی۔

زندگی میں پیٹ اور خواہشوں کا کنواں کبھی نہیں بھرتا۔ انسان بڑا بے شکرا ہے۔ سالوں دنیا کے دھکے کھانے کے بعد ایک بات سمجھ میں آئی ہے کہ وہ انسان سب سے بڑا دولت مند ہے جس کے پاس قناعت کی دولت ہے جس کو جمع کرنے کا حرص نہیں۔ جو سادگی سے رہتا ہے اور دو وقت عزت کی روٹی مل جائے تو چین کی نیند سوتا ہے۔ اپنے رب سے شکایتیں نہیں کرتا بلکہ شکر گزار بن کر رہتا ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ انسان محنت نہ کرے، پیسے نہ بنائے۔ ملیں تو ضرور بنائے جستجو بھی کرے مگر ایک بیلنس ضرور رکھے۔ انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر یہ احساس شدت سے ہوتا ہے پیسا ضروری تو تھا مگر کیا اتنا ضروری تھا کہ بہت سے دوسرے ضروری کام بھی اس کی خاطر چھوڑ دیے۔

موجودہ دور میں اخلاقیات کی جگہ بہتر معیار زندگی کا رجحان غالب ہو گیا ہے۔ اس دور کی بیماری ہی یہی ہے۔ ہر شخص اس وبا کا شکار ہے۔ اس کو گھر میں ہر آسائش چاہیے۔ ہر چیز کی افراط چاہتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایک شخص بھی اس وبا کے اثر سے محفوظ ملے گا چونکہ معیار زندگی کی کوئی حد مقرر نہیں اس لیے جو بھی اس میدان میں گامزن ہے ان کا اپنا ہر قدم پہلا قدم ہوتا ہے۔ ہماری نظروں سے آخری منزل اوجھل ہو گئی ہے۔ کسی کو معلوم بھی نہیں کہ معیار زندگی اور دولت کی حد کہاں ہے کب آئے گی اور کبھی آئے گی بھی یا نہیں چونکہ معیار زندگی کا سارا دارومدار دولت پر ہے۔ جب معیار زندگی کی کوئی حد نہیں مال کے حرص میں بھی کمی کا امکان نہیں۔ جس رفتار سے زندگی کا معیار اونچا ہو رہا ہے اس سے زیادہ شدت کے ساتھ مال کا حرص بڑھتا جا رہا ہے۔

میں جب بھی زندگی کی حقیقت پر غور کرتا ہوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کوئی سہانا یا ڈراؤنا خواب ہے۔ کوئی سپنا ہے، ایسا سپنا جو ایک دن چھناکے سے ٹوٹے گا جب موت سامنے کھڑی ہوگی۔ اس وقت مجھے شدت سے محسوس ہوگا کہ میں تو کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی حقیقت تو کچھ بھی نہیں ہے۔ حقیقت تو میرے سامنے اب کھڑی ہے پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ اس خواب میں بھی ہم نے تم کو کئی اختیارات دیے تھے۔ ارادہ و عمل کے ان کا حساب تمہیں دینا ہے۔ پھر میں تو اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔ مرتے شخص کی شاید یہی سوچ ہوتی ہوگی۔ یہ کیا تماشا تھا جو چند لمحے سے برپا تھا۔ وہ لمحے اتنے طویل تھے کہ میں بچپن گزار کر جوان بھی ہوا اولاد بھی ہوئی اور پھر بوڑھا ہو کر مر رہا ہوں؟ مرتے مرتے عقل اس حیرت میں گھری ہوگی کہ یہ سب کیا تھا۔ خواب یا حقیقت یا پھر دونوں۔

اس دن وہاں سے آئے تو ہر ایک کھل نہیں رہا تھا۔ اپنی اپنی ضروریات کی حد ہر ایک نے بتا دی تھی اور ہر ایک کو اپنی آرزو خواب لگتی تھی۔ آج وہ سب دوست اس سے زیادہ کما رہے ہیں جو ان کی حد تھی مگر پھر بھی خوش نہیں کہتے ہیں کہ خرچ

بڑھ گئے ہیں اس لیے سب کا معیار زندگی بدل چکا ہے۔ معیار زندگی کی کوئی حد نہیں تو دولت کی کیونکر ہو سکتی ہے؟

☆......☆

جمعہ کا دن تھا اور پورے اونٹاریو میں کسی وجہ سے سب دفاتر، فیکٹریاں، بینک اور اسکول بند تھے۔ میں نے صبح سویرے سرجی، مطیع اللہ اور شہباز کو گہری نیند سے جگا کر ان کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ پچھلی رات اچانک بادل گھر آئے تھے اور پوری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ کل رات دیر تک میں کمرے کی ڈور وال سے باہر کے ماحول کو بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ لگاتار برستے مینہ نے درجہ حرارت خاصا گرا دیا تھا اور مجھے ڈور وال کھسکا کر بند کرنا پڑی تھی۔ دو دن پہلے ذرا سی گرمی پڑی تھی اور ٹورنٹو کی عادت اتنی گرمی برداشت کرنے کی نہ تھی اور وہ سارے بادلوں کو ورغلا کر اپنے آسمان پر لے آیا اور پھر جب وہ برسنا شروع ہوئے تو تھمنے کا نام نہ لیا۔ درجہ حرارت بائیس سے گر کر دس درجے تک پہنچا تو سوتے سرجی نے پاؤں کے قریب پڑے کمبل کو سر پر لیتے ہوئے خراٹے بھرتے شہباز کو ایک لات بھی ٹکا دی تھی۔ لات شہباز کو پڑی تو آفت سیٹیاں بجاتے ہوئے مطیع اللہ کی آئی اور شہباز نے گالیوں کا رخ مطیع اللہ کی جانب کر دیا مگر مطیع اللہ نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کیا اور صرف یہ کہا۔ ”ہر وقت بک بک کرتی رہتی ہے۔ رات کو کالی زبان اس کی دن سے بھی زیادہ چلتی ہے۔“

یہ سن کر سب دوبارہ خراٹے لینے لگے تھے۔

کل شام کو جمال کا فون آیا تھا۔ جو قارئین میری سفر کہانی شروع سے پڑھ رہے ہیں وہ جمال کو جانتے ہیں۔ کراچی کا جمال جس نے ڈیرہ میں اپنا بہت سارا وقت گزارا اور ڈیرہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ دنیا کے مختلف ممالک گھوم کر کینیڈا میں ٹک گیا کیونکہ اس کے گردے ختم ہو چکے تھے۔ اب وہ ڈائیلیسس پر تھا۔ وہ میرا بہترین دوست اور نگران بن کے ہمیشہ رہا۔ وہ اپنی بیوی اور بہت پیاری بیٹی کے ساتھ اسکاربرو میں ایک ملٹی اسٹوری اپارٹمنٹ بلڈنگ کے بارہویں فلور پر رہتا تھا۔ وہ اب ایک بیڈ روم اپارٹمنٹ سے سترہویں فلور پر اسی بلڈنگ میں دو بیڈ روم کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو رہا تھا۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ سامان شفٹ کرانے کے لیے اسے مدد کی ضرورت تھی۔ وہ خود کوئی بھاری چیز اٹھانے سے قاصر تھا۔ اس نے مجھے فون کیا کہ کل چھٹی ہے اور اگر تم اپنے دوست لے آؤ تو میرا سامان ایک دن میں شفٹ ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ انہیں بہلا پھسلا کر لے آؤں گا مگر ہم بھوکوں کو کھانا بھی کھلانا پڑے گا جو جانتے ہو۔

دراصل ہماری بھابی بھی کراچی کی تھیں اور کراچی کی خواتین نہاری، بریانی اور حلیم بنانے میں جو مہارت رکھتی ہیں وہ بہت کم دوسرے علاقوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ادھر اپنے اپارٹمنٹ میں ہر روز ایک ہی طرح کی اشیاء کھا کر ذ... ہو چکے تھے۔ جمال نے ہنس کر ہامی بھری اور یہ بھی کہا کہ ... کھلاؤں گا اس سے ڈبل ساتھ پیک کر کے بھی دوں گا۔ اس نے میرا کام آسان کر دیا اور اب میں آرام سے اپنے تینوں دوستوں پر جال پھینک سکتا تھا۔

یہاں لوگ اوسط طور پر ہر تین سال میں گھر شفٹ کرتے ہیں۔ سامان کو پیک کر کے شفٹ کرنا ایک عذاب ہوتا ہے کسی Moving compang کی خدمات میں تو باآسانی تین چار سو ڈالر نکل جاتے ہیں۔ ایک بڑی رقم ہوتی ہے لہٰذا دوست واحباب یہ فرض انجام دینے میں بحالت مجبوری راضی ہو جاتے ہیں۔

میں نے تینوں کے ساتھ مفتی کی نظریں بچا کر و... میٹنگ کی۔ ہم کمرے میں بیٹھے تھے۔ مفتی تو اپنا چائے کپ میٹرس سے کچن تک رکھنے کا روادار نہ ہوتا تھا تو بھلا گھر کا سامان کیسے شفٹ کرا پاتا۔

شہباز میری بات سن کر زرد پڑ گیا اور بولا۔ ”ا... عرصے بعد کوئی چھٹی آئی اور آپ نے یہ سیاپا کھڑا کر دیا۔ مجھ سے یہ پلنگ نہیں اٹھائے جاتے۔“

”میرا ریڑھ کا ہڈی ٹوٹنے والا ہے۔ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے وزن اٹھانے سے منع کیا ہے۔ ... لیے تو بیوی کو بھی کینیڈا نہیں بلوا رہا۔“ مطیع اللہ بولا۔

”کسی کی مدد کرنا بوجھ نہیں، ثواب کا کام ہے ہم ... وقت ثواب حاصل کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔“ سر... نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

میں نے مطیع سے پوچھا۔ ”سمجھ میں یہ بات ... آئی۔ ڈاکٹر نے تمہیں بوجھ اٹھانے سے روکا ہے اور تم ... کو کینیڈا نہیں بلوا رہے۔ ان دو باتوں میں نسبت کہاں ...“

”پھیملی (فیملی) کا بوجھ بھی تو کم نہیں ہوتا۔“ ... طلب نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے تم بوجھ نہیں اٹھانا۔ پلیٹیں اور دیگ... اٹھانا۔ بدلے میں نہاری اور بریانی وہاں بھی کھانے کو ملے گی اور ساتھ کے لیے بھی ملے گی۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ساتھ میں نے یہ گرہ بھی لگائی۔ ”بھابی کے ہاتھوں کی گرم روٹیاں بھی ہوں گی۔“

شہباز تھوک نگل کر بولا۔ ”جمال اچھا انسان ہے، اس کی مدد کرنے میں ایک چھٹی ضائع کرنا کوئی بری بات نہیں۔“

سرجی ڈور وال کے باہر گھر گھر آتے بادلوں کو دیکھ کر بولے۔ ”ہمیں تو لوگوں کی نیتوں کا علم پہلے سے ہو گیا تھا کہ یہاں پیٹ کے پجاری بستے ہیں۔ شومئی قسمت ہم بھی چیلوں کے گھونسلے میں آ گرے۔“

شہباز جو ٹیک لگائے بیٹھا تھا وہ سیدھا ہو گیا۔ چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ کیے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”سرجی کا ہر سیاپا مجھ پر گرتا ہے۔ آپ بھی اسے نہیں ٹوکتے۔ دودھ پیتا بچہ تو نہیں کہ بات کرتے وقت انہیں سمجھ نہ آئے۔ مجھے چیل کو ابنا دیا اور آپ سب لوگ مسکرا بھی رہے ہیں۔“

سرجی بھی بھڑک اٹھے۔ وہ بھڑکنے پر زیادہ سے زیادہ یہی کرتے تھے کہ گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کیے بیٹھ جاتے۔ وہ بولے۔ ”پھر سے میری جلیبیوں کی بات کر رہا ہے اگر من بھی لاؤں تو لوگ اسے بھی چٹ کر جائیں گے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اس نے دودھ کی بات کی ہے جلیبیوں کی تو آپ نے خود بات بڑھائی ہے۔“

”جلیبیاں بھی تو دودھ میں ڈال کر کھاتے ہیں۔ کبھی مجھے خالی دودھ پیتے دیکھا ہے؟“

مطیع اللہ نے بات بدلی اور بولا۔ ”سرجی! جلیبیوں سے یاد آیا۔ تو آپ بھی گرم روٹیوں ..... سے نہاری کھانے جا رہے ہیں؟“

سرجی جو ابھی تک غصے میں تھے، بولے۔ ”یا کرے دردمند اور یا کرے غرض مند۔“

مطیع اللہ نے پوچھا۔ ”اس شعر کا مطلب کیا ہے؟“

سرجی تو بولے۔ ”بھلے کا کام یا میری طرح دردمند دل رکھنے والا کرتا ہے یا پھر وہ لوگ جو نہاری بریانی کھانے کی غرض سے نیکی کرتے ہیں۔“

میں نے ہاتھ کھڑے کر کے سب سے تصدیق کروائی۔ ”تو کل صبح نو بجے ہم سب جمال کے گھر چل رہے ہیں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”تو پھر میں بھی چلتی ہوں۔ آپ لوگوں کے بغیر پورا دن گھر میں بور ہوتی رہوں گی۔“

اس طرح ہمیشہ کی طرح ایک بحث، مباحثے کے بعد سب نے ہامی بھری اور اس وجہ سے آج صبح میں نے تینوں کو جلدی نیند سے جگا دیا تھا۔

رات کے بادلوں نے دن میں بھی اودھم مچا رکھا تھا۔ بارش کا پانی تیز دھار شاور کی طرح ڈور وال کے شیشے سے ٹکراتا تو خوف رہتا کہ کہیں شیشہ ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔ سردی میں اضافہ ہو گیا اور ہماری گرم جیکٹس پھر سے باہر نکل آئیں۔ مفتی اس کھوج میں تھا کہ ہم اس موسم میں کہاں جا رہے ہیں؟ مطیع اللہ نے مفتی سے کہا۔ ”مچھلی کے شکار پر جا رہے ہیں۔“

میں گرم چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مطیع کی باتوں پر مسکراتا رہا۔

مفتی نے حیرت سے پوچھا۔ ”ایسی بارش میں کون مچھلی کا شکار کرتا ہے اور آپ لوگوں کے پاس شکار کا سامان بھی نہیں۔“

مطیع نے بڑی متانت سے لیونگ روم کی چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا کام نیت باندھنا ہے۔ اسباب اوپر والا خود پیدا کرتا ہے۔“

شہباز مسکرا کر بولا۔ ”اتنی بارش میں مچھلیاں باہر بھی نہیں نکلتیں۔ شکار کیسے کریں گے۔“

”میں نے موسم کی خبریں سنی ہیں۔ ابھی بارش رک جائے گی۔ دیکھنا بارش کے بعد ہمیشہ مچھلی باہر نکلتی ہے۔“ مطیع بولا۔

مفتی چکرا گیا۔ اپنا چائے کا مگ ٹی وی ٹرالی پر رکھتے بولا۔ ”تم لوگ کس شکار کی اور کون سی مچھلیوں کی بات کر رہے ہو؟“

”یہ سرجی خاموش خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

کارپٹ پر پڑا شہباز بری طرح سے لرزا، جھٹکے کھائے، اوندھا ہوا اور پھر لگاتار لرزنے لگا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ہنس رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو تھمنے کے بعد بولا۔ ”سرجی کو میکی یاد آ رہی ہے۔ ابھی مجھے بتا رہے تھے کہ کل خواب میں بھی آئی تھی۔“

”سرجی ہمیشہ اکیلے اکیلے خواب دیکھتی ہے۔ بڑی چالاک ہے۔“ مطیع اللہ نے کہا۔

سرجی پھر روٹھ گئے۔ کہنے لگے۔ ”شہباز کو دل کی بات بتانا ایسے ہی ہے جیسے پورے ٹورنٹو میں ڈھول بجانا۔“

پھر سب سرجی کے پیچھے پڑ گئے کہ مکی خواب میں کیا کہنے آئی تھی۔ سرجی کی مونچھیں مسکرا رہی تھیں جیسے بہت بڑا راز ہے جسے آشکار نہیں کرنا چاہتے۔ جب بہت منت سماجت ہو چکی تو بتایا۔ ”زبانی باتیں تو نہیں ہوئیں مگر خواب تو مختصر تھا پر کہانی طویل تھی۔“

میں بھی سرجی کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

اتنے میں بارش رک گئی۔ حیران و پریشان مفتی کو میٹریس پر بیٹھا چھوڑ کر ہم گرم جیکٹوں میں لپٹے باہر آئے۔ ٹھنڈی ہوا بدن کے آر پار ہو رہی تھی۔ ہمارے دانت بجنا شروع ہو گئے۔ سامنے لان میں لگے درخت اور ان پر لگے پھول جھوم رہے تھے۔ سڑکیں، عمارتیں، غرض ہر چیز دھل کر نکھر آئی تھی۔ فضا میں اٹکے پانی کے ذرات ہواؤں کے زور سے ہمارے چہروں پر پڑتے تو باوجود سردی کے ہمارے اندر سرشاری بھر دیتے۔ نہ کوئی کیچڑ اور نہ کہیں پانی کھڑا تھا۔ اتنی زیادہ بارش ہوتی رہی تھی مگر پانی نہ جانے کن خفیہ راستوں سے بہتا کہیں کا کہیں نکل گیا تھا۔ درختوں کے پتوں سے چھٹی بوندیں اب ٹپ ٹپ کرتی ہمارے سروں پر گر رہی تھیں۔ ہم مست و نہال ہوتے بس سے کپلنگ سب وے پہنچے اور وہاں سے ٹرین لے کر آدھے گھنٹے میں وکٹوریہ سب وے پر جا اترے۔ راستے میں ہمیں چند لوگ ہی ملے تھے اور بقیہ شہر سویا پڑا تھا۔ چھٹی تھی تو سب گھروں میں بند تھے۔

وکٹوریہ سب وے سے باہر کی ایک بڑی اور اونچی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں جمال کا اپارٹمنٹ تھا۔ ہم چند ہی منٹ میں اس کے بکھرے اپارٹمنٹ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بارہویں فلور سے میں بالکونی پر کھڑا شہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ کڑکتی سردیوں کی ہواؤں میں بھی میں یہاں چند ماہ پہلے کھڑا تھا۔ جب پورا شہر کملایا کملایا لگ رہا تھا۔ درخت بے برگ اور اجاڑ نظر آتے تھے۔ مگر آج دیکھا تو ان ہی درختوں نے رنگا رنگ پھولوں سے بھرا سبز لباس پہن رکھا تھا۔ ٹورنٹو کا علاقہ اسکاربرو جو کبھی اجاڑ تھا اب دھلی فضا میں جھوم رہا تھا۔ میں پیالی لے کر بالکونی میں آ گیا اور اب بالکونی میں اکیلا کھڑا چائے پی رہا تھا اور اندر لیونگ روم سے اٹھتے قہقہے مجھ تک آ رہے تھے۔

ہمیں لفٹ کے ذریعے سامان بارہویں فلور سے اوپر سترہویں فلور پر لے جانا تھا۔ اس عمارت کے کل تیئیس فلور تھے۔ اب یہاں معاملہ یہ بن گیا کہ ہم لفٹ میں سامان رکھتے اور وہ پہلے گراؤنڈ فلور پر نیچے جاتی اور دوبارہ اٹھ کر سترہویں فلور کی جانب چلتی، ہر فلور پر کوئی نہ کوئی بٹن دبائے کھڑا ہوتا اور پھر یہ ایسے چلنا شروع ہوئی جیسے گاڑی کو ہر سو گز بعد سگنل سرخ ملے۔ اس طرح سفر کی تھکاوٹ نہ تھی جتنی بریکیں لگنے کی کوفت تھی۔ ہم میں سے کسی نے ایسا بھاری کام نہ کیا تھا لہٰذا سب چند پھیروں میں تھک چکے تھے۔ وزن اٹھانے سے زیادہ تکلیف احتیاط برتنے سے ہو رہی تھی۔ اگر کوئی چیز ہلکی سی بھی ٹوٹ جاتی تو اس کا ٹھکانا کوئی مرمت کی دکان نہیں بلکہ کوڑا کرکٹ تھا کیونکہ یہاں مرمت پر جو خرچ اٹھتا ہے وہ چیز کی قیمت کے برابر جا پہنچتا ہے۔

جمعہ نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔ معلوم نہیں مسجد کتنی دور تھی کیونکہ بہرحال ہمیں وہاں بسوں کے ذریعے ہی پہنچنا تھا مگر جمال نے ہمیں حیرت زدہ کر کے رکھ دیا کہ اس بلڈنگ کے ایک اپارٹمنٹ کو مسلمانوں نے مسجد بنا رکھا ہے۔ پانچ وقت کی نماز کے علاوہ جمعہ نماز بھی ہوتی ہے۔ بچے قرآن پاک بھی پڑھتے ہیں اور عورتیں یہاں محفل میلاد، قرآن پاک کا ختم وغیرہ بھی کرتی ہیں۔ جمال بتا رہا تھا کہ آدھی بلڈنگ مسلمانوں سے بھری ہوئی ہے۔ جس بلڈنگ میں بھی مسلمان بڑی تعداد میں ہوتے ہیں تو سب مل کر ایک فنڈ بنا لیتے ہیں۔ اس سے ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر مسجد بنا لی جاتی ہے۔ اس کے لیے اور بھی فلاحی کام کیے جاتے ہیں۔

تھکاوٹ سے سب کی سانس چڑھی ہوئی تھی مگر شہباز کا تنفس تو دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے جمال سے کہا۔ ”اس لیے کہتے ہیں کہ مزدور کو سانس بحال ہونے سے پہلے مزدوری دے دی جائے۔“

”کون سی مزدوری؟“ وہ متعجب ہو کر بولا۔

میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”ایک ایک پلیٹ سالن اور ساتھ دو روٹیاں۔“

صوفے پر آڑھا ترچھا لیٹا مطیع اللہ کھکھیا کر بولا۔

”اور ایک ایک گرما گرم چائے کا کپ بھی۔“

”جو میرے پاس ہے وہ حاضر ہے۔ آپ دوستوں کا میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں کہ اتنے مشکل کام میں بھی پیچھے نہ ہٹے۔“ جمال نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

سرجی اپنا بازو سہلاتے ہوئے بولے۔ ”یار دھی پکا

جس نے پکاون رکھا۔“

”لگتا آسان تھا پر بہت مشکل کام تھا۔ سامان کو شفٹ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔“ جمال داد دے کر بولا۔

سرجی ترنت بولے۔ ”میں تو دیکھتے ہی بھانپ گیا تھا کہ ہڈی کھانا آسان مگر ہڈی بچانا بہت مشکل ہے۔“

جمال چکرا گیا کہ سرجی کیا کہہ گئے ہیں۔ وہ شرمندگی سے بولا۔ ”نہاری ہڈی والی نہیں بلکہ بونگ کے گوشت کی بنائی ہے۔“

”سرجی شعروں کی زبان بولتی ہے۔ ان کا کہنا کسی کے پلے نہیں پڑتا۔“ مطیع اللہ بولا۔ پھر وہ سرجی کی جانب مڑ کر مخاطب ہوا۔ ”آپ اہل زبان ہیں تو جمال اور بھائی بھی زبان رکھتی ہے۔ وہ بھی کراچی کے ہیں مگر آپ کے بھقرے (فقرے) ان کے بھیجے کو بھی سمجھ میں نہیں آئے۔“

”ان سے یہی محاورے بلوا لو کام کا کہو تو جان نکلتی ہے۔“ شہباز نے چوٹ کی۔

سرجی طیش میں آ کر بولے۔ ”آپ کو ندیم بھائی مشکل سے کھینچ کر لائے ہیں جیسے پاؤں میں مہندی لگی ہو۔ نہاری اور بریانی کا سنا تو راضی ہوئے۔“

میں نے سرجی کو گھور کر دیکھا تو وہ بولے۔ ”ہم سچی بات کہنے میں تو ہزار میں بھی نہ چوکیں۔ یہاں تو صرف بھابی صاحبہ سن رہی ہیں۔“

جمال نے مجھ سے اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ سرجی ہر فقرے میں محاورے بول رہے ہیں۔ میں نے مسکرا کر اسے کہا کہ ایسا ہر وقت ہمارے اپارٹمنٹ میں ہوتا رہتا ہے۔ پھر ہم نماز پڑھنے کے لیے اترے اور واپس آ کر ادھر ادھر ہو گئے۔

جمال اپنا سامان بھول کر سرجی کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ان کی گپ شپ شروع ہوئی تو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ شہباز نے یہ کہہ کر آنکھیں موندھ لیں۔ ”سرجی کے ساتھ ساتھ جمال بھائی کا بھی سیاپا میں ذرا اونگھ لوں۔“

پھر ہم اونگھنے لگے۔ گرم تازہ روٹیوں کی مہک لیونگ روم میں پھیلی تھی۔ بالکونی کے باہر موسم کا اندازہ ان ہواؤں سے ہوتا تھا جو اپنی خنکی لیے ڈور وال سے ٹکراتی تھیں۔

گرم روٹیوں کے ساتھ نہاری اور پھر بریانی نے اپنا کام کر دکھایا۔ سب نے اتنا کھانا کھایا کہ تھکاوٹ اور بڑھ گئی۔ نہاری اتنی لذیذ تھی کہ سرجی اب جمال کی بیوی سے پکانے کا پورا طریقہ اور مصالحوں کی ترتیب وزن کاغذ پر اتار چکے تھے۔ جب شہباز نے کہا کہ بریانی کی ترکیب بھی لے لیں تو بولے۔ ”سمجھ نہیں آتی تمہیں ہر وقت کھانے کی کیوں پڑی رہتی ہے۔“

ہم بکھرے سامان کے بیچ خود بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ گرم چائے نے آنکھیں کھول دیں شام اتر رہی تھی۔ بالکونی سے ٹورنٹو کی جلتی روشنیاں ایسے نظر آتی تھیں جیسے کوئی چراغاں ہو۔ اتنی زیادہ بلندی پر صرف ہواؤں کا شور سنائی دیتا ہے اور جب ڈور وال بند کر دو تو سناٹا چھا جاتا ہے۔

ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو دیگچوں میں بچ جانے والا سارا کھانا پلاسٹک کے برتنوں میں پیک کر کے ہمیں تھما دیا گیا تھا۔ جتنی ہو سکیں روٹیاں بھی ہمیں پکڑا دی تھیں۔ سرجی کو جلیبیاں یاد آئیں۔ سب نے کہا کہ اب رات ہو گئی ہے واپس چلتے ہیں۔ سرجی افسردہ ہو کر بولے۔ ”ہماری آرزو تو کبھی بر نہیں آتی۔“

یہ سن کر جمال نے زوردار قہقہہ مارا اور میرے کان میں بولا۔ ”یار بڑی رونق ہے تمہارے اپارٹمنٹ میں کبھی دن گزارنے آؤں گا۔“

☆......☆

ایک دن ہیموسال میں کام جلدی ختم ہو گیا۔ سب فارغ بیٹھے لنچ روم میں گپ شپ کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ نسرین کی طرف چکر لگا لوں۔ اس کو داخلے کے فارم دے آیا تھا اور وہ بھی چیک کر کے اس سے لینے تھے۔ اس کو ویک اینڈ پر سینٹرل آئی لینڈ جانے کا بولا تھا اور اس ویک اینڈ کو گزرے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ مجھے سیکیورٹی کی جاب سے چھٹی نہیں ملی تھی اور اس کو مطلع بھی نہیں کر سکا تھا۔

اسے وہیں سے فون کیا تو اسی نے اٹھایا۔ پوچھنے پر بتانے لگی کہ ابھی سعد کو اسکول سے لینے جا رہی ہوں۔ پہلے تو ہر بار کہتی تھی کہ کب آ رہے ہو مگر آج پوچھا بھی نہیں تھا۔ آج اس کی چپ چپ سی کیفیت تھی۔ ایسی کیفیت کیوں تھی اس بات نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ آخری بار جب ہم ملے تھے اور اسے بتایا تھا کہ میرے بچے امریکا آنے ہی والے ہیں تب بھی اس کا والہانہ پن کم نہیں ہوا تھا پھر آج اس کی آواز ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ میں ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ ایک زوردار آواز کی گونج سنائی دی اور لائن کٹ گئی۔

(باقی آئندہ)

گنگا جمنی تہذیب

محمد ایاز راہی

تہذیب اپنے سفر پر رہتی ہے، ہر منزل پر کچھ اور نکھر جاتی ہے، کچھ تہذیبیں وقت کے گرداب میں دم توڑ دیتی ہیں، تو کچھ تہذیبیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ برِصغیر میں بھی ایسا ہی ہوا کئی تہذیبوں نے جنم لیا اور پھر ماضی کے سمندر میں غرق ہو گئیں۔ ماضی قریب میں تہذیب گنگ و جمن نے جنم لیا، یہ اسی تہذیب کا ذکر ہے۔

دم توڑتی ہوئی تہذیبِ گنگ و جمن کا تذکرہ

مشہور شاعر و انشاء پرداز جون ایلیاء(14 دسمبر 1931ء تا 8 نومبر 2002 عیسوی۔ اصل نام سید اصغر حسین) نے کہا تھا کہ سمندروں کے کنارے تجارت فروغ پاتی اور ترقی کرتی ہے جب کہ دریاؤں کے کنارے تہذیب پروان چڑھتی اور عروج پاتی ہے۔ یہ قول یقیناً حقیقت پر مبنی اور انسانی تاریخ کا آئینہ ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں نے دریاؤں کے کنارے ہی جنم لیا، وجود پایا، پھلی پھولیں اور عروج وزوال کے مراحل سے گزر کر اپنے پیچھے ان مٹ نقوش چھوڑ گئیں۔ خواہ وہ قبل از مسیح دریائے نیل کی قدیم مصری تہذیب ہو یا دریائے دجلہ و فرات کی پرانی عراقی تہذیب۔ دریائے سندھ کے کنارے موہن جو دڑو اور ہڑپہ کا دیار ہو کہ بعد از مسیح دیائے گنگا و جمنا کا سُندر تمدن۔ بنیادی وجہ پانی ہی ہے کہ آدمی کی پہلی ضرورت تازہ و صاف ہوا اور دوسری ضرورت پانی ہی ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ لاریب کہ پانی زندگی ہے پانی جو آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے اپنے اندر بھی زندگی رکھتا ہے اور باہر کی زندگی بھی اسی کی مرہون منت ہے کسی شاعر پُرشعور نے یوں ہی تو نہیں کہا کہ:

"سبزہ بے پانی کہیں ہوتا نہیں، جس جگہ پانی ہے
جیون ہے وہیں۔"

دوسرے مصرع میں تبدیلی و تصرّف کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اس کائنات میں پانی اور ہوا دونوں ہی تخریب و تعمیر کا عمل سرانجام دیتے ہیں کہ یہ ایک فطری قانون ہے بہ ہرحال یہی پانی تہذیبوں کو سرسبزی و شادابی عطا کرتا ہے ان میں دھنک کے تمام رنگ بھرتا بکھیرتا اور حسن و سُرور بخشتا ہے۔ دریا نہ صرف تہذیبوں کے پالن ہار ہوتے ہیں بلکہ تجارت، سفر اور انسانی معاشروں میں رابطے کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ خشکی کے ساتھ ساتھ آبی گزرگاہوں نے بھی انسانوں کو سیر و سیاحت خصوصاً نئی دُنیائیں دریافت کرنے کی راہ سجھائی تھی۔ اسی طرح ایک تہائی خشکی (زمین) کا سات براعظموں میں تقسیم ہونے کا جواز سمندر (پانی) ہی ہیں۔ دریا اگر خشک ہوتے یا راستہ بدلتے ہیں تو اس عمل میں صدیاں لگتی ہیں۔ مورّخ کا قلم ہی پھر ان کی یاد دلاتا ہے۔ اس مختصر سی قلمی کوشش و کاوش میں وادی گنگ و جمن کی تہذیب پر اِک طائرانہ نظر ڈالنے کی سعی کی جائے گی جس نے بڑے پُرتکلف سماج کو جنم دیا۔ انسانی تاریخ میں جب بھی دو الگ الگ تہذیبیں آمنے سامنے آئیں یا آپس میں ٹکرائیں تو دو طرح کا ردِعمل سامنے آیا کہ طاقت ور



تہذیب نے کمزور تہذیب کو نگل لیا۔ یہی اس دنیا کا دستور بھی ہے کہ طاقت ور تہذیب کمزور کو ہڑپ کر جاتی ہے یا پھر اک نئی ملی جُلی تہذیب جنم لے لیتی ہے۔ یہاں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن ہمیں اپنے موضوع تک ہی محدود رہنا ہوگا ورنہ بات بہت پھیل جائے گی۔

ہندوؤں نے قدیم دراوڑی قوم کے رسم و رواج کو اگلا۔ کافی حد تک بدھ مت اور سکھ تحریک کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اس لیے کہ ہندو مت ہزاروں برس پرانی ذات۔ دیوی دیوتاؤں اور رسم و رواج میں ڈھلی کھڑی ہے جسے گوتم بدھ (483 تا 563 قبل از مسیح) اور گورونانک (1469-04-15 تا 1539-09-22 عیسوی) انتہائی کوشش کے باوجود بھی ذات پات اور بت پوجا کے جال کو نہ توڑ سکے بلکہ بدھ مت کے پیروکار بھی بت سازی اور بت پوجا کے شکار ہوگئے جب کہ سکھ ہندوؤں میں ضم ہوتے ہوئے بھی بت پوجا سے آزاد رہنے میں کامیاب رہے۔ ایسے میں اسلامی تہذیب نے جب دریائے جمنا کے کنارے پڑاؤ ڈالا تو جمنا کے اُس پار بھرپور ہندو تہذیب اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ تن کے کھڑی تھی۔ اسلامی تہذیب ایران، عراق اور افغانستان سے ہوتی ہوئی اب ہندو تہذیب کو غور سے دیکھ رہی تھی ..... اور جس میں صدہا رنگینیاں (ناچ گانا۔ بت بنانا۔ تصویریں بنانا۔ شاعری اور موسیقی) اور دلبرانہ ادائیں مچل رہی تھیں۔ اُدھر اسلامی تہذیب۔ دلبری با قاہری پیغمبری ' کا باوقار انداز اپنائے ہوئے تھی جبکہ ہندو تہذیب ۔ دلبری بے قاہری جادوگری سے بھری ہوئی تھی۔ ہندو قوم کا بنیادی عقیدہ ہے کہ بھارت دھرتی (برصغیر) صرف اور صرف ہندوؤں کی ہے جب کہ باقی سب لوگ ملیچھ (ناپاک) اور پاپی (گنہگار) ہیں جنہیں بھارت کی پوتر (پاک) دھرتی پہ پاؤں رکھنے کا کوئی ادھیکار (حق) نہیں۔ ہندو تہذیب خود میں ہی اعلیٰ (برہمن جاتی) اور ادنیٰ (شُودر) میں منقسم ہے۔ واضح ہو کہ آج سے چار ہزار برس پہلے آریا ہندوستان پر حملہ آور ہوئے تو دراوڑ تہذیب (موہن جو دڑو۔ ہڑپہ) اپنے عروج پہ تھی مگر فاتح آریاؤں نے مفتوح دراوڑوں کو شودر بنا ڈالا جنہیں نفرت سے داس (غلام) کہا گیا۔ جانوروں سے بھی بدتر گردانا گیا۔ یہ کیفیت آج بھی برقرار ہے ہندو آج بھی بھارت دھرتی پہ کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کر پاتا چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اسلامی تہذیب نے صدیوں ہزاروں برس پرانی ہندو تہذیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو اپنے مخصوص انداز سے ہندو تہذیب کو سمجھانے کا آغاز کر دیا جیسے ایک باوقار خاتون کسی شوخ و شریر لڑکی کو سنجیدہ رنگ میں رنگ کے توازن بخشتی ہے مگر اس باوقار خاتون کو البہڑ سندر نار کی رنگین ادائیں بھی بھلی لگیں چنانچہ خاتون خود بھی مسکرانے لگی ۔ دونوں تہذیبوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ تبدیلی کا پیش خیمہ بنی۔ دونوں تہذیبیں جنبِ شانہ بہ شانہ چلیں تو آگے چل کر اِک نئی تہذیب نے جنم لیا جس میں ہندو مسلم دونوں رنگ آپس میں ملے جُلے ہوئے تھے یہ اسلامی تہذیب ہی تھی جو ہندو تہذیب کے آگے ڈٹ کر کھڑی رہی باہر سے آنے والی اسلامی تہذیب نے یہاں کی جادو بھری فضا میں رہ کر بھی اپنی شناخت برقرار رکھی دیگر مذاہب۔ نظریے یا تحریکیں لڑ بھڑ کر بالآخر دم توڑ گئیں یا ہندو مت میں ضم ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ مندر، گھنٹی اور پوجا کے مقابل مسجد۔ اذان اور نماز کا مستقل وجود ہندو یلغار کو روکنے تھامنے میں کامیاب رہا۔

نفیس انسان ہر جگہ اور ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں چاہے وہ کسی بھی مذہب و مسلک سے منسلک ہوں۔ چنانچہ دونوں تہذیبوں (ہندو مسلم) کے نفیس لوگ آپس میں

ایک دوسرے کے نزدیک آتے گئے۔ اعتدال اور میانہ روی نے اِک نئی معاشرت کی داغ بیل ڈالی اور اسے بڑھایا پھیلایا۔ کسی بھی تعصب سے دور اس نئی تہذیب کا چولا نیا اور نرالا ہی تھا جس میں خدا اور رام کی جگہ اوپر والا۔ نیلی چھت نیلی چھتری والا۔ آسمان والا۔ دھنّے واد کی بجائے شکریہ۔ بندہ پروری ہے آپ کی۔ ذرہ نوازی ہے جناب کی۔ السّلام علیکم۔ نمستے نمسکار، پرنام کے برعکس آداب تسلیمات۔ آداب عرض کرتا (کرتی) ہوں۔ تسلیمات بجالاتا (لاتی) ہوں۔ کا مخصوص انداز اور روّیہ رواج پاتا گیا۔ آپس میں ہاتھ ملانا یا دونوں ہتھیلیاں کھڑی جوڑنا چھوڑ دی گئیں اور سیدھی ہتھیلی پیشانی تک لے جاکے یا پھر ماتھے پہ رکھ کر نیز قدرے جھک کر پیشوائی وسلام کرنا وتیرہ بن گیا۔ نرم لہجے میں شُستہ اور دھیما لب ولہجہ اس تہذیب کی بنیاد بنا۔ شدید غصہ بھی تکلفات لیے ہوتا۔

ہندوستان کا گرم اور نرم ماحول جفاکش فاتح مسلمانوں (افغانی۔ ترکی۔ ایرانی وغیرہ) کو آسائش وتکلفات کا عادی بناتا گیا۔ یہ تہذیب ہر دو جگہ قلعۂ معلّیٰ دہلی اور دیارِ لکھنؤ میں جنم لیتی پروان چڑھتی گئی۔ اس میں ہندو مسلم دونوں رنگے گئے اور یہی تہذیب گنگا جمنی تہذیب کہلائی۔ دراصل یہ ہندو مسلم اتحاد کی لاشعوری یا شعوری کوشش تھی کیونکہ کسی ایک کا مٹنا یا دبنا ناممکن تھا دین داری اور دنیاداری کا مکمل طریقہ سلیقہ اپنا اپنا تھا عیسائیوں نے تو بالآخر ہسپانیہ کی آٹھ سو سالہ مسلم حکومت کو ختم کرکے مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹا ڈالا سوائے چند عمارات کے آج ہسپانیہ میں مسلم وجود ناپید ہے شاید اس لیے کہ مسلمان (بنو امیہ) وہاں کی مقامی تہذیب کے ساتھ خلط ملط نہ ہوسکے یا رچ بس نہ پائے، اپنے حال اور کھال میں مست ومگن رہے کچھ لو اور کچھ دو کا ملا جلا رنگ اور زندگی نہ اپنا سکے لیکن ہندوؤں کے لیے مسلمانوں کا نکالنا، مٹانا ناممکن تھا کہ ہند کے زمینی حقائق، آب وہوا، ماحول کچھ اور تھا۔ مسلمانوں نے یہاں ہر شعبے پر اثر ڈالا تو قبول بھی کیا۔ سو ہندو مسلم اتحاد کے لیے آگرہ کے سیّد غلام بھیک نیرنگ (16-10-1952 تا 25-09-1876 عیسوی) نے نعرہ لگایا کہ نمسکار نمستے اور السلام علیکم کی جگہ نمستے علیکم یا علیکم نمستے کو اپنایا یا رواج دیا جائے اس پر لاہور کے زمیندار ہے۔ اخبار کے مالک ومدیر مولانا ظفر علی خان (1873 تا 27-11-1956 عیسوی) پکار اٹھے۔

سُنا ہے کہ اِک آگرہ کا مسافر
اٹھائے ہوئے سر پہ ویدوں کے بستے
عراق و عجم میں یہ جا کے پکارا
نمستے علیکم ۔علیکم نمستے

لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ اپنی سخاوت اور دریا دلی کی بناپر مشہور تھے ان کے دور میں بھی ہندو مسلم اتحاد کی خاموش کوشش ہوتی رہی۔ چنانچہ ہندو دکاندار بھی صبح دم جب اپنی اپنی دکانیں کھولتے تو نیک شگون (شگن) کے لیے پکارتے۔ ”آصف الدولہ۔ جسے دے مولا“۔

مسلمان فاتحین نے جب دریائے جمنا کے کنارے پاؤں رکھے تھے تو اس دریا کے کنارے دہلی، متھرا اور دیگر شہر آباد تھے۔ یہ دریا آگے چل کر دریائے گنگا میں جاملتا ہے جب کہ دریائے گنگا بہت سے صوبوں اور بنگال سے ہوتا خلیج بنگال میں جاگرتا ہے۔ گنگا ہندوؤں کا بڑا مقدس دریا ہے جس کے کنارے بڑے بڑے ہندو میلے لگتے اور مذہبی رسومات اداہوتی ہیں۔ ان میلے ٹھیلے میں بھی کوشش ہوتی کہ دونوں تہذیبیں مل کر ایک نئی تہذیب جنم لے لے۔ ہندوؤں کے رسم ورواج میں مسلمانوں کی تہذیب کا اثر ڈالا جائے۔ بھلے ہندو اپنے پوجا پاٹ کرتے رہیں مگر تہذیب ایک جیسی بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو دھوتی باندھنے کی بجائے پاجامہ پہننے لگے جو افغانستان اور وسطی ریاستوں سے آئے شلوار سے متاثر ہوکر ایجاد کیا گیا تھا۔

مسلمانوں کی تہذیب نے جمنا کے کنارے سے پھیل کر ہندو تہذیب پر اپنا اثر وسایہ ڈالا اور خود بھی ہندی رنگ میں رنگی گئی تو اس کی کوکھ سے نکلی گنگا جمنی تہذیب جس نے دیارِ لکھنؤ میں وہ عروج پایا کہ باید وشاید۔ اٹھنا بیٹھنا، لباس، لب ولہجہ، انداز اور تکلفات نے وہ رنگ جمایا کہ بغیر نام لیے، بتائے ہندو مسلم کی پہچان ہی مشکل ہوگئی گو کہ قلعۂ معلّیٰ دہلی میں بھی یہ بہت نکھری سنوری جو بن پایا مگر وہ بہ ہر حال اِک محدود فضا اور جگہ تھی جب کہ لکھنؤ اِک ریاست تھی جہاں گنگا جمنی تہذیب نے وہ چمک دمک دکھائی کہ بڑی بوڑھی تہذیبوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ قلعہ معلّیٰ دہلی نے اگر بہادر شاہ ظفر مومن خان مومن۔ ابراہیم ذوق اور مرزا غالب جیسے نابغۂ روزگار پیدا کیے تو لکھنؤ کی سرزمین نے مرزا ہادی بیگ رسوا (ناول امراؤ جان ادا) میر انیس۔ رتن ناتھ سرشار جیسے ادیب اردو زبان کو دیے۔ عجیب بات کہ آدابِ محفل کو لکھنؤ کی طوائفوں نے حرز جاں بنایا بڑے بڑے امراء اور شرفا اپنے بچوں کو محفل کے

آداب سکھانے طوائفوں کے پاس بھیجا کرتے تھے انسانی تاریخ میں گنگا جمنی تہذیب کی لکھنوی طوائف ہی واحد طوائف ہے جو باقاعدہ درس گاہ (اکیڈمی) قرار پائی۔ لکھنؤ کی امراؤ جان ادا سراسر فرضی کردار ہوتے ہوئے بھی زندہ اور سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب میں مغلیہ تہذیب کی تمام خوبیاں اور خامیاں سمٹ آئی تھیں جب کہ امراؤ جان ادا لکھنؤ تہذیب کا مستقل استعارہ اور پہچان بنی۔ اردو کا پہلا باقاعدہ ناول امراؤ جان ادا۔ مرزا ہادی بیگ رُسوا کو دوام بخشتا ہے تو آگے چل کر امراؤ جان ادا۔ سیف الدین سیف جیسے مستند اور ثقہ شاعر سے فلمی گیتوں کی صورت خراج تحسین خود کو منواتی ہے۔ نثار بزمی جیسے اعلیٰ موسیقار اسے سرسنگیت کا دھنک رنگ چولا بلکہ چولی ساڑی پہناتے ہیں جب کہ حسن طارق اپنے ہنر سے اس میں رُوح پھونکتے ہیں۔

دنیا کی ہر تہذیب میں طوائف کو انتہائی نفرت وحقارت سے معاشرے کا ناسور گردانا گیا مگر گنگا جمنی تہذیب اسے انفرادیت سے نوازتی ہے۔ اِک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتی اور کرواتی ہے کہ یہ بھی انسانی سماج ہی کی پیداوار ہے۔

یہ گنگا جمنی تہذیب دراصل ہندوؤں کو مسلمانوں کے قریب لانے کی ایک کوشش تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وسطی ہند کے مسلمان اور ہندوؤں کی تہذہب ایک جیسی نظر آنے لگی تھی۔ مسلمان روزے رکھتے تو ہندوؤں میں ”برت“ کی شروعات ہوگئی۔ ہندو کرتن کرتے تو مسلمانوں نے قوالی کو فروغ دے دیا۔ ہندو مختلف بھگوانوں کی ”کتھا“ کرتے تو مسلمانوں نے ”معجزے“ کے بیان کو محفل کی زینت بنالی۔ گویا دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے متاثر ہوکر قریب سے قریب تر آتی گئیں لیکن ایک بڑا نقصان مسلم تہذیب کو یہ پہنچا کہ وہ اپنے اصل سے دور ہونے لگیں۔

وادی گنگ وجمن کی تہذیب بڑا ابھر پور اور وسیع موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ عبدالحلیم شرر (گذشتہ لکھنؤ) کے علاوہ بے شمار ادیبوں اور شعراء نے اس تہذیب کے سچا خدوخال ابھارے، نمایاں کیے اور حق ادا کردیا۔ ان کتب کا مطالعہ اگر قاری کے ادبی ذوق کو جلا بخشتا ہے تو ساتھ ہی اس گنگا جمنی تہذیب کی کرنیں ذہن ودل کو گرماتی منور کرتی ہیں۔

گنگا جمنی کے دیگر معانی بھی ہیں۔ دورنگا، ملا جلا، سنہری روپہلی، ماش اور چنوں کی مرکب دال، کان کا زیور، کسی چیز پہ سونے چاندی کا کام، سیاہ وسفید رنگ۔

وادی سندھ کی تہذیب

وادی سندھ کی پرانی تہذیب کا شمار جس کے آثار قدیمہ آج بھی ہڑپہ اور موئنجوداڑو کی شکل میں پاکستان میں موجود ہیں۔ زمانہ مسیح سے قبل دنیا کی تین بڑی تہذیبوں میں ہوتا تھا۔ دوسری دو تہذیبیں مصر میں دریائے نیل کے کنارے فرعونوں کی تہذیب اور مشرقِ وسطیٰ میں میسوپوٹیمیا کی تہذیب تھیں۔ ان تینوں ہم عصر تہذیبوں کا زمانہ 3000 ق م سے 1500 ق م بتایا جاتا ہے۔ اس دور کو کانسی کا دور بھی کہتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں زیور، سکے اور برتن بنانے کے لیے کانسی کے بھرت کا استعمال عام تھا۔ سندھ کی تہذیب کو ہڑپہ تہذیب کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے کیونکہ ہڑپہ وہ پہلا شہر تھا جس کے آثار قدیمہ انیسویں صدی کے وسط میں ملنے شروع ہوئے اور 1920ء میں پورا ہڑپہ شہر دریافت ہوا۔ یہاں سے ملنے والی مہروں، برتنوں اور زیورات سے ماہرین آثار قدیمہ نے اندازہ لگایا ہے کہ 2200 قبل مسیح سے لے کر 1900 قبل مسیح تک ہڑپہ کی تہذیب اپنے عروج پر تھی پھر اچانک ہی اس تہذیب پر زوال آگیا اور یہ تہذیب ماضی کی تہوں میں گم ہوگئی، آثار قدیمہ کے ماہرین ہڑپہ کے گردونواح سے ملنے والے انسانی ڈھانچوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہے ہیں کہ وہ کون سے عوامل تھے جو اس تہذیب کی تباہی کا سبب بنے۔ مختلف شواہد سے سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شروع شروع میں اس تہذیب کے لوگ انتہائی امن پسند، ملنسار اور بااخلاق تھے۔ ہر شہری کو بنیادی سہولتیں میسر تھیں اور معاشرہ طبقاتی اونچ نیچ سے پاک تھا مگر آہستہ آہستہ سوسائٹی میں بگاڑ آتا گیا۔ معاشی طبقات وجود میں آگئے۔ حکمرانوں اور اشرافیہ کی طرف سے غریب اور لاچار طبقے کے لیے ناانصافیاں بڑھتی گئیں۔ نتیجتاً معاشرے میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا جس نے بزور طاقت وسائل پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس کشمکش سے معاشرے میں تشدد، لاقانونیت اور انارکی پھیل گئی۔ رہی سہی کسر موسمیاتی تبدیلیوں اور وبائی امراض نے پوری کردی اور اس طرح دنیا کی یہ عظیم تہذیب مکمل طور پر صفحہ ہستی سے نیست ونابود ہوگئی۔

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء سٹی کراچی

تعاون

سید احتشام

جرائم پیشہ اپنے جرم کو چھپانے کے لیے نت نئے حربے استعمال کرتے ہیں مگر وہ جرائم پیشہ نہیں تھی، ایک خانہ دار عورت تھی پھر بھی اس نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کے لیے کس طرح منصوبہ سازی کی کہ عقل حیران رہ جائے۔ یورپ بھر میں اس قتل پر بحث چھڑ گئی تھی۔

ایک قاتلہ کے قتل کرنے کا انوکھا انداز

وہ ایک خوشگوار مئی کی صبح تھی۔ میں اپنی سہیلی سیلی بین کے ہمراہ اس سڑک پر چل رہی تھی جو اس ریستوران تک جاتی تھی۔ وہ لندن کے اس حصے کی ایک پرانی وسیع اور ویران سڑک۔ وہ سڑک آج بھی موجود ہے اور اب شاید تاریخی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ وہ مکان بھی وہاں موجود ہے۔ ایک بڑے مکان کے پہلو میں بہت ہی پرانا اور بہت ہی تنگ مکان۔ صدر دروازے کے پہلو میں ایک کھڑکی اس کے اوپر محراب اور اس کے اوپر ایک اور چھوٹی سی کھڑکی۔

''یہی ہے، وہ مکان۔'' میں نے سیلی کو بتایا۔

''کیا سچ مچ؟'' وہ رک کر مکان کو گھورنے لگی۔

''ہاں، اس نے یہی کہا تھا۔''

''ممکن تو نہیں لگتا۔'' سیلی بولی۔ اس کے لہجے میں معصومیت تھی۔ ''اتنے سارے لوگ وہاں قتل ہو گئے؟''

''صرف دو افراد۔''

''اور وہ کتا۔''

گویا کتے اس کی نظر میں انسان تھے۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس بھی ایک کتیا تھی لمبے بالوں والی، متحمل مزاج۔ میں نہیں سمجھتی کہ لوگ اپنے کتوں کی طرح بن جاتے ہیں بلکہ وہ ایسے کتے منتخب کرتے ہیں جو انہیں اپنے آئینے میں نظر آتے ہیں۔ سیلی بھی تھوڑی تھوڑی اپنی ڈیسنڈ کی طرح تھی۔

''وہ جلد ہی یہاں آ کر رہنے لگے گی۔'' میں نے کہا۔

''میرے خیال میں اگلے مہینے۔''

''اگلے مہینے؟ کیا وہ یہاں واپس آ رہی ہے؟''

''ہاں آج کل کوئی مجرم ہمیشہ جیل میں نہیں رہتا۔ قتل کا مجرم بھی نہیں۔''

''لیکن...... اس گھر میں لوٹنا، جہاں اس نے قتل کیے تھے۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ اس کے پاس رہنے کی کوئی اور جگہ ہے۔ آخر یہ اس کی پراپرٹی ہے۔''

''لیکن اس نے یہ بہت ہی بھیانک جرم کیا تھا۔'' سیلی نے جھرجھری سی لی۔

تم ایسا سوچ سکتی ہو، میں بھی ایسا سوچ سکتی ہوں۔ اس نے ایسا نہیں سوچا۔ اس نے کہا تھا جیسے کو تیسا اور جیوری نے اس سے آدھا اتفاق کیا تھا۔ میرا یہ مطلب ہے جیوری کے ارکان تقریباً برابر تعداد میں بیٹھے تھے۔ سات عورتیں اور پانچ مرد، اگر جیوری کے ارکان سب کے سب مرد ہوتے تو وہ ماریہ کو باعزت بری کر دیتے کیونکہ وہ یقین کر ہی نہیں سکتے کہ ایک ننھی منی سی صاف ستھری معزز گھریلو عورت نے



بہیمانہ قتل کیا ہوگا لیکن عورتیں بہتر جانتی تھیں۔ پتا ہے وہ تقریباً صاف بچ نکلی تھی۔ دامن پر کوئی چھینٹ نہ خنجر کا کہیں سراغ۔

''اچھا، میں سمجھی تھی خنجر مل گیا ہوگا۔''

''ہاں بعد میں مل گیا تھا۔ ایک پارک میں لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں تھی کہ وہ کبھی پارک میں گئی تھی۔ ہاں اس کی شہادت تھی کہ وہ گھر ہی میں تھی۔''

''ہاں، مجھے یاد آ گیا۔'' سیلی بولی۔ ''لیکن وہ سراسر مجرم تھی۔''

بے چاری سیلی تو بذات خود ہمیشہ سے معصوم تھی۔ ''انہیں کوئی خون آلود کپڑا تو نہیں ملا تھا۔ کیا ملا تھا؟'' وہ ریستوران کی لفٹ میں سوار ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس نے سارے کپڑے اتار کر بالکل برہنہ ہو کر یہ جرم کیا ہوگا۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ لزی بورڈین نے ایسا کیا تھا اور وہ شخص ویلس جس نے اپنی بیوی کا خون کیا تھا۔''

''تمہیں پتا ہے، میں اس سے ملی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے اس خونی واقعے سے پہلے ہم ہیلتھ کلب کے اسٹیم روم میں ملے تھے۔ میں غالباً بھاپ کی وجہ سے اس کی شکل ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی تھی لیکن اس کا جسم چھریرا تھا۔ وہ اس کی آواز ہے جو مجھے نہیں بھولتی۔''

''ہاں، میں نے ٹیلی ویژن پر اسے دیکھا اور سنا تھا۔'' سیلی بول پڑی۔ ''اس کی آواز واقعی غیر معمولی تھی۔''

''گرفتاری سے پہلے اس کا انٹرویو نشر ہوا تھا۔ خود میں نے بھی وہ انٹرویو سنا تھا۔''

یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ اس مکان میں تین جانیں اس بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دی گئی تھیں۔ انہیں چاقو سے ہلاک کیا گیا تھا۔ دو افراد اور ایک کتا۔ قاتلہ ماریہ نے اپنے شوہر، اس کی داشتہ اور ان کے کتے کو چاقو کے پے در پے وار کر کے ہلاک کر دیا تھا، ایک ایک کر کے۔

ہم نے کھانے کا آرڈر دیا۔ میں نے سیلی کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ جو چاہے طلب کر لے۔ میرے خیال میں، میں اسے بہترین کھانا کھلانے کی پابندی تھی۔ میں اپنے مہمانوں کے بارے میں جنہیں میں وہاں کھانا کھلانے لے جاتی تھی، ایسا ہی سوچتی تھی کیونکہ اکثر بعد میں ایسا ہوا کہ ان پر کوئی آفت ناگہانی ٹوٹ پڑی۔ میں نہیں سمجھتی کہ ریستوران منحوس تھا بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ میں ہی بدنصیب تھی۔

''اس خونی واقعے کے بعد ہم کئی بار ملے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک دو مرتبہ میں اسے یہاں لنچ کرانے بھی لا چکی ہوں۔''

''واقعی؟'' سیلی کانٹے سے سالمن مچھلی کے ٹکڑے کرتی ہوئی بولی۔

سیلی قدرے لالچی واقع ہوئی تھی۔ وہ واقعی لالچی تھی اور جو چیز پسند کرتی تھی، اس کے بارے میں خود جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ وہ اور میں اسکول کے زمانے کی دوست تھے کلاس میں ہم ساتھ بیٹھتے تھے۔ بیلے سیکھنے کی کوشش کی تھی اور اسکول کی ڈرامیٹک سوسائٹی میں ساتھ ہی شمولیت اختیار کی تھی۔ اب وہ ایک جگہ عارضی جاب کر رہی تھی۔ اسی کی کمپنی ایک نیا سینٹ متعارف کرا رہی تھی۔ اس کی ہستی عارضی تھی۔ آنی جانی۔

''سیلی تم سے عجیب سی بو اٹھ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنی کلائی میری طرف بڑھا دی سونگھنے کے لیے۔ ''نیا سینٹ...... ظاہر ہے کمپنی چاہتی ہے کہ میرے جسم سے ان کے سینٹ کی خوشبو آئے۔ یہ گاہکوں کو خود اعتمادی عطا کرتی ہے کہ وہ بھی میری طرح مہک اٹھیں گے۔''

''اور میری طرح نظر آئیں گے۔'' وہ یہ اضافہ بھی کر سکتی تھی۔ وہ خوب صورت تھی۔ بے چاری سیلی۔ میں خود بھی بری نہیں تھی لیکن سیلی کے قیامت خیز شباب نے اسے غیر

معمولی بنا دیا تھا۔ حسن وشباب کا یہ ملاپ دوآتشہ تھا اور قابل دید تھا۔ میں جتنی بھی اپنی دوستوں کو وہاں لنچ کرانے لے گئی تھی۔ وہ ان سب میں حسین اور پُرشباب تھی۔

''میں تمہیں سینٹ کی ایک بوتل دوں گی۔'' وہ بولی۔ ''مجھے کم قیمت میں ملتی ہے۔''

''نہیں، شکریہ...... میں نہیں سمجھتی کہ میں اس بُو کے ساتھ بستر پر جانا پسند کروں گی۔''

وہ حیران نظر آنے لگی۔ گویا اسے یہ امید نہیں تھی کہ میں ایسی کوئی بات کہہ سکتی تھی۔ ''جب وہ جیل سے باہر آئے گی تو ہی اس سے ملوں گی۔'' میں نے آئس کریم سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔

''واقعی؟ کہاں؟''

''میرے خیال میں اس کے گھر میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ وہیں واپس آئے گی۔''

''میں تو کبھی نہ جاتی۔''

''تمہیں پتا ہے، میں اس سے جیل میں بھی ملی تھی۔''

''واقعی؟'' سیلی نے کہا۔

''اب پھر واقعی مت کہنا۔ ہاں میں اس سے ملی تھی۔''

''لیکن کیسے؟''

''اجازت لینی پڑتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ میں نہیں سمجھتی کہ بہت سے لوگ اس سے ملنے جاتے ہوں گے۔''

''تم تو بہت دلیر ہو۔'' سیلی نے ایک جھرجھری سی لی۔

''میں اس کے لیے چھوٹے موٹے تحائف لے گئی تھی۔ چاکلیٹ، سگریٹ وغیرہ۔ حالانکہ میں نہیں سمجھتی کہ وہ تمباکو نوشی کرتی ہے لیکن جیل میں سگریٹ سے بڑے کام نکلتے ہیں۔ میں نے اسے تھوڑی سی رقم بھی دی تھی اور وقتاً فوقتاً دیتی رہی تھی۔''

''کیا اس کی اجازت ہے؟''

''نہیں لیکن میں نے ایسا کیا تھا اور ہم کبھی پکڑے نہیں گئے۔''

''گریس تم سچ مچ بہت شریر ہو۔'' سیلی نے توصیفی لہجے میں کہا۔ اس نے پھر لپ اسٹک لگالی تھی اور واپس کام پر جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ ''تم سے پھر ملاقات ہوگی ڈارلنگ۔'' وہ بولی۔ ''ہم پھر یہاں لنچ کریں گے اگلی مرتبہ میری طرف سے...... سب لڑکیاں مل کر۔''

''درست۔'' میں نے کہا۔

''لیکن بہت جلد نہیں۔ میں مختصر سی تعطیل منانے برمودا جارہی ہوں، وہاں میری کئی سہیلیاں ہیں۔''

''بہت خوب، ہمیشہ سے میری بھی یہی خواہش رہی ہے۔'' میں بالکل جل بھن گئی۔

وہ بن سنور رہی تھی۔ میں بل ادا کرنے کے لیے اپنی جگہ بیٹھی اسے بنتے سنورتے ہوئے دیکھنے لگی اور جیل میں ماریہ سے ہونے والی اپنی ایک ملاقات کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں نے ماریہ کو یاد دلایا تھا کہ میں نے اسٹیم روم میں اس سے کیا کہا تھا۔ ''کیا تمہیں یاد ہے کہ میں نے کیا کہا تھا؟''

وہ احمقوں کی طرح میری صورت تکنے لگی تھی۔ پھر بولی۔ ''ہاں میں نے اس پر غور کیا ہے۔ اکثر و بیشتر کرتی رہی ہوں۔''

''میں نے یہ کہا تھا کہ اگر تم اپنے شوہر اور اس کی داشتہ کو قتل کرنا چاہتی ہو تو تمہیں چاہیے کہ کسی کی مدد حاصل کرو، یہ سب سے محفوظ طریقہ ہے۔''

''تم نے کہا تھا کہ اگر تمہارا شوہر تمہیں چھوڑ کر چلا گیا تو تم یہی کروگی۔ کیا تم نے ایسا کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ واپس آگیا۔ وہ جس عورت سے ملتا رہا تھا اسے بھیانک حادثہ پیش آگیا۔ اس کی کار کے بریک میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ وہ مری تو نہیں لیکن پہلے جیسی رہی بھی نہیں۔''

تب ماریہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جلد ہی رہا ہونے والی ہے۔ آزمائشی طور پر...... اسے اپنے پروبیشن آفیسر کو ہر ہفتہ اپنے بارے میں رپورٹ دینا ہوگی لیکن وہ آزاد ہوگی۔ میں بیمار پڑگئی تھی اور میں کسی کے لیے بھی خطرہ نہیں ہوں۔ وہ مسکرائی بھی تھی۔ آخر اسے جو کرنا تھا وہ کرہی چکی تھی۔

اس نے اپنی عارضی سزائے قید سے تو سمجھوتا کرلیا لیکن اس کی صحت پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ میں نے ان برسوں میں غور کیا تھا کہ اس کی صحت بگڑتی چلی جارہی تھی۔ ہر ملاقات پر وہ پہلے سے زیادہ کمزور نظر آتی تھی۔ یوں لگتا دھیرے دھیرے پگھل رہی ہو۔ شاید وہ اس سے کہیں زیادہ بیمار تھی، جتنا وہ جانتی تھی۔ وہ قطعی متجسس نہیں تھی۔ مثال کے طور پر اس نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ میں اس سے ملنے کیوں آتی ہوں۔ اگر وہ پوچھتی تو یقیناً میرے پاس کوئی

...لی بخش جواب نہ ہوتا۔ سوائے اس کے کہ میں بس اس ...ے رابطہ رکھنا چاہتی ہوں۔ میں اسے بے حد پسند کرتی ...تھی۔ وہ ساری عورتوں کا عذاب اکیلی جھیل رہی تھی۔

سیلی بن سنور چکی تھی۔ میں نے بل ادا کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے واپس کام پر جانا ہے۔'' میں نے سیلی ...سے کہا۔

''لیکن تم جاب تو نہیں کرتیں۔'' وہ بولی۔

''ہاں کرتی ہوں، بہت خوب صورت جاب ہے۔ ...اپنے شوہر کی دیکھ بھال کرنا، یقین کرو یہ ایک محنت طلب کام ...ہے۔''

''اوہ ہاں، میں تو یہ بھول ہی گئی تھی۔ میں سمجھتی ہوں ...یہ ایک اہم فریضہ ہے۔''

''بالکل۔''

سیلی خاموش ہوگئی۔ شاید وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔ ''...معلوم ہوتا ہے تم اسے اپنی ملکیت سمجھتی ہو۔'' آخرکار وہ ...بولی۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ میں نے تمہارے ...بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔

☆......☆

اسے رخصت کرنے کے بعد میں جاکر اس مکان کے ...سامنے کھڑی ہوگئی۔ لوگ اب بھی اس مکان کو گھورتے ...تھے۔ جب وہاں قتل کی واردات ہوئی تھی تو گھورنے والوں ...کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ نہیں، اس میں مبالغہ تھا۔ میں نے ...کبھی بیس یا بائیس سے زیادہ افراد کو نہیں دیکھا اور وہ بھی ...زیادہ دیر رکتے نہیں تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ پولیس ...ان کو رکنے نہیں دیتی تھی۔ دوسرے یہ کہ دیکھنے والوں کو ...خوف آتا تھا۔ وہ مکان دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اس ...سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں اکثر اس ہجوم میں نظر ...آتی تھی۔ اس دوران وہاں مجھے آن ڈیوٹی ایک پولیس ...کانسٹیبل ملی تھی۔ نیلی، چمکیلی آنکھوں اور گلابی جلد کی مالک، ...میں نے اس سے کہا تھا کہ میں گھریلو قتل کی انسانی تاریخ پر ...مضمون لکھ رہی ہوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تین ...لاشیں کس طرح مختلف کمروں میں پائی گئی تھیں لیکن وہاں ہر ...طرف خون ہی خون تھا۔ اس کے خیال میں قتل ہونے والی ...عورت پورے گھر میں بھاگتی رہی تھی اور اس کے زخموں سے ...خون بہہ رہا تھا۔ پھر وہ صدر دروازے کے پیچھے گر کر ختم ہوگئی ...تھی۔

''بڑی عجیب سی بات ہے۔'' وہ بولی۔ ''وہ تینوں لاشیں دروازے کے پیچھے پائی گئی تھیں۔ مرد دروازے سے ٹیک لگائے نیم دراز پایا گیا تھا۔''

''کیا تم نے خود یہ منظر دیکھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں میڈم۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اور مجھے اس بات کی خوشی ہے، پہلے میرا ساتھی پولیس مین اندر گیا تھا اور اس نے پورے گھر کا جائزہ لیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہاں کتنی لاشیں تھیں۔''

''تو اسے تین لاشیں ملی تھیں؟''

''کتے سمیت۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ بھی زخمی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگتا رہا تھا۔''

وہ کہہ رہی تھی اور میں تصور کی آنکھ سے اس مکان کے اندرونی حصے کو دیکھ رہی تھی۔ اس مکان میں جگہ جگہ خون کے دھبے تھے پھر میں وہاں سے روانہ ہوگئی تھی۔ چند ہی دنوں کے بعد قتل کا مقدمہ شروع ہوگیا تھا۔ میں سماعت کے دوران عدالت جاتی رہتی تھی۔ وہاں نشست ملنی مشکل تھی لیکن ماریہ کے وکیل صفائی کو میں جانتی تھی اسی نے میری مدد کی تھی۔ میں نے ماریہ کو عدالت کے کٹہرے میں دیکھا تھا، اس پر جرح ہوتے سنا تھا۔ مجھے ماریہ کا استقلال دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ اپنی بے گناہی کے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ دباؤ ڈالے جانے پر بھی نہیں جھکی تھی۔ اس نے صرف یہ تسلیم کیا تھا کہ وہ اپنے گھر میں تھی لیکن بالائی منزل پر سو رہی تھی۔ وہ خواب آور گولیاں کھا کر سوئی تھی کیونکہ وہ اس خیال سے ذہنی طور پر بے حد پریشان تھی کہ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر جارہا ہے۔

یہ نکتہ یقیناً اس کے حق میں جاتا تھا کہ پولیس کو آلہ قتل نہیں ملا تھا اور اس کے دامن پر خون نہیں پایا گیا تھا۔ ایک قطرہ بھی نہیں جسے صاف کرنا آسان نہ ہوتا، مجھے یقین ہے کہ وہ سمجھتی تھی وہ بھی لزی بورڈین کی طرح بے قصور پائی جائے گی جس نے مادر زاد برہنہ ہوکر اپنے شوہر کا قتل کیا تھا۔ وہ نسوانیت، کم گوئی، نفاست اور سادگی کی تصویر لگتی تھی لیکن ان لوگوں نے یقیناً اسے اسٹیم روم میں نہیں دیکھا تھا جب کہ میں نے دیکھا تھا، وہ شہوت اور جنسی خواہشات سے بھرپور تھی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ وہ ناکافی ثبوت کی بناء پر باعزت بری ہوجائے گی لیکن کیس میں کوئی ایسی بات تھی جو جیوری کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی ایسی بات جس نے انہیں بے چین کردیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا، جب وہ فیصلہ سنانے کے لیے واپس عدالت کے کمرے میں آئے تھے تو فیصلہ

سنانے سے پہلے جج سے مشورہ کیا تھا اور جج نے کہا تھا کہ وہ ارکانِ جیوری کی اکثریت کے فیصلے کو قبول کرے گا اور انہوں نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

ماریہ قتل کی مجرم پائی گئی ہے۔

میں نے عدالت سے نکل کر ایک خاتون رکن جیوری کا اس کے گھر تک تعاقب کیا تھا اور بس میں اسے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ اس کے خیال میں ماریہ نے نشے کی حالت میں جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ میں اس خاتون سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ بس سے اتر گئی تھی۔ ماریہ نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی تھی اور وہ اپیل مسترد کر دی گئی تھی۔ مجھے پہلے سے اس کا اندازہ تھا۔ مجھے اس کی تفصیل کا علم نہیں ہو سکا تھا کیونکہ میں اپنے شوہر کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی تھی لیکن میرے خیال میں اخبارات نے اس واقعے میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔

☆......☆

میں کئی سال تک ماریہ سے ملنے جیل نہیں جا سکی تھی لیکن جب جانا شروع کیا تو وہ اس وقت جیل کی لائبریری میں کام کر رہی تھی۔ وہ ایک مثالی قیدی تھی۔ اس سے مزید کسی تشدد یا بدمعاشی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ قید خانہ، وارسینٹر کے ایک سرسبز قطعہ میں واقع تھا۔ عمارت باہر سے جتنی خوشنما تھی اتنی اندر سے نہیں تھی۔ جب میں پہلی بار وہاں گئی تو جیل کے ایک سائیکاٹرسٹ نے میرا معائنہ کیا۔ اسے انٹرویو کا نام دیا گیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ میری نگرانی کی جا رہی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ میں کون ہوں جو ایک قاتلہ سے ملنے جیل آئی ہے۔ میں بار بار اس سے ملنے کیوں آتی ہوں؟ میرے اور اس قیدی کے درمیان کیا رشتہ ہے؟''

''میں محض ایک دوست ہوں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''اس نے تو آج تک کسی سے ملنا نہیں چاہا ہے۔''

''میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں آؤں گی۔ میں نے اسے ایک یا دو خط بھی لکھے تھے جس کا اس نے جواب نہیں دیا لیکن مجھے اس کے جواب کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میرے خطوط محض یاد دہانی کے طور پر تھے کہ میں اب بھی یہاں موجود ہوں۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیل کی اس ڈاکٹر نے میرے خطوط پڑھے ہوں گے لیکن میرے وہ خطوط بالکل عام نوعیت کے تھے۔ ان سے کچھ زیادہ پتا نہیں چلتا تھا اور یہی بات اس سائیکاٹرسٹ کی پریشانی کا باعث تھی۔'' ماریہ نے مجھے تمہارے وہ خطوط دکھائے تھے لیکن پہلے پہل اس نے کہا کہ وہ تمہیں نہیں جانتی۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ تم اسے خط کیوں لکھتی ہو۔'' وہ بولی۔

میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ مجھے بھول گئی تھی۔

''میں تمہیں خبردار کرنے کے لیے تم سے ملنا چاہتی تھی۔'' وہ سائیکاٹرسٹ کہہ رہی تھی۔

''مجھے خبردار کرنے کے لیے؟''

''وہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہے؟''

''کہیں وہ مجھ پر حملہ تو نہیں کر دے گی؟''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔''

''خوب۔'' میں نے سوچا۔

میں جب ماریہ سے ملی تو وہ مجھے ذہنی طور پر منتشر نظر نہیں آئی۔ تھوڑی سی خشک اور بوڑھی ہو گئی تھی۔ کسی پتے کی طرح جو مسلسل دھوپ میں ہو لیکن اپنی شاخ سے پیوستہ ہو۔

''میں پہلے تم سے ملنے نہیں آ سکی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ پہلے شاید تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں۔''

اس نے شانے اچکائے۔ ''میں کچھ بھی نہیں چاہتی۔''

''مجھے افسوس ہے کام ویسا نہیں ہوا جیسا کہ توقع تھی۔''

''میں جو کرنا چاہتی تھی، میں نے کر دیا۔''

پہلی ملاقات کے موقع پر ہمارے درمیان زیادہ باتیں نہیں ہوئیں لیکن میں بعد میں کئی بار اس کے لیے تحائف لے کر اس سے ملنے گئی لیکن وہاں وہ آخری ملاقات تھی جب اس نے مجھے بتایا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں بہت جلد رہا ہونے والی ہوں۔''

''مجھے بہت خوشی ہوئی۔'' میں نے کہا جو ایک حقیقت تھی۔

''میرے دل کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ بولی پھر مسکرائی۔ ''یہ لوگ نہیں چاہتے کہ میں جیل میں مر جاؤں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''میرے احساسات شروع ہی سے یہ تھے کہ شاید میں مجرم نہیں ہوں۔''

''حالانکہ تم نے اس کا ارتکاب کیا تھا، نہیں کیا تھا؟''

جواب میں وہ محض شانے اچکا کر رہ گئی۔

''کیا تمہیں اس کا افسوس ہے؟''

''اوہ نہیں، اس کے بارے میں تو میں اندر سے بالکل ٹھیک ہوں لیکن اس نے مجھے بدل دیا ہے۔ اس حرکت نے مجھے بدل دیا ہے۔''

میں اس کے شوہر کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ وہ کس قسم کا آدمی تھا۔ وہ جینی سے یا جو بھی اس عورت کا نام تھا، کیوں جنسی تعلق قائم کر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے زندہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صرف اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھی تھیں اور تصویروں سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ یہ سوچتے ہوئے بڑا عجیب لگتا ہے کہ اگر وہ آج زندہ ہوتا تو بوڑھا ہو چکا ہوتا۔ وہ ماریہ سے بیس سال بڑا تھا۔ ماریہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اس خیال سے کمسن ماریہ سے شادی کی تھی تاکہ وہ اس کے بڑھاپے میں اس کی دیکھ بھال کر سکے لیکن انسان نہیں جانتا کہ اس کی قسمت کیا لکھا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے محبت اور وفا کی خاطر شادی کی تھی۔ آرام اور سہارے کے لیے کی تھی اور میں نے یہ سب کچھ اپنے شوہر رابرٹ کو بتا دیا تھا لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ بدلے میں اس سے یہ سب کچھ پایا بھی تھا حالانکہ یہ ممکن ہے کہ وہ چیزوں کو مختلف انداز سے دیکھتی ہو۔

☆......☆

دو ماہ کے بعد میں نے اس مکان کے دروازے پر دستک دی۔ میں جانتی تھی کہ وہ پھر سے آباد ہو گیا ہے کیونکہ پردے یا تو بدلے ہوئے تھے یا دھلے ہوئے تھے۔ دستک کے جواب میں بدستور خاموشی چھائی رہی۔ تب میں نے کال بیل بجانے کی کوشش کی۔ بیل نہیں بجی میں کچھ سمجھ نہیں سکی۔ معلوم ہوتا تھا، گھنٹی مرمت چاہتی تھی لیکن چند لمحوں بعد دروازہ تھوڑا سا کھل گیا اور ماریہ نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ''میں جانتی تھی کہ تم موجود ہو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم آؤ گی لیکن میں نے یہ سوچا تھا کہ شاید تم پہلے فون کرو۔''

''میں تو ڈر رہی تھی کہ تم بھاگ جاؤ گی۔'' میں نے مذاق سے کہا۔

''میں نے آج کل بھاگنا چھوڑ دیا ہے۔''

''ناقص دل۔'' میں نے سوچا وہ نحیف لگ رہی تھی۔

مکان دہشت آمیز تھا۔ اس سے موت کی بو آ رہی تھی بلکہ بدبو...... گویا وہاں کوئی شے پڑی سڑ رہی ہو۔ شاید وہ خشک خون تھا۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی تھی کہ جب سے وہ جیل گئی تھی تب سے اب تک خون پر ایک کپڑا تک نہیں پھیرا گیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کہتی تو میں خود آ کر صفائی کر دیتی۔ گھر کے اندر ایسا لگ رہا تھا گویا وقت کی نبض تھم گئی ہو۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا آج سے دس سال پہلے اس دن تھا جب قتل ہوا تھا۔ اس گھر میں زندگی اسی دن رک گئی تھی۔ ہال میں ایک میز پر دی ٹائمز کی ایک پرانی کاپی پڑی ہوئی تھی جو زردی مائل ہو رہی تھی۔ ایک گملے کے مردہ پودے کے نزدیک ہی اخبارات اور خطوط کا ڈھیر بکھرا ہوا تھا۔ گھر کیا تھا، عجائب گھر تھا۔

وہ لمبے ہال سے گزار کر کچن میں لے گئی۔ میں اس گھر کے جغرافیہ سے تھوڑا بہت واقف تھی۔ یہ سامنے چھوٹا نظر آتا تھا لیکن پیچھے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر دو کمرے تھے اور ایک کچن تھا جب کہ بالائی منزل پر تین کمرے تھے اور اس کے اوپر بالاخانہ تھا۔ مکان کے پچھواڑے ایک باغیچہ تھا۔ کچن ہی وہ جگہ تھی جہاں سے سڑاند پھیلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے امید ہے کہ تم باہر آ کر خوش ہو۔'' میں نے کہا۔

''آخری جگہ اتنی بری نہیں تھی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''لیکن پہلی جگہ بہت دہشت ناک تھی۔'' اس کے لہجے میں چڑچڑاپن شامل ہو گیا۔ ''انہوں نے مجھے ایک قاتلہ کی کوٹھڑی میں ڈال دیا تھا۔'' وہ بولی۔ ''میرا مطلب ہے وہاں پہلے سے ایک قاتلہ موجود تھی۔''

میں نے پلکیں جھپکائیں۔

''میرا کیس اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ایک مجرمہ تھی۔ اس نے ایک گھر میں گھس کر ڈاکا ڈالا تھا اور ایک بوڑھے شخص کو ہلاک کر دیا تھا۔''

میرے خیال میں، ہم اپنی ذات کے لیے کبھی مجرم نہیں ہوتے۔ ہمارے درمیان زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔

''میں جلد ہی دوبارہ تم سے ملنے آؤں گی۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاؤں گی۔ کیا تمہیں بھوک لگتی ہے؟ تم کیا کھاتی ہو؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ میں کھا رہی ہوں۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔ ''لیکن بہرحال میں کچھ کھا رہی ہوں۔''

''اپنے آپ کو۔'' میں نے سوچا۔ وہ ایسی ہی نظر آتی تھی۔ وہ برسہا برس سے اپنے آپ کو کھاتی آ رہی تھی۔ خاموشی سے ایک ایک اونس...... اپنا گوشت، اپنی چربی اور اپنی ہڈی کھاتی آ رہی تھی۔ ''مجھے بتاؤ کیا میں تمہارے لیے

کچھ کر سکتی ہوں؟''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تنہا نہیں ہوں۔''

''اتنے گہرے کرب کے ساتھ کوئی کبھی تنہا نہیں ہوتا۔''

☆......☆

اس دن ماریہ سے مل کر میں واپس ایبری اسٹریٹ پر واقع اپنے فلیٹ آ گئی۔ یہ اس اسٹریٹ سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں ماریہ رہتی تھی۔ میں نے رات کے لیے کئی عمدہ ڈشیں تیار کر رکھی تھیں۔ ''تم بہت مصروف نظر آ رہی ہو۔'' کھانے پر رابرٹ نے کہا۔

''ایک سہیلی سے ملنے جاتی رہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں اس کے لیے بہت پریشان ہوں۔''

''تم ہر شخص سے بہت اخلاق سے پیش آتی ہو۔'' وہ تھوڑی سی شراب انڈیل کر بولا۔

''اوہ، کیا تم ایسا سمجھتے ہو؟ مجھ سے جو کچھ بن پڑتا ہے، میں کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''چلو اگلے ہفتے کہیں ڈنر کرنے چلتے ہیں۔ ترتز یا سیوائے۔ تم جہاں پسند کرو۔''

''رٹز چلتے ہیں۔''

''میرے جانے سے پہلے ایک ڈنر ہو جائے۔''

رابرٹ، اچھی صحت کا مالک، دراز قامت اور بہت خوش لباس تھا۔ ایک کامیاب بزنس مین۔ ''اس مرتبہ کہاں کے ارادے ہیں؟'' میں نے کافی انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''برمودا۔ مستقبل کا ہانگ کانگ۔ ہم وہاں اپنی برانچ قائم کر رہے ہیں۔''

''میں بھی وہاں جانا چاہوں گی۔ ہمیشہ ہی سے جانا چاہتی تھی۔''

''میں جانتا ہوں اگلی مرتبہ سہی۔''

☆......☆

اگلے دن میں ماریہ سے ملنے گئی۔ ''کیا تم مجھے اپنا گھر ادھار دو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ادھار؟''

''ہاں، صرف ادھار۔ دن بھر کے لیے، شاید صرف سہ پہر کے لیے ہاں سہ پہر کافی رہے گی۔''

''میں کہاں جاؤں گی؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔ اِدھر اُدھر ہوا خوری کرنے چلی جانا، اگر تم اس بات پر پریشان ہو کہ کوئی تمہیں پہچان لے گا تو مطمئن رہو۔ تمہیں کوئی بھی نہیں پہچانے گا۔''

''میں یہ چاہتی بھی نہیں۔''

''تمہیں پتا ہے، میرے پاس اب بھی ایک چابی ہے۔ میں آرام سے داخل ہو سکتی ہوں۔ تمہیں مجھے کچھ دینا ہے۔ میں نے اس دن تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا یعنی تمہاری مدد کی تھی جیسا کہ میں نے تم سے اسٹیم روم میں وعدہ کیا تھا۔ میں تمہاری خاطر قتل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تم خود سب کچھ اپنے طور پر کرنا چاہتی تھیں لیکن میں آ گئی اور یہ کہا کہ آلۂ قتل یعنی چاقو اور وہ گاؤن جو تم پہنے ہوئی تھیں اپنے ساتھ لے گئی۔''

''لیکن وہ چاقو انہیں مل گیا تھا۔''

''میں کچھ اور نہیں کر سکتی تھی۔ میرے پاس جتنا وقت تھا۔ اس وقت میں جو کچھ ہو سکتا تھا میں نے کیا اور وہ کبھی اس گاؤن کا سراغ بھی نہیں لگا سکے۔ تم جانتی ہی ہو۔''

پھر بھی وہ ہچکچا رہی تھی۔

''میں اس کے عوض تمہیں کچھ دوں گی۔'' میں نے کہا۔

''ٹھوس شکل میں؟''

''تمہارے لیے وہ ٹھوس ہی ہو گا، میرے خیال میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں گی۔ ہم تھیٹر جائیں گے، مووی جائیں گے، عمدہ ہوٹلوں میں ڈنر کریں گے۔ میں تمہیں اپنے پسندیدہ ریستوران میں لنچ کراؤں گی۔''

میں اس کی کمزوری بھانپ گئی تھی۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی تھی، کر چکی تھی۔ جس جگہ قتل کرنا چاہتی تھی وہاں اس نے قتل کر دیا تھا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اسے دوبارہ سوسائٹی میں جگہ مل جائے لیکن وہ داخلے کی ٹکٹ کھو بیٹھی تھی۔

''ٹھیک ہے لیکن یاد رہے صرف سہ پہر کے لیے۔'' وہ بولی۔

ہم نے اگلے ہفتے کی ایک تاریخ طے کر لی اور میں انتظامات کرنے کے لیے وہاں سے روانہ ہو گئی۔ سب سے پہلے میں نے اپنا بینک اکاؤنٹ چیک کیا۔ جیسی کہ مجھے توقع تھی۔ رابرٹ نے میرے اکاؤنٹ میں خاصی رقم ڈیپازٹ کرا رکھی تھی۔ اس اعتبار سے وہ ایک فیاض اور مہربان شوہر تھا۔ اسی رات ڈنر پر میں نے اس سے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ چل کر ایک مکان دیکھ لو جسے میں خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہوں۔''

’’خریدنے میں؟‘‘ وہ ہمیشہ تجارتی نقطۂ نظر سے سوچتا تھا۔ ’’ہاں، اس وقت مارکیٹ گری ہوئی ہے۔ کچھ خریدنا سود مند ہوگا، کیسا گھر ہے؟‘‘

’’ایک طرح کا عجائب گھر ہے۔‘‘ میں نے پرخیال لہجے میں جواب دیا۔ ’’سالہا سال سے خالی پڑا ہوا ہے۔‘‘

’’سالہا سال سے خالی پڑا ہوا ہے؟ اوہ ایسے پرانے مکانات بڑے کام کے ہوتے ہیں۔‘‘

’’تم اسے ایسا ہی پاؤ گے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کیا تم چلو گے؟‘‘

’’ہاں چلوں گا۔‘‘

☆......☆

پھر میں سیلی سے ملی۔

’’کیا پھر لنچ؟‘‘ اسے روف ٹاپ ریستوران کا لنچ یاد تھا۔

’’نہیں، اس مرتبہ میں تمہیں ایک مکان دکھانا چاہتی ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’مجھے؟‘‘ اس کے لہجے سے حیرت برس رہی تھی۔ ’’کیا تم منتقل ہو رہی ہو؟‘‘

’’نہیں ایسا نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں تمہیں ایک راز میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔ یہ وہی اوکرے اسٹریٹ والا مکان ہے میرے خیال میں تمہیں وہ مکان دیکھنا چاہیے۔ محض تجسس دور کرنے کی خاطر۔‘‘

’’کیا وہ عورت بھی وہاں موجود ہوگی؟‘‘ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ اس کا اشارہ ظاہر ہے ماریہ کی طرف تھا۔

’’معلوم نہیں ویسے میں بعد میں تم دونوں کو ایک دوسرے سے ملواؤں گی ضرور۔‘‘ میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

’’ٹھیک ہے میں آؤں گی۔‘‘ وہ بولی۔ ’’کیا میں اپنی پالتو کتیا کو بھی لا سکتی ہوں؟‘‘

’’بڑے شوق سے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’بلکہ میں تم سے کہنے ہی والی تھی کہ اسے لانا۔‘‘

’’کیا واقعی؟ تو کیا وہاں چوہے ہیں؟‘‘

’’ممکن ہے تہ خانے میں ہوں لیکن اسے زنجیر میں جکڑے رکھنا، میں نہیں چاہتی کہ وہ اِدھر اُدھر بھاگتی پھرے اور ہاں وقت پر پہنچنا۔‘‘

’’ظاہر ہے۔‘‘ وہ بولی۔ ’’میں ہمیشہ وقت ہی پر پہنچتی ہوں۔‘‘

☆......☆

لیکن وہ دیر سے پہنچی تھی۔ مجھے پہلے سے اس کا اندازہ تھا۔ رابرٹ آدھا گھنٹا پہلے پہنچا تھا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا فرنٹ دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔

’’مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ میں اس پتے سے واقف ہوں۔ کیا یہاں کبھی پارٹی میں آئے تھے؟ اور تم اس گیٹ اپ میں کیوں ہو؟‘‘ مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔

’’نہیں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تم یہاں پہلے کبھی نہیں آئے، تم ٹھیک سے جائزہ لو میں ابھی آئی؟‘‘

میں اسے بوکھلایا بوکھلایا سا اِدھر اُدھر ٹہلتا اور جائزہ لیتا ہوا چھوڑ کر کچن کے دروازے کے پیچھے چلی گئی اور وہ سفید لبادہ پہن لیا جسے پہن کر ماریہ نے اپنے شوہر اور اس کی داشتہ کا قتل کیا تھا۔ وہ لبادہ دھلا ہوا تھا، پھر میں ایک دم اچھل کر برآمد ہوئی اور چاقو رابرٹ کے حلق میں پیوست کر دیا۔ ’’نہیں۔‘‘ وہ چیختا ہوا پیچھے ہٹا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ ’’تم پاگل ہو گئی ہو۔‘‘ اس نے میری کلائی اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ ’’میں نے تمہارے بینک اکاؤنٹ میں ایک بڑی رقم رکھ دی ہے۔‘‘

’’مجھے یقین ہے کہ برمودا میں اس سے تین گنا رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ہوگی۔‘‘

میں سوچتی ہوں کیا واقعی ہمارے درمیان اس قسم کی کوئی گفتگو ہوئی تھی؟ کیوں کہ اب مجھے خیال آتا ہے کہ وہ ایک لفظ کہے بغیر فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ خون میں ڈوبا ہوا اور میں نے اس پر وار کیا تھا۔

جب سیلی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میں اس کی منتظر تھی۔ گھنٹی اس بار بھی نہیں بجی تھی۔ حالانکہ میں نے اس کی مرمت کرا دی تھی۔ جب اس نے مجھے خون آلود سفید لبادے میں اپنے سامنے کھڑا ہوئے پایا تو اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ ’’گریس تم ایسے کپڑوں میں کیوں ہو؟ کیا ہوا ہے؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے؟‘‘

وہ واقعی احمق تھی لیکن اس کی کتیا احمق نہیں تھی۔ وہ زور زور سے بھونکنے لگی۔ ’’ہاں ایک بھیانک حادثہ پیش آ گیا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’جلدی سے کچن میں آؤ۔ وہاں رابرٹ ہے۔‘‘

’’رابرٹ؟‘‘ اس کی چیخ مزید دہشت آمیز ہو گئی۔

پھر وہ جونہی رابرٹ پر جھکی میں نے اس پر وار کر دیا۔ وہ رابرٹ کے اوپر ہی ڈھیر ہو گئی۔ میں نے ماریہ سے بہتر

ام لیا تھا جسے پورے گھر میں اپنے دوسرے شکار کا پیچھا کرنا تھا لیکن دوسری طرف کتیا نے میری کلائی پر کاٹ کھایا۔ ے کہ ماریہ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا یا اس نے کبھی اس کا ار نہیں کیا تھا۔ مجھے کتیا کو ہلاک کرتے ہوئے افسوس ہوا ان مجھے یہ کرنا ہی تھا۔ تب میں نے چاقو سنک میں اچھال یا۔ وہ کچن کا پرانا چاقو تھا۔ میں پچھلی مرتبہ چرا کر لے گئی تھی اور اسے تیز کر لیا تھا۔ میں نے نلکا کھول دیا۔ محض اس لیے کہ ں اسے دھونا چاہتی تھی کیونکہ میں نے تو دستانے پہن رکھے ہے بلکہ اس لیے کہ ان پر ماریہ کی انگلیوں کے نشانات نہ ئے جا سکیں اور پولیس باور کرنے پر مجبور ہو جائے کہ ماریہ نے چاقو دھو دیا تھا۔

میں نے لبادے کو فرش پر گر جانے دیا۔ یہ لانڈری کا ھلا ہوا تھا لیکن مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ماہرین ں کی تہ میں موجود خون کے پرانے دھبوں کا سراغ لگا لیں ... گھریلو عورتیں جانتی ہیں کہ خون کے دھبے صاف کرنا نا مشکل ہوتا ہے۔ اب اس امر کا سراغ لگانا سراغ سانوں کا کام تھا کہ یہ پرانا لبادہ ماریہ نے اب تک کہاں چھپائے رکھا تھا۔

☆......☆

پھر میں سڑک کی دوسری طرف واقع پارک میں جا بیٹھی اور اپنی زخمی کلائی کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر ے بعد ماریہ آ گئی۔ میرے بچ نکلنے کے امکانات روشن تھے۔ یہ ایسا ہی لگا ہوگا گویا ماریہ نے اپنے جرم کو دہرایا ہو۔ ایک بار پھر دو معصوم افراد کو ہلاک کر دیا ہو۔ میں نہیں سمجھتی کہ ماریہ کے احتجاج میں کوئی وزن ہوگا پھر یہ کہ میں جب بھی اس سے ملنے جیل گئی تھی میں نے انہیں اپنا اصلی نام نہیں بتایا تھا۔ کبھی اپنے اصل حلیے میں بھی نہیں گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر خون لگ گیا ہوگا۔ میں سارے دروازوں کے ہینڈلوں پر خاصا خون چھوڑ آئی تھی۔ تھوڑا سا خون ٹیلی فون پر بھی لگا دیا تھا۔

میں وہاں دھوپ میں بیٹھی اسے گھر کے اندر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک پولیس کار آ کر وہاں رک گئی۔ پھر ایک ایمبولینس اور اس کے پیچھے دوسری ایمبولینس وہاں پہنچ گئی۔ پھر ایک دوسری پولیس کار آ دھمکی۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی یہ سب دیکھتی رہی۔ دوسری ایمبولینس غالباً ماریہ کے لیے تھی۔ اس منظر نے اس کا دماغ یقیناً الٹ دیا ہوگا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہوگا۔

میں خاموشی سے اٹھ کر پیدل چلتی ہوئی اپنے فلیٹ پر پہنچ گئی تاکہ ٹیلی فون کا انتظار کر سکوں جسے آنا ہی تھا۔ مجھے رابرٹ کے بارے میں بری خبر دی جاتی۔ مجھے رٹز میں رابرٹ کے ساتھ ڈنر نہ کرنے کا افسوس تھا لیکن انسان کو ہر چیز نہیں مل جاتی۔ میں خود رٹز یا سیوائے جا سکتی تھی۔ پھر اگر سب ٹھیک رہتا تو برمودا کا بھی ایک چکر لگا سکتی تھی جہاں ساری رقم اب میری ہوگی لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ماریہ کا کہنا بالکل درست تھا۔ انسان قتل کر کے بدل جاتا ہے۔ ہم دونوں ہی برمودا جائیں گے۔ میری دوست بھی میرے ساتھ ہی جائے گی جس نے قتل کیا تھا۔ وہ اب میرے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔

☆......☆

ایک نرس اور ایک ڈاکٹر جن میں سے ایک سائیکاٹرسٹ تھا، ماریہ کے بیڈ کے پاس کھڑے تھے۔ ماریہ کی آنکھیں بظاہر کھلی ہوئی تھیں لیکن وہ درحقیقت کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔

’’پچھلے سال جیل میں اس میں انتشار کی علامتیں ظاہر ہوئی تھیں۔‘‘ سائیکاٹرسٹ نے کہا۔ ’’لیکن میں یہ سمجھ رہا تھا کہ مرض ہمارے قابو میں ہے۔‘‘

’’اس مرض نے کیا شکل اختیار کر لی ہے؟‘‘ ڈاکٹر نے پوچھا۔

’’یہ خواب دیکھتی ہے۔ یہ خواب در خواب ہے۔ اس نے خوب میں دیکھا کہ ایک عورت اس سے ملنے آئی تھی جو سیلی ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی لیکن جسے یہ نہیں جانتی۔ وہ اس کے پاس آئی اور ملاقات کے دوران اسے بتایا کہ یہ اپنے جرائم کو دہرائے گی۔ پھر یہ اس پورے منظر کو خواب میں دیکھے گی جس میں اس نے سچ مچ قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ خواب میں بھی اور حقیقت میں بھی۔ یہ ایک بہت ہی پیچیدہ کیس ہے اور اس کا قوی امکان ہے کہ یہ کبھی نارمل نہیں ہو سکے گی۔‘‘

آپ سمجھ گئے ناں کہ رابرٹ اور سیلی کو میں نے کیوں قتل کیا؟ وہ مجھے احمق سمجھتے تھے لیکن وہ مجھے احمق سمجھیں یا کچھ اور، مگر جیوری نے مجھے احمق قاتلہ قرار دے دیا ہے کیونکہ انہیں کتے کی زنجیر اور پٹے پر میری انگلیوں کے نشان مل گئے تھے پھر انہیں اس ڈاکٹر کا بھی سراغ مل گیا تھا جس نے میرے ہاتھ کی ڈریسنگ کی تھی۔ میں نے ایک بے داغ منصوبہ بنایا تھا مگر بھول گئی تھی کہ جرم کبھی چھپتا نہیں ہے۔



شاعرِ درد

سلمیٰ اعوان

احساسات اور جذبات کی ترجمانی شاعری کہلاتی ہے اور اگر شاعری میں اپنا درد، اپنے آنسو سمو دیئے جائیں تو وہ محمود درویش کی شاعری کہلائے گی۔ ظلم و جبر کی بھٹی میں جلتا ہوا آہوں اور سسکیوں میں زندگی گزارتا ہوا یہ شاعر دو طرفہ دبائو کا شکار رہا۔ عرب اسے غدار کہتے اور صیہونی اسے مجرم...... مگر وہ!

تباہ شدہ ماحول میں پرورش پانے والے شاعر کی کتھا

زندگی میں خوش قسمتی کبھی کبھی آپ کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ یہ آپ کا مقدر ہے کہ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے اندر چلی جائیں یا پھر اِسے بند کر دیں۔ فلسطین اور اسرائیل جانا اور بیت المقدس کو دیکھنے کا موقع ملنا خوش قسمتی ہی تھی نا۔

بات ہے بہت سالوں پہلے کی غالباً 1993ء کی۔ عمان میں اپنے قیام کے دوران ہوٹل والوں نے اسرائیل کے لیے چند گھنٹوں کا ٹرانزٹ ویزا دینے کا پوچھا۔ پہلے تو بھونچکی سی ہو کر گرد و پیش کو دیکھا۔ ایک ہاہاکار سارے میں مچی تھی۔

آنکھوں میں بے یقینی کی ابھرتی لہروں نے مخاطب کو دیکھا۔ اندر نے جیسے مسرت بھری کلکاری بھری اور سرگوشی کی۔ ''ہائے یروشلم جیسے خوابوں کا شہر۔'' پہلی للک نے دھمال ڈالی۔ کہیں اس کے کوچہ و بازار میں پھرتا وہ بے مثل شاعر محمود درویش مل جائے۔ دوسری جذباتی للک نے گدگدی کی۔ سفر میں امکانات اور ممکنات دونوں کی بہتیری گنجائش۔ ڈرامائی موڑوں کا ایک نام زندگی بھی۔

جیسے یہاں کھڑے اس پیشکش کا ملنا۔ تو خوش بختی کی اِس آواز کو سنی ان سنی کیوں کیا؟ پکار پر توجہ نہ دی اور خود کو اس نعمت سے محروم کیوں کر لیا جس سے میں نوازی جانے والی تھی؟

یہ کیا حادثہ تھا؟

آج خود سے پوچھتی ہوں، تب میرے انکار کی وجہ کیا تھی؟ پیسے زیادہ مانگے تھے انہوں نے یا اسرائیل کا خوف تھا؟ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ سوچتی ہوں تو جذبات گڈمڈ سے ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔

تب دہشت گردی کا بھی آج جیسا دور دورہ نہ تھا۔ اسرائیل اور فلسطین میں معمول کی جھڑپیں ضرور ہوتی تھیں۔ خاص طور پر انتفاضہ کے بعد سے مگر اس کے ساتھ ہی دوستانہ تعلقات رکھنے والی عرب ریاستوں سے سیاحتی معاہدے بھی تھے کہ سیاحت اسرائیل کے لیے ایک اہم صنعت کا درجہ لے چکی تھی۔

اب کھیسے میں پیسوں کی تو کوئی کمی نہ تھی۔ رہا خوف ووف کا مسئلہ۔ خوف والے دن تو میں جمی ہی نہیں۔ تو پھر کیا تھا؟ یہی سمجھنے سے قاصر ہوں۔

پھر کوئی پانچ سال بعد کی بات ہے۔ مصر میں اپنی سیر کے دوران ایک تو فلسطین کے موضوع پر عام لوگوں سے کھل کر باتیں ہوئیں۔ مختلف آراء سننے کو ملیں۔ تند و تیز اور تلخ تلخ سی۔ اِن فلسطینیوں کو بھی ہابڑے پڑے ہوئے تھے مہنگے داموں اپنی زمینیں بیچنے کے۔ بیروت میں جائیدادیں خریدنے کے ہوکے تھے۔ خیر سے اب بھگتیں۔

اسی فلسطین کا شاعر ہے محمود درویش جس کی شاعری کے بارے میں سنا۔ محمود درویش سے دیس میں بھی چاہتوں، محبتوں اور عقیدتوں کا رشتہ پالے بیٹھی تھی۔ جہاں کہیں خون جگر میں ڈوبی شاعری کا کوئی ٹکڑا پڑھنے کو مل جاتا، کئی دنوں تک تڑپتی رہتی۔

اس سیر سپاٹے کے دوران صحرائے سینا (Sinai) کے ریگ زاروں سے گزرتے ہوئے خلیج عقوبہ (Gulf of Aqaba) کے ساحلی شہر ایلات اور اسرائیلی شہر رفہ (Rafah) سے ظالم اسرائیل کو شروع ہوتے دیکھنا بڑا تلخ تجربہ تھا۔ یہ سرحدی علاقہ افقی صورت میں چلتا چلتا بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلوں پر واقع غزہ سے جا ملتا ہے جو ایک چھوٹی سی مستطیل پٹی ہے۔

یہیں وہ بدقسمت اور مظلوم قوم جس کا نام فلسطینی ہے محصور ہوئی پڑی ہے۔ مصر کے ساتھ جڑے اس چھوٹے سے حصے میں جیالوں نے سرنگیں بنا رکھی ہیں۔ ایک ظالم اسرائیل، دوسری ظالم مصری فوجی حکومتیں غزہ کے مجاہدین اور مصر کے

اخوان المسلمین سے خائف ہیں۔ وہ دلیر اور جیالے فلسطینی مجاہد جنہوں نے سو جتنوں اور حربوں سے یہ غیر قانونی راستے بنائے ہیں۔ ظالمین انہیں بار بار تباہ کرتے ہیں اور وہ اسے پھر بنا لیتے ہیں۔

میں نے بھی اُس سرنگ کے راستے فلسطین جانے کا سوچا۔ خرچہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ لالچی طبیعت نے اب ساری توانائی اس میں جھونک کر اس مقصد کو حاصل کرنے کی اپنی سی کوشش کرنی چاہی۔ گویہ آدم خور شیر کے کچھار میں سر دینے والی بات تھی۔ پر اس وقت خواہش کے منہ زور اور تند و تیز ریلے کے سامنے بڑی مجبوری محسوس کر رہی تھی۔ فلسطینیوں سے ملنے اور محمود درویش کو دیکھنے کی خواہش چین نہیں لے رہی تھی۔ دل اڑ کر اس زمین پر جانا چاہتا تھا۔

انہی دنوں ایک اور واقعہ بھی ہوا۔ میری خالہ زاد بہن ڈاکٹر رضیہ حمید جو عرصہ چالیس سال سے امریکا میں مقیم ہے، وہاں کی شہری ہے۔ انسانی حقوق کی مختلف تنظیموں سے وابستہ ہے۔ Peace Now کی طرف سے تین ماہ کے لیے اسرائیل بھیجا گیا۔ تین ماہ بعد واپس آ کر اس نے فلسطین کے شہروں غزہ، راملہ، ویسٹ بینک اور اسرائیل کے حیفہ، عکا، یروشلم اور بیت اللحم کے قصیدے پڑھے۔

غزہ کی بوڑھی عورت کے زیتون کے باغ میں زیتون کے درختوں پر چڑھنے، انہیں توڑ کر گھر لانے اور دستی مشین سے تیل نکالنے کے قصے سنائے۔

اسرائیل کی ظالمانہ کہانیاں، اس کے ظالمانہ ہتھکنڈے، حماس کی خدمتِ خلق، ان کے جذبات کی شدتیں، الفتح کی سیاست اور سب سے بڑھ کر محمود درویش سے ملاقات۔ اس کی شاعری کے ٹکڑے اس کی اپنی زبان میں سنوائے تو میری حالت قابلِ دید تھی۔ حسرتوں کا دھواں تھا جو مجھے سلگا سلگا کر مارے جا رہا تھا مگر ہو کیا سکتا تھا۔ قہرِ درویش برجانِ درویش والا معاملہ تھا۔

مصر پر جو کتاب لکھی تھی ''مصر میرا خواب۔'' جب چھپی تو سوچا کہ اس کی کچھ تقریب کا ہی اہتمام کروں۔ سچی بات ہے کتاب لکھ کر اس کی رونمائی کروانا بھی اب بیٹی کو بیاہنے کی طرح ایک مجبوری بن گئی ہے۔ سوچا کہ بھئی مصر پر لکھا ہے تو مصر والوں کو بھی خبر کرو۔ یہ کیا کہ سوتے ہوئے بچے کا منہ چوم رہی ہوں، نہ ماں کو خبر نہ پیو کو پتا۔ کتاب سفیر صاحب کو بھیجی اور ساتھ ہی انہیں لاہور آنے کا سندیسہ بھی بھیج دیا۔ جواب آیا۔

''بڑے مشکور ہیں ہم کہ آپ نے ہمارے دیس پر لکھا۔ اب حق تو ہمارا بنتا ہے۔ پچاس لوگوں کی برأت لے کر



جولائی کے پہلے ہفتے ہمارے گھر اسلام آباد تشریف لے آئیں۔" اب اس الیلی داستان کی روئیداد کی تفصیل کا کیا ذکر کہ من آنم و من دانم۔ بہرحال سفارت خانے کی اِس نوازش کا بہت شکریہ کہ بہتیری عزت دے ڈالی جس کا ہمیں گمان تک نہ تھا۔

تقریب کا اہتمام سفارت خانے نے اپنے قومی دن کے موقع پر کیا۔ میری خوش قسمتی کہ مشرق وسطی کے سبھی ممالک کے سفیر اور ان کی بیگمات تشریف لائیں۔ یہیں تقریب کے اختتام پر ایک اُونچے لمبے نوجوان نے اپنا تعارف ابوشیب الہیثم سفیر فلسطین کی حیثیت سے کرواتے ہوئے کہا۔" ہمارے ملک فلسطین پر لکھیے نا۔"

لومیاں۔ ہمارے تو نتھنے پھولے۔ جی باغ باغ ہوا۔ سالوں پرانی خواہش کی تکمیل کے آثار نمودار ہوئے۔ فلسطین پر بھلا کس کافر کا جی لکھنے کو نہ چاہے گا اور فلسطین کی سرزمین پر اُترنے کی تمنا کون نہ کرے گا؟ اور محمود درویش سے کون ملاقات کرنی نہ چاہے گا؟

پاسپورٹ اور درخواست فوری بھیجنے کو کہا گیا جو بھیج کر انتظار میں بیٹھ گئی۔ شوق و اضطراب بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ چند بار رابطہ کیا۔ لہجے کی بیتابی اور شتابی پر صبر اور حوصلے کی تلقین کی گئی۔ کارگزاری کی رپورٹ بلاشبہ بڑی مسرور کن تھی۔ اس بے چاری نمانی سی عورت کا ذکر صدر فلسطین جناب محمود عباس سے ہوا تھا۔ انہوں نے کہا۔ اھلاً وسھلاً، جم جم آئیں سو بسم اللہ، سر متھے سر آنکھوں پر۔ پاکستان اور پاکستانی ہمیں بہت پیارے۔ وہاں کی وزارتِ اطلاعات کی چیف سیکریٹری ہماری آمد کی تہِ دل سے منتظر اور اسرائیل خانہ خراب کے ہاں اس بھی تذکرہ ہو گیا تھا۔

روز خواب بنتی۔ ہائے محمود درویش سے ملوں گی۔ اس ....سے کہوں گی کہ تمہاری شاعری دل تڑپاتی ہے۔

دو تین بار فون کر کے صورتِ حال جاننا چاہی۔

"کوشش ہو رہی ہے۔ گھبرایئے نہیں۔" جواب ملا۔

ایک دن جب میں جنگ اخبار کی ریفرنس لائبریری میں بیٹھی "سری لنکا" کی فائل دیکھ رہی تھی۔ ماحول کی خاموشی اور سناٹے کو فلسطینی سفارت خانے سے آنے والی آواز نے توڑا۔ ابوشیب بول رہے تھے۔

"اسرائیل نے آپ کو اوکے کر دیا ہے۔ پر ساتھ ہی چند شرائط بھی عائد کر دی ہیں۔ سن لیجیے۔"

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سنی۔ کڑی شرائط میں سب سے اہم فلسطین کے مسئلے پر نہ لکھنے کا وعدہ تھا۔ یروشلم میں داخلے کی کوئی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔ چند اور بھی ایسی ہی بے تکی باتیں تھیں۔ فون بند ہو گیا تھا۔ اب خود سے پوچھنا ضروری تھا تو میں نے وہاں کرنے کیا جانا ہے اگر لکھنا نہیں پھر چند لمحوں کی چپ کے بعد میرا اندر جیسے پھڑک اٹھا تھا "ہے نا لعنتی یہ اسرائیل بھی۔"

اب یہ بھی کہیں ممکن تھا کہ فلسطین پر جس انداز سے بھی لکھا جائے اسرائیل کا ذکر نہ آئے۔ اس کے وجود کا کینسر اس اُس کے بغیر ہی۔ یعنی افسانہ آئیں بائیں شائیں سے بچ جائے اور اصل قصے سے رہ جائے یا شاعر کے خوبصورت لفظوں میں کہ وہ بات جس کا سارے فسانے میں ذکر نہ تھا والی بات ہو۔

گھر واپس آ کر میں نے خود پر لعن طعن اور پھٹکار کا پٹارا کھولا جس میں اس سے پہلے بھی بیسیوں بار میں اُسے غوطے دیتی رہی ہوں۔

میری امیدوں پر جلد ہی پانی پھر گیا۔ ابوشیب نے ایک دن بتایا کہ ظالم اسرائیل جو مشکل سے پٹڑی پر چڑھا تھا ایک گڑگڑاہٹ سے نیچے اتر گیا ہے۔ اب ٹھنڈی ٹھار ہو کر بیٹھ جانے والی بات تھی۔

پھر یونہی اِدھر اُدھر کہیں کسی پرچے، کہیں نیٹ پر اس کی شاعری پڑھتے پڑھتے ایک دن میں نے بھی ہزاروں پاکستانیوں کی طرح اِس خبر کو بوجھل دل سے سنا اور ٹی وی پر دیکھا کہ وہ بے خانماں شاعر جسے بے شمار ملکوں اور تنظیموں کی طرف سے بے شمار ایوارڈز اور انعام دیے گئے مگر جس کا سب سے بڑا انعام وہ بے پایاں محبت اور پیار تھا جو اُسے فلسطینیوں نے اپنا قومی شاعر قرار دینے کی صورت دیا۔

لاکھوں عربوں نے اُسے دل کی مسند پر بٹھایا اور اُسے فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر کہا۔ وہ جو اول آخر فلسطینی تھا حیات میں بھی اور موت میں بھی۔ وہ جو عربوں کی نمائندہ ثقافتی شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ خوبصورت سوز و گداز سے لبالب بھری شاعری کا خالق ہوسٹن کے ہرمن اسپتال میں فوت ہو گیا تھا۔ فلسطین میں دفن ہونے کی اس کی آخری خواہش پر اُسے فلسطین لایا گیا۔ فلسطینی صدر محمود عباس نے تمام تدفینی رسومات میں حصہ لیا اور راملہ میں اُسے قومی شاعر کے طور پر پورے اعزاز سے دفنایا گیا۔ قومی سطح پر تین روز اس کا سوگ منایا گیا۔

اس کی حیاتی کے بارے میں کوئی ورقہ کھولنے سے پہلے میں اس

ایک نظم پڑھتی ہوں۔

دو سے آٹھ شہیدوں
اور دس زخمیوں
بیس گھروں
اور پچاس زیتون کے پیڑوں کا
قتلِ عام ہمارا روزانہ کا نقصان ہے

یہ اوائلِ بہار کا خوشگوار چمکتا روشن دن 13 مارچ تھا۔ 1942ء جب مغربی گلیلی کے بالائی علاقے کی سرسبز پہاڑی پر واقع گاؤں البروا Al-Birwa کے رہائشی سلیم اور حوریہ درویش کے ہاں ان کا دوسرا بچہ محمود پیدا ہوا۔ زمیندار گھرانا تھا۔ ماں گو اَن پڑھ تھی مگر دادا صاحبِ علم تھا۔ بچہ کو لکھنا پڑھنا اُسی نے سکھایا تھا۔

چھ سال کا تھا جب اُسے اپنے سرسبز و شاداب گاؤں سے بھاگنا پڑا۔ جون 1948ء کی وہ رات اس کی یادوں میں اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ ساری زندگی جھانکتی رہی تھی۔

اُس کی آنکھوں میں خواب تھے اور ماں جھنجھوڑے چلی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اونچے چلاتی تھی۔

"اٹھو اٹھو میرے بچے، کمبخت صیہونیوں نے حملہ کر دیا ہے۔"

کچے خواب دیکھتی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتے، معصوم یادوں کی گٹھڑی اٹھائے وہ ماں کا ہاتھ تھامے سیکڑوں لوگوں کے ساتھ کھائیوں، ٹبوں، جنگلوں میں ننگے پاؤں بھاگ رہا تھا۔ تعاقب میں گولیاں تھیں۔

پتا نہیں ماں قافلے سے بچھڑ کیسے گئی۔ دن طلوع ہو گیا تھا وہ اُس کا ہاتھ تھام کر قریبی کھیت میں چھپ گئی۔ سورج کی تپش، بھاپ چھوڑتے ڈھل اور بھوکا پیاسا وہ۔ رونے لگتا تو ماں ہونٹوں پر انگلی رکھ دیتی کہ آواز نہ نکلے۔

پھر ایک موٹا تازہ فوجی ایک ہاتھ میں بندوق تھامے اور دوسرے ہاتھ سے ڈنٹھلوں کو ہٹاتا ان کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ کرخت آواز میں پوچھا تھا اُس نے۔ "بروا سے ہو؟"

ماں کی خوبصورت آنکھوں کی پتلیوں میں خوف جیسے ٹھہرے ہوئے پانیوں کی طرح ساکت تھا۔ اُس سے بولا تو نہیں۔ بس سر ذرا سا اثبات میں ہلا۔

"بھول جاؤ اُسے۔ پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھنا ورنہ گولیاں چھلنی کر دیں گی۔"

ماں اس کی انگلی پکڑے بھاگتی گئی اور یہ بھاگنا اُس کی زندگی کا وہ تلخ ترین حادثہ تھا جس نے اُسے ساری زندگی مضطرب رکھا اور وہ ساری زندگی یہاں وہاں گھر کے لیے، اپنی زمین کے لیے بھاگتا اور بھٹکتا رہا۔

پہلی پناہ گزینی لبنان میں ہوئی۔ کس درجہ المناک اور دکھ بھرے احساسات میں وہ محصور رہتا تھا۔ In memory of forgetfulness میں وہ لکھتا ہے۔

"مجھے اپنا ہرا بھرا گاؤں یاد آتا، اپنا بڑا سا گھر۔ اُس کا وسیع و عریض آنگن، اس کی کیاریوں میں چنبیلی اور گلاب کے بوٹے، زیتون کے پیڑ، چھوٹے بہن بھائی اُن کی شرارتیں اور لڑائیاں۔ مردان خانے کا بڑا کمرا اور اس کا آنگن جہاں میرے دادا کے پاس اردگرد کے علاقوں کے معززین اور گاؤں کے لوگ آتے۔ قہوہ اور کافی کی سروس چلتی۔ کوئی کتاب پڑھتا اور باقی سب سنتے۔ کبھی قدیم اور کبھی جدید شاعری سنی جاتی۔ اس پر حاشیہ آرائی ہوتی۔ یہ عرب روایات تھیں جن سے ہم محروم ہو گئے تھے۔ نئے ماحول کا دن اگر تکلیف دہ تھا تو راتیں اُس سے سوا تھیں کہ آنسو گالوں پر بہتے جاتے اور میں کبھی خود سے اور کبھی اپنے ہم عصر مقامی بچوں سے ایک ہی سوال بار بار پوچھے چلا جاتا کہ آخر ہمارا گھر ہم سے کیوں چھن گیا؟"

یہاں کوئی چیز اگر مانوسیت رکھتی تھی تو بس یہی زبان تھی۔ اس جرأ جلا وطنی کے یہی شب و روز تھے جنہوں نے اُسے ایک چھوٹے معصوم بچے سے بڑے میں بدل دیا۔ اس کے سب خواب اور بچپنے کی چہلیں جیسے کہیں اڑ پڑ گئی تھیں۔ کھانے کے لیے لمبی قطار میں لگنا پڑتا تھا۔ جو سرکاری امداد محکمہ تقسیم کرتا تھا۔ کتنے ہی ایسے نئے لفظ اس نے پہلی بار سنے۔ وطن، مہاجرین، جنگ، سرحدیں جنہوں نے آنے والے دنوں میں بہت کچھ سمجھایا اور سکھایا اور اُس سے اس کا رہا سہا بچپن بھی چھین لیا۔

جیزن Jezzin اور دیمور Damour میں ایک سال رہنے کے بعد واپسی کا فیصلہ ہوا۔ اس رات انہوں نے چوری چھپے وطن واپسی کی تو گاؤں ملیامیٹ ہو کر اسرائیل کے نئے منصوبے کی آماجگاہ بن رہا تھا۔

بدقسمتی کہ وہ اسرائیلی علاقوں میں رہ جانے والے فلسطینی عربوں کی مردم شماری میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا۔ خاندان عکا میں دیر الاسد میں قیام پذیر ہوا۔ مگر اپنی جنم بھومی میں آ کر وہ ہجرت اور پناہ گزینی کے ایک اور کرب سے گزرا جو اُس کے حساس ذہن پر ہمہ وقت کچوکے لگاتا تھا۔

مدرسے میں ہوتا تو اچانک کسی اسرائیلی فوجی افسر کے آنے پر اُسے چھپا دیا جاتا۔ جب پولیس گاؤں آتی تب بھی یہی عمل دہرایا جاتا۔ کسی الماری میں، کسی بیڈ کے نیچے، کسی غسل خانے میں، کسی مجرم کی طرح چھپا وہ سوچوں کے دہکتے جہنم سے گزرتا۔ گھر کے بڑوں کی تاکید تھی کہ گفتگو میں لبنان کا کبھی ذکر نہ آئے کہ وہ حملے کے وقت وہاں چلے گئے تھے۔

"میں ذہین اور ہونہار طالب علم تھا۔ شاعری کے ساتھ مصوری بھی میرا شوق تھا۔ میں کوئلوں سے دیواروں پر ایسی تصویریں بناتا کہ یقین سے ماورا ہوتیں۔ میرے والد، میرے عزیز اور ملنے جلنے والے حیرت کا اظہار کرتے۔ میری یہ مشق بس دیواروں اور ردّی کاغذوں تک ہی محدود رہی کہ والد کے پاس رنگوں اور برش کے لیے پیسے ہی نہیں ہوتے تھے۔ اپنی غربت کا مجھے شدید احساس تھا۔ مصوری کے شوق کے پورا نہ ہوسکنے نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا کہ یہ سہولت اور مفت میں ہوجانے والا ہنر تھا۔ میرے اساتذہ نے میری نثر کی بھی بڑی حوصلہ افزائی کی۔"

پہلی نظم جو اُس نے تیرہ سال کی عمر میں پڑھی وہ ایک صدائے احتجاج تھی۔ وہ ابھی مدرسے کا طالب علم تھا اور اسرائیل اپنی آٹھویں سالگرہ منا رہا تھا۔ عرب رہائشی علاقوں میں جلسے، جلوس، ریلیاں اور اسکولوں میں تقریری مقابلے ترتیب دیے گئے۔ اُس نے بھی اپنے اسکول میں ہونے والی تقریب میں حصہ لیا۔ مائیکروفون کے سامنے کھڑے ہوکر اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار ایک نظم کی صورت میں کیا۔ یہ نظم ایک احتجاج تھی، اُس کے اندر کے جلتے کرب کا اظہار تھی۔

ایک عرب لڑکے کے اسرائیلی لڑکے سے سوال تھے۔

"تمہارے پاس گھر ہے
میرے پاس گھر کیوں نہیں؟
تم جیسے چاہو جس طرح چاہو
سورج کے نیچے کھیل سکتے ہو
میں کیوں نہیں؟
خوشیاں تمہارے لیے ہیں
میرے لیے کیوں نہیں؟
میں ایک پناہ گزین کیوں ہوں؟
تم اور میں اکٹھے مل کر کھیل کیوں نہیں سکتے؟"

اگلے ہی دن اُس لڑکے کو مجد الکروم کے فوجی دفتر میں بلا کر ڈرایا دھمکایا گیا۔ فوجی انچارج کا لہجہ اس درجہ دہشت اور توہین آمیز تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا اور خود سے سو[ال] کرتا رہا کہ آخر اُس کا جرم کیا تھا؟ اپنے اس سوال کا جو[اب] پوری فصاحت کے ساتھ اُسے بہت بعد میں ملا۔

تاہم کفر یاسیف کے ہائی اسکول کے دوران میں [اُس] کی زندگی میں ایک یہودی شخصیت نے بڑا مثبت کردار ادا [کیا]۔ وہ اس کی اُستاد سوشنہ تھی۔ اس کے اندر ممتا تھی۔ وہ نیک [...] کی علامت تھی۔ اُس نے نفرت کی آگ سے اُسے نکالا [...] پیار لیک جیسے شاعر کی شاعری پڑھنے پر اُسے اُکسایا۔ یہ وہ [...] کردار تھا جو ہمیشہ اس کی یادوں میں جھلملاتا رہا۔

اس [...] memory of forgetfulness میرے سامنے کھلی پڑی ہے۔ اُن محرومیوں پر میں اشک [...] ہوں جو اُس ذہین بچے کی جھولی میں وقت نے ڈالیں۔ جنہ[وں] نے اُسے پل پل تڑپایا اور سوالوں کے کٹہرے میں کھڑا کیا [...] اپنے ایسے ہی دنوں کی تلخ یادوں میں سے گزرتے ہوئے [...] ہیں۔

"میری یادوں میں وہ بوڑھا ہمیشہ کسی لَو کی طرح [...] ہے۔ اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد کی پہلی مردم ش[ماری] کے وقت ہم لبنان میں تھے۔ جب دو سال بعد واپس آ[ئے] گویا ہم Infiltrators (بھگوڑے) تھے۔ یعنی صدی[وں] سے اپنی ہی دھرتی پر رہنے والے سنگینوں کی نوکوں پر نکا[لے] جانے والے دو سال بعد Infiltrators بن گئے تھے [...] ہمارے پرکھوں کا وطن اُن کا ملک بن گیا تھا [...] الاسد Dayr-Al-Asad میں کوئی سوچ سکتا ہے یہ [...] نفسیاتی کمپلیکس تھا۔

"اور وہ بوڑھا بھی تو ایسے ہی مسئلے کا شکار تھا جو ہر [...] کو قریبی گاؤں سے آتا۔ اُس کی آواز میں کیا درد اور سوز [...] رباب پر وہ اپنی کہانی گاتا۔ کیسے اس نے گھر چھوڑا اور [...] باڈر پار کیا؟ اور کیسے وہ واپس آیا؟ رات ہوتی، آسمان پر [...] ہوتا گھپ اندھیرا اور ہر دل کو مٹھی میں بھینچنے والی یہ شاعری [...] موسیقی ہوتی۔ یہیں مجھے احساس ہوا کہ درد کیسے لفظو[ں کا] احساس دے کر انہیں باہر نکالتا ہے اور آرٹ کیسے عام چیز[وں] کی کوکھ سے ہی نکل آتا ہے۔ اب کیسے نہ وہ سارے منظر [...] یادداشتوں میں ابھرتے جو میں اپنے گاؤں البروا میں دیکھ[تا] جو میری یادوں کا حصہ تھے۔"

یادوں کے اِسی ہجوم میں گھرا وہ کچھ اور منظروں [...] چہروں سے پردہ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں شاعر بن کر [...] اندر کے اُس بچے کو کھوجتا رہا جو اس کے اندر تو تھا پر [...]

[...] رکھ کر بھول گیا تھا۔ شاعر تو بڑا ہوتا گیا مگر وہ بچہ جسے اُس [...] بڑا ہونے نہیں دیا تھا، اپنی جگہ رہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ میری اور میرے مادرِ وطن کی کہانی [...]ہ زیادہ مختلف نہیں۔ کم عمری میں ہی گھر چھوڑ دیا۔ شاید [...]۔ احساس تھا کہ میں اپنے خاندان کا ایک نظرانداز کیا ہوا [آو]ارہ اور غیر ذمے دار لڑکا ہوں۔ کم از کم اپنی ماں سے مجھے [...]یہی تاثر ملا۔ بہت ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن کرتی تھیں [...] شاید سمجھتی تھیں کہ گھر کے ابتر حالات میں کچھ میرا بھی [...] ہے۔

"1956ء میں غزہ پر قبضے اور مصر پر حملے کے خلاف [...]الاں اور احتجاج کی صورت میں جیل میں تھا۔ جب میری [...] جیل آئی اور انہوں نے میری پیشانی چومی۔ میرے لیے وہ [...] اور کافی لائیں۔ یہ وہ پہلا دن تھا جب میں نے جانا کہ [...] پر تھا۔ وہ مجھے پیار کرتی ہے۔ کیسی ناقابلِ بیان [...] تھی جیسے میرے اندر قندیلیں سی جل اٹھی ہوں۔ جیل [...] مجھے ماں کی محبت کا احساس دلایا تھا۔ جیل میں ہی میں نے [...] احساسات پر وہ نظم لکھی۔

"I long for my mother's bread

"اپنی ماں کے ہاتھوں کی کافی
ماں کے ہاتھوں کی پھینٹی ہوئی
بچپن میرے اندر عود کر آیا ہے
دنوں نے اپنی آنکھیں کھول دی ہیں
اور یہ مجھے کتنے عزیز ہیں
کیونکہ اگر میں مر جاؤں
میری ماں کے آنسو مجھے شرمندہ کریں گے
اگر میں کسی دن واپس آؤں
تمہاری پلکوں پر کسی شال کی طرح
اپنا ہاتھ
میری ہڈیوں پر پھیرنے دو
اپنے بالوں کے کنڈلوں سے ہمیں باندھ لو
اپنے لباس کی ڈوریوں سے ہمیں اپنی پشت پر کس لو
اگر میں تمہارے دل کی گہرائیوں کو
چھولوں
تو میں خدائی دیوتا کا روپ دھار لوں
اپنی ماں کے ہاتھوں کی روٹی
میری دلی تمنا

وسطی ایشیائی ملک آذربائیجان کے ابشرا جزیرہ نما کی سب سے بڑی جھیل بحیرہ کیسپین سے متصل ہے۔ اسی علاقے میں آذربائیجان کا دارالحکومت باکو بھی واقع ہے اس باکو کے اچیری علاقے میں طرح طرح کے ریستوران ہیں۔ یہاں روز شام کے وقت گھر سے باہر کھانے کا کلچر ہے۔ عام طور پر لوگ بکری کے گوشت کے کباب کے ساتھ نان کھاتے ہیں۔ باکو شہر یا ابشرا جزیرہ نما کی یہ کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ یہاں کے لوگ اس بات سے بے خوف ہیں کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے پریشر کُکر کہے جانے والے علاقے کے باشندے ہیں۔ یہاں رہ رہ کر زمین کے اندر سے چنگاری پھوٹ نکلتی ہے۔ آتش فشاں پھٹ جاتے ہیں کیونکہ ابشرا جزیرہ نما میں زمین کے نیچے بڑی تعداد میں قدرتی گیس کے ذخائر ہیں۔ جب میتھین گیس کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو وہ زمین کی ملائم سطح سے باہر آنے لگتی ہے، تیز رفتاری سے گیس یوں زمین سے نکلتی ہے جیسے مٹی کا کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ہو۔ آذربائیجان میں 400 سے بھی زیادہ مٹی کے آتش فشاں ہیں۔ آج سے 70 برس قبل کسی نے پہاڑی پر سگریٹ پھینک دی تھی۔ جس سے لگنے والی آگ آج تک جل رہی ہے۔ اس علاقے میں اکثر ایسے دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ عام طور پر تو خطرناک نہیں ہوتے ہیں لیکن کئی بار خوفناک مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سن 2001ء میں باکو سے 15 کلومیٹر کے فاصلے پر لوکبطن نامی آتش فشاں میں اتنا زبردست دھماکا ہوا تھا کہ آسمان میں سیکڑوں میٹر بلند چنگاریاں دیکھی گئی تھیں۔ وہاں کی فضا مکمل طور پر کیچڑ اور دھوئیں سے بھر گئی تھی۔ ایک دھماکا 6 فروری 2017 کو بھی ہوا تھا۔ پورے علاقے کا یہی حال ہے پھر بھی اس علاقے میں ہزاروں سال سے لوگ آباد ہیں۔

☆☆☆

برلن کے بوٹینکل گارڈن میں دنیا کا سب سے بڑا اور بدبودار پھول کھل اٹھا ہے جسے دیکھنے کے لیے شائقین کی ایک بڑی تعداد گارڈن کا رخ کر رہی ہے۔ تفصیلات کے مطابق یہ پھول قدرتی طور پر کسی مردہ جانور کی طرح بدبودار ہوتا ہے جس کی بو کیڑوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ پودے کی اس نایاب قسم کی مجموعی عمر 40 سال ہوتی ہے جس پر صرف ایک پھول دو یا تین دنوں کے لیے ہی کھلتا ہے اور اس کی لو سے کیڑے مکوڑے کھنچے چلے آتے ہیں جو پھول کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ پودا درحقیقت انڈونیشیا میں پایا جاتا ہے جس کے پھول کو دنیا کا سب سے بڑا پھول تصور کیا جاتا ہے۔

مرسلہ: یوسف وسیم۔ ملتان

مجھے سنبھال لیتا اگر میں کبھی واپس آؤں
اپنے اوون میں ایندھن کے طور پر
جو تمہارے پکانے میں مدد کرے گا
اپنی چھت پر پھیلائے کپڑے کی طرح
جسے تم ڈالتی اور سمیٹتی ہو
میں تمہاری روزانہ کی دعاؤں میں
شامل ہونا اور وہاں رہنا چاہتا ہوں
میں بڑا ہو گیا ہوں
مجھے میرا وہ بچپن لوٹا دو
ہجرت کرنے والے پرندوں کے ساتھ واپس آؤں
تمہارے گھر میں جہاں میری واپسی کا انتظار ہوا"

یہ کیسی اثر انگیز نظم تھی۔ آنسو میرے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ جانے کتنی دیر میں پسرانہ اور مادرانہ جذبات کے اس نوسٹلجیا میں کھوئی رہی۔

1960ء میں اُس نے ہائی اسکول مکمل کیا اور حیفہ چلا گیا۔ یہاں اسرائیلی کمیونسٹ پارٹی راکھا Rakah اور پارٹی کے ترجمان اخبار الاتحاد اور ہفتہ وار الجدید کے عربی سیکشن کا انچارج بنا۔ 1970ء میں وہ ماسکو تعلیم کے لیے چلا گیا۔ ایک سال بعد اُس نے قاہرہ میں "الاہرام" میں ملازمت کر لی۔ کچھ عرصے بعد پی ایل او میں شامل ہو گیا۔

شاعری اُس کے خمیر میں رچی تھی۔ اس کی شاعری کا پہلا دور ہجرت کے اُن دکھ بھرے تجربات پر ہے جو اُس نے دیکھے، جن سے وہ گزرا اور جو اُس نے سہے۔ دوسرا فیز ایک بڑے کیوس کی صورت میں سامنے آیا جس میں لبنان جیسے خوبصورت ملک پر اسرائیل کی وحشیانہ بمباری، بیروت پر جیٹ فائٹرز کی چیختی دہاڑتی آوازوں نے گلوکاروں کی میٹھی آوازوں اور موسیقی کے سروں کو نگل لیا۔ شیلنگ نے شہر کا حُسن گہنا دیا۔ آگ اور خون نے انسانیت کو قتل کر دیا۔ صابرہ اور اشتیلہ کے کیمپوں کی حالت زار اور اسرائیل کی بربریت اور ردعمل کے طور پر انتفادہ۔

درویش کی شاعری ہمیشہ اس کے انفرادی اور اجتماعی رویّوں، سیاسی ناانصافیوں اور وطنی دکھوں کے گرد گھومی۔ تاہم جب وہ اسرائیلی چالبازیوں، ان کے خود ساختہ وضع کردہ دہرے معیاروں کی کھینچا تانی میں لڑھکتا اپنا خون جگر پیتا تھا، تب ذاتی احساسات پر مبنی بہت کچھ لکھا گیا۔

"زیتون کی شاخ
اس کی چھاتیوں پر شام پھول کی طرح کھلتی ہے
وہ پرندے کا خواب دیکھتا ہے
اور لیمن کے پھولوں کے بارے میں بات کرتا ہے
اس کے لیے مادر وطن وہ کہتا ہے
جیسے ماں کی بنائی ہوئی کافی پی جائے
جیسے رات پڑنے پر گھر واپس آیا جائے
اور میں نے دھرتی کے بارے میں پوچھا
اس نے کہا تھا
میں کچھ نہیں جانتا"

اُسے اسرائیل میں رہنے والے بیشتر یہودی دانشوروں کا رویّہ ناقابلِ فہم لگتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میں سمجھ نہیں سکتا وہ کیسے ادیب ہیں جو دنیا میں کہیں بھی یہودیوں پر گزرنے والے کسی حادثے یا تکلیف پر مضطرب ہوا[تے] ہیں؟ وہ اسرائیل میں رہنے والے عرب فلسطینیوں کے [دکھ اور] بے چینیاں کیوں محسوس نہیں کرتے؟

وطن کی جیل زیادہ خوبصورت ہے
جلاوطن ملکوں کے باغوں سے
انہوں نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا
مسکراتے ہوئے، ہنستے ہوئے
اور دریاؤں کے کنارے اُگے گلابوں پر
اندھا دھند گولہ باری کر دی تھی
وہ تو ہر بات اور ہر معاہدہ بھول جاتے ہیں
گزرتے دنوں کے ساتھ ان کی انگلیاں موٹی ہو جائیں گی
زنگ آلود آئینوں پر انہیں
اپنے چہرے نظر نہ آئیں گے
یوں یہ اچھا ہے باغ پھیلتا جائے گا
خزاں سے پہلے جب وہ واپس آئیں گے
ہم ابھی تک کون ہیں
ہمیں صحرا میں کون واپس بھیجے گا

اُس کے یہی جذبات تھے کہ اُس نے اپنے ہرادار[ے] میں اِس مسئلے کو چھیڑا اور اپنے اسرائیلی ہم وطنوں سے سو[ال] کیا۔ قوموں کے درمیان بنیادی تضادات کیوں پیدا ہوں[؟] ان کے باہمی تعلقات مساوات اور انصاف کی بنیادوں پر [کیوں نہیں] ہوں۔

"گیارھویں سیارے" میں وہ کہتا ہے۔
"میں دو جنتوں کا وہ آدم ہوں
کہ جن سے دوبار نکالا گیا ہوں

مجھے بہت آہستگی سے نکالو
مجھے آرام سے مارو
گارشیا لورا کے ساتھ
میرے زیتون کے پیڑ کے نیچے دفن کر دو"

اب اس کی ایک اور نظم لبوں پر ہے۔

"یہاں پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر
شام کے دھندلکوں میں
وقت کی توپ
اِن ڈوبتے سایوں کے ہجوم کو نگل رہی ہے
ہم وہی کرتے ہیں
جو قیدی کرتے ہیں
اور جو بے کار لوگ کرتے ہیں
ہم امیدیں کاشت کرتے ہیں"

محمود درویش کا کہنا ہے کہ میں باوجود اِن دکھوں اور [درد]وں کے جو ظلم سے پیدا ہوتی ہیں اور جو ہمیں متاثر کرتی [ہیں، ا]پنے خود کو منفی نہیں ہونے دیتا۔ انسانیت کا اہم عنصر اپنے اندر [پا]لنا چاہتا ہوں اور رکھتا بھی ہوں۔

"میری محبت اگر تم بارش نہ بن سکو
تو درخت بن جاؤ
زرخیزی سے لبالب بھرا ہوا
درخت بنو
میرے پیار اگر تم درخت نہ بن سکو
تو پتھر بن جاؤ
نمی سے پور پور بھیگا ہوا
پتھر بنو
میرے محبوب اگر تم پتھر نہ بن سکو
تو چاند بن جاؤ"

ایک چاہنے والی عورت کے خواب میں فروزاں چاند

میں جن حالات میں رہتا ہوں اس پر جھنجھلاتا نہیں ہر شام اپنے کمرے میں بیٹھا یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں [کہ می]را رشتہ صرف آفتاب سے ہے کیونکہ رات کو میں اسرائیلی [قانون] کے تحت باہر نہیں نکل سکتا۔ خود سے کہتا ہوں کہ [اُس] نے مجھے کیسی عزت بخشی ہے کہ میرا ناتا روشنی سے جوڑ [دیا] ہے۔

ہر روز چار بجے مجھے تھانے جا کر اپنے وجود کا ثبوت دینا ہے۔ میں دل میں کہتا ہوں ہم نے دن رات کو چوبیس [گھنٹو]ں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اُن کے لیے رات، میرے لیے دن۔ ہم جانتے ہیں کہ رات سے دن زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ زیادہ پر اُمید ہوتا ہے۔ تو میں فائدے میں ہوں اور اسرائیلی پولیس نقصان میں۔

میں ہمیشہ چاہتا ہوں کہ قومی تعصب سے بالاتر رہوں اور یہی وجہ ہے کہ جب میں نے A Soldier dreams white lilies لکھی اور مجھ پر دو تین شامی ادیبوں نے تنقید کی کہ یہ میری محض خیالی کردار نگاری ہے۔ میں نے ان کی بات کو رد کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انسانوں کو ایک ہی پلڑے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اِس خطے میں رہنے والے یہودیوں کے ساتھ بطور انسان تو کوئی لڑائی نہیں۔ لڑائی تو صرف عرب قومیت اور صیہونیت کے ساتھ ہے۔ یہاں وہ اپنے یہودی دوستوں سے کہتا ہے۔

"میرے وجود میں ایک دل کی ضرورت ہے
ایک بندوق کے میگزین کے وزن کی ضرورت نہیں
میں مرنے سے انکاری ہوں
اپنی بندوق کو محبت میں بدلتا ہوں"

وہ سوال اٹھاتا ہے کہ آخر ہم کیوں یہ چاہتے ہیں کہ جذباتی اور جانب دارانہ احساسات کی شاعری ہی توڑ ہے۔ نہیں، یہ عقلِ سلیم کو قائل نہیں کرتی۔ ضرورت ہے کہ اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کے لیے اعلیٰ فنی معیار اپنایا جائے۔ جیسے میری نظموں نے دنیا میں میرے موقف کی بھرپور تائید کی ہے۔ "شناختی کارڈ" کو ہی دیکھیں۔

"رجسٹر میں لکھو میں ہوں عرب
کارڈ کا نمبر ہے اکاون ہزار
میرے بچے آٹھ ہیں
اور نواں آنے کو ہے گرما کے بعد
تم نے ہی چھینے ہیں مجھ سے
باغ تھے جتنے میرے اجداد کے
اور چھینا ہے زمین کا وہ قطعہ
ہاں تو پہلے صفحے پر لکھو
مجھ کو انسانوں سے کوئی بغض یا نفرت نہیں
لیکن اتنا ہے کہ میرا رزق اگر چھن جائے گا
غاصبوں کا گوشت بھی کچا چبا جاؤں گا
بس ڈرو تم بھوک سے میری ڈرو
اور میرے غیظ و غضب سے ڈرو"

یہی وہ نظم تھی۔ بیتا وقت ہوا یا (شناختی کارڈ) جو نظارت کے سینما گھر میں پڑھی گئی اور جس پر خوفناک ردِعمل سامنے

آیا۔ دنوں میں یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ایک احتجاجی گیت کے طور پر پوری عرب دنیا اور ترجمہ ہو کر یورپ میں پھیل گئی۔

سلام+شلون بھی ایک ایسی ہی نظم ہے

”تم جو دروازے میں کھڑے ہو
اندر آؤ
ہمارے ساتھ عرب قہوہ پیو
تمہیں احساس ہوگا
کہ تم ہماری طرح کے ہی انسان ہو
تم جو گھروں کے دروازوں میں کھڑے ہو
ہماری صبح کے اوقات میں
باہر تو نکلو
ہمیں بھی یقین آئے
کہ ہم بھی تمہاری طرح کے ہی انسان ہیں“

محمود درویش نے دو شادیاں کیں اور دونوں ناکام ہوئیں۔ پہلی بیوی رعنا قبانی رائٹر تھی۔ دوسری شادی ایک مصری مترجم سے ہوئی، حیات ھینی۔ بچہ کوئی نہیں تھا۔ درویش کی نظموں کی دنیا ریٹا کون تھی؟ ریٹا کو ایک مفروضہ بھی کہا جاسکتا ہے جو ایک خاص عورت کی اشارے کنایے میں عکاسی کرتا ہے۔ یہ ابہام ایک شدید خواہش، طاقت، ذہانت، کمزوری، دوری الغرض بہت سی علامتوں کے مظہر کے طور پر بھی اس کی شاعری میں ظاہر ہوا ہے۔ ایک جگہ اس کا اظہار دیکھیے کیسے ہوا۔

”میں تو تم سے محبت کرنے پر
مجبور ہوا ہوں
اس لیے تھوڑی
کہ تم بہت ہی حسین ہو
بلکہ اس لیے
کہ تم بہت گہری ہو
خوبصورتی سے محبت کرنے والا
بالعموم بیوقوف ہوتا ہے“

لیکن وہ دراصل ایک خوبصورت یہودی عورت تھی جس سے وہ محبت میں اس وقت مبتلا ہوا جب وہ حیفہ میں رہتا تھا۔ یہی تعلق فلم ”شناختی کارڈ“ کا موضوع بنا جسے فلم ساز ابتسام مارانہ نے بنائی جو خود مسلمان تھی اور جس نے ایک یہودی سے شادی کی تھی۔

شاید اس میں کہیں جھگڑے کا کوئی تاثر اُبھرتا ہو جب قومی اختلاف جسم کو محبت کرنے اور محبت بھری کہانی بُننے سے روکتا ہو۔ میری نظموں میں ریٹا وہی یہودی خاتون ہے۔ کیا ایک راز ہے؟ یہ راز جسے میں کھولتا ہوں۔

”ریٹا اور میری آنکھوں کے
درمیان رائفل ہے
وہ جو کوئی ریٹا کو جانتا ہے
وہ گھٹنے جھکاتا اور دعا مانگتا ہے
اُن شہد جیسی رنگت والی آنکھوں میں
الوہیت کے سائے ہیں
ہمارے درمیان ملیں
چڑیاں اور خواب ہیں
اور بہت ساری ملاقات کی جگہیں
رائفل نے نشانہ لیا
لیکن اُس سے پہلے رائفل میری آنکھوں کو
تمہاری آنکھوں سے ہٹاتی
ایک یا دو لمحوں کی جھپکی
یا شہد رنگے بادل
اِن شہد رنگی آنکھوں کی
طرف بڑھ جاتے ہیں“

اُس کی شاعری کے کوئی تیس والیوم چھپ چکے ہیں۔ کی تقریباً آٹھ کتابیں۔ پہلا مجموعہ ”زیتون کی پتیاں“ آخری ”گیارہ سیارے“ ہیں۔ نو مجموعوں پر مشتمل کلیات بہت بار چھپی اور لوگوں سے خراج حاصل کرچکی ہے۔ اُس انٹرویوز اُس کے اہم مضامین بھی کتابی صورت میں ہو چکے ہیں۔

ایک جگہ درویش اپنے خیالات کا اظہار پیرائے میں کرتا ہے۔ میں گلوکار میکیش تھیوڈوراکس بہت محبت کرتا ہوں۔ وہ مجھ جیسا ہی ہے۔ ایک دن نے پڑھا کہ اُسے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ میں نے اُ ...ve me Rita گرفتاری سے متاثر ہو کر لکھی۔ نظم کے تعارف میں، میں نے لکھا تھا کہ میکیش گرفتاری دراصل انتہا پسندی کی طرف اسرائیل کا ہوا رجحان ہے جو صحت مند نہیں۔

اگلے چند دنوں میں وہ بھی گرفتار ہوگیا تھا۔ روزمرہ کی ڈائری میں جو اُس کے درج کردہ واقعات ہیں بھی کسی چھوٹے موٹے افسانے سے کم نہیں۔ یہ اُس دکھ ہیں جو ہیجان برپا کرتے ہیں۔

اُس کی شاعری میں، اُس کی نثری تحریروں میں

استعارہ ہے۔ اس کی محبوبہ، اس کی جنت کا جو چھن گئی۔ وطنی اور گھر بدری کا غم اور اندر کے دکھ کا اظہار۔ وہ جب وطنی کے بارے میں لکھتا ہے تو گویا پوری دنیا کا نمائندہ بن جاتا ہے۔

اُس کی شہرہ آفاق طویل نظم ”عاشق من فلسطین“ ہے۔ نظم کی جو محبوبہ ہے وہ دراصل سرزمین فلسطین ہے۔ شاعر نے کیسے اپنا دل چیر کر اپنا درد اس ... دیا ہے۔

”ہمارا ملک وہ ملک ہے جس کے ہم مالک بنتے ہیں
اس کے پرندے، اس کے پھل پھول
اس کی سب جان دار اور بے جان چیزیں
ہمارا ملک ہماری جائے پیدائش
ہمارے آبا و اجداد کی
ہماری آنے والی نسلوں کی
ہمارا ملک تو وہ ہے
جہاں ہمارے لوگ
آگ اور راکھ سے
اس کے گرد نقشی باڑ بناتے ہیں
اس انداز سے
کہ ایک جنت
اور ایک جہنم“

اُسے فلسطین کی انسانیت کا پیغمبر کہا گیا۔

ایک اور جگہ لکھتا ہے۔

”میں نے تمہارا چہرہ پانیوں میں دیکھا
چاند کی طرح خاموش اور ساکن
کھیتوں میں تمہیں پایا
لہولہو میں ڈوبے ہوئے“

اسرائیلیوں کے لیے محمود کا نام فلسطینی قوم پرستی کا دوسرا ... ہے۔ حالانکہ اس کی شاعری تعصب سے بہت بلند ہے مگر ... لفظ ہی اس کا ہتھیار بن گئے تھے۔ وہ کہتا ہے۔

”ہمیں لفظ لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر سوچ اور نظریے ... اوپر اٹھنا ہے۔ سیاسی پارٹیاں ہوں یا اسلامی جہادی ... ہیں۔ اتحاد کے لیے لفظ لکھنے ہیں۔ دنیا کو بتانے کے لیے، ... سویا ہوا ضمیر جگانے کے لیے، ذہنوں کو متاثر کرنے کے ... مدلل تحریر ذہن میں کھلبلی مچا دیتی ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو ... کی تلوار اٹھانی ہے۔ سادہ مگر گرفتار کرنے والے لفظ جو ... یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی ثقافتی بنیادوں کے ڈھانچوں پر کھڑے ہوں۔“

دنیائے عرب میں گزشتہ نصف صدی کی نسل میں محمود درویش ایک عظیم شاعر کے طور پر جانا اور مانا گیا ہے۔ عربی کے چوٹی کے سات آٹھ شعراء میں سے وہ ایک ہے جس نے اپنی زندگی میں بہت سارے ایوارڈز کے ساتھ افریشیائی اہل قلم کا ادبی ایوارڈ ”لوٹس“ بھی حاصل کیا۔ اُس کی نظموں کے ترجمے کم از کم بیس زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ جنہیں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

وہ المتنابی اور خلیل جبران سے بہت متاثر تھا۔ جدید شاعروں میں نزار قبانی، گارشیا لورا، پابلو نرودا، Yeats اور ڈیرک والکوٹ کا عاشق تھا۔

اسرائیل کے وزیر تعلیم نے محمود درویش کی پانچ نظمیں اسرائیلی اسکولوں میں اختیاری مطالعے کے طور پر چاہا کہ شامل کی جائیں۔ یوسی سارد کا کہنا تھا کہ ایک دوسرے سے لاتعلق اچھے پڑوسیوں کے زمرے میں نہیں آتی۔ مگر حکومتی ارکان نے سخت مخالفت کی۔

اِس خوبصورت شاعر کا کلام اس کے اندر کے کرب کا غماز ہے۔ اس نے اپنے کام سے عشق کیا۔ اِسے عبادت جانا۔ اُس کی شاعری اُس کی تاریخی، اجتماعی اور ذاتی ماضی کے اثاثے پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُس کے مادرِ وطن کے عکس نظر آتے ہیں۔ ”قید اور محاصرے میں“ ذرا دیکھیے۔

”زمین ہمارے اوپر تنگ ہو رہی ہے
ہم کہاں جائیں گے
اس آخری سرحد کے بعد
پرندے کہاں اُڑیں گے
اس آخری آسمان کے بعد“

1988ء میں اس کی ایک نظم Passing between the passing words نے بڑا طوفان اٹھایا۔ یہ اسرائیلی کنیسٹ Knesset میں بھی زیرِ بحث آئی۔

”ہماری زمین کو چھوڑ دو
ہمارا ساحل، ہمارا سمندر
ہماری گندم اور ہمارا نمک
اور
ہمارے زخم“

ایجاد کی ماں

محمد یاسر اعوان

ضرورت ہی ایجاد کو جنم دیتی ہے۔ ہمیں رات کے اندھیرے دور کرنے کی فکر ہوئی تو ہم نے مشعل اور چراغ بنا لیے پھر برقی بلب ایجاد کرلیے۔ ندی پار کرنے کی ضرورت ہوئی تو کشتی بنا لی۔ ہمارے آس پاس ایسی بہت سی ایجادات ہیں جنہیں ضرورت نے پیدا کیا اور ان کی افادیت نے ہر دلعزیز بنادیا۔

معلومات حاصل کرنے والوں کے لیے ایک مختصر سی مگر قابلِ توجہ تحریر

ویسے تو ہزاروں بلکہ لاکھوں چیزیں ایجاد ہوئیں مگر کچھ ایجادات ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گئیں پھر بھی ان کی افادیت کم نہیں ہوئی، آپ خود ملاحظہ کرلیں۔

1۔ ہل: ہل ایک بہت سادہ سا آلہ ہے جس نے کھیت کو تیار کرنے کی رفتار اور اہلیت کو بڑھایا۔ اس کے باعث بیج بونا اور فصلیں حاصل کرنا ممکن ہوا۔ اگر ہل ایجاد نہ ہوتا تو آج اربوں لوگوں کو خوراک مہیا کرنے میں بہت مشکل پیش آتی اور کچھ ملکوں میں تو یہ کام بالکل ہی ناممکن ہوتا۔

ہل کی ابتداء بہت سادہ انداز میں ہوئی۔ شاید کسی آدمی نے کیاری بنانے کے لیے زمین کھودتے وقت اس کے بارے میں سوچا ہو۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق قدیم ترین ہل کے آثار 4500 ق م میں میتو پوٹیمیا میں ملتے ہیں۔ (موجودہ عراق کا علاقہ)۔

یہ ایک سادہ سا آلہ تھا۔ ایک لمبا سا موٹا ڈنڈا جس کا ایک سرا یعنی پھل تیز دھار والا یا نوکیلا تھا۔ شروع میں انسان خود ہی زور لگا کر ہل چلاتا تھا پھر جانوروں کے ذریعے اسے استعمال کیا جانے لگا کہیں ایک یا دو بیل استعمال ہونے لگے اور کہیں گھوڑے اس طرح انسان تھکن سے نڈھال ہوئے بغیر فصل کے لیے کھیت تیار کرنے کے قابل ہوگیا۔ مصر عراق کی نیم ریتیلی مٹی میں لکڑی کے پھل کارآمد تھے وہاں موسم کم شدید اور خشک تھا، یہ سرد اور گیلے موسم ا... علاقوں میں زیادہ بہتر کارکردگی نہیں دکھا سکتا تھا۔

گھریلو جانوروں مثلاً گائیوں، بیلوں اور گھوڑے کا ا... ضروری ہوگیا۔ چین کے لوگوں نے ہل میں بڑی بہتری کی۔ وہ اپنی دنیا اور ایجادات کے متعلق بڑی رازداری بھی کام لیتے تھے۔ لہٰذا مغربی دنیا کو 300 ق م کے... میں استعمال کیے جارہے اوزاروں کا علم نہ ہوسکا۔ ... دھار پتھروں کو ہل کے پھل کے طور پر لگاتے تھے۔

انجام کار چینیوں نے 600 ق م میں لوہے کا... ایجاد کرلیا۔ مغربی اقوام 500 سال بعد یہ کامیابی حاصل کرسکیں۔ لوہے کا پھل واضح برتری رکھتا تھا۔ ایک تو ا... ترین صورت دی جاسکتی تھی اور دوسرے اس لیے کہ... لکڑی کی نسبت یہ زیادہ اچھی کارکردگی دکھاتا تھا۔

درحقیقت چینیوں نے دو قسم کے پھل بنائے... ایک مکمل لوہے کا اور دوسرا جزواً لکڑی اور جزواً لو... انہوں نے لوہے کو دیگر معدنیات کے ساتھ ملا کر طاقتور اور مضبوط بنالیا تھا۔ قبل ازیں استعمال ہونے... لوہے کے پھل کسی پتھر وغیرہ کے ساتھ ٹکراتے ہی ٹوٹ جاتے تھے۔

ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ زمین میں ہل گزرنے کے بعد ... دوبارہ برابر ہو جایا کرتی تھی اور کسان کو یہ مٹی کیاری ... کے لیے خود نکالنا پڑتی۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے ... نے پھل کو تکونی شکل دی تاکہ مٹی اطراف میں گرے ... کیاری کے اندر۔

ایک اور بہتری، ایسا ہل بنانا تھی جو ہر قسم کی گہرائیوں ... ایڈجسٹ ہوسکے۔ یورپ اور باقی دنیا کو سترہویں صدی ... چینی ہل کے متعلق اس وقت معلوم ہوا جب چین نے اپنی ... گاہیں تجارت کے لیے کھولیں۔ ڈچ تاجر چینی ہل کی ... کے بارے میں معلومات یورپ میں لائے۔ ... ہویں صدی کے دوران شمالی یورپ میں استعمال ... والا معیاری ہل Rotherham کہلاتا تھا۔ ... یہ اس جگہ کا نام تھا جہاں یہ یارک شائر، انگلینڈ میں ... ہوتا تھا۔

آہستہ آہستہ پھل میں بہتریاں پیدا کی گئیں اور یہ ... سے زیادہ موثر ہوتا گیا۔ جدید دور میں لکڑی سے بنا ہل ... ہوگیا ہے اور اس کی جگہ لوہے کے تیز دھار پھل والے ہل ایجاد ہو چکے ہیں جو ٹریکٹرز کے ذریعے زمین کے اندر بہت گہرائی تک چلے جاتے ہیں اور زمین کو زرخیز کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

آگ بجھانے والا آلہ فائر پمپ: آگ ہوا میں موجود آکسیجن اور کسی ایندھن کے درمیان کیمیائی عمل کا نام ہے۔ لکڑی کی آگ آکسیجن لکڑی اور شدید حرارت کا ایک ری ایکشن ہے۔

پہلے سے جلتی ہوئی چیز لکڑی کو بہت گرم کردیتی ہے۔ (100 ڈگری فارن ہائیٹ تک) لکڑی میں شامل سیلولوز کا کیمیائی عمل بگڑ جاتا ہے اور ہائیڈروجن، کاربن ڈائی اوکسائیڈ اور آکسیجن گیسیں خارج ہوتی ہیں۔ جب یہ جلی ہوئی گیسیں مخصوص حد تک گرم ہو جائیں تو مرکب کے مالیکیولز بکھر جاتے ہیں اور ایٹم آکسیجن کے ساتھ دوبارہ مل کر پانی، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دیگر گیسیں بناتے ہیں۔ اوپر اٹھتی ہوئی گیس شعلے کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ کاربن کے ایٹم گرم ہو کر روشن ہو جاتے ہیں اور شعلے کی شکل اختیار کرچکی حرارت ایندھن کو جلتے رہنے میں مدد دیتی ہے۔

جب تک ایندھن اور آکسیجن موجود ہو جلنے کا عمل بھی جاری رہے گا۔

آگ بجھانے .... کے لیے ان تین عناصر میں سے کم ازکم ایک کو ختم کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر آگ کی حرارت ختم کرنے کے لیے اس پر پانی ڈالا جاتا ہے، کوئی موٹا کمبل یا ریت ڈالنے کے ذریعے آکسیجن کو جلنے کے عمل میں شامل ہونے سے روکنا ممکن ہے۔

ایندھن کو ہٹانا زیادہ مشکل کام ہے۔ اگر کسی گھر میں آگ لگی ہو تو وہ گھر ہی ایندھن بن جاتا ہے۔

اکثر آگ بجھانے کا موثر ترین اور عام طریقہ پانی ڈالنا ہی ہے لیکن اگر یہ غیر موزوں صورتِ حال میں استعمال کیا جائے تو نقصان میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ ہم جلتی ہوئی لکڑی، گتے یا کاغذ پر تو پانی ڈال سکتے ہیں مگر بجلی سے لگنے والی آگ پر یا پیٹرول پر لگی آگ پر پانی ڈالنا نہایت خطرناک ہے اور اگر جلتے ہوئے غیر آتش گیر مائع پر پانی ڈالا جائے تو آگ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھتی ہے۔

قدیم روم میں بھی آگ پر قابو پانے والا محکمہ بنایا گیا تھا۔ تقریباً 200 قبل مسیح میں اسکندریہ کے Ctesibius نے پہلا فائر پمپ ایجاد کیا تھا۔ 1666ء میں لندن کو آگ لگی تو اس پر قابو پانے کے لیے کوئی طریقہ

موجود نہ تھا۔ سارا شہر جل کر راکھ ہو گیا۔ اس واقعے نے پہیوں والا پسٹن پمپ ایجاد کرنے کی تحریک دلائی۔

نیویارک نے 1648ء میں فائر انسپکٹرز تعینات کیے جو فائر کوڈ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جرمانہ کرتے تھے۔

بوسٹن نے 1659ء میں پہلا فائر انجن درآمد کیا جب کہ 1743ء میں نیویارک کے تھامس لوٹے نے امریکی فائر انجن بنایا۔

آگ بجھانے والا آلہ 1872ء میں تھامس جے مارٹن نے پیٹنٹ کروایا۔ پھر ایک صدی بعد جولیان نے ایرو فوم بنایا جو گیس اور تیل کی آگ کو بجھا سکتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران امریکی بحریہ کے بہت سے جہاز راں اس آلے کی وجہ سے زندہ بچنے میں کامیاب ہوئے مگر مزے کی بات یہ ہوئی کہ 1950ء میں جولیان کا اپنا نیا گھر آتش دان کی آگ کی وجہ سے جل گیا۔

موجودہ آلے شعلوں کو بجھانے کے لیے کاربن ڈائی آکسائیڈ استعمال کرتے ہیں۔ یہ آس پاس کے ایریا میں موجود آکسیجن کو خارج کرتے ہوئے آگ کا دم گھونٹ دیتے ہیں۔ دھاتی سلینڈر (جس کے اوپر نلکی یا ٹیوب لگی ہوتی ہے) سوڈا اینڈ ایسڈ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے اندر سوڈا اور پانی کے مرکب کے اوپر ایک برتن میں ایسڈ رکھا ہوتا ہے۔ آلے کو الٹا کرنے پر ایسڈ سوڈے کے ساتھ مل کر کاربن ڈائی آکسائیڈ بناتا ہے۔ گیس کا دباؤ مرکب یا محلول کو زور سے ٹیوب کے راستے باہر نکلنے پر مجبور کرتا ہے۔

اس کے علاوہ خالص کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بھی آگ بجھانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اسے سلینڈر کے اندر پریشر کے تحت مائع حالت میں بھر دیا جاتا ہے۔ کھولے جانے پر کاربن گیس پھیل کر آس پاس ایک نئی گیس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ آکسیجن کی نسبت بھاری ہونے کی وجہ سے جلتے ہوئے ایندھن کے آس پاس سے آکسیجن کو پرے دھکیل دیتی ہے۔

عموماً آگ بجھانے والے آلے چھوٹے پیمانے پر لگی آگ کو بجھانے میں ہی موثر ثابت ہوتے ہیں۔ زیادہ اور بڑی آگ کے لیے فائر انجن جیسے بڑے آلے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں تمام بڑی رہائشی و کمرشل عمارتوں میں آگ بجھانے والا آلہ ضرور نظر آئے گا مگر پاکستان جیسے تیسری دنیا کے اور پسماندہ ممالک صرف ا اور حساس عمارتوں میں ہی اس کی ضرورت محسوس کرتے ہ حالانکہ ہر شہری کو آگ بجھانے والے آلے کی ٹریننگ ہو ضروری ہے۔ آئے دن ملک کے مختلف شہروں میں آگ لگنے کے واقعات تیزی سے رونما ہونے لگے ہیں اور گھر میں بھی اکثر آگ بھڑک اٹھنے کی خبریں گردش کرتی رہ ہیں۔ اس آلے کے استعمال سے کسی حد تک آگ پر قابو جا سکتا ہے اور ہر گھر میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا سلنڈ موجود ہونا ضروری ہے۔

ایٹم بم اور ایٹمی ری ایکٹر: بلاشبہ ایٹمی طاقت انسا کے اختیار میں آنے والی عظیم ترین طاقت ہے اور یہ کارنا انجام دینے والے ایزیکو فرمی اور اس کے پارٹنر، لیوسیزیلا نے نیوکلیئر یا ایٹمی ری ایکٹر کی مدد سے کامیابی حاصل تھی۔ انہوں نے یہ کارنامہ یورینیم پر نیوٹران کی بمبا کے سلسلے سے خارج ہونے والی توانائی کو کنٹرول میں لا کے ذریعے انجام دیا۔ انہوں نے 1955ء میں اپنی ا کو پیٹنٹ کروایا مگر پیٹنٹ امریکی حکومت کے نام تھے کیو ایزیکو فرمی اور لیوسزیلا دوسری عالمی جنگ کے دورا امریکی حکومت کی طرف سے ہی کام کر رہے تھے۔

ایزیکو فرمی ستمبر 1901ء میں اٹلی میں پیدا ہوا۔ ابتداء سے ہی ریاضی اور طبیعات میں دلچسپی رکھتا تھا جوان ہونے پر ایک انجینئر کا شاگرد بن گیا۔ ان موضوعا پر اس کی دلچسپی اتنی گہری تھی کہ 1918ء میں ا یونیورسٹی آف پیسا کے شعبہ طبیعات میں پڑھنے کے وظیفہ دیا گیا۔ چار سال بعد اس نے طبیعات میں ڈاکٹر کے ساتھ گریجویشن کر لی۔ وہ روم میں طبیعات اور پھر ا طبیعات کا پروفیسر بنا اور مصنوعی آئسوٹوپ کے کام میں رہا۔ اس میدان میں اس کا کام زبردست تھا کہ 938 میں وہ نوبل انعام یافتہ بنا۔ وہ بیوی کے ہمراہ اپنا نوبل ا وصول کرنے اسٹاک ہوم گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا نے کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں انسٹرکٹر طبیعات کا قبول کر لیا تھا۔ کولمبیا میں ہی فرمی نے سیر بلارڈ اور گریجویٹ اسٹوڈنٹ والٹرزن کے ساتھ مل کر نیوکلیئر فشن تجربات کیے۔

گروپ اس نتیجے پر پہنچا کہ عمل کے دوران نیوٹران ریلیز ہوئے تھے کہ ایک چین ری ایکشن پی سکے۔ یعنی توانائی کا اخراج۔ اسے عسکری لحاظ سے اہ

حامل سمجھا گیا اور مارچ 1939ء میں فرمی نے امریکی بحریہ ے ساتھ اس بارے میں گفتگو کی مگر کوئی نتیجہ خیز بحث نہ ہو ل۔ چندہ ماہ بعد سز بلارڈ نے آئن اسٹائن کو اپنی ٹیم کی تحقیقات کے متعلق بتایا اور سیاسی حلقوں میں کافی اثر رسوخ ے حامل آئن اسٹائن نے صدر فرینکلن روز ویلٹ کو آگاہ یا۔

صدر روز ویلٹ نے دیگر سائنسدانوں کو بھی اس کام ں لگایا اور کولمبیا کو مزید چالیس ہزار ڈالرز کا فنڈ دیا۔ ایک ال بعد امریکا اور ایکسز پاورز (جرمنی، اٹلی، جاپان) کے رمیان رقابتیں پیدا ہونے پر ٹیم نے شکاگو میں ایک تجربہ رنے کا منصوبہ بنایا۔ دو دسمبر 1942ء میں یہ تجربہ شکاگو ینورسٹی میں اسکوائش کورٹ کے اسٹینڈ تلے کیا گیا۔ یہ لیئر فشن کے سلسلے وار ری ایکشن کو کنٹرول کرنے کی پہلی وشش تھی، تجربہ کامیاب رہا۔

آئندہ دو برس کے دوران کام تیزی سے ہوا۔ 1944ء میں آپریشن لاس ایلاموس، نیو میکسیکو میں منتقل کیا گیا جہاں ایک نئی لیبارٹری تعمیر کی گئی تھی اور جے رابرٹ وپن ہائمر اس کا سربراہ تھا۔ فرمی فزکس ڈیپارٹمنٹ کا چیف ن گیا۔

اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ لیبارٹری کا مقصد صرف اور رف ایٹم بم بنانا تھا۔ شدید جنگ کے دوران ٹیم نے بم یار کرنے میں مزید ایک سال اور دو ملین ڈالرز لیے۔ انہوں نے سولہ جولائی 1945ء کی صبح Alamogordo ایئر بیس پر یہ کام مکمل کر لیا۔ اس وقع پر صرف فوجی رہنما اور سائنسدان موجود تھے۔ کامیابی حاصل ہونے کے بعد ٹیم نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر جنگ ں استعمال کے لیے ایٹم بم تیار کر لیے۔ اس کام میں صرف ن ہفتے لگے۔ چھ اگست 1945ء کو پہلے بم نے ناگاساکی (جاپانی شہر) اور چند روز بعد ہیروشیما کو بھی تباہ و برباد یا۔

دو ایٹم بم گرانے کے بعد امریکا نے دوسری عالمی ے کا خاتمہ کر دیا اور امن و خوشحالی کے لیے عالمگیر کوششیں وع ہوئیں۔ ابتداء میں امریکا، یورپ میں شروع ہونے الی جنگ سے لاتعلق رہنے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔ جرمنی دو ممالک کو ہڑپ کرتا جا رہا تھا لیکن تب جاپانیوں نے ت دسمبر 1941ء میں پرل ہاربر پر اچانک حملہ کر دیا اور اہ تر جنوب مشرقی ایشیا، جاپان کے تسلط میں آگیا لیکن جیسا کہ ایک جاپانی جنرل نے کہا۔ ”مجھے خوف ہے کہ ہم نے سوئے ہوئے شیر کو جگا دیا ہے۔“

امریکا نے آہستہ آہستہ بحرالکاہل میں جاپانی مقبوضہ علاقہ واپس لے لیے اور جاپان کو روکا لیکن امریکا کو یقین تھا کہ حقیقی اور بڑھتا ہوا خطرہ جرمنی ہے۔

صدر روز ویلٹ کی قیادت میں امریکا اور برطانیہ نے ایٹم بم بنانے کی خفیہ کوشش شروع کر دی۔

نیو میکسیکو میں برس الاماس جیسے الگ تھلگ مقامات پر جنرل ہیزی، آر، گرووز کی سرکردگی میں شروع ہونے والے پروگرام کے متعلق چند ایک سائنس دانوں اور سیاستدانوں کو ہی علم تھا۔

صدر ہیری ٹرومین کو بھی منصوبے کے متعلق بتاتے وقت اسے اشارتاً مین ہٹن پروجیکٹ کہا گیا۔ مین ہٹن پروگرام کامیاب ہونے کا کسی بھی طرح یقین نہیں تھا۔ کئی تکنیکی مشکلات پیش آئیں اور ماہرین کو علم تھا کہ بم کی تخلیق کا دارومدار ایک غیر مصدقہ تھیوری پر ہی ہے۔

1945ء کے آغاز میں پروجیکٹ پر دو ملین ڈالرز خرچ کیے جا چکے تھے اور دھماکے کے بہترین طریقہ کار کے متعلق شکوک پائے جاتے تھے۔ بم بنائے جانے کے دوران نہ صرف تحفظ ملحوظ خاطر رکھنے بلکہ ساری دنیا کو بھی اس کی خبر نہ ہونے دینے کے لیے زبردست دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔

بم کی تیاری میں اہم ترین عنصر پلوٹونیم کی تیاری تھا، جو فطری حالت میں نہیں ملتی، لیکن وہ یورینیم کی طرح ری ایکشنز کا ایک سلسلہ پیدا کرنے کے قابل ہے۔

ایٹم بم کو کارآمد بنانے والا ری ایکشن Fission کہلاتا ہے۔ فشن کا عمل اس وقت ہوتا ہے جب نیوکلیس (ایٹم کا مرکز) دو برابر حصوں میں پھٹ جائے۔ ایک مرتبہ جب نیوٹران یورینیم کے ایٹم کو توڑ دے تو اس کے ٹکڑے دیگر نیوٹرانز کو توڑتے ہیں اور ان کے ٹکڑے مزید ایٹموں کا، یہ سلسلہ اسی طرح بڑھتا جاتا ہے۔

یہ سلسلہ وار ری ایکشن ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں ہو جاتا ہے اور اس کے دوران خارج ہونے والی توانائی کئی کروڑ وولٹ توانائی جتنی ہوتی ہے۔ فشن کے عمل میں حرارت اور تابکاری کی بہت بڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں اور خارج ہونے والی تابکاری گیس تابکاری کہلاتی ہے۔ یہ انسانوں کے لیے سب سے زیادہ مہلک ہے۔

ناگاساکی اور ہیروشیما پر بمباری میں حصہ لینے والے کئی امریکی فوجی اپنے کیے پر پچھتاوے کا اظہار کر رہے تھے لیکن ایسے فوجی بھی موجود تھے جن کا کہنا تھا کہ یہ کارروائی بالکل درست اور ضروری تھی کیونکہ جاپانیوں نے اور کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔

اینٹ: اینٹ کو غور سے دیکھنے پر اس میں کوئی انوکھی یا قابل غور بات نظر نہیں آتی۔ عموماً مستطیل شکل کے اس بلاک کا سائز ایک ہاتھ سے لے کر اہرام مصر کے دیو قامت بلاک جتنا بھی ہے۔ اینٹوں نے ہماری تعمیراتی تہذیب کی بنیاد رکھی اور دنیا کو حقیقی معنوں میں بنایا۔

اینٹ کی کہانی کا آغاز دجلہ اور فرات کناروں پر تہذیب کے جنم کے ساتھ ہوا۔ حالانکہ یہ جگہ چین، امریکا، یورپ یا دیگر قدیم آبادیوں سے الگ تھلگ تھی۔ دریاؤں میں طغیانی کا پانی اترنے پر موٹی ریت اور گارا ساحل پر ہی رہ جاتی اور دھوپ میں سوکھتی رہتی۔

پوری طرح خشک ہونے پر یہ گارا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جاتا جنہیں کسی بھی مناسب یا مطلوبہ شکل میں تراشا ممکن تھا۔

مثلاً چھوٹے مجسمے، پیالے، اینٹیں وغیرہ۔ آہستہ آہستہ انہی ٹکڑوں کو اوپر نیچے رکھ کر جھونپڑے بنا کر موسمی آفات کے خلاف پناہ گاہ تیار کی گئی۔

4000 ق م کے قدیم میسوپوٹیمیائی شہر شہدار میں ان اینٹوں سے ایک حقیقی محراب بنائی گئی تھی۔ محراب، بذات خود تعمیرات کے ارتقاء کا ایک اہم عنصر ہے جو اینٹ کی وجہ سے ممکن ہوئی۔

اینٹ کو خانے کی شکل دینے اور متعدد خانوں کو اکٹھا کرنے کے ذریعے مستری ہر اینٹ پر عمارت کا مساوی بوجھ ڈالنے کے قابل ہو گیا۔ انسانی اختراع پسندی، طبیعات اور اینٹ کی مضبوطی نے مل کر سادہ دہلیز سے لے کر پلیوں اور پلیوں اور بلند قامت گوتھک گرجا گھروں کی تعمیر کو ممکن بنایا۔

کھانا پکانے اور گھر کو گرم رکھنے کے لیے استعمال ہونے والی انگیٹھیوں نے اینٹ کی ترقی میں اگلے مرحلے کو جنم دیا۔ کچی اینٹیں آگ میں رکھے جانے پر پتھر جیسی سخت اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔

اس قدیم ثقافت کے کمہاروں نے بہت زیادہ حرارت پیدا کرنے کے لیے ایک بھٹی بنائی جس میں وہ اپنے برتن پکاتے تھے۔ بھٹی نے کمہاروں کو کچی مٹی کو پختہ بنانے کا ایک اور زیادہ بہتر طریقہ مہیا کر دیا۔ بھٹی کا درجہ حرارت 1600 اور 2000 ڈگری فارن ہائیٹ کے درمیان رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ جدید مفہوم میں اینٹ بنائے جانے کا آغاز 1500 قبل مسیح میں ہوا۔ دوسری طرف خود بھٹیاں بھی اینٹوں سے ہی بنتی تھیں۔ تاریخ میں اینٹ اور برتن سازی کا ارتقاء ساتھ ساتھ ہوا۔

اینٹ کی تیاری میں اگلے بڑے قدم ٹائیل میں جدید سرامکس تیکنیکیں شامل تھیں جس کی وجہ سے عمارت کو رنگین بنانا ممکن ہو گیا۔ آج بھی کوئی اور میٹریل پختگی اور پائیداری میں اینٹ اور ٹائیل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب اینٹ سازی کا فن دنیا بھر میں پھیلا تو پھر لوگوں نے اپنے اپنے مخصوص میٹریلز، اسٹائل اور تیکنیک استعمال کرنا شروع کر دی۔ اس کام کے لیے استعمال ہونے والی چکنی مٹی تین قسم کی ہوتی ہے۔ سطحی مٹی جو عموماً دریاؤں کے کناروں پر ملتی ہے۔ پرتوں والی مٹی، مثلاً سلیٹ اور گہری زیر زمین کانوں میں سے نکالی جانے والی مٹی جو سب سے زیادہ خالص ہوتی ہے۔ جب یورپ تاریک ادوار سے نکلا اور شہروں میں لوگوں کی آبادی بڑھنے لگی تو لکڑی کے گھروں میں ہر وقت آگ لگنے کے خطرے کو محسوس کیا گیا۔ 1666ء میں لندن کی آتشزدگی تاریخ کا حصہ بن گئی۔

اینٹ کی آگ کے خلاف مدافعت کرنے کی خصوصیت نے ایسے تمام بڑے شہروں کی تعمیر کے لیے ترجیحی میٹریل بنا دیا۔ مشرق میں بڑے بڑے قدیم پختہ قلعے اور دیوار چین، جیسی دیو قامت اور پختہ عمارات ملتی ہیں جو اینٹ سے تعمیر کی گئیں اور سینکڑوں برسوں سے قائم ہیں۔

تیسری صدی قبل مسیح میں پہلے شہنشاہ ہوانگ تی نے 4160 میل لمبی دیوار بنا کر عوام کو حملہ آوروں کے خلاف تحفظ دیا اور دیوار کی پچھلی طرف موجود مختلف صوبوں کو متحد کر کے چین کی صورت دی۔

آخر میں مزے کی بات یہ ہے کہ خلا سے بھی نظر آنے والی عظیم دیوار چین آگ اور دھوپ میں خشک کی گئی اینٹوں سے بنی ہے۔

پاکستان میں بھٹیوں کے علاوہ کروڑوں بھٹے کام کر رہے ہیں جہاں کچی اینٹوں کو سکھا کر سخت کیا جاتا ہے۔ یہ بھٹے کروڑوں غریب مزدوروں کے روزگار کا ذریعہ ہیں۔

کیلیفورنیا سے لے کر شمال مغرب میں پھیلا ہوا راکی ماؤنٹین کا طویل سلسلہ ہے۔ جس میں لاتعداد برف پوش چوٹیاں، اونچے درّے اور سطح مرتفع ہیں۔ یہاں دس ہزار فٹ سے زیادہ کی بلندی پر مستقل برف موجود رہتی ہے اور آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اس کے کچھ حصوں تک انسان رسائی حاصل نہیں کر سکا ہے۔ یہاں نہ صرف جدید آبادگاروں نے بلکہ امریکا کے قدیم باشندوں نے بھی ایسے بڑے جسم، بڑے پیروں اور گھنے بالوں سے ڈھکے جاندار کا ذکر کیا ہے جو بلند پہاڑوں میں رہتا ہے اور کبھی کبھی خوراک کی تلاش میں نیچے آتا ہے۔ جب یورپی آبادگار اس خطے میں پہنچے اور ان کا مقامی لوگوں سے واسطہ پڑا تو انہوں نے آبادگاروں کو اس مخلوق کے بارے میں بتایا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دیوتاؤں جیسی قوت رکھتے ہیں اور کوئی انسان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس وقت آبادگار سمجھے کہ وہ انہیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر جلد وہاں آباد ہونے والوں کو بھی اس مخلوق سے واسطہ پڑا تھا اور انہوں نے بھی اس کی کہانیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ کیونکہ یہ مخلوق بڑے پیمانے پر خطرے کا باعث نہیں بنی تھی اور نہ اس نے آبادگاروں پر حملے کیے۔ وہ مویشی نہیں پالتے تھے بلکہ زمین کاشت کرتے تھے ان کے برعکس مقامی باشندے جانور پالتے تھے اور وہی اس مخلوق کے حملوں کا نشانہ بنتے تھے۔ مقامی باشندے یورپی آبادگاروں کا مقابلہ نہیں کر سکے جو جدید اسلحے سے لیس تھے اور انہوں نے مقامی لوگوں کو طاقت کے بل پر اوپری پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا۔ جہاں وہ بگ فٹ کا زیادہ قریبی نشانہ تھے۔

راکی ماؤنٹین کی اس پُراسرار مخلوق کا حلیہ کچھ اس قسم کا ہے کہ اس کا قد چھ سے نو فٹ تک اور وزن ڈیڑھ سو کلوگرام سے ساڑھے چار سو کلوگرام تک ہو سکتا ہے۔ سر سے پاؤں تک گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا اور بالوں کا رنگ سیاہ، گہرا بھورا اور گیرا سرخی مائل ہوتا ہے جہاں سے جلد نظر آتی ہے وہاں بھی رنگ گہرا اور بعض کا ہلکا ہوتا ہے۔ انسانی پاؤں کے مقابلے میں اس کا پاؤں

پراسرار مخلوق

کاشف زبیر

اس جہانِ رنگ و بو میں ایسے ایسے جاندار سانس لے رہے ہیں جن کے بارے میں ہم مطلق نہیں جانتے۔ نہ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور نہ ان کے بارے میں سنا ہے۔

ایک نامعلوم مخلوق جس نے دہشت پھیلا دی تھی



زیادہ بڑا اور ایڑی کا حصہ زیادہ چوڑا ہوتا ہے۔ چلنے کے دوران یہ ایڑی پر زیادہ زور ڈالتا ہے جس سے ایڑی کا نشان گہرا آتا ہے۔ پاؤں کا تلا ہموار اور پانچوں انگلیاں ایک سائز کی ہیں البتہ انگوٹھا موٹائی میں بڑا ہے۔ مقامی لوگ اسے "جنگلی آدمی" یا "بالوں والا آدمی" کہتے ہیں۔ لیومی قبائل جو ہزاروں سال سے اس خطے میں آباد ہیں وہ اس مخلوق کو "ٹس ایو یکسوا" کہتے ہیں۔ یہ بگ فٹ کا مقامی نام ہے۔ ایک اور نام سیٹیاہ ہے جو کیوی بتا ہے۔ قبائل اس کا نام لینے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر اس کا نام لیا جائے اور وہ سن لے تو نام لینے والے کو اٹھا کر لے جاتا ہے یا مار ڈالتا ہے۔ ایک عیسائی پادری پال کینے نے مقامی قبائل کی ایک قدیم روایت بیان کی۔

ان کے مطابق ایک مخلوق سینٹ ہیلنا کی چوٹی پر رہتی ہے لیکن وہ اسے ایک فطری جانور کے بجائے مافوق الفطرت مخلوق تصور کرتے تھے۔ موجودہ واشنگٹن کے قریب رہنے والے قبائل بھی ایک ایسی دیو قامت انسان نما مخلوق کے بارے میں بتاتے ہیں جو آس پاس کے پہاڑوں پر رہتے تھے اور وہ ندی نالوں میں لگے ماہی گیری کے جالوں سے سالمن مچھلی چرا کر لے جاتے تھے۔ اس مخلوق کا ایک نام "ایک ہی بار سامنا" بھی ہے یعنی جو اس کا سامنا کرتا ہے وہ پھر کسی اور کا یا اسی کا دوبارہ سامنا کرنے کے لیے زندہ نہیں رہتا۔ برٹش کولمبیا میں پائی جانے والی اس پُر اسرار مخلوق کو بگ فٹ سے زیادہ دیو یا درندے کا لقب دیا جاتا تھا کیونکہ یہاں پہاڑی سلسلے نہیں تھے اور بگ فٹ کی کہانیاں زیادہ تر پہاڑی سلسلوں سے متصل ہیں۔

جدید دور کی اوّلین شہادت **1913**ء میں سامنے آئی جب ہنری میٹ نامی شخص نے راکی ماؤنٹین کے ایک حصے ایکلاک میش نامی جگہ کیمپ لگایا۔ اس کا بیان ہے کہ وہ شام کے وقت اپنے بلڈاگ کتے الفا کے ساتھ خیمے کے باہر بیٹھا ہوا بیئر سے شغل کر رہا تھا کہ اس کا بلڈاگ بھونکا اور تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ وہ اس کے پیچھے لپکا تو اس نے دیکھا کہ اس کے خیمے سے کوئی بیس گز کی دوری پر ایک بالوں سے ڈھکا ہوا جاندار دونوں پیروں پر کھڑا ہوا ہے۔ الفا اتنا تیز بھاگا تھا کہ اس کے پیروں کے درمیان سے نکل گیا۔ ہنری اسے ریچھ سمجھا اور پلٹ کر اپنی رائفل لینے بھاگا مگر جب وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جانور دو پیروں پر بھاگتا ہوا اوپر چٹانوں میں غائب ہو رہا تھا اور اس کی رفتار ناقابلِ یقین حد تک تیز تھی۔ الفا اب ساکت اپنی جگہ کھڑا تھا۔ ہنری میٹ نے اس واقعے کو اپنی کتاب میں بیان کیا اور یہ امریکا میں بگ فٹ کے بارے میں اوّلین شہادت تصور کی جاتی ہے۔

1924ء میں کانوں میں کام کرنے والے پانچ مزدوروں کو بالوں سے ڈھکی ایسی مخلوق کے حملے کا سامنا کرنا پڑا جب انہوں نے رات میں ان کے کیبن کو گھیر لیا اور ان پر پتھر برساتے رہے۔ جواب میں وہ ان پر گولیاں برسا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے واقعہ بیان کرنے والے فریڈ بیک اور اس کے چار ساتھی اس حملے میں محفوظ رہے اور جب وہ اگلی صبح کیبن سے باہر آئے تو انہوں نے جا بہ جا خون اور سرخی مائل لمبے بال بکھرے پائے۔ خون ان کی گولیوں سے زخمی ہونے والے جانوروں کا تھا۔ بعد میں اس جگہ کو ایپ مین کی گھاٹی کا نام دیا گیا۔ فریڈ کا کہنا ہے کہ ایپ مین سات اور آٹھ فٹ طویل تھے۔ ان کے جسم گھنے بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور وہ دونوں پیروں پر انسانوں کی طرح چل رہے تھے۔ وہ اتنے طاقتور تھے کہ دس سے بیس کلوگرام کے پتھر اٹھا کر ان کے کیبن پر مار رہے تھے۔ اگر وہ بہت موٹے تنوں سے نہ بنا ہوتا تو اس سنگ باری کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

1941ء میں برٹش کولمبیا میں ایک ریڈ انڈین خاندان کو دیو قامت مخلوق کے حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ رات کے وقت ساڑھے آٹھ فٹ لمبا اور بہت بڑا جانور ان کے گھر تک آیا تو وہ لوگ وہاں سے نکل بھاگے جب وہ واپس آئے تو ان کے گھر کا دروازہ اور شیڈ ٹوٹا ہوا تھا۔ مچھلیاں سکھانے والا ایک ٹب بھی ٹوٹا پایا گیا اور اس میں نمک لگی مچھلیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ پہلی رات کے بعد وہ جانور لگاتار پورے ہفتے ان کے گھر کا دورہ کرتا رہا اور انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ یہاں سے چلے جائیں اس سے پہلے کہ انہیں جانی نقصان بھی اٹھانا پڑے۔ ایسی لاتعداد شہادتیں اور داستانیں راکی ماؤنٹین کے قرب و جوار میں بکھری ہوئی ہیں۔ ہمالیہ اور روسی خطے کے بر عکس یہاں کئی فوٹیجز اور ویڈیوز بھی سامنے آئی ہیں جن میں نظر آنے والا جانور بگ فٹ قرار دیا جا رہا ہے مگر ماہرین کے نزدیک یہ شہادتیں ناکافی ہیں۔ جب تک ایسی کوئی مخلوق زندہ یا مردہ حالت میں سامنے نہ آئے اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے۔ شاید آنے والا... وقت اس حقیقت سے پردہ اٹھا سکے جو فی الحال دنیا کے چند پُر اسرار ترین موضوعات میں سے ایک ہے۔



بیت بازی

قارئین

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

نیلوفر شاہین..........اسلام آباد

وہ یوں گئے کہ یاد یہیں ان کی رہ گئی
اک داغ رہ گیا مہہ کامل نہیں رہا

(ادیب الغنی شکیل ملتان کا جواب)

عبدالستار..........ساہیوال

وہ کون سا عقدہ ہے کہ وا ہو نہیں سکتا
کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

فلک بنت عبدالندیم..........حیدرآباد

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

(عبدالجبار حیدرآباد کا جواب)

غضنفر عباس مرزا..........اسلام آباد

ہمیں کیا کہ مرقد پہ میلے رہیں گے
تہ خاک تو ہم اکیلے رہیں گے

آفتاب احمد عطاری..........سرگودھا

ہر سو پھیلی تھی گھٹن شہرِ سخن میں عارفؔ
جب میں آیا تھا یہاں تازہ ہوائیں لے کر

(نزہت بٹ لاہور کا جواب)

ساجدہ پروین ڈوگر..........کمالیہ

روشنی جس کے پسینے سے جنم لیتی ہے حکمرانو
وہی مزدور اجالے کو ترستا کیوں ہے

(محمد معیز لاہور کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری..........ملیر کراچی

یہ سلوٹیں نہیں ہیں جبیں کی اٹھان پر
لمحے نقوش چھوڑ گئے ہیں چٹان پر

احمد جان..........لاہور

یہ کہہ کر کاٹ دیں زبانیں اہلِ دانش نے
نہ ہو مصرف کسی شے کا تو وہ بیکار ہوتی ہے

(امیر حمزہ اشرف ملتان کا جواب)

منشی عزیز مے..........وہاڑی

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ ہم نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

مسز اشفاق احمد..........کراچی

اب خوشی دے کے آزما لے مجھے
ان غموں سے تو میں نہیں مرتی

(نیاز احمد کراچی کا جواب)

محمد ظفر اللہ ضیاء..........کمالیہ

تھکا دیا اسے آندھیوں نے مل جل کے
وہ اک پرندہ جو اونچی اڑان رکھتا تھا

افشاں بتول..........ساہیوال

ترتیب تو نے دی ہیں یہ سبب خود اداسیاں
اب جان پہ بن آئی ہے حیران ہو کس لیے

(سید عباس شاہ سکھر کا جواب)

شبیر شاہ..........گڈو بیراج

یہ محبت بھی کیا روگ ہے فرازؔ
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا

جمیل اختر..........جھنگ

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

(نزاہت افشاں مہورہ کا جواب)

عبدالحکیم شمر..........کراچی

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

محمد عقیل چٹھہ..........حافظ آباد

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

(نزہت علی کا جواب)

ایم افضل کھرل............ننکانہ صاحب

کبھی ارادہ ہو چھوڑ جانے کا تو پہلے خبر کرنا
اچانک حادثے بے موت مار جاتے ہیں

(نازیہ حمید نوشہرہ کا جواب)

نازنین مجید............اسلام آباد

وہ بے خواب آنکھوں کا سحر محبت
وہ بے تاب دل کا فسوں شاعرانہ

(نثار محمد خان ڈی آئی خان کا جواب)

عطاالجلیل............واہ کینٹ

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے ناامیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

سرور علی خاں............پشاور

بغاوتوں کے طبل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جواں مشعلیں جلائے ہوئے

(جاوید صدیقی کراچی کا جواب)

محمد یاسین اندوری............حیدرآباد

سورج چڑھا تو پھر بھی وہی لوگ زد میں ہیں
شب بھر جو انتظارِ سحر دیکھتے رہے

فرحانہ سعید قاسمی............ڈالوال چکوال

سحر کا حسن ہے کیا رات کا عذاب ہے کیا
بدن نہ ہو تو گناہ کیا ہے اور ثواب ہے کیا

نواب علی............کراچی

جو گھر سے اوڑھ کے نکلے تھے موم کی چادر
پتا چلا انہیں رستے میں آفتاب ہے کیا

(کلثوم ارشاد حسین اسلام آباد کا جواب)

عابد علی عطاری............میرپور خاص

روانہ خود تلاشی کی مہم پہ کیجیے ہم کو
ہم اپنی چاہتے ہیں بازیابی یارسول اللہؐ

(شکیلہ صنم حویلی لاکھاں کا جواب)

اشعر ناز............راولپنڈی

وہ بے خواب آنکھوں کا سحر محبت
وہ بے تاب دل کا فسوں شاعرانہ

(اسد علی شیخوپورہ کا جواب)

نزاہت افشاں............مہورہ فتح جنگ

ترکِ اُلفت سے کیا ہوا حاصل؟
تب بھی مرتا تھا، اب بھی مرتا ہوں

عابد علی............راولپنڈی

ابھی اک فیصلہ ہونا ہے باقی
ابھی میرا بیاں رکھا ہوا ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے) 113

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

قسط نمبر: 19

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

راکا اسے پستول کے زور پر ایک کمرے میں لے گیا اور پوچھنے لگا کہ میرا ساتھی جب فون پر بات کر رہا تھا تو تم چھپ کر کیوں سن رہے تھے، "بٹوی نے کہا کہ سن نہیں رہا تھا بلکہ فون خالی ہونے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ فون کر کے مسٹر او برائے گرانٹ کو بتا سکوں۔ یہ نام سن کر راکا ٹھنڈا پڑ گیا

اور نومی وہاں سے باہر نکل آیا۔ باہر اس کی ملاقات اسی ٹیکسی ڈرائیور سے ہوئی اس نے بہرام خان کی بیوی سے ملاقات کرادی تب نومی کو پتا چلا کہ تمام ثبوت بہرام خان کی بیوی نے پولیس کو دے دیے ہیں۔ وہاں سے وہ اپنے ہوٹل کے لیے چل پڑا۔ راستے میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک شاندار کار میں تعاقب کررہا ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اس نے کھڑکی سے نیچے دیکھا تو وہ بندہ کار سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہورہا تھا۔ نومی واپس آکر بیڈ پر بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

اب آگے پڑھیں

میں بری طرح ٹھٹکا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ اس دیدہ دلیری سے میرے کمرے میں آکر دروازے پر دستک بھی دے سکتا ہے۔ شاید میں بھول رہا تھا۔ یہ ان کا ہی علاقہ تھا۔ کسی خطرے کو بالکل قریب محسوس کرکے یکلخت میرے اعصاب تن گئے تھے۔ فاران نے صحیح کہا تھا کہ مجھے یہاں اب غایت درجے کی احتیاط کی ضرورت تھی۔

میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ تھا۔ ایک چاقو تک نہیں مگر دماغ تو تھا۔ میں ابھی یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ دوبارہ دستک ہوئی۔ دستک دینے کے انداز میں کوئی عجلت نہیں تھی۔ میں دھڑکتے دل سے آگے بڑھا اور دروازے کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”کون؟“

”مسٹر نعمان ! دروازہ کھولیے میں ہوں واجد۔“ باہر سے آواز ابھری۔ لہجہ عربی تھا، مگر زبان ٹوٹی پھوٹی انگریزی کی۔ عجیب کھچڑی سی بن گئی تھی بولی کی بھی۔

”کون واجد؟“ میں نے بھویں سکیڑلیں۔ ”میں تو کسی واجد کو نہیں جانتا۔“

”آپ واقعی مجھے نہیں جانتے محمود الحسن صاحب نے بھیجا ہے مجھے آپ کے پاس، وہی، جن سے آپ ملنا چاہتے ہیں۔“

میں بری طرح چونک پڑا لیکن پھر بھی سوچا کہ کہیں یہ کوئی چالاکی نہ ہو، میں نے جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا، یہ وہی کالا عربی تھا اور نہتا بھی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے جواب دیتے ہوئے غور سے اس کا جائزہ لیا پھر اندر آنے کا بھی راستہ دے دیا۔ میں بہت محتاط تھا۔

وہ اندر آکر سیدھا ایک کرسی پر براجمان ہوگیا۔ میں ابھی تک دروازے پر ہی کھڑا تھا اور احتیاطاً ایک بار پھر ادھر اُدھر کا جائزہ بھی لیا کہ کہیں اس کا کوئی ساتھی نہ چھپا ہو۔

”اندر آجایئے جناب ! کیا اب بھی مجھ پر یقین نہیں آیا؟“ وہ بولا۔ میں دروازہ بند کرکے اس کی جانب پلٹا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”میں کئی گھنٹوں سے آپ کے انتظار میں وہاں دفتر کے سٹنگ روم میں بیٹھا تھا۔“

”میں کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔“ میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ”نہ یہ کہ بھلا محمود الحسن کو کیسے علم ہوا میرے بارے میں؟ یوں بھی وہ تو ابوظہبی گئے ہوئے ہیں اور پھر تم کس لیے میرے منتظر بیٹھے رہے؟ کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں دفتر کی طرف ہی آؤں گا؟“

”آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔“ وہ بولا۔ ”آپ بیٹھ تو جایئے آرام سے۔“

”نہیں...... میں ایسے ہی ٹھیک ہوں اور آپ برائے مہربانی اب یہاں سے تشریف لے جائیں۔ میں کل خود ہی ان سے مل لوں گا۔“

”وہ کہیں بھی نہیں گئے ہیں۔ آپ ہی کے منتظر ہیں اور یہ بھی بتادوں، وہ آپ سے اس طرح کبھی بھی نہیں مل سکتے۔“

”کیا انہوں نے منع کر رکھا ہے؟“

”ہاں!“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ آپ کی وجہ سے دشمنوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتے۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں، میں تو ایک عام سی کاروباری میٹنگ میں آیا تھا۔“

”ٹھیک ہے آپ کی بات...... مگر آپ ابھی یہاں سے ہیں۔“ وہ جیسے پینترا بدل کر بولا۔ ”اتنی جلدی یہاں کے حالات آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔“

میں تھوڑی دیر سوچتا رہا کہ اس کے ساتھ بے وقوفوں کی طرح چل دوں یا نہیں۔

تب ہی میں نے ایک حتمی فیصلہ کرلیا اور چہرے پر ناگواری طاری کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے کھول کر میں نے کالے عربی سے کہا۔ ”آپ اب جا سکتے ہیں۔ مسٹر محمود اگر مجھ سے نہیں ملنا چاہیں تو نہ سہی۔ مجھے بھی ان کی پروا نہیں۔“

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر میرے ناگوار تیور اور چہرے

طبیعت گھمبیرتا دیکھ کر بالآخر اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے آخری کوشش کے طور پر کہنا چاہا۔

”دیکھیے مسٹر......!“

”پلیز!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرکے چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کردیا پھر دوبارہ کھڑکی کی طرف آیا۔ جھری سے باہر جھانکتا رہا۔ ذرا سی دیر بعد میں نے اسے اپنی کار میں سوار ہوتے اور جاتے دیکھا۔

میں ایک گہری سانس خارج کرکے اپنے بستر پر آ بیٹھا۔

یہ جھوٹ تھا یا سچ، میں نے اس میں دماغ کھپانا ضروری نہیں سمجھا، احتیاط ہر حال میں لازمی تھی اور اس خطرناک علاقے میں یہی وتیرہ اپنائے رکھنے کا میں نے پختہ ارادہ بھی کر رکھا تھا۔

گلنارا کی مہربانی سے میرے پاس اچھے خاصے بیلنس کے ساتھ سیل فون موجود تھا، میں نے سب سے پہلے رانا بشیر سے رابطہ کرنا ضروری سمجھا، دوسرا ضروری فون مجھے زُنیرہ کو کرنا تھا۔ اس سے میں نے کالیا اور فہیم کی خیریت پوچھنی تھی، لیکن ابھی زنیرہ سے رابطہ کرنا شاید قبل از وقت ہوتا۔ کیونکہ ان کی تو دو دن بعد کی فلائٹ تھی دبئی کی۔ وہ پہلے وہاں پہنچتا اور پھر اپنے کسی کونفیڈنٹ نمبر کا بندوبست کرکے وہ زنیرہ کو پہنچاتا، اس میں ابھی کچھ دن مزید لگنا تھے، کالیا نے ہی مجھے فوزیہ کا بھی حال و احوال دینا تھا۔ جبکہ رانا بشیر سے تو مجھے فوری رابطہ کرنا ہی تھا۔ لہٰذا میں رانا بشیر کے سیل نمبر پنچ کرنے لگا۔

پہلی اور دوسری بار میں رابطہ ممکن نہ ہوسکا لیکن تیسری بار بیل جانے لگی، اس کے بعد ان کی آواز اُبھری۔

”ہیلو، انکل! میں بول رہا ہوں، نعمان، بحرین سے۔“

”ارے بیٹا! تم...... بب...... بتاؤ کیسے ہو؟ خیریت سے پہنچ گئے ناں......؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“ وہ ایک دم بولے۔

”مسئلے تو بہت ہوئے مگر اللہ کا بھی کرم رہا۔ ایک ضروری اطلاع دینی تھی آپ کو۔“

”ہاں...... ہاں کہو۔“

”آپ نے مجھے بہرام خان نامی جس آدمی سے ملنے کی تاکید کی تھی وہ میرے بحرین (مناما) ائرپورٹ پر اُترنے سے دو گھنٹے پہلے قتل ہوچکے تھے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ میں کس سے ملاقات کروں اب باقی یہاں کی سیاست بہت خراب چل رہی ہے۔ میں خود بھی اس کی زد میں آتے آتے بچا ہوں۔ یہاں اگر آپ کا کوئی اور آدمی جان پہچان کا ہے تو بتائیں تاکہ میں اپنا مشن آسانی کے ساتھ آگے بڑھا سکوں۔“

وہ میری باتیں سن کر ایک دم چپ ہورہے۔ خاصی دیر تک جیسے وہ کسی شاک کی کیفیت سے گزرتے رہے۔ پھر ان کی آواز ابھری تو بہت افسردہ اور تھکی تھکی سی تھی۔ بولے۔ ”بیٹا! یہ تو...... واقعی بہت برا ہوگیا۔ مجھے احساس ہے کہ وہاں تمہارے ساتھ کس طرح کے حالات بیت سکتے ہیں۔ چند ایک اور جاننے والے تو ہیں لیکن ان میں قابلِ اعتبار کوئی نہیں ہے، ایک بے چارہ بہرام خان ہی تھا مگر......“

”بس! یہی مجھے پوچھنا تھا، میں پھر آپ سے رابطہ کروں گا، میرا یہ نمبر نوٹ کرلیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنے طور پر کام کرکے دیکھتا ہوں۔“

”ٹھہ...... ٹھہرو بیٹا!“ وہ ایک دم تفکر آمیز بے چینی سے بولے۔ ”ی ی...... یہ تو بتادو کہ فرحانہ کا کچھ پتا چلا؟“

”ابھی نہیں لیکن مجھے اُمید ہے، میں جلد اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ باقی تو خیریت ہے ناں؟“ میں نے کسی خیال کے تحت آخر میں پوچھا۔

”خیریت ہی تو نہیں ہے ناں بیٹا!“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”شاہ میر کا فون آیا تھا۔“ اس نے کہا اور میں دھڑک گیا۔ ”سخت غصے میں تھا، کہہ رہا تھا، نعمان اور کالیا سے کوئی رابطہ نہیں ہو پارہا اس کا، وہ اپنے بیٹے ثمیر سے بات کرنا چاہتا ہے، اس نے دو دنوں کی مہلت دی ہے ورنہ وہ یہی سمجھے گا کہ اس کے بیٹے کو ہلاک کردیا گیا ہے اور پھر تمہاری بیٹی کی بھی خیر نہیں، میں اسے زندہ رکھ کر موت سے بدتر سزا دوں گا۔ میری بیٹی کو بچالو بیٹا! اس خونی شیطان سے بچالو۔“ وہ رو پڑے۔

میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔ ”آپ نے میرے اور کالیا کے بارے میں کیا بتایا؟“

”یہی کہ تم دونوں اچانک غائب ہوگئے ہو۔“

”بالکل ٹھیک جواب دیا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ بالکل فکر نہ کریں۔ شاہ میر کو اب تک پتا چل چکا ہوگا کہ میں کہاں ہوں، بعد میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ خدا حافظ!“ یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کردیا۔ میں چشم تصور میں شاہ میر کو بے بسی اور طیش کے مارے اپنے بال نوچتے دیکھ رہا تھا لیکن یہاں

تشویش اور تفکر کی بات میرے لیے بھی کم نہ تھی۔ اس کا اپنے بیٹے کے لیے یہ سمجھنا کہ وہ دنیا میں اب نہیں رہا کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا اور یہ سمجھنا بھی کہ وہ اپنے بیٹے کو مردہ سمجھتے ہوئے اس کا انتقام فرحانہ سے لے گا، جبکہ بقول کالیا کہ پھر...... رانا بشیر، شمیر کے قتل کا الزام ہم پر تھوکنے میں زیادہ دیر نہیں لگائے گا۔

میں خود کو ایکا ایکی دہری اور تہری پریشانیوں میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ فرحانہ کی تلاش تو مجھے ہنوز دلی دور است والی محسوس ہونے لگی تھی، جبکہ ابھی تو میں گلفو آئل کمپنی کے کسی ذمے دار افسر سے بھی ملاقات نہ کر سکا تھا۔

بہرام خان قتل نہ ہوتا تو وہ میرے لیے کافی حد تک اس گھمبیر مسئلے میں سود مند ثابت ہو سکتا تھا اور کچھ نہیں تو کم از کم بن رائد اور شاہ میر اصل خفیہ ٹھکانوں کا ہی بتا دیتا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ محمود الحسن سے میری ملاقات کس حد تک ممکن ہو سکتی تھی، نیز میں اس سے کتنا استفادہ کر سکتا تھا۔

مجھے نیند آنے لگی تھی۔ کمرے میں کھانا لانے کا کچھ خاص بندوبست نہ تھا، منگوایا بھی جاتا تو کافی دیر سے لایا جاتا، لہٰذا میں نے نیچے ہی ہال میں جا کر فرشی نشست میں رات کا کھانا کھایا اور دوبارہ اُوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں دن سے ہی بھوکا تھا اسی لیے کھانا بھی ڈٹ کر کھایا تھا۔ اسی سبب مجھ پر نیند سوار ہونے لگی۔ تھکا ہوا تو میں پہلے ہی تھا پھر بھی بستر پر جانے سے پہلے میں نے کھڑکی کا رخ کیا۔

وہ کھلی ہوئی تھی اور صحرا کی طرف سے کچھ ٹھنڈی ہوا آنے لگی تھی۔ صحرا کا مزاج ایسا ہی ہوتا ہے، دن میں باپ کی شفقت کی طرح گرم جوش اور رات میں ماں کی ممتا جیسا لطیف اور ٹھنڈا۔

کھڑکی سے باہر دور تک آسمان نظر آتا تھا۔ ننھے منے تارے ٹمٹمارہے تھے۔ چھوٹے بڑے ٹیلوں کے ہیولے، چاند کی طلسماتی روشنی میں پُراسرار ہیولوں کی مانند نظر آتے تھے۔ صحرا میں رات بہت دھندلی اور اُداس اُداس سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے کیفی کا سماں تھا اُدھر۔

میں نے باہر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اپنے بستر پر آ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تھا، پیٹ بھی بھر گیا تھا، ہوا بھی خوب تھی، نیند نے جلد ہی آلیا۔

☆......☆

اگلے دن بہ خیر و عافیت آنکھ کھلنے پر میں اللہ کا شکر بجا لایا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ ہر قدم پر ہی نہیں بلکہ اب تو ہر لمحہ پُرخطرہ محسوس ہوتا تھا۔ کبھی تو مجھے احساس ہوتا کہ شاید میں نے یہاں آتے ہی کچھ زیادہ ہی جلد بازی سے کام لیا ہے اور دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا لیا پھر سوچتا جن حالات میں یہاں آیا تھا وہ پہلے ہی کب میرے لیے موافق تھے۔

میں ایک جماہی لیتا بستر پر اُٹھ بیٹھا۔ کھلی کھڑکی سے دھوپ کی تیز کرنیں اندر پڑ رہی تھیں اور صحرا کی طرف سے آنے والی بادِ سموم سے کمرا گرم ہو رہا تھا۔ بڑی خشک قسم کی گرمی تھی۔ میں نے وقت دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ لگتا یوں تھا جیسے سورج ابھی سے ہی نصف النہار پر آگیا ہو۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتے کو دل نہیں کیا میں نے صرف ایک کپ چائے منگوا کر پی اور فاران کا پوچھا۔ پتا چلا وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا، میں سمجھ گیا اسے شہر میں دیر ہوگئی تھی اور وہ وہیں ڈیرا ڈال بیٹھا تھا۔

میں کارواں سرائے سے باہر آیا تو لو کے گرم تھپیڑوں نے میرا استقبال کیا۔ دھوپ ابھی سے ہی تیز محسوس ہوتی تھی۔ اس میں حدت آگئی تھی۔ چہرہ تک جھلس رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی یا بس وغیرہ کے انتظار میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی، کوئی آثار نظر نہ آئے۔

ناچار مجھے دھوپ میں جھلستے رہنا تھا سو کھڑا رہا انتظار میں تب ہی میں نے شہر کی طرف سے آنے والی ایک بس کو ریت کے بادل اُڑاتے آتے دیکھا۔ میں نے فوراً ہاتھ کا اشارہ دے دیا۔ بس قریب آئی تو میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ یہ لگژری بس نہیں تھی بلکہ دور دراز کے مضافاتی گاؤں دیہاتوں میں چلنے والی ''لاری'' ٹائپ مسافر بس تھی۔ بہرکیف اس وقت یہ بھی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم تو نہ تھی، میں اس میں سوار ہوگیا۔

اس لاری نے یہ احسان کیا کہ آدھے گھنٹے کا سفر ایک گھنٹے میں طے کیا اور میں نے اپنی منزل پہ پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔

کیمپ تھری کے دفاتر کی عظیم الشان عمارت میرے سامنے تھی۔ میں گیٹ کی طرف بڑھا۔ اب وہاں سب ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ گیٹ پر ہی سیکیورٹی والوں میں مجھے روک لیا اور جب میں نے اپنا مقصد بتایا تو میں حیران رہ گیا۔ حالانکہ مجھے ایسی ''آسانی'' اور ایسے استقبال کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔ سیکیورٹی والے میرا نام اور غایت جان کر ایک دم یوں الرٹ ہوگئے جیسے میں ان کا کوئی بڑا افسر تھا۔

مجھے فوراً اندر لے جایا گیا۔ اندر سینٹرل اے سی کی ٹھنڈک میں، میں نے سکون کا سانس لیا۔

سٹنگ روم سے ہوتے ہوئے ہم ایک راہداری میں چلنے لگے۔ وہ مجھے محمود الحسن کے پاس لے جا رہے تھے اور میں دھکڑ پکڑ کرتے ذہن سے یہ سوچ رہا تھا کہ کیا محمود الحسن واقعی اب تک مجھ سے غائبانہ ہی سہی، آشنا ہو چکا تھا اور خود بھی مجھ سے ملنے کے لیے بے چینی سے متمنی تھا؟ اور کیا...... اس کا رات میں وہ بھیجا ہوا فرستادہ عرب باشندہ اسی کا ہی آدمی تھا؟

طویل راہداری سے گزرنے کے بعد دائیں جانب مڑے۔ بائیں ہاتھ پر ایک کمرا تھا۔ اس پر ایک تختی چسپاں تھی۔ جس میں اُوپر عربی میں اور نیچے انگریزی میں محمود الحسن لکھا ہوا تھا۔

''آپ بغیر دستک دیے اندر تشریف لے جا سکتے ہیں۔''

دونوں اہلکاروں میں سے ایک نے کہا اور پھر واپس مڑ گئے۔

نجانے کیوں مجھے ایکا ایکی عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ بہرکیف، میں نے دروازہ آہستہ سے اندر کی جانب دھکیلا اور جیسے ہی ایک قدم اندر رکھا، سامنے نگاہ پڑتے ہی مجھے بری طرح چونکنا پڑا۔

میرے چونکنے کی وجہ بڑی معقول تھی۔

وہاں کُل پانچ افراد موجود تھے۔ جن میں سے بھی افراد میرے شناسا تھے۔ ایک راکا تھا اور دوسرا اس کا وہی گرانڈیل ساتھی۔ تیسرا ابن رائد تھا اور چوتھا میرا ازلی دشمن شاہ میر۔

ان سب کو بیک وقت وہاں ایک ساتھ موجود پا کر پل کے پل مجھے ایسا لگا جیسے کوئی فلمی داستان اپنے کلائمکس پر ہو۔

جبکہ پانچویں کے بارے میں میرا اندازہ ہی تھا کہ وہ محمود الحسن ہی ہو سکتا تھا۔ وہ ایک بھاری جسامت اور گندمی رنگت کا آدمی تھا۔ عربی ہی نظر آتا تھا۔ اس نے سفید لبادہ پہن رکھا تھا۔ سر پہ عربوں والا صافہ بندھا ہوا تھا۔ چہرہ بھی چربیلا سا تھا۔ آنکھوں پہ نفیس فریم والا نظر کا چشمہ تھا۔ آنکھیں اس کی چھوٹی تھیں۔ وہ اپنے سامنے ایک بڑی سی جہازی سائز کی آبنوسی رنگت والی میز پھیلائے ایک بھاری بھرکم اور قدرے اُونچی ریوالونگ چیئر پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان تھا۔

اسے عربی لباس میں دیکھ کر مجھے تھوڑا سا کھٹکا ہوا تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق وہ ایک ایرانی باشندہ تھا۔

اس کے سامنے کی دو کرسیاں خالی تھیں۔ دائیں بائیں اطراف پڑی کرسیوں پر وہ چاروں حیوانِ خبیث بیٹھے تھے، وہ سب میری طرف گھورنے کے انداز میں دیکھ رہے تھے۔

متوقع شخصیت محمود الحسن کے سیدھے ہاتھ والی دو کرسیوں پر شاہ میر اور بن رائد، جبکہ بائیں ہاتھ پر دھری دو کرسیاں راکا اور اس کے گرانڈیل ساتھی کے ناپاک بوجھ اُٹھائے ہوئے تھیں۔

ایک لمحہ کو میرا جی چاہا تھا کہ اسی وقت اُلٹے پاؤں واپس پلٹ جاؤں، میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ان چاروں کی یہاں موجودگی ''پلانڈ'' تھی یا یہ محض کوئی اتفاق تھا؟

کم از کم اس وقت میرے جانی دشمنوں کا پورا ٹولہ ہی وہاں موجود تھا۔ مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ میرے یہ چاروں دشمن مجھے دیکھتے ہی مجھ پر جھپٹ پڑیں گے۔

بہرطور میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور ذرا بھی چونکنے پن کا اظہار کیے بغیر اور ان چاروں کو نظرانداز کرتے ہوئے سیدھا میز کی جانب بڑھا۔ میری نظریں فقط سامنے بیٹھے محمود الحسن کے چہرے پر جمی رہی تھیں۔

اس کے چہرے پر سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ ایک کاروباری متانت تھی یا پھر رُکھائی کہ اس نے اپنے چہرے پر ایک ذرا سی خیر مقدمی مسکراہٹ تک بھی لانا گوارا نہ کیا تھا، مجھ سے مصافحہ بھی اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے البتہ قدرے خم ہو کر ضرور کیا تھا اس کے بعد مجھے اپنے سامنے والی کرسی سنبھالنے کا اشارہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس پچپن کے آس پاس ہونی چاہیے تھی۔

کرسی سنبھالنے تک میرے تیزی سے سوچتے ذہن میں کل رات سرائے میں آنے والے اس کالے عربی کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

مختصر رسمی کلمات کے بعد کاروباری گفتگو کا آغاز ہوا اور معاہدے کا اعادہ کیا گیا لیکن اس کے روکھے رویے اور باتوں سے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مجھ سے ہی نہیں اس معاہدے سے بھی جان چھڑانا چاہ رہا ہو۔

''مسٹر نعمان احمد!'' آخر میں محمود الحسن نے کہا۔ ''حتمی پیمنٹ کی ادائیگی کے فیصلے کے لیے آپ کو دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے اس پیمنٹ کے بعد معاہدہ بھی ہمیں ختم کرنا پڑے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ مسٹر محمود؟'' میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

''ہم نے دیگر کمپنیوں سے بھی کوٹیشنز لی ہیں، باقی کی مشینری کی سپلائی کا ٹھیکا انہی میں سے کسی ایک کا انتخاب

کر کے انہیں دیا جائے گا۔"

میں نے دیکھا یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے اردگرد ڈیرہ ڈالے بیٹھے ان چاروں کی طرف بھی کن انکھیوں سے دیکھا تھا، بل کے پل مجھے احساس ہوا کہ ماحول میں ایک نامعلوم سی کھنچاؤ کی کیفیت تھی اور محمود الحسن جو بات مجھ سے (یا ان چاروں کے سامنے) کرنا چاہتا تھا وہ کر چکا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے میری جانب فوراً رخصتی کے لیے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔ صورتِ حال کا ادراک مجھے بھی ایک قیافہ شناسی کی حد تک ہی ہوا تھا تاہم میں نے بھی مصافحہ کر کے اس سے رخصت ہو جانا ہی مناسب سمجھا اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

یوں میں نے دیکھا دیکھی صرف بن رائد اور شاہ میر کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھا تھا، وہ کچھ بے چین سے دکھائی دے رہے تھے اور بار بار محمود کا چہرہ تکے جاتے تھے۔

میں باہر نکل آیا۔

کیسی عجیب بات تھی۔ شاہ میر، بن رائد اور راکا جیسے میرے دشمن وہاں موجود تھے اور ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے خلاف کچھ کرنے سے معذور رہے تھے، حتیٰ کہ ایک جملے کا بھی تبادلہ ہمارے درمیان نہیں ہوا تھا، کم از کم شاہ میر اور راکا تو میرا جانی دشمن تھا۔ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ یہ چاروں مجھے گھور گھور کر دیکھتے رہے تھے۔ ہم لوگوں کی ایک ہی دلی کیفیات تھی۔ یعنی بے بسی...... اور غیظ و غضب۔

میں ایک دباؤ کی سی کیفیات میں اس کے شاہانہ آفس سے باہر نکلا اور میری سمجھ میں نہ آسکا آخر میں اپنے اردگرد جو اسراریت سی محسوس کر رہا تھا اس کی وجہ کیا تھی؟ آفس کی عمارت سے باہر آتے ہی میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات ہونے لگی تھیں۔ میرے دونوں ازلی دشمن اندر موجود تھے۔ ایک طرح سے ہم تینوں ہی روبرو تھے۔

ناچار میں گیٹ کی طرف بڑھا اور دفتری عمارت (کیمپ تھری) کے احاطے سے باہر آگیا۔

گرمی تو الحفیظ الامان ...... اس قدر پڑ رہی تھی کہ میرا جسم اے سی والے کمرے سے نکلتے ہی پسینے میں شرابور ہو گیا اور تیز دھوپ کی تمازت کے ساتھ گرم ہواؤں کے تھپیڑوں میں اُڑتی ریت نے مزید میرا برا حال کر کے رکھ دیا۔

لیکن میرے دل و دماغ میں اس سے زیادہ ہلچل مچی ہوئی تھی۔ شاہ میر اور بن رائد اندر موجود تھے اور ایسے میں دیکھنا یہ تھا کہ میں اس وقت ان کے خلاف کیا کر سکتا تھا؟ کیا یہ میرے لیے ایک سنہری موقع تھا؟ میں نے خود سے سوال کیا؟ شاہ میر اور بن رائد اندر موجود تھے۔ آفس کے باہر اور کیمپ تھری کے وسیع و عریض احاطے میں دو شاندار جیپ ٹائپ انٹر کولر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کیا میں شاہ میر یا بن رائد کے باہر نکلتے ہی ان کی گردنیں دبوچ لیتا اور فرحانہ کا پتا پوچھتا کہ انہوں نے اُسے کس جگہ یرغمال بنا کر رکھا ہے؟ یا پھر خاموشی اور رازداری سے ان کا تعاقب کرتا۔

"یہی موقع ہے، یہی موقع ہے۔" میرے اندر ایک ہی گردان ہونے لگی۔ وہ جانتے تھے کہ میں یا وہ ایک دوسرے سے نبردآزما نہیں ہو سکتے تھے۔ چھپ کر کارروائی کی جاسکتی تھی۔ میں تعاقب کیسے کرتا؟ کوئی سواری تو در کنار یہاں تو مجھے مسافر گاڑی کے آثار بھی نظر نہیں آرہے تھے، بہ قول ٹیکسی ڈرائیور فاران، یہاں صرف پرائیوٹ گاڑیاں ہی چلتی ہیں۔ مسافر بسیں نہ ہونے کے برابر تھیں، یعنی ان کے آنے جانے کا ایک ہی وقت تھا اور مجھے کسی مقررہ منزل پر نہیں بلکہ مطلوبہ منزل پر پہنچنا تھا جو اندرِ صحرا کی جہنم زار بھول بھلیوں میں بھی ہو سکتی تھیں۔

کیا کرنا چاہیے؟ میں تیزی سے سوچنے لگا اور جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں یہ سنہری موقع کھونے لگا ہوں۔

ادھر سواری کے انتظار میں مجھے مزید کوفت ہونے لگی۔ پیاس کی شدت سے حلق کانٹے کی طرح سوکھ رہا تھا۔ اس کم بخت نے مجھے پانی تک کا نہیں پوچھا تھا۔

اسی وقت ایک کار میرے سامنے آکر رکی۔ اس کا دروازہ کھلا اور میں چونک پڑا۔

"جلدی سے اس میں سوار ہو جایئے نعمان صاحب! اس سے پہلے کہ وہ لوگ محمود صاحب کے کمرے سے باہر آجائیں اور ہم پر ان کی نظر پڑ جائے۔"

کار سوار نے میری طرف کا دروازہ کھول کر مجھ سے کہا تھا۔ یہ وہی کل رات والا شخص تھا جسے میں دشمنوں کا آدمی سمجھے ہوئے تھا۔ اب معاملہ کچھ اور تھا۔ میں تذبذب میں تھا، لیکن بعض حالات میں معاملے تقدیر کے سپرد بھی کر لیے جاتے ہیں۔ میں کار میں سوار ہو گیا۔

"ویری تھینکس۔" اس نے کہا اور کار کو ایک جھٹکے سے ریورس کر کے بیک ٹرن لیا اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف کار دوڑا دی۔

کار میں اے سی آن تھا۔ مجھے کچھ سکون ملا۔ وہ اپنی نظریں ونڈ اسکرین پر مرکوز رکھے ہوئے بولا۔ "حالات کے

نہیں تھے، میں آپ کو اس ملاقات سے روکنا چاہتا تھا مگر آپ بھروسا کرنے پر تیار ہی نہیں تھے مجھ پر۔"

"کیسے بھروسا کرتا۔ تمہاری کل والی ساری باتیں جھوٹ ثابت ہوئی تھیں۔" میں نے شکوہ کیا۔

"وہ جھوٹ تھیں، اسی لیے جھوٹی ثابت ہوئی تھیں، مسٹر نعمان!" اس نے عجیب اسرار بھرے لہجے میں کہا اور میں چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگا۔ اس نے بھی کار چلاتے ہوئے ایک ذرا اپنی گردن موڑ کر میری طرف دیکھا تھا اور ہولے سے مسکرایا بھی۔

"تمہاری باتیں بہت عجیب اور مشکوک بھی ہیں۔ میں یہ چکر بالکل بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔" میں نے قدرے جھلا کر کہا۔

"اس سے بھی زیادہ گھن چکر ہے یہاں، ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔" وہ بولا۔ پھر سنجیدہ ہو کر دوبارہ گویا ہوا۔

"بات ویسے سیدھی اور فقط اتنی ہے کہ ...... اوہو!" کہتے کہتے وہ ایک دم چونکا۔ اس کی نظریں سائیڈ مرر پر جم گئیں۔ آگے بولا۔ "یہ بدبخت لوگ بھی اسی طرف آرہے ہیں۔ تم ایسا کرو فوراً عقبی سیٹ پر جا کر لیٹ جاؤ۔ جلدی۔"

میں بوکھلا سا گیا۔ دل میں پھر خدشہ اُبھرا کہ کہیں یہ دشمنوں کا آدمی تو نہیں تھا اور اب ان کے آنے پر یہ مجھے ان کے حوالے کر دیتا۔ لیکن پھر یہ مجھے چھپنے کا کیوں کہتا؟

میں نے تیزی کا مظاہرہ کیا اور کار کی پچھلی سیٹ پر گھٹنے سکیڑ کر لیٹ گیا، ساتھ ہی میرا دل بھی سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ وہ چاروں خطرناک دشمن، بہ قول اس اجنبی شخص کے ہماری کار کے تعاقب میں آرہے تھے۔

تھوڑی دیر اور بیت گئی۔ پھر اسی آدمی کی آواز سنائی دی۔ "آجاؤ اب...... دونوں گاڑیاں آگے نکل گئی ہیں۔"

اسی وقت میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

"سنہری موقع" یہ لفظ میرے ذہن میں اُبھرا۔ مجھے اپنے سامنے سڑک پر وہی دونوں شاندار انٹر کولر گاڑیاں جاتی ہوئی دکھائی دیں۔

"ان دونوں گاڑیوں کا تعاقب کرو فوراً۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ بھونچکاں سا میرا منہ تکنے لگا۔

"للل...... لیکن......" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی اور تیز لہجے میں بولا:

"اگر تم یا محمود الحسن میری خیر خواہی اور ایک ہی مقصد کا دعویٰ کرتے ہو تو میری یہ بات ماننا ہوگی۔ یہ میرے دشمن ہیں اور میں ان کی ایک کمزوری سے واقف ہوں۔ یہی وہ موقع ہے ...... میں تمہارے ساتھ ہوں، پھر جہاں کہو گے چلوں گا تمہارے ساتھ، یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

"دیکھو دوست!" وہ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "اس طرح کی جلد بازی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے، مت بھولو کہ تم یہاں ایک پردیسی ہو اور وہ بھی بے سہارا۔ یہ صحرائی علاقہ میلوں تک ضرور پھیلا ہوا ہے مگر یہاں کی زمین کے چپے چپے پر بااثر شیوخ کا قبضہ ہے۔ وہ اس کے مالک ہیں۔ یہاں تمہاری ذرا سی بھی غیر قانونی حرکت تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔ تم جو بہروپ بھر کر اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے یہاں آئے وہی بہتر رہے گا، دشمنوں کے ٹھکانوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں، تم اس کی فکر مت کرو اور میرے دوستانہ مشورے پر عمل کرو۔ ہم تمہارے ہاتھ مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔"

مجھے اس کی بات میں سچائی کی بو محسوس ہوئی اور میرے سینے سے ایک بھاری سانس کا اخراج میرے جوش کو ہوا بنا گیا۔ تاہم اپنی تسلی کی خاطر بولا۔

"تم انہیں جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔ شاہ میر اور بن رائد۔"

"ہوں ں......" میں خاموش ہو گیا۔

چند لمحے بعد میں ایک بار اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر فیصلہ کن انداز میں اس سے بولا۔ "اب تم سب سے پہلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ تم کس کے آدمی ہو اور یہ سب آخر معاملہ کیا ہے؟"

"میرا نام...... ہاشم ہے۔" اس نے بلا دیر اپنا نام بتایا۔

"میں مسٹر محمود کا آدمی ہوں اور اس کا باڈی گارڈ بھی۔"

"ہم اب کہاں جا رہے ہیں؟"

"مسٹر محمود صاحب کی رہائش گاہ کی طرف۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"وہ تم سے کھل کر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

"جو وہ اپنے آفس میں ان چاروں کے سامنے نہیں کر پائے تھے مجھ سے؟" میں نے اپنے اب تک کے اپنے قیافے سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اب تم سب کچھ سمجھ رہے ہو اور مجھ پر اعتماد بھی کر رہے ہو۔" وہ پُرطمانیت سے بولا تو میں نے اپنے سر کو اثباتی

جنبش دی۔

سفر جاری رہا۔ کار شاندار تھی۔ میں وقت کے انتظار میں خاموش رہا اور کھڑکی کے بند شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ جہنم زار صحرا کے سوائے کچھ بھی نہ تھا۔ حدنگاہ ریتیلے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی ڈھلانوں پر کیکٹس اُگے ہوئے تھے۔ سوکھی جھاڑیوں کے جھنڈ بھی نظر آتے تھے

نصف گھنٹے کے اس سفر کا پتا ہی نہ چلا اور اب ہمارے دائیں جانب نخلستان کے آثار نظر آنے لگے۔ کچے مکانوں ..... اور کھجوروں کے درختوں کا سلسلہ ان کے ساتھ ساتھ خاصی دور تک چلا گیا تھا۔

''کسی آبادی کے آثار ہیں شاید۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں چپ رہا۔ اس نے ایک ناپختہ راستہ نما سڑک پر کار موڑلی جو اب ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

اب ہم نخلستان کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ یہاں مجھے پختہ اینٹوں والے بڑے مکان بھی نظر آرہے تھے۔ اچھی خاصی ہریالی نظر آرہی تھی یہاں۔ کہیں کہیں بڑے پائپ ریتیلی زمین میں نصب اور کچھ دھنسے ہوئے نظر آئے، نہری نظام بھی دکھائی دیا تھا۔ مجھے اس نخلستان کی ہریالی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔

کار ایک بڑے سے پختہ اینٹوں والے مکان کے سامنے رک گئی۔ ہم دونوں نیچے اُتر آئے۔

''یہ کوئی بستی ہے؟'' میں نے اطراف میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''ربع الخالی نام ہے اس بستی کا۔'' اس نے مکان کے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بتایا۔ ''کبھی یہ بحرین کا طویل ترین صحرا کہلاتا تھا۔ اب اس کے قرب وجوار میں کئی چھوٹے بڑے قصبے دیہات بن چکے ہیں۔ بہت سی آبادیاں پھیلنے کے باوجود بھی یہ صحرا طویل ہے۔ آؤ......''

کہتے ہوئے وہ دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا، کوئی ملازم ٹائپ بوڑھا شخص تھا۔ مجھ پر ایک نظر ڈالی اور پھر ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ میں ہاشم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

سامنے کشادہ صحن تھا۔ ایک طرف سیاہ رنگت کا درخت تھا۔ دوسرا کھجور کا تھا۔ گملے اور بیلیں دیواروں پر نظر آرہی تھیں۔ مکان سادہ سا ہی نظر آتا تھا۔ سامنے کے رخ پر دو کمرے تھے۔ دائیں جانب کچن وغیرہ تھا، بائیں طرف ایک اور بڑا سا کمرا تھا جس کے ساتھ میں ایک زینہ اُوپر کھلی چھت کی طرف جاتا تھا۔ بڑا سا برآمدہ تھا جس پر پھونس کا بڑا سا سائبان تھا۔ وہاں دو بڑی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کمروں کے باہر سے اے سی کے ''آوٹر'' دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہاں ہر کمرے میں اے سی لگا ہوا تھا۔

ہاشم مجھے اسی کمرے میں لے آیا۔ یہاں بھی اے سی تھا۔ کمرا اندر سے سادگی مگر نفاست سے سیٹ کیا گیا تھا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ فرنیچر تھا۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ہم نرم گدے دار صوفوں پر براجمان ہوگئے۔

وہ خدمت گار بوڑھا بھی اندر آگیا اور ہاشم کی طرف دیکھنے لگا۔ ہاشم نے اسے کچھ کھانے پینے کو لانے کا کہا اور کچھ اپنی زبان میں پوچھا بھی تھا جس کا بوڑھے نے مختصر جواب دیا اور چلا گیا۔

''یہ مکان محمود صاحب کا ہے؟'' میں نے کمرے کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ اس نے راستے میں مجھے بتایا تھا کہ ہم محمود صاحب کی رہائش گاہ کی طرف جارہے ہیں، پھر بھی کسی موہوم سے خیال پر میں نے دوبارہ پوچھا تھا۔

''استعمال میں تو محمود صاحب کے ہی ہے لیکن اس کے مالک کا نام شیخ سلیمان ہے۔ وہ اپنے قبیلے کا سردار ہے۔ بہت اچھا اور مہمان نواز آدمی ہے اور دوستوں خیر خواہوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔'' ہاشم نے بتایا۔ پھر ایک لمحہ توقف کے بعد مجھ سے بولا۔

''تم فریش ہونا چاہو تو وہ سامنے غسل خانہ ہے۔ تب تک میں ذرا اندر سے ہوکر آتا ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ اٹھا، اسی وقت سیل فون کی بیل گنگنائی۔ یہ ہاشم کا سیل تھا۔ اس نے جیب سے نکال کر کان سے لگایا۔

''یس سر! نعمان صاحب کو میں بالکل خیریت سے یہاں لے آیا ہوں۔ مگر وہ اب بھی کچھ شکوک وشبہات کا شکار ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر میری جانب دیکھا تھا اور دوسری جانب سے کچھ سنتا رہا۔ پھر اختتامی لہجے میں بولا۔

''یس سر! آپ آجائیں گے تو تب ہی ان کا شک دور ہوگا۔

اوکے سر! بائی......'' پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''محمود صاحب کا ہی فون تھا، تسلی کررہے تھے کہ میں تمہیں ان کے حکم کے مطابق بہ خیریت یہاں لے آیا ہوں۔''

وہ چلا گیا۔ میں نے غسل خانے کا رخ کیا۔

اگلے نصف گھنٹے بعد جب محمود الحسن کو بہ نفس نفیس میں نے وہاں موجود پایا تو میری تسلی ہوئی لیکن اندر کی اُلجھن اپنی

جگہ قائم رہی۔

''سب سے پہلے میں اپنے رویئے کی معافی چاہوں گا مسٹر نعمان!'' محمود نے معذرت خواہانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ اب اس کا روئیہ روکھا نہ تھا۔ وہ اس وقت مجھے بہت ہی ملنسار اور خوش اخلاق آدمی نظر آرہا تھا۔

''کوئی بات نہیں جناب!'' میں نے دوستانہ سی مسکراہٹ سے جواب میں مختصراً کہا اور منتظر رہا کہ وہ آگے مجھ سے اس ضمن میں کہنا کیا چاہتا تھا؟

''یہ میری مجبوری تھی۔ اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ تھا۔ یہاں کچھ ایسی خطرناک مونوپلی چل رہی ہے کہ بس! کیا کہوں؟'' وہ کچھ پریشان اور متفکر نظر آنے لگا۔ ''آپ نے دفتر میں میرے رویئے کا برا تو منایا ہوگا مگر......''

''ایسا شاید آپ نے بن رائد اور شاہ میر کی وہاں موجودگی کے باعث کیا تھا۔'' بالآخر مجھے کہنا پڑا۔

''بالکل...... یہی بات ہے، شکر ہے اللہ کا تم اپنی ذہانت کے بل بوتے پر سمجھ گئے۔'' محمود جیسے ایک دم مطمئن سا ہوگیا۔ جیسے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔

''میں ان خبیثوں کے سامنے تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میں انہیں وہاں سے بھگا بھی نہیں سکتا تھا۔ نہیں چاہتا تھا میں کہ اس کے سامنے ہمارے بیچ جو کاروباری ڈیلنگ ہو وہ اس کی تفصیل سے واقف ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکا پھر ایک دم میری طرف دیکھ کر مستفسرانہ انداز میں بولا۔ ''کیا تم ان دونوں کو جانتے ہو؟''

''میں ان کے ساتھ بیٹھے ان کے غنڈے راکا کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرا اس سے کئی بار ٹاکرا بھی ہو چکا ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھ سے منہ کی کھائی ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے مجھے جوش میں یہ سب بتانا پڑ گیا اور میں نے دیکھا کہ محمود ہی نہیں۔ اس کا باڈی گارڈ اور قریبی ساتھی ہاشم بھی حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگے۔

پھر محمود اپنا سر دھنتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ایسا محسوس تو ہوا تھا کہ ان سے تمہاری ٹھیک ٹھاک قسم کی دشمنی ہے۔''

''دشمنی نہیں ہے، جانی دشمنی ہے۔'' میں نے وضاحت کی اور آخر میں اس سے سوال کیا۔ ''آپ کا ان سے کیا معاملہ ہے؟''

''جیسا کہ میں نے کہا کہ میں ان کے سامنے تم سے کاروباری معاملات کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ مجھے دباؤ میں رکھے ہوئے تھے اور طرح طرح کی رشوتیں دینے کا لالچ دے رہے تھے کہ میں ان کی بات مان لوں۔''

''کون سی بات؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ شاہ میر اور بن رائد تمہاری کمپنی پرل ٹریڈرز سے کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے اُلٹا سوال کردیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس معاملے کی بھنک اسے بھی تھی۔ ایک خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا بہرام خان نے تمہیں کچھ بتایا تھا؟''

''ہاں!'' وہ بولا اور وہی بات میرے سامنے دہرادی۔ یعنی بھاری مشینری کی آڑ میں ناقص مال سپلائی کرنا اور...... زیادہ منافع حاصل کرنا۔

''لیکن بات صرف منافع کی بھی نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''درحقیقت یہاں ایک گروپ ایسا ہے جو صرا ئفہ میں تیل کے کنوؤں کی کھدائی نہیں چاہتا۔ یہ لوگ بھی اسی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں مگر میں اور بہرام نہیں۔''

''ہم......'' میرے منہ سے نکلا۔ ''کیوں؟ آخر کیوں یہ لوگ نہیں چاہتے کہ صرا ئفہ میں تیل کی کھدائی نہ ہو؟''

''اس لیے کہ اگر صرا ئفہ میں تیل نکل آیا تو وہ ترقی کرجائے گا اور سلطان شیخ زاہد نہیں چاہتا کہ شہزادی نیلم کا یہ علاقہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔''

''شہزادی نیلم......؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ مجھے ابھی جنوں، پریوں اور پرستانوں کی کہانیاں سنانا شروع کردے گا۔

''بہت لمبی کہانی ہے یہ، پھر کبھی سہی، یہ بتاؤ تمہارا ابن رائد اور شاہ میر سے کیا جھگڑا ہے؟'' محمود بولا۔

''یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔'' میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ ''کیا یہ دونوں تمہارے بھی دشمن ہیں؟''

''ہاں......!''

''تو پھر مجھ سے تمہیں کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے؟ جبکہ میں تو خود یہاں ایک پردیسی اور بے سہارا آدمی ہوں۔ کم از کم تمہارے اس آدمی ہاشم کا تو میرے بارے میں یہی کہنا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے ہاشم کی طرف بے تاثر سی مسکراہٹ سے دیکھا تھا۔ محمود بھی چونک کر اور قدرے سوالیہ نظروں سے ہاشم کا چہرہ دیکھنے لگا، تب ہاشم نے مختصراً لفظوں میں میری اور اس کے درمیان کار میں ہونے والی بحث کے بارے میں آگاہ کردیا۔

”تم کیا ہو یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں نوجوان!“ یہ سب سن کر محمود معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”تم تو دوسروں کے لیے سہارا بنتے ہو۔ تم نے ان دونوں کو گنتی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ میں نے آج سے پہلے ان دونوں کو اس قدر پریشان اور بے بس نہیں دیکھا تھا۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔“

وہ ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد میرے کاندھے پر دوستانہ انداز میں اپنا ایک ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر نعمان! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم یہاں بحرین میں ریت پھانکنے نہیں آئے ہو۔ ان دونوں کی دشمنی تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔“

میں اس کی باتیں سن کر ششدر سا رہ گیا۔

”یہ سب باتیں تمہیں کس نے بتائی ہیں؟“ میں نے اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بہرام خان نے۔“

”بہرام خان نے...... لیکن......“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”تمہارے باس رانا بشیر نے اسے پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا۔“ محمود نے ایک اور انکشاف کیا اور میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

”تم جو بہروپ بھر کے یہاں آئے ہو، یہی بہتر رہے گا، ہم تو ان کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر ہیں مگر تمہاری بات اور ہے۔“

”تو تم میرے کاندھے پر پستول رکھ کر چلانا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔

”صاف گوئی اور دیانت داری اسی میں ہے کہ میں اس بات کا اعتراف کرلوں کہ تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔“

”مجھے تمہاری یہ صاف گوئی پسند آئی۔“ میں ہلکے سے مسکرایا، اس کے بعد ہمارے درمیان کھل کر گفتگو ہوئی۔ میری نہ صرف تسلی ہوتی چلی گئی بلکہ مسرت بھی ہوئی کہ یہاں مجھے ایک ایسے گروپ کی مدد حاصل ہوگئی تھی جس سے میں شاہ میر اور بن رائد سے نمٹ سکتا تھا۔

ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کا مختصر الب لباب بڑا سنسنی خیز تھا۔ اگرچہ اس کے کچھ حصوں سے میں پہلے سے ہی گلنارا کی زبانی واقف ہی تھا مگر یہاں کچھ اور باتیں آشکار ہوئیں۔

کالا سونا گروپ سے میں پہلے ہی واقف تھا، گلنارا کی زبانی مجھے ”بلیک ڈیول“ کی مکروہ سازشوں کا پتا چلا، جبکہ اس کا پس منظر مجھے محمود الحسن سے پتا چلا جس میں صرائفہ کی سیاست بھی شامل تھی۔

اور پھر جب میں نے اسے اپنے اور گلنارا کے درمیان ہونے والی باتوں اور ساتھ ہی اپنے عزائم سے بھی آگاہ کیا تو محمود نے بے اختیار وفورِ جذبات تلے مجھے اپنے گلے سے لگالیا۔

”نوجوان! مجھے تم سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ اس بات کی بھی کہ ہمارے اس گروپ میں تمہاری صورت ایک ایسے بہادر ساتھی کا اضافہ ہوا ہے جس کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ ابھی تم آرام کرو اور اپنی تھکن اُتارو، کیونکہ شام کو ہم نے صرائفہ روانہ ہونا ہے۔ شہزادی نیلم سے تمہاری ملاقات کرانا اب اور بھی ضروری ہوگیا ہے۔“

☆......☆

صرائفہ کی شہزادی، نیلم ہی اس گروپ کی سربراہ تھی جس نے بلیک ڈیول اور اس کے عظیم الشان آئل رگ (Oil Rig) یعنی او، پی، پی (آئل پروڈکشن پلیٹ فارم) کو تباہ کرنے کا بیڑا اُٹھا رکھا تھا۔ بہرام خاں سمیت محمود، ہاشم اور چند دیگر لوگ اس گروپ میں شامل تھے۔ جن کے نام مجھے محمود نے بتائے۔

شہزادی نیلم درحقیقت صرائفہ کے سلطان حماد بن اشعر کی اکلوتی اولاد تھی۔ حماد ایک امن پسند اور صلح جو فطرت کا انسان تھا۔ سلطان شیخ زاہد اور سلطان حماد بن اشعر کبھی ایک دوسرے کے دوست ہوا کرتے تھے۔ وہ قصبہ ”حذی“ کا سردار تھا۔ دونوں گہرے دوست تھے. لیکن ان کی دوستی کے بیچ دراڑ پڑی تو یہ دونوں ایک دوسرے کے جان کے دشمن بن گئے۔

عربوں کی ایک مثال تھی کہ صرف دشمن خطرناک نہیں ہوتا، لیکن جو دوست، دشمن بن جائے تو اس سے زیادہ خطرناک دشمن کوئی نہیں ہوسکتا۔ شیخ زاہد اور حماد بن اشعر کا بھی یہی معاملہ تھا۔ دونوں جب دوست سے دشمن بنے تو ربع الخالی کا امن وسکون تباہ ہوکر رہ گیا۔ کسی نے ان دونوں قبائل کے درمیان صلح کروانے کی بھی کوششیں نہ کی تھیں۔ اس کی وجہ یہی تھی بدخواہ چاہتے ہی یہی تھے کہ یہ دونوں قبائل آپس کی خوں ریز جنگ میں مبتلا ہوکر تباہ و برباد ہوجائیں اور پھر ان پر وہ قابض ہوسکیں۔ اسی سبب ان کی دشمنی کو ہوا بھی انہی بدخواہوں نے لگائی تھی۔

دراصل دشمنی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب شیخ زاہد نے

اپنے بیٹے کے لیے حماد بن اشعر کی لاڈلی اکلوتی بیٹی نیلم کا رشتہ مانگا تھا، یوں بن اشعر کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا، صورتِ حال تب خراب ہوئی جب خود نیلم نے اس رشتے سے انکار کردیا۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ اسے زاہد کا بیٹا بن رائد پسند نہیں تھا۔

بن رائد کس قماش کا آدمی ہے یہ تو مجھے بھی معلوم تھا، لہٰذا اس بات نے باپ سے زیادہ بیٹے یعنی بن رائد کو مشتعل کردیا۔ اس نے انتقامی کارروائی کے طور پر پانی کی تقسیم کے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرڈالی جو پہلے سے ان دونوں قبائل کے درمیان طے شدہ تھا۔

نیلم سے متعلق یہ باتیں بھی گردش کرتی رہی تھیں وہ کسی اور قبیلے کے نوجوان کو پسند کرتی تھی۔ اس میں کتنی سچائی اور مبالغہ آمیزی تھی اس کا صحیح اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا۔

اب دونوں کے باپ دنیا میں نہیں تھے یوں صرائفہ کی شہزادی اور حذی کے شہزادے کے درمیان بری طرح ٹھنی ہوئی تھی۔

مجھے اس ”نیلم پری“ والی داستان سے چنداں دلچسپی نہ ہوتی اگر یہاں معاملہ میرے دشمنوں سمیت سات پردوں میں چھپے ہوئے ”بلیک ڈیول“ کا نہ ہوتا۔ جس کا بنایا ہوا ”آئل رگ“ عالم اسلام سمیت پوری دنیا کے لیے ایک خطرہ تھا اور جس کی خاطر بہرام خان جیسے بہادر آدمی نے اپنی جان تک قربان کردی تھی اور اپنے بیوی بچوں کو اللہ کے آسرے پر چھوڑ دیا تھا۔

میرے کانوں میں ابھی تک اس کی بیوہ گلنارا کے وہ الفاظ میرے ایمان کی تازگی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ میری جنگ پھیلتی جارہی تھی۔

بن رائد اور اس کے حواریوں نے اسی ”بلیک ڈیول“ کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ نیلم ایک عورت ذات ہوکر بڑی بہادری سے اس کا راستے روکے ہوئے تھی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ بلیک ڈیول درحقیقت ایک یہودی ہے۔ صرائفہ پر قبضہ بھی اس کے کسی خفیہ منصوبے کا حصہ ہے۔ اس طرح بن رائد اسی کی طاقت اور سپورٹ پر صرائفہ والوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کیے ہوئے تھا۔

محمود نے مزید یہ بتایا کہ صرائفہ میں یہ لوگ کوہ جبل کے بالائی چشموں سے یعنی یہاں سے کوئی تیس، چالیس میل کے فاصلے پر پانی جمع کیا جاتا ہے۔ پھر زیرِ زمین پائپوں کے ذریعہ صرائفہ تک لایا جاتا ہے۔ ان زیرِ زمین نالیوں کو ”فلج“ کہا جاتا ہے، یہ درحقیقت ایران کا صدیوں پرانا آبپاشی کا طریقہ تھا اب اسے ذرا جدید خطوط میں استوار کر دیا تھا۔ ”حذی“ والے انہی نالیوں کو تباہ کررہے تھے۔ وہ چاہتے تھے صرائفہ...... سوکھا پڑ جائے۔ وہ خشک ہوکے تباہ ہوجائے اور پھر وہ وہاں قبضہ جما کر بعد میں تیل کے چھپے ہوئے کنوؤں کی کھدائی کریں۔“

میں نے سوچا یہ سازش بالکل ایسی ہی تھی جیسی انڈیا ہمارے (پاکستان) کے خلاف کررہا تھا۔ پانی روک کر اور ہمیں ڈیموں کے ایشوز پر لڑوا رہا تھا۔ محمود الحسن ایرانی انجینئر تھا اور آبپاشی کا یہ طریقہ اسی نے ہی صرائفہ جیسے دور دراز قصبے میں متعارف کرایا تھا، اسی لیے صرائفہ کی شہزادی نیلم اور وہاں کے باشندے اسے اپنا محسن سمجھتے تھے۔

بہرکیف...... میں نے دن میں دوپہر سے آرام کیا اور تین گھنٹے کی نیند لینے کے بعد تقریباً شام چھ بجے جاگ پڑا۔ دوپہر کا کھانا خاصا پُرتکلف تھا۔ بھیڑ کا گوشت، اُبلے ہوئے چاول۔ سرخ گندم کی تازہ تنوری روٹی، جو بہت خستہ اور لذیذ تھی، اسے تو بغیر سالن کے بھی کھانے میں مزہ آتا تھا۔ ٹھنڈا شفاف پانی اور آخر میں قہوہ پیا تو جیسے یوں لگا سارا کھانا ہی ہضم ہوگیا ہو۔

ایک آرام دہ اے سی والے کمرے تک ہاشم نے میری رہنمائی کی اور میں نرم بستر والی ایک مسہری پر دراز ہوگیا۔

شام کو جاگا تو خوش ذائقہ چائے دی گئی اور اس کے ساتھ بسکٹ تھے۔ محمود کے ساتھ اسی نشست گاہ میں پھر میری بیٹھک لگی اور میں نے بھی اپنی غرض و غایت اس پر واضح کردی، یہ بھی بتایا کہ اس وقت گلنارا کی جان کی حفاظت ضروری ہے، جب تک کہ بہرام خان کے قتل کی تفتیش پولیس جاری رکھے ہوئے ہے۔

”گلنارا ہی تو ہمارے لیے ایک اہم شخصیت ہے جو دشمنوں کے خلاف قانونی شکنجے کو تنگ کرسکتی ہے۔“ محمود بولا۔

میں نے کہا۔ ”محمود صاحب! یہ ساری باتیں اپنی جگہ، لیکن میرا اصل مشن وہی ہے جس کے بارے میں آپ کو آگاہ کرچکا ہوں۔ میرے باس رانا بشیر کی اکلوتی جوان بیٹی فرحانہ اس وقت بن رائد کی قید میں ہے۔ مجھے اسے چھڑانا ہے اور شاید اس گھمبیر معاملے میں مجھے بھی آپ کی ضرورت پڑسکتی ہے۔“

”میں حاضر ہوں برادر......!“ اس بار محمود نے اپنے

سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے خم ہو کے کہا۔ ”یہ خطرناک کام یوں بھی تمہارے اکیلے کے کرنے کا نہیں ہے۔“

”مجھے سب سے پہلے یہی اہم کام نمٹانا ہے۔ اس کے بعد میں بہ آسانی تمہارا اور شہزادی نیلم کے کاز پر کام کر سکتا ہوں۔“

”یہ کام شہزادی نیلم کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہو سکے گا۔“ محمود نے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے یہ مجھے زبردستی نیلم سے نتھی کرنے پر تلا ہوا ہے، حالانکہ میں خود بھی ذاتی طور پر اس کی مدد میں شامل ہونے کا فیصلہ کر ہی چکا تھا، یہ میرے لیے ایک عظیم مشن تھا، بلکہ گلنارا سے تو میں نے اس کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔

”مسٹر محمود! میرا نہیں خیال کہ میں اپنے اس ذاتی معاملے میں شہزادی صاحبہ کو بھی گھسیٹوں...... مجھے بس ابن رائد اور شاہ میر کے ٹھکانے کا بتا دیں۔ میں فرحانہ کا خود ہی کھوج لگا لوں گا۔“

وہ میری بات پر مسکرایا، بولا۔ ”برادر! یہ بحرین ہے۔ یہاں قوانین بہت سخت ہیں، اور تم پردیسی بھی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ مکار دشمن تمہیں کسی مصیبت میں ڈال دیں۔“

”مصیبت میں تو میں انہیں ڈالنے آیا ہوں۔“ میں پُرعزم اور قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ”بہرام خان کا بھی تو دن دھاڑے بیدردی سے قتل ہو گیا۔ اب دیکھیں یہاں کی پولیس کیا کرتی ہے۔ قاتلوں کو گرفتار کرے گی یا پھر کیس داخلِ دفتر۔“

”وہ سب وقت کے ساتھ ظاہر ہو ہی جائے گا مگر تم سمجھ نہیں رہے ہو کہ تمہاری بات اور ہے، برادر!“ محمود نے پُرزور لہجے میں کہا۔

”اور...... میں اسی مقصد کے لیے ان دونوں خبیثوں کا تعاقب بھی کرنا چاہتا تھا، مگر......“ اس کی بات کو صرفِ نظر کرتے ہوئے کہا اور قریب فرشی نشست پر بیٹھے اس کے آدمی کی طرف دیکھا۔

”ہاشم نے تمہیں منع کر کے کوئی غلط کام نہیں کیا برادر!“ محمود سنجیدگی سے بولا۔ ”فرحانہ کو اگر رہائی دلانا ہی چاہتے ہو تو یہ کام شہزادی نیلم کی مدد کے سوا نہیں ہو سکتا، بلکہ حقیقتاً میں یا ہاشم بھی تمہاری کوئی مدد کرنے سے قاصر ہیں اس معاملے میں۔“

میں نے سوچا، فرحانہ والا معاملہ بھی کم حساس نہ تھا، یوں بھی شہزادی نیلم سے ملاقات تو کرنا ہی تھی لہٰذا میں نے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے کہا۔

”میں اکیلا اس مہم کو سر کرنے نہیں آیا ہوں، میرا ایک جانثار دوست بھی میرے ساتھ شامل ہے۔“

”جانثار دوست؟ کون ہے وہ اور کہاں ہے؟“ محمود نے فوراً پوچھا اور میں نے اسے شیراز عرف کالیا کے بارے میں بتا دیا۔ اور یہ بھی بتایا کہ اسی کی مدد سے ہی میں نے پاکستان میں شاہ میر سمیت، بن رائد اور ان کے مشترکہ مقرب خاص کارپرداز راکا کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔“

”آفرین! اس بہادر آدمی سے تو ہمیں بھی مل کر خوشی ہوگی، وہ ہے کہاں؟“

”وہ دبئی پہنچ چکے ہوں گے۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ ”کیا آپ دبئی کے اس اسپتال سے رابطہ کروا سکتے ہیں جہاں یہ لوگ موجود ہیں۔ کالیا سے مجھے بھی بات کرنی ہے، بلکہ وہ میرا ہی منتظر ہوگا۔“ کہتے ہوئے میں نے محمود کو اس اسپتال کے تین کونٹیکٹ نمبرز بتا دیے۔ جو میں نے پہلے ہی ازبر کر رکھے تھے، جب میں کالیا کے ساتھ اپنے بھائی فہیم کو بھی علاج کی غرض سے دبئی روانہ کرنے کا بندوبست کر رہا تھا۔

محمود نے اسی وقت ہاشم کو اشارہ کیا۔ وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا، وہ اس نے محمود کو تھما دیا۔ میں نے تینوں نمبرز اسے بتائے۔ دو نمبر تو مسلسل انگیج ملتے رہے البتہ تیسرے نمبر پر اس کا رابطہ ہو گیا۔ اس نے ایک پاکستانی مریض یعنی میرے بھائی فہیم کے حوالے سے پوچھا اور کالیا کا بھی بتایا جو شیراز کے نام سے مریض کے ساتھ تھا۔ دوسری جانب سے محمود کو فون ہولڈ آن کرنے کا کہا گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ میرا دھیان فوزیہ کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی دبئی پہنچ چکی ہوگی۔ اس کے بارے میں کالیا نے کیا تیر مارا ہوگا وہ بھی میں کالیا کی زبانی جاننے کے لیے بے چین تھا۔ میری دھڑکتی نظریں محمود کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

شاید دوسری جانب سے اسے کچھ بتایا جا رہا تھا۔ وہ سنتا رہا اور تب ہی اس نے شیراز کا نام لے کر اسے فون پر بلوانے کی درخواست کی جو قبول تو نہیں کی گئی مگر اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے نمبر مانگ لیا کہ یہ نمبر مریض کے اٹینڈنٹ (کالیا) کو دے دیا جائے گا۔ وہ پھر ہم سے خود ہی رابطہ کر لے گا۔ یہ بھی صحیح تھا لہٰذا میں نے محمود کو اپنے اس سیل فون کا نمبر دے دیا جو مجھے گلنارا نے دیا تھا۔ نیز کسی احتیاط کے پیشِ نظر محمود نے

اپنا نمبر بھی استقبالیہ کلرک کو نوٹ کرا دیا۔

”کیا پروگرام ہے پھر برادر؟“ یہ کام نمٹانے کے بعد محمود نے دوستانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ میرے سر سے تھوڑا بہت بوجھ اُتر چکا تھا۔

”جیسے آپ کہیں۔“

”بس! پھر ابھی تھوڑی دیر بعد ہاشم اور تم صرائفہ روانہ ہو جاؤ گے، میں جب تک ایک تحریری پیغام شہزادی نیلم کے نام لکھے دیتا ہوں۔“

”کیا آپ نہیں چلیں گے ساتھ؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔

مسکرایا اور بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے برادر! ہاشم تمہارے ساتھ ہے سمجھو میں ساتھ ہوں، یوں بھی میرا یہ اقدام کسی احتیاط کے پیشِ نظر ہی ہے۔ میں ابھی تک مخالف گروپ کی نظروں میں مشکوک نہیں ہوں۔ کیا تمہیں آج دفتر میں میرا رویّہ یاد نہیں؟“

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے چند منٹوں بعد میں اور ہاشم صرائفہ کی روانگی کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ محمود الحسن نے شہزادی نیلم کے نام ایک خط لکھ کر ہاشم کے حوالے کر دیا تھا۔ ہم تینوں مکان سے باہر آ گئے۔

میں نے دیکھا، باہر چہار اطراف میں عجیب سا منظر پھیلا ہوا تھا۔ گلیوں اور کہیں کہیں کھلے راستوں سے جھانکتے ہوئے صحرا میں اُداس سی پھیکی پھیکی شام اُتری ہوئی تھی۔ لوگ باگ آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ کچی پکی گلیوں میں اُونٹ بان اور تختہ دار ریڑھے کھینچتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ ایک بھرپور صحرائی بستی کا ہی منظر تھا۔

میں نے دیکھا محمود ہمارے ساتھ باہر آتے ہی بڑے محتاط انداز میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا اس کے بعد وہ ہمیں جلدی سے ”فی امان اللہ“ کہتا ہوا اپنے گھر میں گھس گیا۔

میں اور ہاشم اسی کار میں سوار ہو گئے جس میں وہ مجھے یہاں تک لایا تھا۔

کار میں سوار ہوتے وقت جب میں.... ہاشم سے صرائفہ تک کے سفر کی طوالت کے بارے میں پوچھ رہا تھا تو اچانک غیر ارادتاً میری نظر اپنے طرف کے سائیڈ مرر پر پڑی۔ مجھے ایک کچے سے مکان کی دیوار کی آڑ سے جدھر باڑے جیسی کوئی جگہ تھی، ایک دبلا پتلا اور خاصا طویل القامت شخص اپنے اُونٹ کی رسی کھینچتا ہوا نمودار ہوتا نظر آیا۔ وہ ہماری طرف ہی بار بار دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر سفید اور سیاہ ڈبیوں والا صافہ بندھا ہوا تھا اور اس نے لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا۔ جانے کیوں مجھے اس پر کچھ شبہ سا ہوا۔

وجہ یہی تھی کہ وہ بڑے عجیب انداز میں اور بار بار ہماری کار کی طرف ہی تکے جا رہا تھا۔ حالانکہ بظاہر وہ اپنے اونٹ کی باگ درست کرنے میں محو تھا۔ اونٹ کو اس نے ہاتھ کے اشارے اور منہ سے ”ہُشکارے“ مار کر بیٹھا دیا تھا۔

میں نے کوئی توجہ تو نہیں دی، مگر یہ میرے ذہن سے محو بھی نہیں ہوا تھا۔

”یہاں سے صرائفہ چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔“ ادھر ہاشم میرے سوال کے جواب میں مجھے بتا رہا تھا۔ جیپ ہوتی تو اور بات تھی۔ مگر کار میں یہ سفر ڈیڑھ سے دو گھنٹوں پر محیط ہو سکتا ہے۔ یہ بتاتے ہوئے اس نے کار اسٹارٹ کی اور گیئر ڈال کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

اس بار ارادتاً میری نگاہ پھر مرر پر پڑی۔ عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں وہ مشکوک شخص پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں رات وہیں صرائفہ میں ہی گزارنا پڑے گی؟“ میں نے کہا۔ نظریں میری ہنوز سائیڈ مرر پر جمی ہوئی تھیں۔ اب وہ آدمی بدستور ہماری آگے بڑھتی ہوئی کار کو تکے جا رہا تھا اور ایک دم اس نے اونٹ پر سواری کر لی تھی۔ اُونٹ کھڑا ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اونٹ پر اب ہمارا تعاقب بھی کر سکتا ہے؟

”ہاں! لیکن صرف تم وہاں رات گزارو گے۔“ ہاشم نے کہا اور میں نے قدرے چونک کر سائیڈ مرر سے نظریں ہٹا کر ہاشم کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟ کیا تم مجھے وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤ گے؟“

”ہاں!“

”لیکن تمہیں تو تب تک رات ہو جائے گی؟ اکیلے تمہارا واپس پلٹنا مناسب ہوگا؟ اور پھر میں کیسے اور کب لوٹوں گا؟“

ہاشم نے کار کو آبادی سے نکال لیا تھا۔ ہم ایک نیم پختہ سی سڑک پر تھے۔ مجھے ہاشم کے جواب کا انتظار تھا۔ کار کو ایک مناسب رفتار میں کرنے کے بعد وہ جواب میں بولا:

”میں نے کہا ناں...... جانِ برادر! فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم پہلے صرائفہ پہنچو تو سہی، شہزادی نیلم سے ملو،

پھر دیکھنا وہ تم سے مل کر کس قدر خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ کس عزت سے پیش آئے گی تمہارے ساتھ اور پھر جب اُسے یہ معلوم ہوگا کہ تم اس کے ہاتھ مضبوط کرنے آئے ہو نیز تمہارے اور اس کے دشمن مشترک ہیں تو پھر دیکھنا تم ان کے خاص الخاص مہمان کہلانے لگو گے۔"

"برادر ہاشم!" میں نے بھی اسی کے انداز و لہجے میں کہا۔ "یہ باتیں اپنی جگہ لیکن میری دلچسپی کی وجہ کچھ اور ہے، وہی ہوتی رہے میرے لیے کافی ہوگی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔" ہاشم نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ساتھ ہی اس نے کار کی اسپیڈ کم کردی۔ یہاں سڑک زیادہ ہی ناہموار تھی۔ "وہ سب بھی ہوگا تمہارا مقصد بھی اور آرام بھی۔ لوٹنے کی فکر نہ کرو۔ فون پر رابطے میں تو ہم رہیں گے ہی۔ پھر بھلا شہزادی نیلم کے پاس سواریوں کی کیا کمی ہے۔"

"ہم......" میں نے دانستہ چپ سادھ لی۔ میں آیندہ کے حالات پر تھوڑی دیر غور کرنا چاہتا تھا۔ میرے ازلی دشمنوں کے ساتھ معاملہ داری کی چین مجھے بہت لمبی ہوتی نظر آرہی تھی۔ حالات کی مجبوری بھی تھی کہ میں نے خود کو تقدیر کے حوالے کردیا تھا۔ اپنے ملکوں سے میلوں دور میں بحرین کے ان صحراؤں میں بے سہارا ہو کے نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اتنے بڑے گھمبیر دشمنوں کے سامنے مجھ اکیلے کی بھلا حیثیت ہی کیا تھی؟ کالیا ساتھ ہوتا تو اور بات تھی، پھر بھی میں سمجھ رہا تھا کہ میں خوش قسمت ہی واقع ہوا ہوں اور تقدیر میری مدد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ مقامی لوگوں میں اچانک بہی خواہوں کا ملنا میرے لیے کوئی کم خوش نصیبی کی بات تو نہیں تھی۔

میں نے کار کی پشت سے سر ٹکایا اور ایک بار پر سائیڈ مرر پر نظر ڈالی، مگر وہاں ماسوائے پیچھے بھاگتے ویران صحرائی مناظر کے اور کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ کھڑکی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ شام میں اتنی گرمی تو نہ تھی مگر ہاشم نے کار کا اے اسی آن کردیا تھا۔

شیشے سے پار مجھے صحرا کی ریتیلی سطح پر لہریں بنتی دکھائی دیں۔ پانی کا یہ سراب ہواؤں کا ہی رہین منت تھا۔ جا بجا ریتیلے ٹیلے اور کہیں کہیں سوکھے آبنوسی درخت، صحرا میں عجیب منظر پیش کرتے تھے۔ کجلاہٹ بکھیرتی شام دھیرے دھیرے رات میں ڈھلتی محسوس ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں ہی مجھے ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا۔ وجہ وہی صحرا کا دن اور رات میں بدلتا موسمی مزاج تھا۔ ہاشم نے اے اسی بند کردیا۔ شیشے البتہ چڑھے رہنے دیے۔

میری زندگی کا غالباً یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ان دنوں میرے روز و شب کھلے ریگستانوں میں بیت رہے تھے اور ان کے جلوں میں خطرات کس قدر تھے، اس کا بھی مجھے بہ خوبی ادراک تھا۔ یوں اس وقت بھی میں ایک کھلے ریگستان میں سفر کررہا تھا، بس شکر یہی تھا کہ ایک تو یہ سفر خارزار دن کا نہیں تھا اور گاڑی میں تھا۔

کہیں کہیں کسی نخلستان کے آثار بھی دکھائی دیتے تھے، مگر وہ بھی بہت مختصر۔

کچھ دیر بعد جب شام اور رات کا اتصال ہونے لگا اور ہم نے ابھی بہ مشکل دس بارہ کلومیٹر کا ہی سفر طے کیا ہوگا کہ اچانک کار کو جھٹکے لگنا شروع ہوگئے۔ کسی خرابی کو محسوس کرکے ہاشم نے گاڑی کے ساتھ کسی قسم کی زبردستی یا زور آزمائی کرنے کے بجائے اسے فوراً روک دیا۔ گاڑی کا انجن بھی اب بند ہوگیا تھا۔

"کیا ہوا......؟ پیٹرول......؟"

"ٹنکی فل ہے، کوئی مسئلہ لگتا ہے، دیکھتا ہوں۔" کہتے ہوئے ہاشم نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ ایک انگڑائی سی لے کر بدن کی اکڑن دور کی اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ زرد ٹیلوں پر سیاہ دھبے لہرانے لگے تھے۔ فضاء میں خنکی تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ چہار سو اسرار بھرا تاریک سناٹا طاری تھا۔

"لگتا ہے گرم ہوگئی ہے گاڑی؟" میں نے ہاشم کے قریب آکر کہا۔ وہ کار کا بونٹ اٹھائے اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ ریڈی ایٹر کا پانی ہی چیک کررہا تھا، بولا۔ "ریڈی ایٹر میں پانی تو ڈالنا ہی پڑے گا لیکن لگتا ہے خرابی کچھ اور ہی ہے۔"

وہ پانی کی ایک بوتل کار میں سے اٹھا لایا۔ پانی ڈالنے کے بعد اس نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی، مگر کار کا انجن کھانس کر خاموش رہا۔ اس نے کار کے گلوز کمپارٹمنٹ سے چھوٹی ٹارچ نکالی اور کار سے نیچے اترا۔ اب وہ ایک بار پھر کار کے انجن پر جھک گیا تھا۔

میں یوں ہی اطراف میں خالی نظریں دوڑانے لگا۔ رات میں صحرا کا منظر جتنا مسحور کن اور طلسماتی نظر آتا تھا دن میں اُتنا ہی بے رحم اور پُرتپش ہوتا تھا۔

ہاشم ابھی تک کار کی خرابی دور کرنے میں مصروف تھا، میں ابھی اس کی طرف مڑنا ہی چاہتا تھا کہ معاً ہی میں چونکا۔ مجھے دور کچھ نظر آیا تھا۔ میں غور سے آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔

مجھے تاروں کی ٹمٹماتی روشنی میں ریت سی اُڑتی نظر آرہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے کوئی دوڑا چلا آرہا ہو۔ وہ رفتہ رفتہ قریب آتا جارہا تھا۔ میں نے ہاشم کو آواز دے کر متوجہ کیا۔ "ہاشم! کوئی آرہا ہے۔"

میری آواز سن کر بونٹ پر جھکا ہوا ہاشم سیدھا ہوا اور میری طرف آیا۔ اس کی نظریں بھی میرے تعاقب میں مذکورہ سمت پر جم گئیں۔ آنے والا قریب آگیا۔ وہ کوئی اونٹ سوار تھا۔ جب وہ قریب آیا تو میں اسے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ اونٹ سوار وہی مشکوک آدمی تھا، جسے میں نے محمود الحسن کے گھر سے روانہ ہوتے وقت دیکھا تھا۔

میں کچھ محتاط سا ہوگیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں سلام کیا اور اونٹ کو ہشکارے دیتے ہوئے اسے نیچے بٹھایا اور خود اترا۔

"کوئی مسئلہ ہوا ہے؟" اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! برادر! کار خراب ہوگئی ہے ہماری۔" ہاشم نے دوستانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ وہ آدمی اس کی طرف کم اور میری طرف زیادہ گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔

"کہاں جارہے تھے؟ اور یہ کون ہے؟ کوئی غیر ملکی لگتا ہے۔" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ نعمان ہے، برادر ملک پاکستان سے آیا ہے، ہمارا مہمان ہے۔" ہاشم نے جواب دیا۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ اب اس سے جان چھڑانا چاہتا ہو۔

"تم نے بتایا نہیں کہاں جارہے تھے تم؟" اس مشکوک آدمی کی سوئی اسی جگہ اٹکی ہوئی تھی اور یوں پل کے پل مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ میرے اعصاب تن رہے تھے۔

"برادر! تم تو ایسے سوال کررہے ہو جیسے تم کوئی پولیس والے ہو، ہماری مدد کرسکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ اپنا راستہ لو......" ہاشم کو غصہ آگیا۔ اس کی بات پر اس شخص کے چہرے پر ایک تندی لہر اُبھری اور غائب ہوگئی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا، جیسا کہ مذکور ہوا وہ ایک دبلا پتلا مگر طویل القامت شخص تھا۔ چہرہ لمبوترا اور آنکھیں میچی میچی سی تھیں جن سے مکاری جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اسی انداز میں مسکرا کر ہاشم سے بولا۔

"خفا کیوں ہوتے برادر! میں دراصل اسی لیے پوچھ رہا

ذہنی امراض کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان غیر معمولی حالات میں ہی اپنی زندگی کے خاتمے جیسا انتہائی قدم اٹھاتا ہے۔ خودکشی کی ایک بڑی وجہ ڈپریشن ہے جس کی وجہ سے انسان خود کو بے بس اور بے یار و مددگار سمجھنے لگتا ہے۔ پاکستان میں حالیہ برسوں کے دوران شہری خواتین میں خودکشی کی شرح میں کافی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جس میں خاص طور پر نوجوان عورتوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر گزشتہ ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں لاہور میں خودکشی کرنے والے 10 افراد میں سے پانچ جوان خواتین تھیں جن میں سے کچھ چھوٹے بچوں کی مائیں بھی تھیں۔ چھ مئی کو لاہور کے علاقے نواں کوٹ کی رہائشی 30 سالہ اسکول ٹیچر نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا اس واقعہ کے دو دن بعد، 8 مئی کو سبزہ زار، لاہور میں دو بچوں کی ماں نے گھریلو جھگڑے پر خودکشی کرلی۔ اسی مہینے 27 مئی کو شفیق آباد کی رضیہ بی بی نے شوہر کی بدسلوکی اور غربت سے تنگ آکر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ شاہدرہ لاہور کی نفیسہ بی بی کے لیے 29 مئی اس کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا جب اس نے غربت سے گھبرا کر اپنی جان لے لی۔

ماہرین ذہنی امراض کا کہنا ہے کہ جدید سماجی ڈھانچے کی بدولت لوگوں پر ذہنی دباؤ میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے لیکن معاشرے نے اس دباؤ کو ختم یا کم کرنے کے لیے مدد کا کوئی نظام نہیں بنایا۔ سماجی طور پر کوئی مدد دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے لوگ خودکشی جیسا قدم اٹھاتے ہیں۔ ماہرین اس خیال سے بھی متفق نہیں ہیں کہ خودکشی کرنے والے لوگوں کی اکثریت نے غربت کی وجہ سے اپنی جان لی۔ ان کا خیال ہے کہ انتہائی مایوسی، بچپن کے حالات اور مسلسل ناکامی جیسے عوامل خودکشی کی بڑی وجوہات ہیں۔ پرانے زمانے میں خانقاہوں میں پریشان حال لوگوں کو مدد مل جاتی تھی۔ وہاں لوگ ان کے دکھ اور پریشانی سنتے تھے جس سے انہیں حوصلہ ملتا تھا لیکن آج کے دور میں کسی سماجی مدد کے نظام کی غیر موجودگی لوگوں میں مایوسی پیدا کر رہی ہے۔

مرسلہ: یوسف وسیم۔ ملتان

تھا کہ کہو تو میں منزل تک پہنچا دوں، مجھے موٹر کاروں کا تجربہ نہیں۔"

"تمہارا شکریہ! میں خرابی دور کرلوں گا۔" یہ کہتے ہوئے ہاشم واپس کار کی طرف پلٹ گیا۔ وہ شخص کھڑا رہا اور اب میری جانب عجیب سی نظروں سے تکنے لگا، اس کے بعد واپس اپنے اونٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"ہیئز...... ہڑہڑڑڑ......" اسے ہشکارے دے کر اُٹھایا لگام تھامی اور ہاشم کی طرف منہ کرکے بہ آواز بلند بولا۔ "ذرا دھیان رکھنا برادر! یہ علاقہ شیخ زاہد کا ہے۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ وہ کیسا آدمی ہے۔"

"ہمیں پتا ہے۔ فی امان اللہ......" ہاشم نے کار کے بونٹ پر جھکے جھکے ہی ہاتھ اُٹھا کر جواب دیا۔ میں نے دیکھا اونٹ سوار کے حلق سے ہلکی سی غراتی ہوئی آواز خارج ہوئی تھی۔ مجھے صاف لگا تھا کہ وہ ہم سے ہماری منزل کے بارے میں جاننے کا متمنی تھا۔ مقصد کی ناکامی پر وہ تپ گیا تھا۔

میں دونوں ٹانگیں پھیلائے اور ہاتھ پہلوؤں پر ٹکائے اسی کی جانب تب تک گھورتا رہا جب تک کہ وہ آگے نہیں بڑھ گیا۔

مجھے لگا تھا کہ یہ ہمارے تعاقب میں چلا آرہا تھا اور اب ہمارے یہاں مجبوری کے باعث ٹھہر جانے کے سبب وہ بھی گڑبڑ گیا تھا کہ اب کہاں کا رخ کرے۔

کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ جدھر جارہا تھا اسی طرف کو بڑھ گیا، میں اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اب اس کی رفتار تیز نہیں تھی۔ وہ یوں چلا جارہا تھا جیسے اب اس کی کوئی منزل یا ہدف نہ رہا ہو۔

وہ کافی دو جا چکا اور ابھی حدِ نظر میں ہی تھا کہ مجھے لگا جیسے وہ رک گیا ہو۔ تاروں کی ٹمٹماتی روشنی میں اس کا اونٹ سوار ہیولا رکا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اس کے ذرا دیر بعد ہی میں نے روشنی سی ہوتے دیکھی۔

"خیریت برادر؟ تم اس طرف اتنے غور سے کسے دیکھ رہے ہو؟"

اچانک ہاشم کی آواز پر میں چونکا۔ وہ جانے کب میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا تھا۔

"وہ دیکھو...... سامنے......" میں نے مذکورہ سمت کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں کوئی روشنی سی ہورہی ہے۔" ہاشم نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی آدمی ہے، لگتا ہے اس نے پڑاؤ ڈال لیا ہے وہاں۔" میں نے کہا۔

"ہمیں اس سے کیا۔" ہاشم بولا۔ "آجاؤ کار کی خرابی دور ہوگئی ہے۔"

ہم دونوں کار میں سوار ہوگئے۔ ہمارے اردگرد مدھم سی روشنی تھی۔ حدِ نگاہ تک صحرا ویران اور خاموش نظر آتا تھا۔

"یہ ہمارے تعاقب میں ہے۔ اس سے ہوشیار رہو ہاشم!" اس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی تو میں نے جیسے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔

"اوہ......! تمہیں کیسے اندازہ ہوا اس بات کا؟" اس نے چونک کر سوال کیا اور میں نے اسے بتا دیا۔ وہ متفکر سا ہو گیا۔ بولا۔ "بڑے محتاط ہو تم اور گہری نظر بھی رکھتے ہو۔ اس لیے یہ ہم سے ہماری منزل دریافت کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن اگر ایسا ہے تو اس کم بخت نے ہماری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ ہم اب اس کی موجودگی میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

"کار روکنا پڑے گی اب......" وہ تھوڑے توقف سے بولا تو میں نے اسے منع کردیا۔

"کار مت روکو۔ میں مزید تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

ہاشم نے ایسا ہی کیا اور کار کی رفتار بڑھادی۔ ہم اس کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ وہ کوئی پیٹرومیکس روشن کیے بیٹھا تھا۔ ہماری کار پر اس نے بھی نظر ڈالی تھی۔

"اب کار کی رفتار دھیمی رکھو۔" میں نے ہاشم کو ہدایت دی۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میری نظریں سائیڈ ویو مرر پر جمی رہیں۔

"اب کار اس ٹیلے کے عقب میں لے جاکر روک دو اور نیچے اُتر آؤ، لائیٹس بھی آف کرو۔" میں نے ایک قریبی ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو نسبتاً بلند تھا۔

ہاشم کار کو اسی طرف بڑھالے گیا اور انجن بند کرکے لائیٹس بھی آف کردیں۔ اس کے بعد ہم اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئے۔

کار چھپ گئی تھی۔ ہم دونوں ٹیلے کی ڈھلان کے اس رخ پر کہنیوں اور سینے کے بل لیٹے لیٹے آگے بڑھے جدھر سے میرے اندازے کے مطابق اسی اونٹ سوار کو گزرنا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بیتی ہوگی کہ مدھم سی روشنی میں اسی اونٹ سوار کا ہیولا ابھرا۔ وہ خاصی تیز رفتاری سے اپنے اونٹ کو دوڑاتا ہوا آرہا تھا۔

"اسے شبہ ہوجائے گا کہ ہم اس ٹیلے کے پیچھے چھپے

...ہیں۔" ہاشم نے میرے ساتھ لیٹے لیٹے سرگوشی کی۔

"جانتا ہوں میں۔ وہ ریت پر بنے ٹائروں کے ...ات کی رہنمائی لے رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یہی مطلب تھا میرا...... لیکن پھر......"

"خاموش۔" میں نے اسے چپ کرایا۔

ذرا ہی دیر بعد ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اونٹ ...ی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور پھر میں نے دیکھا وہ ...لے کے قریب آکر رک گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں ...ونے لگیں۔ میری عقابی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

"...ی...... یہ کم بخت تو واقعی ہمارا......"

"شش...... ش۔" میں نے ہاشم کی سرگوشیانہ بات کاٹ ...اسے خاموش کیا۔

اونٹ سوار چند ثانیے تو سوچنے کے سے انداز میں ...جگہ جمار ہا پھر دوسرے ہی لمحے میری رگ و پے میں ...ہری دوڑ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ...ول دیکھا۔ جسے اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا ...اب ایک ہاتھ سے اونٹ کی باگ تھامے اسے ہشکارے ...کر بٹھا رہا تھا۔ ہاشم کو وہیں رہنے کی تاکید کرکے میں ...طرح لیٹے لیٹے دائیں ہاتھ کی جانب سرکنے لگا۔ یوں کہ ...ی نظریں ایک لمحہ کے لیے بھی اونٹ سوار سے نہ ہٹنے ...پائیں۔

وہ اپنے اونٹ کو ریت پر بٹھا چکا تھا اور اب میں نے ...نے اور اپنے درمیان فاصلہ گھٹانا شروع کردیا۔

وہ ایک تنگ سا چکر کاٹ کر ٹیلے کی اسی جانب محتاط ...از میں بڑھنے لگا جدھر ہاشم نے کار کھڑی کی تھی۔ میں بھی ...جانب سرکتا جارہا تھا اور پھر جیسے ہی میرا اور اس اونٹ ...کا فاصلہ اتنا قریب ہوا کہ میں اس پر باآسانی چیتے کی ...چھلانگ لگا سکتا تھا، میں نے لگادی۔

اس نے بھی شاید میری جھلک بھانپ لی تھی اور اپنے ...تیزی سے میری طرف پلٹ کر گولی داغنی چاہی تھی اور ...بھی ڈالی۔

تاریک صحرا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا، گولی کی آتشیں ...کو میں نے بالکل اپنی کنپٹی کے قریب محسوس کیا۔ نشانہ ...خطا چلا گیا تھا اور تب تک میں اسے رگیدتا ہوا ریت ...

...گرتے ہی میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر ...مارا۔ پستول دور ریت میں جاگرا۔ میرا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی کراہ خارج ہوئی۔ وہ تڑپا، مگر میں اب اسے کہاں سنبھلنے دینا چاہتا تھا۔ دوسرا گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ پھر چیخا، اس کے بعد میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ میرے دونوں ہاتھوں کا شکنجہ اس کی گردن پر تھا۔ اس کے حلق سے خرخراتی آوازیں خارج ہونے لگیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا شکنجہ توڑنے کی تگ و دو میں مصروف تھا مگر کامیاب نہ ہوسکا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ یوں دائیں بائیں ریت پر پھیلا لیے جیسے ہمت ہار چکا ہو، مگر یہ اس کی چالاکی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھی میں ریت بھر کر میرے چہرے پر اُچھال دی۔

مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں میں کسی نے مرچیں بھر دی ہوں۔ میرے حلق سے غراتی ہوئی چیخ نکل گئی۔ بے اختیار میرے دونوں ہاتھوں نے اس کی گردن چھوڑ دی اور میں اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔ اسے مجھ پر حملہ کرنے کا موقع ملا اور مجھے اس نے پرے اُچھال دیا۔ میں چند لمحوں کے لیے اندھا سا ہوگیا تھا۔ اپنے سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا، جیسے آنکھوں میں گھسی ریت کو جھاڑنے کی کوشش کررہا ہوں۔ یہ میرے لیے بے بسی اور اذیت ناکی کے بڑے سنگین ترلمحات تھے۔ میرے مکار مدِمقابل نے مجھے لات مار کے نیچے گرادیا۔ پیٹ پر لگنے والی لات کی ضرب نے مجھے نڈھال سا کرکے رکھ دیا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اندر جوش و غیظ کی چنگاریاں بھر گئیں جو میری تکالیف پر غالب آنے لگیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں، جلن بڑھی، دھندلے خاکے نظر آنے لگے، اسی دوران میں نے حملہ آور کو ریت میں کچھ ڈھونڈتے پایا۔ شاید وہ پستول تلاشنے کی کوشش میں تھا اور پھر اسے شاید وہ مل گیا، وہ جھکا تھا، یہی وہ وقت تھا جب میں نے مغلوب الغضب ہوکے اس پر چھلانگ لگادی۔ ساتھ ہی میری کوشش تھی کہ اس کے پہلو پر ایک لات کی ضرب بھی زوردار انداز میں پڑے۔

میرا حملہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ وہ حلق کے بل چیخا اور گرا۔ تب تک میں کچھ دیکھنے کے قابل ہو چکا تھا، دیکھا کہ پستول اس کے ایک ہاتھ میں تھا۔ وہ مجھ پر فائر کرنے کے لیے تیار تھا، میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔ اسی گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، مگر دوسرے ہی لمحے میری سماعتوں میں اس کی چیخ سنائی دی۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو حیران رہ گیا۔ حملہ آور اپنے ہی خون میں ریت پر تڑپتا ہوا نظر آیا اور اس کے ساتھ

میرے حلق سے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ دیکھا، کار کی ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف ہاشم کھڑا تھا، مگر اس طرح کہ اس کے دونوں ہاتھ کار کی چھت پر تھے اور ان میں پستول دبا ہوا تھا۔

میں حملہ آور کی جانب بڑھا۔ وہ بے سُدھ پڑا تھا۔ گولی نے اس کا سینہ توڑ ڈالا تھا۔ ہاشم بھی وہیں آگیا۔

''افسوس! میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں! تمہاری اگر جان پر نہ بنی ہوتی تو میں بھی اسے ہلاک کرنے کی کوشش نہ کرتا۔'' وہ متاسفانہ لہجے میں بولا۔

''کم از کم پتا تو چلتا کہ یہ کس کے کہنے پر ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا؟'' میں نے کہا۔

''ہمارے مخالف گروپ کے سواء اور کن کا آدمی ہو سکتا ہے یہ بھلا۔'' ہاشم بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آقا محمود کے گھر کی بھی جاسوسی کی جا رہی ہے۔ مجھے تو ان کی جان بھی اب خطرے میں نظر آ رہی ہے۔'' وہ تشویش زدہ ہو گیا۔

''یہ باتیں بعد میں سوچنے کی ہیں، یہ بتاؤ، اس کا کیا کریں؟''

''کیا کرنا ہے، ادھر ہی چھوڑ دو اسے...... صحرائی بھیڑیے اور گدھ اسے ناقابلِ شناخت بنا دیں گے۔ آبادی سے بہت دور کا علاقہ ہے یہ۔''

''تب پھر ہمیں چلنا چاہیے۔'' میں نے کہا اور پھر کار میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

☆......☆

رات اچھی خاصی گہری ہونے تک ہم صرائفہ کی حدود میں داخل ہوئے۔ میں نے دیکھا کار اب سخت سی پتھریلی زمین پر چل رہی تھی۔ پگڈنڈی نما اس راستے پر بے شمار ہیرے چمک رہے تھے۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ کھول لیا تھا اور حیرت سے راہ میں پڑے ان ہیروں کو دیکھ رہا تھا۔

ہاشم شاید میری حیرانی اور دلچسپی کو بھانپتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہیرے نہیں ہیں۔ چمکتی ہوئی ریت کے موٹے ذرّے ہیں جو راتوں میں جگنوؤں کی طرح چمکتے ہیں۔''

''وہ تو میں بھی سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن ان کی چمک واقعی خیرہ کن ہے۔''

''یہ ابرق ہے۔'' اس نے بتایا پھر مستفسر ہوا۔ ''برادر! تمہیں طبقاتِ الارض سے کوئی دلچسپی ہے؟'' ہاشم نے پوچھا۔

''طبقات الارض............؟'' میں سوالیہ انداز بڑبڑایا۔

''ہم...... اس کا مطلب ہے نہیں پتا۔''

''عجیب بات ہے، اس ملک میں طبقات الارض سواء رکھا ہی کیا ہے۔'' وہ بھی بڑبڑایا۔

کار تھوڑی دیر کے بعد روڑوں اور کنکروں پگڈنڈی سے نکل کر ایک پھر نرم ریت پر آہستہ آہستہ لگی۔ اگرچہ ابھی آبادی کے آثار تو نظر نہیں آئے تھے نخلستان ضرور شروع ہو گیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔

''اندھیرے میں صرائفہ کو ڈھونڈ لوگے تم؟'' نے تاریکی کو اُمڈتے دیکھ کر اس سے پوچھا۔

''انشااللہ۔''

تقریباً آدھے گھنٹے بعد کچھ آبادی کے آثار کچے مکانوں کے ہیولوں کی صورت میں دکھائی دینے لگی۔ مسلح لوگوں نے ہماری کار روکی، وہ ہاشم کو تو پہچانتے تھے مجھے نہیں، اس لیے میرے بارے میں استفسار پر ہاشم انہیں مطمئن کرنے لگا۔

کار اب کھجوروں کے ایک باغ کی کچی دیوار ساتھ ساتھ دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اندر معمولی روشنی آ رہی تھی۔ ایک بڑا سا پھاٹک آیا۔ اس کے مجھے کسی محل نما عمارت کے آثار نظر آئے۔ یوں کار پھا سے محل کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ راستے پر بجری بچھی تھی۔ یہاں روشنی کا خاصا بندوبست نظر آ رہا تھا۔

محل کے وسیع و عریض سبزہ زار میں کئی لوگ آ رہے تھے۔ یوں لگا جیسے کوئی بڑی دعوت ہے۔ کھانے وغیرہ کا اہتمام تھا۔

ہاشم نے کار روک دی۔ ہم دونوں نیچے اُتر آئے۔ محل قدیم و جدید طرز کا نمونہ نظر آتا تھا تاہم اس کے بام...... کچھ بوسیدہ سے نظر آئے۔

ایک بھاری بھرکم سیاہ آدمی ہمارے قریب آیا۔ ہی اس نے سب سے پہلے ہاشم سے مصافحہ کیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ یہاں کے لوگ ہاشم کو اچھی طرح پہچانتے ہیں کیونکہ کچھ لوگوں نے تو دور سے ہی سلام کرنے میں اپنے ہاتھ ہلائے تھے۔

''یہ شہزادی صاحبہ کے خاص مہمان ہیں۔'' ہاشم میرا اس...... بھاری بھرکم شخص سے تعارف کراتے ہوئے

تھا۔ موٹا اور ہٹا کٹا ہونے کے باوجود مجھے اس شخص کے اطوار میں نسوانیت محسوس ہوئی۔ وہ شخص ہمیں اپنے ہمراہ محل کے اندر لے گیا۔

غلام گردشوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک چھوٹے کمرے میں آگئے۔ یہ کمرا سبزہ زار سے الگ تھلگ بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں خوبصورت اور منقش قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ بیش قیمت صوفے تھے۔

ایک عرب ہمارے خیر مقدم کے لیے اُٹھا۔ اس کی والی آنکھیں تھیں۔ اس کی ریشمیں قبا میں ایک خوبصورت دستین خنجر اڑسا ہوا تھا۔ جو کاری گری کا واقعی اعلیٰ نمونہ تھا لیکن ایک عجیب بات ہوئی، میں اسے دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔ مجھے یہ آدمی کچھ شناسا معلوم ہوا۔ اچانک سامنے آنے کے باعث میں اسے فوری طور پر پہچاننے سے قاصر تھا۔ تب ہی ذہن پر زور دیا تو یاد آگیا کہ یہ کون ہے۔ جب وہ بالکل قریب آگیا تو میری نظریں اس کے موٹے کالے ہونٹوں پر پڑیں، وہ ہنوز متورم تھے۔ میں نے اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا تھا اور جس کے نتیجے میں یہ سب ہوا تھا اور اس کا ایک سامنے والا دانت بھی ٹوٹا ہوا تھا جو اس نے ابھی تک نہیں لگوایا تھا۔ یہ عرب وہی تھا جس نے جہاز میں ایک معصوم پاکستانی بچے کو تھپڑ رسید کیا تھا، جس کے نتیجے میں وہ دور جا گرا تھا اور اس کا سر پھٹ گیا تھا، میں اسے پہچان کر بھی انجان سا بنا رہا۔ دیکھنا یہ تھا کہ یہ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں۔

''یہ شیخ عالی جاہ ہے، شہزادی صاحبہ کا باڈی گارڈ اور ... بھی۔ لڑائی بھڑائی میں ماہر اور جنگ باز۔''

اس کے قریب آنے تک ہاشم میرے کان میں اس کا تعارف کرا چکا تھا۔

شیخ عالی جاہ نے ہاشم سے بڑے پُرجوش انداز میں مصافحہ کیا پھر میری طرف ہاتھ بڑھایا...... اور اسی وقت مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ وہ بھی مجھے پہچان گیا تھا۔ میں اندر سے پریشان ہو گیا۔ تاہم فضا ایسی تھی کہ میں نے خود کو انجان ہی رہنے دیا اور اگلے ہی لمحے میں حیران ہو گیا۔ اس نے پہلے مجھے پہچانتے ہی اس کے چہرے اور آنکھوں سے غصے کی تند لہری اُبھری تھی مگر اب دوسرے ہی لمحے وہ بھی میری طرح انجان بن گیا۔ تاہم اس دوران ہاشم نے اس سے عربی میں میرے بارے میں چند کلمات کہے تو وہ خوش اور حیرانی کے ساتھ مجھ سے بھی گرمجوشی سے ملا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

''اہلاً و سہلاً مرحبا یا حبیبی! صرائفہ میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ شہزادی صاحبہ بھی آپ سے مل کر یقیناً خوش ہوں گی۔ تشریف رکھیں۔''

جانے کیوں مجھے اس کا انداز تحکمانہ سا محسوس ہوا۔ تاہم آواز میں نرمی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے کوئی شکوہ کیوں نہیں کیا؟ یہ ایک اُلجھا ہوا سوال تھا جو آنکڑے کی طرح میرے حلق میں اٹک رہ گیا تھا۔

اس نے عینک لگا رکھی تھی جس کا فریم نفیس اور رنگ سنہرا تھا۔ عینک کی گولائی اور سنہرے فریم کی وجہ سے اس کی کالی آنکھیں ایک دم توجہ کا مرکز بن جاتی تھیں۔ کمرے میں بیٹھا ہوا دوسرا شخص بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو دیکھ کر مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ یہ اس کا وہی ساتھی تھا جو اس کے ہمراہ جہاز میں تھا اور مجھ سے اس نے بھڑنے کی کوشش بھی کی تھی اور میں نے اس کے لات رسید کر دی تھی مگر دیگر مسافروں نے بیچ بچاؤ کرا دیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ شیخ عالی جاہ کا چھوٹا بھائی سلطان تھا۔ اس کے چہرے پر میں نے پہلے چونکنے کے اور پھر ایکا ایکی غصے کے آثار دیکھے۔ اس نے اپنے بھائی کے کان میں کچھ کہا تھا اور میں نے دیکھا عالی جاہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خود سے پرے کر دیا۔ یقیناً اس نے یہی بتانے کے لیے اس کے کان میں کہا ہوگا کہ میں وہی جوشیلا پاکستانی نوجوان ہوں جس نے چند روز پہلے جہاز کے سفر کے دوران ان دونوں کی ٹھکائی کی تھی۔ میرے اندر زبردست ہیجان سا محسوس ہوا۔ عالی جاہ کا کینچلی بدلنے کا کیا مقصد تھا؟ میں نے خود سے سوال کیا اس لیے کہ میں شہزادی نیلم کا مہمان تھا۔

ہاشم بے چارے کو اس بات کا علم بھی نہ تھا کہ میرے اور ان دونوں عرب بھائیوں کے بیچ کیا ''معاملہ'' تھا۔ ہاشم بھی تھوڑا بدھو ہی ثابت ہوا ورنہ وہ ہمارے چہروں کے یک دم بدلتے تاثرات سے تھوڑا بہت تو اندازہ قائم کر ہی سکتا تھا کہ ہم تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کیوں چونکے تھے۔

عالی جاہ شاید مصلحت سے کام لینے پر مجبور تھا اور میں بھی۔ بہر کیف ہم بھی قالین پر گاؤ تکیوں کا سہارا لے کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

عالی جاہ بھی ہماری آؤ بھگت ہمیں معزز مہمان سمجھ کر ہی کر رہا تھا۔ ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ کچھ

عربی میں کچھ انگریزی میں، اچھی خاصی ایک کھچڑی زبان بولی جاری تھی۔ جس کا لب لباب مختصراً یہی تھا کہ شہزادی نیلم کو ''مہمان'' یعنی میری آمد کا علم نہیں تھا ورنہ وہ میرے استقبال کے لیے خود تشریف لاتیں۔ لہٰذا اب وہ چند قبیلوں کے سرداروں کے ساتھ ایک اہم نوعیت کی میٹنگ میں مصروف تھیں تاہم انہیں میری آمد کے بارے میں بتا دیا جائے گا اور فارغ ہوتے ہی وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے شاہی محل کے مہمان خانے کے ہی ایک گوشۂ خاص میں مجھ سے خود بہ نفسِ نفیس ملاقات کریں گی۔

دو تین خادم چاندی کے جگ اور سلفچیاں اُٹھائے حاضر ہوئے۔ ہمارے ہاتھ دھلائے گئے۔ سادہ چاولوں کی طشتری آئی پھر گوشت کی پلیٹیں۔ ہاشم نے ایسے میں میرے کان میں سرگوشی کی۔

''کچھ پسند آئے نہ آئے، کھانا ہوگا اور ہاتھ سے ہی......''

''فکر نہ کرو، مجھے یہاں کے آداب ملحوظ رکھنے کا ہنر آتا ہے۔'' میں نے بھی اسی سرگوشی میں اسے جواب دیا۔

بھوک لگی ہوئی تھی، میں اور ہاشم کھانے میں مشغول ہوگئے۔ گوشت سخت اور چربی والا تھا۔ اچھی طرح گلایا بھی نہیں گیا تھا۔ تاہم خوش ذائقہ مشروبات کے ساتھ نگلنے کا کام کیا جاتا رہا۔ مربے بھی تھے۔ شہد بھی۔ پراٹھے اور تنوری روٹیاں۔ ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے اور جب سب کھا چکے تھے تو دوبارہ ہمارے ہاتھ دھلوائے گئے۔ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں قہوہ دیا گیا۔ قہوہ پیتے وقت سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ شیخ عالی جاہ کی آواز جسے میں اب تک نرم اور میٹھی سمجھتا رہا تھا دراصل بڑی تیز تھی۔ اک ذرا گستاخی کا بلکہ دوسروں کی تضحیک کا شائبہ بھی لب ولہجہ میں شامل تھا۔ ہاشم نے غالباً دانستہ عربی اور انگریزی زبان اپنا رکھی تھی، مقصد یہی تھا کہ میں بھی بوقتِ ضرورت گفتگو میں شامل ہوسکوں یا پھر سنتا اور سمجھتا رہوں۔

ادھر جب ہاشم اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا کہ راستے میں ہمارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا تو عالی جاہ کے انداز میں تضحیک اور حقارت در آئی تھی۔ میں نے ہاشم کو محمود الحسن کا رقعہ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے دیکھا۔ مجھے ہاشم کے اس فعل پر اعتراض تھا مگر سب کے سامنے میں کچھ کہہ نہ سکا کیونکہ میرا اپنا خیال تھا کہ اگر یہ رقعہ محمود نے شہزادی نیلم کے نام لکھا تھا تو ہاشم نے اس کے باڈی گارڈ کو زحمت کیوں گوارا کی؟

رقعہ پڑھتے ہی عالی جاہ نے کچھ تیز سی نظر میری طرف دیکھا تھا۔ اس دوران اس کا بھائی سلطان کے قریب کھسک آیا تھا اور اونٹ کی طرح گردن آگے رقعہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگا، مجھے یہ سب برا لگ رہا

''اچھا! تو یہ ہمیں غدی والوں سے بچانے آیا'' عالی جاہ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ اس کے تبصرے جز بز ہوا۔ اسے خفت ہوئی۔ اس نے میرے حق میں کچھ بولنا چاہا تھا کہ اونٹ جیسی گردن آگے کیے بدخو عالی جاہ کے بھائی سلطان نے بھی اسی طنزیہ میری طرف دیکھ کر کوئی ایسا جملہ کہا جس کے معنی چہ پدی پدی کا شوربہ تھا۔''

اپنی اہانت پر میں اندر ہی اندر کھولنے بالآخر ہاشم کی طرف دیکھ کر اپنا اُبال اس پر اُنڈیلا۔ ''یہ حرکت ہی صریحاً غلط تھی۔ تمہارے آقا نے یہ خط صرف اور صرف شہزادی نیلم کو دینے کا حکم دیا تھا غلاموں کو نہیں اور خط ایک امانت ہوتا ہے۔''

میری بات پر ہاشم تو بے چارہ خفت سے سر جھکا رہا تھا مگر میں نے دیکھا میری اس ذومعنی تضحیک آمیز نے عالی جاہ اور اس کے بھائی دونوں کو جیسے بھتے اُکھاڑ دیا۔ ایک خنجر میں ہاتھ ڈالا تو دوسرے نے پستول کے دستے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اپنے اندر کا زہر اُگلنے دونوں غبی بھائیوں کو شاید کوئی بہانہ چاہیے تھا اندر سے تھوڑی تشویش ہوئی۔ ''تمہیں جرأت کیسے ہماری شہزادی کا نام لینے کی بخدا! تم اگر مہمان نہ ہو تو ادھر ہی تمہارا خاتمہ کر دیتا۔''

''میں اسی وقت لوٹ جانا چاہتا ہوں۔'' میں ایک دم طیش میں اُٹھتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ بھی اسی میں ایک دم ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''تم شہزادی کے محل کی چھت کے نیچے گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہو نوجوان!'' اس بار سلطان نے طرف غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''ہاشم اگر ساتھ تو......'' اس نے کہتے ہوئے تہدیدی انداز میں دا جملہ اُدھورا چھوڑا تو ہاشم بوکھلا گیا اور ڈرنے والے انداز اس کے اور میرے بیچ میں آتے ہوئے بولا:

''مجھے آپ لوگوں کے اس غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں

آپ ناراض ہوتے ہیں تو ہم عزت مآب شہزادی صاحبہ ملے بغیر ہی واپس چلے جاتے ہیں۔''

''یہی بہتر رہے گا۔'' اس شیخ عالی جاہ نے غصے سے آواز میں کہا۔ وہ اور اس کا بھائی ابھی تک بپھرے ہوئے وہ دونوں مجھے بڑی خوں خوار نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔ ان کے چڑھے ہوئے تیوروں سے لگتا تھا جیسے ان بس چل رہا ہوں کہ یہ ابھی مجھے دبوچ لیں۔

''آؤ نعمان!'' ہاشم نے کہا۔ وہ سخت خوف زدہ اور الگ رہا تھا۔

مجھے بھی وہاں ٹھہرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ ایسی تذلیل نے سوچا بھی نہ تھا۔ خود میرا دماغ مارے طیش کے گرم تھا۔

ہم واپس پلٹے محل سے نکلے۔ ہاشم نے میرا بازو یوں تھا کہ کہیں میں دوبارہ اندر جا کر ان سے بھڑ نہ پڑوں۔

کار تک پہنچے تو میں نے بھی خفگی سے اپنا ہاتھ جھٹکا۔ اپنا چھڑا کر میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ والی سیٹ پر جا بیٹھا۔ ہاشم بھی جلدی سے سوار ہوا اور سنبھالتے ہی کار اسٹارٹ کر دی۔

''ناقابلِ یقین، مجھے دکھ ہوا نعمان صاحب! مم...... معاف......''

''گاڑی آگے بڑھاؤ ہاشم!'' میں جیسے اپنے اندر کے بمشکل قابو پاتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔

اس نے جلدی سے اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی، کار کا اور گیئر ڈال کر اس نے کار آگے بڑھا دی۔

''ی ی...... یقین کرو...... مم...... میرے لیے خود ان کا یہ رویہ انتہائی غیر متوقع اور اچانک تھا۔ بہ خدا اس کوئی قصور نہیں، تت...... تم آقا سے اس کی شکایت''

''تمہارا قصور اس قدر ہے کہ تم نے شہزادی کا خط ان سردو بھائیوں کے کیوں حوالے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میری بہت بڑی بے وقوفی اور غلطی تھی۔'' ایک لمحہ کے بعد وہ پھر حیرانی سے بولا۔ ''میری ابھی تک سمجھ میں نہیں کہ یہ شیخ عالی جاہ اور اس کے بھائی سلطان کو اچانک ہوا تھا؟ وہ کیوں اس قدر بگڑ گئے تھے؟''

میں نے اس کی حیرت کو رفع کرنا ضروری سمجھا اور اسے الفاظ میں جب اس کی وجہ بتائی تو اس نے میری توقع بڑے پُرزور انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔

''ہرگز نہیں...... بالکل نہیں، یہ کوئی اتنی بڑی وجہ نہیں ہو سکتی ان کی ناراضگی کی جبکہ انہیں میں نے بتایا بھی تھا کہ تم شہزادی نیلم کے خصوصی مہمان ہو اور ان کے دشمنوں کی کمزوری بھی۔''

اس کی بات سن کر میں بے اختیار ایک سرد سی ہنکاری بھر کے رہ گیا۔ ہاشم میرے توقعات سے بھی زیادہ بدھو ثابت ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ دونوں غبی اور کینہ پرور بھائی جہاز میں میرے ہاتھوں ذلت اُٹھانے کے بعد مجھے نہیں بھولے تھے۔ پھر بھی میں نے اس کا قیافہ جانچنے کے لیے اس سے پوچھا۔

''تو پھر تمہارا کیا خیال ہوسکتا ہے؟ یہ دونوں اس قدر کیوں طیش میں آ گئے تھے؟''

''یہ دونوں تیز مزاج کے ہیں۔ شہزادی نیلم کے منہ چڑھے بھی۔ ہوسکتا ہے انہوں نے کسی باہر کے آدمی کو اپنی مدد کے لیے آتا دیکھ کر ان کی انا کو ٹھیس پہنچائی ہو۔''

مجھے اس کی بات لغو محسوس ہوئی، میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور بولا۔ ''پھر بھی...... جب تم نے انہیں میرے بارے میں یہ بتایا بھی کہ میں ان کی شہزادی نیلم کا مہمان ہوں اور محمود نے ایک خط کے ساتھ مجھے یہاں بھیجا ہے تو انہیں کچھ تو خیال کرنا ہی چاہیے تھا، چلو میرا انہیں تو اپنی شہزادی کا ہی پاس رکھ لیتے، اور...... تمہارا آقا محمود الحسن ان کا محسن بھی تو تھا۔''

''یہی تو حیرانی کی بات ہے۔'' ہاشم بولا۔

ہماری کار ابھی آبادی کے اندر ہی تھی کہ اچانک فائرنگ کی آواز اُبھری۔ میں بدکا۔ ہاشم خوف زدہ ہوگیا۔ چند ہی ثانیے بیتے، ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ ایک گولی کار کی ونڈ اسکرین کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نیچے جھک گیا۔ فائرنگ مسلسل جاری تھی۔ پھر شور مچ گیا۔ میرا رواں رواں تن گیا۔ میں محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں ہم تو نامعلوم حملہ آوروں کا ٹارگٹ نہیں تھے؟ کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ ایک گولی اور اس طرف آئی تھی اور اگلے ہی لمحے میری تھکی ہوئی سماعتوں میں ''بچاک'' کی آواز ٹکرائی، چھینٹے اُڑتے محسوس ہوئے، اور اسی وقت میرے جھکے جھکے کندھوں پر کسی کا بدن گرا، میں لرز گیا۔ سنبھلا تو یہ ہاشم تھا۔ اس کی کنپٹی میں سرخ روشندان بنا ہوا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب میرے پورے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑتی چلی گئی۔

(جاری ہے)

قربانی

جناب معراج رسول
السلام علیکم
یہ وطن پیارا وطن ہمیں ایسے نہیں مل گیا، ہم نے اس کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔ اس کا ذکر محال ہے۔ آزادی کے ہنگامے میں ایک قربانی شمی ماموں کی بھی ہے۔ ایک عجیب اور منفرد قربانی۔ اُمید ہے قارئین کو میری تحریر پسند آئے گی۔
نسرین منصور
(کراچی)

نام تو ان کا شمیم احمد تھا لیکن سب انہیں شمی کہہ کر بلاتے تھے اور یہی نام ان کی پہچان بن گیا تھا، صرف گھر والے ہی نہیں بلکہ عزیز رشتے دار، دوست اور محلے والے بھی انہیں اسی نام سے پہچانتے تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی اور وہ ہمارے ساتھ رہا کرتے تھے۔ شمی ماموں بڑے مخلص اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ویسے تو وہ سبھی بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے لیکن مجھ سے ان کی گہری دوستی تھی حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں بیس بائیس برس بڑے تھے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم دونوں کی دلچسپیاں اور مشاغل ایک جیسے تھے۔ ہم دونوں ہی لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ اس کے علاوہ اسپورٹس اور سیاست سے بھی دونوں کو ہی گہری دلچسپی تھی۔ میرا بیشتر وقت ان کے ساتھ گزرتا۔ اس لیے مجھ پر ان کی شخصیت کا اثر غالب آگیا۔ وہ صبح کالج جانے سے پہلے اخبار کا مطالعہ کرتے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی آٹھ سال کی عمر میں ہی اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ڈائجسٹوں کا رواج نہیں تھا البتہ وہ باقاعدگی سے ادبی رسائل نقوش، فنون، بیسویں صدی اور نقاد لاتے تھے۔ میں نے بھی وہ رسائل پڑھنا شروع کر دیے لیکن ان کی تحریریں میرے سر پر سے گزر جاتی تھیں۔ انہوں نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے بچوں کے رسائل تعلیم و تربیت اور ہمدرد نونہال منگوا دیے۔

شہر میں جب بھی کوئی نمائش لگتی یا کوئی غیر ملکی کرکٹ ٹیم میچ کھیلنے آتی تو وہ ہمیں وہاں ضرور لے جاتے۔ ہم سے مراد میں اور میرا چھوٹا بھائی ارشد۔ اسے ان چیزوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اگر اس کا دل ہوتا تو چلا جاتا ورنہ صاف منع کر دیتا لیکن میری تو کرکٹ میں جان تھی اس لیے ہر میچ اسٹیڈیم میں جا کر دیکھا۔ پھر مجھے فلمیں دیکھنے کا شوق ہو گیا۔ ماموں کو جب علم ہوا تو وہ مجھے سنیما بھی لے جانے لگے لیکن ابو اس کے سخت خلاف تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر اس چھوٹی عمر میں مجھے فلموں کی لت لگ گئی تو میں پڑھائی پر خواہ توجہ نہیں دے سکوں گا لیکن ماموں نے انہیں قائل کر لیا اور بولے۔ ”اگر ہم نے اسے فلم دیکھنے سے روکا تو یہ اسکول کے لڑکوں کے ساتھ مارننگ شو دیکھنے جائے گا اور ہمیں خبر بھی نہ ہو گی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ کبھی کبھار اسے اپنے ساتھ فلم دکھانے لے جایا کریں



اس طرح اس کا شوق بھی پورا ہوتا رہے گا اور یہ الٹی سیدھی فلمیں دیکھنے سے بھی بچ جائے گا۔“

اس کے بعد ابو کچھ نہ بولے اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ماموں نے یہ احتیاط ضرور رکھی کہ وہ مجھے صرف وہی فلمیں دکھاتے جن میں فحش اور بے ہودہ مناظر نہ ہوں۔ اس زمانے میں فلمی اخبارات باقاعدگی سے نئی فلموں پر تبصرہ شائع کرتے تھے۔ انہیں پڑھ کر ماموں کو فلم کے بارے میں اندازہ ہو جاتا تھا، ویسے ان دنوں نوے فی صد پاکستانی فلمیں صاف ستھری ہوا کرتی تھیں انہیں فیملی کے ساتھ دیکھنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

جوں جوں میں شعور کی منزلیں طے کرتا گیا۔ فلموں سے میری دلچسپی کم ہوتی گئی اور اس کی جگہ کتابوں نے لے لی۔ اس کا سہرا بھی ماموں کے سر تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ مجھے بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق تھا۔ ابتداء بچوں کے رسالوں سے ہوئی پھر میں نے ماموں کی لائبریری سے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے پاس ادبی جرائد کے علاوہ کتابوں کا بھی بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ وہ ہر مہینے دو چار نئی کتابیں ضرور لے کر آتے۔ ان کے کمرے میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتیں۔ کسی کو بھی اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ البتہ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے اتنی رعایت دے دی تھی کہ میں ان کے کمرے میں بیٹھ کر کتاب پڑھ سکتا ہوں اور ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ میں جو کتاب جہاں سے اٹھاؤں گا اسے واپس اسی جگہ پر رکھنا ہوگا۔

شمی ماموں کے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ بیوی بچوں کے جھنجٹ سے آزاد تھے۔ کالج سے آنے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرتے اور شام ہوتے ہی وہ مختلف سرگرمیوں میں مشغول ہو جاتے۔ ادب، صحافت اور سیاست سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ کبھی پریس کلب کبھی آرٹس کونسل تو کبھی کسی مشاعرہ یا ادبی محفل میں پائے جاتے۔ ان کے جاننے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور انہیں آئے دن کسی نہ کسی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ملتا رہتا تھا۔

ویسے تو شمی ماموں ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے لیکن یوم آزادی پر ان کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی تیاری وہ یکم اگست سے شروع کر دیتے تھے، کہنے کو تو ہم سب بڑے جوش و جذبہ سے یوم آزادی مناتے ہیں لیکن عملی طور پر اس جشن میں ہمارا حصہ گھر پر جھنڈا لگانے اور چھٹی سے لطف اندوز ہونے سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن شمی ماموں کے لیے یہ دن ایک تہوار کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی تیاری کئی روز پہلے سے شروع ہو جاتی۔ وہ اپنے خرچ پر خاکروبوں سے محلے کی تمام گلیوں کی صفائی کرواتے۔ جہاں کہیں دیواروں پر اشتہار یا نعرے لکھے ہوتے۔ ان پر سفیدی پھیری جاتی۔ نرسری سے گملے منگوا کر گلی کے ہر موڑ اور چوراہے پر رنگ برنگے پھولوں کا کنج بنایا جاتا۔ تمام گلیوں کو سبز جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے سجایا جاتا۔ جس گھر پر جھنڈا نظر نہ آتا وہاں اپنے پاس سے جھنڈا دے کر لگواتے۔ پورے محلے میں ہر کھمبے پر بانیان پاکستان کی قد آور تصویریں لگائی جاتیں اور مرکزی کیمپ میں دن رات ڈیک پر ملی نغمے گونجتے رہتے۔

چودہ اگست کی صبح ان کی تیاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اتنا اہتمام شاید انہوں نے عید بقرعید پر بھی نہ کیا ہوگا۔ عام دنوں میں وہ صرف جمعہ کی نماز پڑھتے تھے لیکن چودہ اگست کی صبح وہ فجر کے وقت اٹھتے۔ نماز باجماعت ادا کرنے کے علاوہ دو رکعت شکرانہ کے نفل ادا کرتے اور ناشتا کرنے کے بعد محلے والوں کو لے کر مزار قائد روانہ ہو جاتے۔ وہاں جانے کے لیے ایک بس کا انتظام کیا جاتا۔ واپس آنے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی۔ دیگیں چڑھتیں اور پورے محلے میں بریانی اور زردہ تقسیم ہوتا۔

یہ سارا خرچ وہ اپنی جیب سے پورا کرتے۔ کئی مرتبہ محلے والوں نے اس میں اپنا حصہ ڈالنے کی پیشکش کی لیکن ماموں نے صاف انکار کر دیا اور کہا۔ ''یہ دھرتی میری ماں کی طرح ہے۔ اس نے مجھے اپنی آغوش میں پناہ دی ہے۔ میں ساری عمر اس احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔ ان چند روپوں کی کیا حقیقت ہے۔''

وہ پکے محبِ وطن تھے اور وطن سے اپنی محبت کا اظہار محض زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر کیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب 65ء کی جنگ ہوئی اور حکومت نے دفاعی فنڈ قائم کیا تو وہ اس کے لیے رقم جمع کرنے میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے براہ راست کسی سے کچھ نہیں لیا۔ البتہ اپنے رشتہ داروں، قریبی دوستوں، محلے والوں اور کالج کے ساتھیوں کو اس فنڈ میں حصہ ڈالنے کی ترغیب دیتے رہے۔

ماموں ایک بھرپور اور مصروف زندگی گزار رہے تھے۔ بظاہر انہیں کوئی غم نہیں تھا۔ وہ ہم لوگوں میں مگن رہتے۔ میں تعلیمی مدارج طے کرتا ہوا کالج میں آ گیا تھا اور بہت سی باتیں میری سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ بعض اوقات میں نے محسوس کیا کہ ماموں باتیں کرتے کرتے کہیں کھو جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں ایک بے نام سی اداسی تیرنے لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ تنہائی ہو۔ انہوں نے شادی جو نہیں کی تھی، اگر بیوی بچے ہوتے تو شاید ان کی یہ کیفیت نہ ہوتی۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال میرے ذہن میں سر اٹھانے لگتا۔ ''آخر کیا وجہ ہے کہ ماموں نے شادی نہیں کی۔''

اس سوال کا جواب مجھے کون دیتا؟ ماموں سے براہ راست پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ مجھ سے [illegible] بہت بڑے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان کے شا[illegible] کرنے کی کیا وجہ تھی۔ ممکن ہے کہ کچھ ایسے حالا[illegible] گئے ہوں جن کی وجہ سے ان کی شادی نہ ہو سکی [illegible] بہت سوچنے کے بعد میرے ذہن میں ایک ہی با[illegible] کہ شاید ماموں کسی لڑکی کو پسند کرتے ہوں، [illegible] شادی کہیں اور ہو گئی ہو اور وہ ابھی تک اس کی یاد [illegible] سے لگائے بیٹھے ہوں۔

مجھے سب سے زیادہ حیرت امی پر تھی۔ [illegible] زبان پر ایک دفعہ بھی ماموں کی شادی کا ذکر نہیں [illegible] وہی ماموں کی سرپرست تھیں۔ اس لیے لازما [illegible] ماموں کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا [illegible] کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ جب پاکستان [illegible] بائیس سال کے تھے۔ اس وقت ان کی عمر [illegible] بیالیس سال ہوگی۔ بظاہر ان میں کوئی خامی نہ [illegible] مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ تھے۔ لمبا قد [illegible] گھنگریالے بال، فراخ پیشانی، بادامی آنکھیں [illegible] ہونٹ اور ان پر ہلکی سیاہ مونچھیں۔ وہ عموماً سفید [illegible] اور سیاہ پینٹ پہنتے تھے جس میں ان کی شخصیت ا[illegible] جاتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ انہیں ایک سے ایک [illegible] لڑکی مل سکتی تھی۔

انہی دنوں نوشابہ باجی ہمارے یہاں ر[illegible] لیے آئیں۔ وہ رشتہ میں ان کی کزن تھیں او[illegible] والدین کے ساتھ حیدرآباد میں رہتی تھیں۔ ان کی [illegible] ملازمت لگی تھی اور وہ اسی ...... سلسلے میں کرا[illegible] تھیں۔ ان کے آنے سے ہمارے گھر میں بڑی [illegible] ہو گئی تھی۔ وہ بڑی مسحور کن شخصیت کی مالک تھیں [illegible] رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک اور [illegible] بال۔ وہ بے حد ہنس مکھ، شستہ مزاج اور نرم گفتار [illegible] اپنے سے چھوٹوں کو بھی آپ کہہ کر مخاطب کر[illegible] بڑوں کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آتیں [illegible] چھوٹی دونوں بہنیں ان سے بہت جلد گھل مل گئیں [illegible] وقت ان کے ساتھ چپکی رہتیں۔

نوشابہ باجی کو دیکھ کر میرے دل میں پہ[illegible] یہی آیا کہ اگر ان کی شادی شمی ماموں سے ہو [illegible] کتنا اچھا ہو۔ میری نظر میں وہ ایک آئیڈیل جو[illegible] لیکن پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ نوشابہ باجی [illegible]

وغیرہ تو نہیں ہوئی؟ ان کے ہاتھ میں انگوٹھی نہ دیکھ کر مجھے کسی حد تک اطمینان تو ہو گیا۔ اگر ان کا کہیں رشتہ طے ہو گیا ہوتا تو وہ ایک الگ بات تھی۔ میں نے سوچا کہ کسی وقت موقع دیکھ کر امی سے پوچھوں گا۔

نوشابہ باجی اپنی شگفتہ مزاجی اور ہنس مکھ طبیعت کی وجہ سے بہت جلد ہم چاروں بہن بھائیوں سے بے تکلف ہو گئیں۔ وہ فارغ وقت میں ہمارے ساتھ لوڈو، کیرم اور تاش کھیلتیں۔ ہمیں آئس کریم کھلانے لے جاتیں اور رات کو دیر تک ہمارے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گپیں لگاتیں لیکن شمی ماموں سے ان کی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی ان دونوں کا سامنا عموماً رات کے کھانے پر ہی ہوتا تھا ورنہ شمی ماموں اپنا زیادہ وقت باہر ہی گزارتے تھے۔

یہ صورتِ حال میرے لیے بڑی مایوس کن تھی۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ وہ جلد از جلد ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔ ان کے درمیان کچھ بے تکلفی بڑھے۔ وہ ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں تو میں موقع دیکھ کر امی کے کان میں ان کے رشتہ کی بات ڈال دوں لیکن وہ جس طرح ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے۔ اس سے مجھے بڑی مایوسی ہو رہی تھی اور میں مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ انہیں کس طرح قریب لایا جائے۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ امی، ابو اور دونوں چھوٹی بہنیں چچا کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ چھوٹا بھائی بھی کسی کام سے باہر نکلا ہوا تھا اور میں لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا کہ نوشابہ باجی اپنے کمرے سے باہر آئیں اور مجھے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔ ''کیا ہو رہا ہے ہیرو؟''

مجھے کرکٹ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور جب ٹی وی پر کوئی میچ آ رہا ہو تو میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے چڑ کر کہا۔ ''میچ دیکھ رہا ہوں۔''

انہوں نے میرے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس کوئی کتاب ہے، میرا کچھ پڑھنے کا موڈ ہو رہا ہے۔''

''میرے پاس تو صرف کورس کی کتابیں ہیں۔ اگر چاہیں تو وہ دے سکتا ہوں۔''

''انتہائی بدذوق ہو تم بھی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔ ''ارے بھئی میں فکشن کی کتاب مانگ رہی ہوں کوئی ناول یا افسانوں کا مجموعہ۔''

''ایسی کتابیں تو ماموں کے پاس ہی مل سکتی ہیں اگر آپ کہیں تو ان سے لا دوں۔''

''وہ دے دیں گے؟''

''ویسے تو وہ اپنی کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے۔ مجھے صرف اتنی اجازت ہے کہ ان کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے ساتھ وہ کچھ رعایت کر دیں۔''

''اچھا، کوشش کر کے دیکھ لو۔ میں یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرتی ہوں۔''

میچ دلچسپ مرحلہ میں داخل ہو چکا تھا اور میرا ٹی وی کے سامنے سے اٹھنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں نے باجی سے کہا۔ ''آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ دس پندرہ منٹ میں میچ ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد میں آپ کو کتاب لا دوں گا۔''

وہ بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گئیں اور جب انہوں نے بال ٹو بال تبصرہ شروع کیا تو میں سمجھ گیا کہ انہیں بھی کرکٹ سے کافی لگاؤ ہے۔ میچ ختم ہوا تو میں جھجکتے ہوئے ماموں کے کمرے میں داخل ہوا۔ ماموں کی ایک عجیب عادت تھی جب وہ کمرے سے باہر ہوتے تو گھر کے ہر فرد سے خوب اچھی طرح گھل مل کر باتیں کیا کرتے لیکن کمرے کے اندر تنہائی کی چادر اوڑھ لیتے اور انہیں کسی کی بھی مداخلت ناگوار گزرتی۔ میں ان کی اس عادت سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے حتی الامکان ان کے کمرے میں جانے سے گریز کرتا۔

اس وقت بھی میری ہچکچاہٹ کی یہی وجہ تھی لیکن باجی کی کتاب لینے کے لیے مجھے جانا پڑا۔ وہ راکنگ چیئر پر آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ میں نے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔ ''ماموں۔''

انہوں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور مجھے دیکھ کر یوں شرمندہ ہو گئے جیسے کوئی فحش فلم دیکھتے ہوئے پکڑے گئے ہوں پھر ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور وہ شگفتہ لہجے میں بولے۔ ''یار اتنا اچھا سین چل رہا تھا تم نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔''

''اچھا کیا سین تھا وہ؟'' میں نے انہیں چھیڑنے

کی خاطر کہا۔
"باراتوں کی برات۔" وہ آہستہ سے بولے۔ "لیکن تم نہیں سمجھو گے۔ خیر یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟"
"وہ...... وہ نوشابہ باجی کتاب مانگ رہی ہیں۔"
"کون سی کتاب؟" وہ چونکتے ہوئے بولے۔
"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" میں نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ کچھ پڑھنے کا موڈ ہو رہا ہے۔ اگر کوئی کتاب ہو تو دے دو۔"
"اچھا۔" انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ان سے کہو کہ وہ خود آکر اپنی پسند کی کتاب نکال لیں۔"
میں نے نوشابہ باجی کو بھی ماموں کا پیغام پہنچایا تو وہ کچھ شرماتی اور جھجکتی ہوئی میرے ساتھ ماموں کے کمرے میں آگئیں اور حیرت سے الماریوں میں رکھی کتابوں کو دیکھنے لگیں۔ ان کے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ماموں کے پاس کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے۔ وہ ہر الماری پر جاکر ایک کتاب نکال لیتیں۔ اس کی ورق گردانی کرتیں پھر اسے اپنی جگہ پر رکھ دیتیں۔ بالآخر تھوڑی سی تلاش کے بعد انہوں نے اپنے لیے ایک کتاب منتخب کرلی اور ماموں سے بولیں۔
"میں دو تین دن میں پڑھ کر واپس کردوں گی۔"
"کوئی جلدی نہیں ہے۔" ماموں نے کہا۔ "آپ اطمینان سے پڑھیں۔ البتہ ایک گزارش ہے۔"
"وہ کیا؟" نوشابہ باجی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔
"کتاب پڑھ کر مجھے واپس کریں گی۔ یہ نہ ہو کہ اِدھر اُدھر رکھ دیں اور میں پورے گھر میں ڈھونڈتا پھروں۔"
"بے فکر رہیں۔ میں آپ کو ہی واپس کروں گی بلکہ جہاں سے نکالی ہے اسی جگہ رکھ دوں گی۔"
یہ ماموں اور نوشابہ باجی کے درمیان پہلا براہ راست مکالمہ تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ نوشابہ باجی کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ انہیں مزے مزے کی کتابیں پڑھنے کے لیے مل رہی تھیں۔ اب وہ کتاب لینے اور واپس کرنے کے لیے بلا روک ٹوک ماموں کے کمرے میں چلی جاتیں لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان بے حجابانہ گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی۔ اگر نوشابہ باجی کوئی بات کرتیں تو ماموں ہوں ہاں میں اس کا جواب دیتے جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ صنف نازک کو اپنے قریب آنے کا موقع نہیں دینا چاہتے۔
میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جڑ پکڑ رہی تھی کہ ماموں اور نوشابہ باجی کی شادی ہو جائے۔ جب نوشابہ باجی نے کتابیں لینے کے لیے ماموں کے کمرے میں جانا شروع کیا تو میں بہت خوش ہوا، اور یہ اُمید بندھ گئی کہ اسی بہانے ان کے درمیان اجنبیت کی دیوار گر جائے گی اور آہستہ آہستہ یہ ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تین مہینے گزر جانے کے بعد بھی معاملہ رسمی حد تک ہی محدود رہا تو مجھے تشویش ہونے لگی۔
نوشابہ باجی کے جانے کے دن قریب آرہے تھے لہٰذا میں نے راست اقدام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اس بارے میں ماموں کا عندیہ معلوم کرکے رہوں گا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ یہی کہ وہ مجھے ڈانٹ دیں گے۔ میں اس کے لیے بھی تیار تھا لیکن مجھے ایک موہوم سی اُمید تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ماموں نے نوشابہ باجی کو اس نظر سے نہ دیکھا ہو اور اگر میں ان کے کان میں یہ بات ڈال دوں تو شاید وہ اس بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔
ایک دن میں موقع دیکھ کر ان کے کمرے میں گیا تو وہ ہمیشہ کی طرح آنکھیں بند کیے راکنگ چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے قریب جاکر انہیں آہستہ سے آواز دی تو انہوں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور قدرے ناگواری سے بولے۔ "کیا بات ہے؟"
میں سمجھ گیا کہ انہیں اس وقت میرا آنا اور آواز دینا اچھا نہیں لگا۔ شاید میں ان کی تنہائی میں مخل ہوا تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "شاید میں غلط وقت پر آگیا۔ ٹھیک ہے آپ آرام کریں میں بعد میں آجاؤں گا۔"
"نہیں اب آ ہی گئے ہو تو بات بھی کرلو۔" انہوں نے کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کروں۔ میں ان سے عمر میں چھوٹا تھا اور جو بات کرنا چاہ رہا تھا وہ میرے قد سے بہت اونچی تھی۔

میں نے نپے تلے لفظوں میں کہنا شروع کیا۔
"میری ایک درخواست ہے۔"
"وہ کیا؟"
"جو بات میں آپ سے کہنے والا ہوں اگر وہ انہیں نہ لگے تو غصہ کرنے یا ناراض ہونے کی بجائے اسے درگزر کردیجیے۔ سمجھ لیں کہ میں نے کچھ نہیں کہا اور آپ نے کچھ نہیں سنا۔"
"اوہو بھئی! ایسی کیا خاص بات ہے جس کے لیے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی جا رہی ہے۔"
"خاص بات ہی سمجھ لیں۔"
"اچھا بھئی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری کسی بھی بات کا برا نہیں مانوں گا۔ اب تم جلدی سے کہہ ڈالو۔"
"ماموں یہ بتائیں کہ آپ کو نوشابہ باجی کیسی لگتی ہیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"یہ نوشابہ بیچ میں کہاں سے آگئیں۔" ماموں نے چونکتے ہوئے کہا۔ "تم تو کوئی خاص بات کرنے والے تھے؟"
"انہی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ پہلے بتائیں کہ وہ آپ کو کیسی لگتی ہیں؟"
"میں کیا بتاؤں بس ٹھیک ہیں۔ جیسی ہوتی ہیں عام لڑکیاں، بظاہر تو ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔"
"گڈ! اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ کو اچھی لگتی ہیں؟"
"چلو یونہی سمجھ لو۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولے۔ "اگر تم مجھ سے اپنی مرضی کا جواب سننا چاہتے ہو تو یہی سہی۔"
"اگر آپ دونوں کی شادی ہو جائے تو کیسا رہے گا؟"
وہ ایسے اچھلے جیسے میں نے توپ کا گولہ داغ دیا ہو پھر قدرے تیز لہجے میں بولے۔ "پاگل ہوگئے ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"
"کیوں نہیں ہوسکتا۔ میرے خیال میں تو آپ دونوں کی جوڑی بڑی پرفیکٹ رہے گی۔"
"بالکل نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم دونوں کی عمروں میں بہت فرق ہے اور اس سے بھی زیادہ مضبوط بات یہ ہے کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"
"عمر کا فرق تو اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔" میں نے بحث کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔
"یہاں تو ستر سال کے بوڑھے سولہ سال کی لڑکی سے شادی کرلیتے ہیں اور آپ تو زیادہ سے زیادہ چالیس یا بیالیس کے ہوں گے۔ البتہ دوسرا نکتہ قابل غور ہے۔ شادی نہ کرنے کی وجہ بتائیں گے آپ؟"
"تمہارے لیے ہر بات جاننا ضروری نہیں۔" انہوں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی میں اس سوال کا جواب دیتے دیتے تنگ آچکا ہوں۔ بیس سال سے یہی سوال میرا پیچھا کر رہا ہے۔"
"ظاہر ہے کہ لوگ سوال تو کریں گے۔" میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا۔ "جب آپ جیسا پڑھا لکھا اور ہینڈسم شخص شادی سے انکار کردے تو لوگوں کے دلوں میں تجسس پیدا ہونا فطری بات ہے۔ جس طرح میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوگیا ہوں کہ آپ شادی کرنا کیوں نہیں چاہتے۔"
"اس لیے کہ میں کسی لڑکی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا۔" ماموں نے آہستہ سے کہا۔ "میں اسے وہ محبت نہیں دے سکوں گا جو اس کا حق ہے۔"
"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"کیونکہ میرے دل میں کسی اور کی محبت بسی ہوئی ہے۔ میں اس سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔"
"اگر آپ کسی اور سے محبت کرتے ہیں تو اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتے؟"
"یہی تو المیہ ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ "اس کی شادی کسی اور سے ہو چکی ہے۔"
"پھر آپ اس کی یاد کو سینے سے لگائے کیوں بیٹھے ہیں آپ بھی اپنا گھر بسالیں۔"
"یہی تو مشکل ہے بیٹا جی۔ انسان زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتا ہے۔ وہی پہلی اور آخری محبت ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو رشتے بنتے ہیں ان کی بنیاد ضرورت یا ہوس ہوتی ہے۔ اس میں محبت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔"
"مجھے تو یہ شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں جیسی لو اسٹوری لگ رہی ہے۔" میں نے جھکتے ہوئے کہا۔
"ماموں یہ بتائیں کہ جس لڑکی سے آپ محبت کرتے تھے اس سے آپ کی شادی کیوں نہ ہوسکی؟"

’’بس یوں کہہ لو کہ قسمت میں نہیں تھا۔‘‘ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولے۔

’’نہیں ماموں آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔ پوری بات بتائیں کہ ان محترمہ سے آپ کی شادی کیوں نہ ہو سکی۔‘‘

’’ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں پوری بات بتا دی جائے تاکہ جان سکو کہ بعض اوقات انسان کو کسی عظیم مقصد کی خاطر اپنی محبت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں ماموں۔‘‘ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ’’کیا محبت سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے؟‘‘

’’میں وہی بتا رہا ہوں۔‘‘ شمی ماموں بولے۔

’’اب تم خاموشی سے سنتے جاؤ۔ بیچ میں بولنا نہیں ورنہ تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہم دہلی میں رہا کرتے تھے۔ میرے والد یعنی تمہارے نانا اجمل خان روہتک کے زمین دار تھے لیکن بچوں کی پڑھائی کی خاطر انہوں نے دہلی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ برابر میں ہی چچا اکمل خان کا گھر تھا۔ ان کی جامع مسجد کے پاس ہی کپڑے کی دکان تھی اس کے علاوہ زمینوں سے بھی پیسا آتا تھا۔ وہ ہمارے مقابلے میں بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ اسی لیے چچی کی گردن میں سریا فٹ ہو گیا تھا اور وہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی تھیں۔

جہاں آراء انہی کی بیٹی تھی جیسا کہ اس زمانے میں رواج تھا کہ گھر کی بڑی بوڑھیاں بچوں کی پیدائش پر ہی ان کے رشتے طے کر دیا کرتی تھیں۔ اسی طرح جب جہاں آراء پیدا ہوئی تو ہماری دادی نے اعلان کر دیا کہ اسے تو میں اپنے شمی کی دلہن بناؤں گی۔ چچی کو غالباً یہ بات پسند نہیں آئی لیکن ان میں دادی کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ لہٰذا وقتی طور پر خاموش ہو گئیں لیکن بعد میں وقت آنے پر انہوں نے ایک ہی دفعہ میں کسر پوری کر لی۔

میں اور جہاں آراء اکٹھے کھیل کود کر جوان ہوئے۔ بچپن سے ہی ہم دونوں میں بڑی قربت تھی گو کہ ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوا کہ دادی نے بچپن میں ہی ہماری نسبت طے کر دی تھی۔ اس کے باوجود ہم دونوں غیر محسوس طریقے سے قریب آتے گئے اور ہمارے درمیان ایک ان دیکھا رشتہ پروان چڑھتا گیا۔ اس کے دونوں بھائی چھوٹے تھے۔ اس لیے وہ اپنے کاموں کے لیے مجھ سے ہی کہتی اور میں بھی دوڑ دوڑ کر اس کے کام کیا کرتا تھا۔ اس کی فرمائش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی اور مجھے اس کے کام کر کے دلی خوشی حاصل ہوتی تھی۔

یونہی ہنستے کھیلتے ہم بڑے ہو گئے۔ ان دنوں میں عربک ہائی اسکول میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ امتحان سر پر آ گئے تھے اس لیے میں سب کچھ بھول کر پڑھائی میں لگا ہوا تھا۔ اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ایک دن پہلے بھی بڑے زور کا مینہ برسا تھا جس کی وجہ سے گلیاں اور سڑکیں ندی نالوں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

میں برآمدے میں بیٹھا اپنا ہوم ورک کر رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے اگلے دن ہونے والے ٹیسٹ کی بھی تیاری کرنا تھی۔ اتنے میں جہاں آراء آ گئی اور میرے ہاتھ پر ایک سکہ رکھتے ہوئے بولی۔ ’’ذرا جلدی سے جا کر دو پیسے کی املی تو لا دو۔ میں پکوڑے تل رہی ہوں لیکن چٹنی بنانے کے لیے املی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر پکوڑوں کا کیا مزہ۔‘‘

میں نے وہ سکہ اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ’’اس وقت میں کہیں نہیں جا سکتا۔ کل میرا ٹیسٹ ہے۔ اس کی تیاری کر رہا ہوں۔‘‘

پڑھائی کا تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل میں باہر نکلنے سے کترا رہا تھا کیونکہ گلی پانی سے بھری ہوئی تھی اور پتھروں پر پیر رکھ کر وہاں سے گزرنا پڑتا۔ اگر بارش ہو جاتی تو میں سر سے پیر تک پانی میں بھیگ جاتا۔ پھر گھر آ کر نہانا پڑتا۔ کپڑے بدلنا ہوتے اور اس میں مزید ایک گھنٹا ضائع ہو جاتا۔

وہ روہانسی صورت بناتے ہوئے بولی۔ ’’اوہو تمہیں کون سا میلوں دور جانا ہے۔ یہ دو قدم پر تو دکان ہے۔ زیادہ سے زیادہ آنے جانے میں پانچ منٹ لگیں گے۔‘‘

’’کہہ دیا نا کہ اس وقت میں کہیں نہیں جا سکتا۔ اگر املی نہیں ہے تو کیا ہوا۔ چٹنی کے بغیر بھی پکوڑے کھائے جا سکتے ہیں۔‘‘

یہ سنتے ہی وہ رونے لگی۔ اتفاق سے اس وقت اناںبی وہاں سے گزریں۔ انہوں نے جہاں آراء کو روتے ہوئے دیکھا تو لپک کر اس کے پاس آئیں اور اسے گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ ''اے ہے، کیا ہوا میری بچی کو؟ کیوں رو رہی ہے؟''

اناں بی ہمارے گھر کی پرانی ملازمہ تھیں۔ سب بچوں کو انہوں نے ہی گود میں کھلایا تھا۔

''اناں بی۔'' جہاں آراء منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''میں نے شمی سے املی لانے کے لیے کہا تھا۔ اس نے صاف منع کردیا۔ اب میں پکوڑوں کے لیے چٹنی کیسے بناؤں۔''

''بری بات ہے شمی بیٹا۔'' اناں بی میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''اگر اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی کرو گے تو بعد میں کیا ہوگا۔ تم دونوں کو تو ساری زندگی ساتھ رہنا ہے۔''

انہوں نے فارسی نہیں بولی تھی اور نہ ہی میں دودھ پیتا بچہ تھا جو ان کی بات کا مفہوم نہ سمجھتا پھر بھی میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

اناں بی مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تم دونوں کی نسبت بچپن میں ہی طے ہوچکی ہے۔ بس تمہاری پڑھائی ختم ہونے کا انتظار ہے۔ اس کے بعد تم دونوں کی شادی کردی جائے گی۔''

اناں بی تو یہ شوشہ چھوڑ کر چلی گئیں اور ہم ٹک ٹک دیدم کے مصداق ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ہمارے لیے یہ انکشاف بالکل غیر متوقع تھا پھر اچانک ہی جہاں آراء نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا اور دوڑتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔ جب پوری بات میری سمجھ میں آئی تو میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے لیے املی لینے چلا گیا۔

اس دن کے بعد جہاں آراء میرے سامنے آنے سے کترانے لگی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ مجھ سے مکمل پردہ کرلی کیونکہ ہر وقت ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا لیکن اب وہ مجھ سے شرمانے لگی تھی اور مجھے دیکھ کر اِدھر اُدھر ہوجاتی۔

میں نے میٹرک پاس کیا تو ابا جان نے مجھے مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا۔ میں جہاں آراء سے دور نہیں ہونا چاہتا تھا اور میری خواہش تھی کہ دہلی کے ہی کسی کالج میں داخلہ لے لوں لیکن ابا جان سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ علی گڑھ جانے سے پہلے مجھے جہاں آراء سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ صبح سویرے چھت پر جاکر کبوتروں کو دانہ ڈالتی تھی۔ میں بھی اپنی چھت پر چلا گیا۔ دونوں گھروں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ درمیان میں صرف ایک منڈیر تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی دوپٹا سر پر لے لیا اور منہ دوسری طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''ہائے اللہ آپ یہاں کیوں آگئے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟''

وہ پہلے مجھے تم کہا کرتی تھی۔ اب آپ پر آگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے مجھے دل سے اپنا ہونے والا مجازی خدا تسلیم کرلیا تھا۔ میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ ''اول تو اس وقت یہاں کوئی آئے گا نہیں اور اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہوگا آخر ہم پہلے بھی تو آزادانہ طور پر ملتے تھے۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔'' وہ شرماتے ہوئے بولی۔ ''اب ہمیں ایک دوسرے کے سامنے آنے سے گریز کرنا چاہیے۔''

''تم خوامخواہ پریشان ہورہی ہو۔ ابھی تک ہمارے والدین کے علاوہ کسی کو اس رشتے کے بارے میں علم نہیں۔ اس لیے اگر کسی نے ہمیں باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔''

''پھر بھی ہمیں احتیاط کرنی چاہیے جس طرح اناں بی کو یہ بات معلوم ہے ہوسکتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس بارے میں جانتے ہوں۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تم اس رشتے سے خوش ہو؟''

''آپ خوش ہیں؟'' اس نے الٹا مجھ سے ہی سوال کردیا۔

''بہت زیادہ۔ اس خوشی کو میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔''

''بس تو میں بھی بہت خوش ہوں۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ میں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ جارہا ہوں۔ دل تو نہیں چاہ رہا لیکن مجبوری ہے۔''

''آپ ضرور جائیں۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے اور پھر......''

''اور پھر ہمارے ملن میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔'' میں نے اس کا جملہ پورا کردیا۔

''انشاء اللہ۔'' وہ شرماتے ہوئے بولی اور نیچے چلی گئی۔

تحریک آزادی شروع ہوچکی تھی اور علی گڑھ یونیورسٹی اس کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ ویسے تو پورے ہندوستان کی فضا آزادی کے نعروں سے گونج رہی تھی لیکن علی گڑھ کے طلبہ اس میں سب سے آگے تھے۔ قائداعظم نے انہیں تحریک آزادی کا ہراول دستہ قرار دیا تھا۔ وہ جب علی گڑھ آئے تو میں بھی ان کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں طالب علموں کو تلقین کی کہ وہ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اپنے اصل مقصد یعنی تعلیم پر بھی توجہ دیں کیونکہ کل آپ کو ہی اس نوزائیدہ مملکت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ میں نے اسی وقت عہد کرلیا کہ اپنے آپ کو پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کردوں گا۔

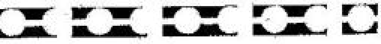
میں چھٹیوں میں گھر آیا تو تحریک آزادی اپنے آخری مراحل میں داخل ہوچکی تھی۔ گلی گلی جلسے جلوس نکل رہے تھے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ تحریک کی شدت میں اضافہ ہورہا تھا۔ کانگریس تقسیم ہند کی مخالف تھی اور کچھ مسلمان رہنما مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد قیام پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام مسلمان بھی دو حصوں میں بٹ گئے۔ یوپی اور بہار کے مسلمانوں کو معلوم تھا کہ ان کا علاقہ پاکستان میں شامل نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود انہوں نے تحریک آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

ہمارے خاندان میں بھی اس معاملے پر واضح تقسیم ہوگئی تھی۔ ابا جان پکے مسلم لیگی تھے گو کہ انہوں نے کبھی جلسے جلوسوں میں شرکت نہیں لیکن وہ اس جدوجہد میں خاموش سپاہی کا کردار ادا کرتے رہے اور جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو وہ بھی برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں کی طرح اپنے آباؤاجداد کی قبریں، گھربار اور جائیدادیں چھوڑ کر پاکستان جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

وہ میری زندگی کا مشکل ترین دور تھا کیوں کہ چچا کسی طرح بھی اپنا آبائی وطن چھوڑ کر پاکستان جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دونوں بھائیوں میں اس مسئلے پر روزانہ بحث ہوتی۔ ابا جان انہیں پاکستان جانے کے فوائد اور ہندوستان میں رہنے کے نقصانات سے آگاہ کرتے اور چچا جان سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا کی رٹ لگاتے رہتے۔ ان پر ابوالکلام کی سوچ غالب آگئی تھی۔

وہ ہمیشہ اپنی بیوی کے کہنے پر چلتے تھے۔ چچی نے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ یہاں تمہارا اچھا خاصا جما جمایا کاروبار ہے۔ زمینیں ہیں اور اگر بھائی صاحب پاکستان چلے گئے تو ان کی زمینیں بھی تمہارے تصرف میں آجائیں گی۔ وہاں کیا رکھا ہے نہ گھر نہ کاروبار۔ سب کچھ نئے سرے سے کرنا پڑے گا۔ اجنبی لوگ، اجنبی ماحول۔ نہ جانے وہاں کیسے رویوں اور سلوک کا سامنا کرنا پڑے وغیرہ وغیرہ۔

دراصل چچی کے میکے والے بھی پاکستان جانے



ویتنام کے دارالحکومت ہنوئی میں ایک نوجوان کا رشتہ اپنی محبوبہ سے ختم ہوا تو اس کے دماغ میں ایک اچھوتا خیال آیا جس کے تحت اس نے ایک بازار لا میں ''اولڈ فلم'' کی بنیاد رکھی جہاں پر اس نے اپنی محبوبہ سے وابستہ تمام تحائف وغیرہ سجا کر رکھ دیئے اور پھر یہ سلسلہ یوں چلا کہ فروری 2017ء کے بعد اس جگہ پر اپنے محبوب سے وابستہ مختلف اشیاء لانے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا کیونکہ ناکام محبت کے بعد گھر میں رکھی اشیاء دیکھ کر وہ تکلیف میں مبتلا ہوتے تھے۔ اب اس بازار میں مختلف اشیاء موجود ہیں جن میں سے ہر ایک پر قیمت کی چٹ لگی ہوئی ہے۔ بازار میں ایک بورڈ بھی لگایا گیا ہے جہاں لوگ اپنے سابق محبوب کے نام کوئی پیغام بھی لکھ سکیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتے ہیں۔ یہاں اشیاء بیچنے والوں کا کہنا ہے کہ وہ مال نہیں بلکہ اپنی حسین یادیں فروخت کرتے ہیں۔





کے خلاف تھے۔ وہ انہی کی زبان بول رہی تھیں۔ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ پاکستان جانے کے بعد وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی شکل دیکھنے کو ترس جائیں گی اس لیے وہ ہندوستان میں ہی رہنا چاہ رہی تھیں تاکہ میکے والوں سے ان کا تعلق قائم رہے۔ انہوں نے اپنی سسرال کو بھی اہمیت نہیں دی۔ ویسے بھی سسرال میں ایک جیٹھ اور دو نندوں کے علاوہ کوئی نہ تھا ان کے ہندوستان میں رہنے یا پاکستان جانے سے انہیں کوئی فرق نہ پڑتا۔

14 اگست قریب آرہا تھا اور ابا جان چاہ رہے تھے کہ اعلان آزادی سے پہلے وہ بال بچوں سمیت پاکستان چلے جائیں کیونکہ شہر کے حالات دن بہ دن خراب ہورہے تھے۔ ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملے شروع کردیے تھے۔ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں تو ہندو کچھ نہیں کرسکے لیکن جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ وہاں ہندو شرپسندی سے باز نہ آتے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مسلمانوں نے محفوظ علاقوں میں پناہ لینا شروع کردی اور اس کے ساتھ ہی بڑے پیمانہ پر ہجرت بھی شروع ہوگئی۔

ابا جان کی تیاری بھی مکمل تھی اور انہیں وہاں سے نکلنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار تھا لیکن پاکستان جانے سے پہلے وہ ایک ضروری فرض نبھانا چاہ رہے تھے۔ اس روز جب رات میں حسبِ معمول بیٹھک جمی تو انہوں نے اکمل چچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اکمل میاں! اب ہمارے پاکستان جانے میں چند روز ہی رہ گئے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے تم ہماری امانت ہمارے حوالے کردو۔''

''کیسی امانت بھائی صاحب۔'' اکمل چچا انجان بنتے ہوئے بولے۔

''یہ بھی مجھے یاد دلانا پڑے گا۔'' ابا جان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''میں شمی اور جہاں آراء کے رشتے کی بات کررہا ہوں۔ تم بھولے تو نہ ہوگے کہ اماں مرحومہ نے ان دونوں کی نسبت بچپن میں ہی طے کردی تھی۔''

''جی مجھے یاد ہے۔'' اکمل چچا نے کہا۔ ''لیکن آپ لوگ تو پاکستان جارہے ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' ابا جان بولے۔ ''ہم کہیں بھی جائیں کہیں بھی رہیں رشتہ تو اپنی جگہ رہے گا۔''

''معاف کیجیے بھائی صاحب، اب یہ ممکن نہیں۔ یہ شادی اسی صورت میں ہوسکتی ہے اگر آپ یہیں رہیں، پاکستان نہ جائیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم اس شادی کو ہمارے پاکستان جانے سے کیوں جوڑ رہے ہو؟'' ابا جان نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

اس کا جواب چچی نے دیا۔ ''اس لیے کہ ہم جہاں آراء کو اپنی نظروں سے دور نہیں کرسکتے نیا ملک، نئے لوگ، اجنبی ماحول۔ نہ جانے اسے وہاں کس حال میں رہنا پڑے۔ نہ بابا مجھے تو رات کو نیند بھی نہیں آئے گی۔ ہر وقت اس کا خیال ستاتا رہے گا۔''

''کیسی باتیں کررہی ہو دلہن؟'' ابا جان غصے سے بولے۔ ''اللہ نہ کرے کہ اسے کوئی مشکل پیش آئے وہ ہمارے ساتھ رہے گی اور اللہ نے چاہا تو یہاں سے اچھے حال میں رہے گی۔''

''ان باتوں سے میری تسلی نہیں ہوگی۔'' وہ بولیں۔ ''اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ شمی اور جہاں آراء کی شادی ہو تو پاکستان جانے کا خیال دل سے نکال دیں۔ شمی کی تعلیم مکمل ہونے پر ان دونوں کی شادی کردی جائے گی۔''

چچی کے اس دو ٹوک انداز نے ابا جان کو لاجواب کردیا اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے کہ انہیں سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ابا جان سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ میری رائے پوچھیں گے۔ میں کیا جواب دیتا۔ چچا اور چچی نے ایسی کڑی شرط لگائی تھی جسے پورا کرنا ہم میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا۔ ہم سالہا سال سے پاکستان بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے لیے ہم نے ایک بھرپور تحریک چلائی۔ بیک وقت انگریزوں اور ہندوؤں کی سازشوں کا سامنا کیا۔ جب منزل قریب آئی تو ہمارے راستے میں یہ رکاوٹ کھڑی کردی گئی۔

میرے لیے چچا کی شرط ماننا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میں ان کی اس شرط کی خاطر اپنے وطن کی آزاد فضا میں سانس لینے کی نعمت سے محروم ہوجاتا۔ میں تو اس دن کا بے چینی سے انتظار کررہا تھا جب میں اپنے وطن کی مٹی کو بوسہ دے سکوں گا۔ میرے قائد نے ہم نوجوانوں کو اس نوزائیدہ مملکت کا معمار قرار دیا تھا۔ میرے وطن کو میری ضرورت تھی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں چچا کی ایک نامعقول شرط مان کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندو کی غلامی قبول کرلیتا۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزاری۔ صبح ہونے تک میں فیصلہ کرچکا تھا کہ چچا اور چچی کچھ بھی کہتے رہیں لیکن میں پاکستان جانے کا ارادہ ترک نہیں کرسکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی سر اٹھا رہا تھا کہ اگر چچا واقعی اپنی بات پر قائم رہے تو جہاں آراء مجھے کبھی نہ مل سکے گی لیکن مجھے یقین تھا کہ بہت جلد چچا کو احساس ہوجائے گا کہ انہوں نے پاکستان نہ جاکر کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ جب متعصب ہندو ان کا جینا دوبھر کردیں گے ان کے لیے اپنے مذہب، عقیدہ اور تہذیب کے مطابق زندگی گزارنا مشکل ہوجائے گا۔ ان کے بچے اسکولوں میں بندے ماترم کا ترانہ پڑھیں گے اور ان پر ہندی تہذیب وثقافت مسلط کردی جائے گی تب انہیں ہجرت کے بارے میں سوچنا پڑے گا اور وہ پاکستان آنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

دوسرے روز میں صبح سویرے چھت پر چلا گیا۔ جہاں آراء بھی معمول کے مطابق اپنی چھت پر کبوتروں کو دانہ کھلا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا سا جھجکی اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی منڈیر تک آگئی۔ مجھے اس کے چہرے پر اداسی نظر آئی اور میں سمجھ گیا کہ اسے گزشتہ روز ہونے والی گفتگو کا علم ہوگیا ہے۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھ سے اس کا رونا نہیں دیکھا گیا۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لیے۔ ''پریشان مت ہو جہاں آراء تم میری ہو اور ہمیشہ میری ہی رہو گی۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔''

''لیکن آپ تو ہمیں چھوڑ کر پاکستان جارہے ہیں۔'' وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''میں بہت جلد واپس آؤں گا تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کے لیے۔''

''لیکن بابا جانی تو کہتے ہیں کہ آپ یہیں رہیں، ہندوستان میں۔ وہ مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں کرسکتے۔''

''اس وقت وہ چچی اور تمہاری ننھیال کی زبان بول رہے ہیں لیکن آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں۔ انہیں آزادی اور غلامی کا فرق معلوم ہوجائے گا اور وہ خود بھی پاکستان جانے پر مجبور ہوجائیں گے۔''

''اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟''

''ایسا ہی ہوگا۔'' جس نے پورے اعتماد سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہ سکیں گے اور میں انہیں پاکستان لے جانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

اس رات پھر میٹنگ ہوئی۔ ابا جان نے چچا کے سامنے دو حل رکھے۔ اوّل یہ کہ وہ بھی اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ ہمارے ساتھ پاکستان چلیں کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جان مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے۔ ابھی ہندوؤں کو اقتدار نہیں ملا لیکن ہندو اکثریت والے علاقوں میں مسلمانوں پر حملے شروع ہوگئے ہیں۔ آنے والا وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بہت کٹھن ہوگا اور اگر وہ پھر بھی ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو جہاں آراء کا نکاح شمی سے کردیں، رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔

چچا نے دونوں باتیں ماننے سے انکار کردیا اور ایک بار پھر یہی کہا کہ وہ نہ پاکستان جائیں گے اور نہ ہی جہاں آراء کو وہاں بھیجیں گے۔ شمی سے اس کی شادی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے کہ آپ لوگ پاکستان جانے کا ارادہ ترک کردیں اور ہندوستان میں ہی رہیں۔

دراصل یہ چچی کی چال تھی جسے ہم لوگ اس وقت نہ سمجھ سکے۔ وہ شروع سے ہی نہیں چاہتی تھیں کہ میری شادی جہاں آراء سے ہو۔ اسی لیے انہوں نے یہ شرط عائد کردی۔ وہ جانتی تھی کہ ہمارا گھرانا پکا مسلم لیگی ہے اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ آزادی کی تحریک میں ہم لوگوں نے کس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور ہم اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھنے کے لیے بے تاب تھے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد ابا جان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولے۔ ”تم نے اپنے چچا اور چچی کی باتیں سن لیں۔ اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”میں کچھ کہوں گا تو وہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہو گی۔ دراصل چچا اس وقت اپنے سسرال والوں کے دباؤ میں ہیں۔ وہ کانگریسی ذہن کے لوگ ہیں اور انہوں نے ہمیشہ تحریک پاکستان کی مخالفت کی۔ چچا کو بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ان کے لیے یہاں رہنا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ آپ نے انہیں سمجھا کر اپنا فرض پورا کیا۔ اب وقت ہی بتائے گا کہ انہوں نے آپ کی بات نہ مان کر کتنی بڑی غلطی کی تھی۔“

”لیکن جہاں آراء......!“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ کہیں نہیں جا رہی۔ آج نہیں تو کل۔ چچا اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

اس کے بعد ابا جان نے کوئی بات نہیں کی اور خاموشی سے پاکستان جانے کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے چچا کو اپنی زمینوں اور مکان کا مختار بنا دیا اور تھوڑی بہت جمع پونجی لے کر رات کی تاریکی میں گھر کے افراد کے ہمراہ پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک دہلی میں فسادات نے زور نہیں پکڑا تھا لیکن اطلاعات یہ تھیں کہ راستے میں بلوائی ٹرینوں پر حملے کر رہے ہیں۔ ہم جس ٹرین میں سوار ہوئے اس کے ساتھ پولیس کا ایک دستہ بھی تھا۔

راستے میں کہیں کہیں بلوائیوں کے جتھے دکھائی دیے لیکن ٹرین کا ڈرائیور بہت ہوشیار تھا۔ وہ خطرہ محسوس کرتے ہی ٹرین کی رفتار بڑھا دیتا۔ اس طرح بلوائی ٹرین تک نہ پہنچ پاتے۔ تاہم مشرقی پنجاب سے گزرتے ہوئے پٹڑی کے دونوں جانب بڑے دلخراش مناظر دیکھنے میں آئے۔ جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ ان مناظر کو دیکھ کر ہم بھی خوفزدہ ہو گئے۔ سب کی زبانوں پر کلمہ طیبہ اور درود شریف کا ورد تھا اور ہم اس خوف سے نجات حاصل کرنے کے لیے تھوڑی تھوڑی دیر بعد باآواز بلند اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔

خدا خدا کر کے ٹرین لاہور اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو پورا پلیٹ فارم اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ رضا کار ہمیں والٹن کے کیمپ میں لے گئے جہاں ہماری رجسٹریشن ہوئی اور کھانے کا بندوبست کیا گیا۔ اسی روز شام کی ٹرین سے ہم کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس وقت ہندوستان سے آنے والے زیادہ تر لوگ کراچی کا ہی رخ کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کراچی پاکستان کا دارالخلافہ تھا۔ کیپیٹل سٹی میں ترقی کے مواقع زیادہ تھے۔ البتہ ہم لوگ کراچی اس لیے آئے کہ بھائی صاحب یعنی تمہارے والد پہلے سے یہاں مقیم تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور پاکستان بننے سے تین ماہ پہلے ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے پہلے سے آرام باغ پر ایک فلیٹ کا انتظام کر لیا تھا چنانچہ ہم اسٹیشن سے سیدھے وہیں چلے گئے۔

ابا جان اپنے ساتھ جو تھوڑا بہت سرمایہ لے کر آئے تھے۔ اس سے انہوں نے ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا اور یوں زندگی کی گاڑی رواں دواں ہو گئی۔ میں نے بھی کالج میں داخلہ لے لیا۔ دو تین مہینے اسی مصروفیت میں گزر گئے۔ اس وقت تک چچا جان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا کیونکہ دونوں ملکوں کے درمیان ڈاک وتار کی سروس معطل تھی۔ جب حالات معمول پر آئے تو ابا جان نے خط لکھ کر یہاں کے حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ہم اپنے وطن میں بہت خوش ہیں اور پُرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن ہندوستان سے آنے والی خبریں پریشان کن ہیں۔ سنا ہے کہ ہندو اکثریت نے مسلمان اقلیت کو تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ دہلی تو پوری طرح اجڑ ہی چکا ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم پہلی فرصت میں پاکستان آ جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے ایک اچھی زندگی گزارنے کے شاندار مواقع موجود ہیں۔

چچا جان نے خط کا جواب تو دے دیا لیکن پاکستان آنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ بہرحال دونوں بھائیوں کے خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابا جان کا کاروبار تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے آرام باغ والا فلیٹ چھوڑ کر کوٹھی کرائے پر لے لی۔ بعد میں جب کلیم داخل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے یہی کوٹھی اپنے نام الاٹ کروا لی۔

ہر خط میں چچا کو اپنی ترقی اور کامیابی کی کہانی سنا کر پاکستان آنے کی ترغیب دیتے لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ مجھے جہاں آراء بری طرح یاد آ رہی تھی۔ شاید ابا جان نے بھی میری کیفیت کو محسوس کر لیا۔ انہوں نے چچا کو خط لکھا کہ اگر تم پاکستان آنا نہیں چاہتے تو ہم اپنی امانت لینے آ رہے ہیں۔ تم بیٹی کو رخصت کرنے کی تیاری کرو اور ہمیں شادی کی تاریخ سے مطلع کر دو۔

چچا جان کا جواب بم کا گولہ ثابت ہوا جس نے پل بھر میں میرے ارمانوں کا محل مسمار کر دیا۔ انہوں نے لکھا تھا۔ ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ہندوستان آ رہے ہیں۔ میں خود بھی آپ کو باضابطہ دعوت نامہ بھیجنے والا تھا۔ آپ کے لیے یہ اطلاع باعث مسرت ہو گی کہ میں نے جہاں آراء کی نسبت عزیزی خرم سے طے کر دی ہے اور اگلے ماہ کی دس تاریخ کو ان کی شادی ہونا طے پائی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ تمام اہل خانہ کے ہمراہ اس شادی میں شرکت کر کے بیٹی کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں گے۔“

وہ جہاں آراء کا ماموں زاد تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ چچی کیوں ٹال مٹول کر رہی تھیں۔ وہ شروع سے نہیں چاہتی تھیں کہ میری شادی جہاں آراء سے ہو۔ اسی لیے انہوں نے پاکستان نہ جانے کی شرط لگائی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ میں اور ابا جان یہ شرط کبھی نہیں مانیں گے۔ بہرحال ان کی چال کامیاب رہی اور میں اپنی محبت سے محروم ہو گیا۔

ابا جان کو اتنا صدمہ ہوا کہ انہیں دل کا روگ لگ گیا۔ انہیں اپنے سگے بھائی سے یہ توقع نہیں تھی کچھ عرصہ بعد انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے انتقال کے بعد کاروبار چلانے کی ذمہ داری مجھ پر آ گئی لیکن یہ کام میرے مزاج کے مطابق نہیں تھا۔ اس لیے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہوتے ہی میں نے کاروبار ختم کر دیا اور ایک کالج میں لیکچرار لگ گیا۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ آپ وقتی طور پر اپنے چچا کی بات مان لیتے اور شادی کے بعد بیوی کو لے کر پاکستان آ جاتے۔“ میں نے ان کی کہانی سننے کے بعد کہا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ ان کا چہرہ یکایک سرخ ہو گیا۔ اگر میں صرف جہاں آراء سے شادی کرنے کی خاطر ہندوستان میں رک جاتا تو یہ اس جذبے کی توہین ہوتی جو ہمارے سینوں میں موجزن تھا۔ ہم نے بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد یہ ملک حاصل کیا تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں آزادی کی نعمت سے محروم رہ جاتا۔“

”آپ نے پاکستان آنے کی خاطر اپنی محبت کی قربانی دینا گوارہ کر لی؟“

”اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جہاں آراء مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے گی۔ اگر میں وہاں رک جاتا تو شاید چچا کی طرح کبھی پاکستان نہیں آ سکتا تھا اور پاک وطن کی آزاد فضا میں سانس لینے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوتا۔ اس آزادی کی خاطر لاکھوں لوگوں نے جان، مال اور آبرو کی قربانی دی۔ اس کے مقابلے میں یہ قربانی کچھ بھی نہیں۔“

”پھر آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟“

”اس کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس دل کے فریم میں ایک تصویر پہلے سے موجود ہے۔ دوسری کے لیے گنجائش کہاں سے لاؤں۔ کیاں ہوا، اگر مجھے میری محبت نہ مل سکی۔ کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ میں بھی اس پاک وطن کے لیے قربانی دینے والوں میں شامل ہوں۔“

اس کے بعد انہوں نے کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں جس کا مطلب تھا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ میں خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

شمی ماموں اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی یاد ہمارے دلوں میں زندہ ہے۔ میں بھی ہر سال انہی کی طرح چودہ اگست مناتا ہوں۔ میں نے تحریک آزادی کے صرف قصے سنے ہیں لیکن میں اس جذبے کو محسوس کر سکتا ہوں جو شمع آزادی کے متوالوں کے دلوں میں موجزن تھا جس کی بدولت انہوں نے نہ صرف اپنی عزیز ترین ہستیوں کی قربانی دی بلکہ آزادی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کرتے چلے گئے۔ خدا کرے یہ جذبہ ہمیشہ قائم ودائم رہے۔

تاوان

محترم مدیر

السلام علیکم

ارسال کردہ سچ بیانی میری روداد نہیں ہے، یہ روداد ہے مہر نجیب علی کی۔ اس کے کچھ حالات میرے علم میں تھے اور کچھ اس نے بتائے، ان تمام واقعات کو جمع کیا اور کہانی کی شکل دی تو احساس ہوا کہ یہ ایک طویل داستان بن رہی ہے اس لیے روداد بیان کرنے کی رفتار تیز کردی ہے تاکہ تمام واقعات آجائیں اور میرے ہم وطن سبق حاصل کر سکیں کہ اس وطن کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے متفرق قربانیاں دی ہیں۔

محمد لطیف

(لاہور)

اس روز گھر میں عید کا سا سماں تھا۔ بچے' بڑے خواتین جوش کے ساتھ ساتھ ان دیکھے دباؤ کا شکار بھی تھے۔

''کیا ہوگا آج؟'' عدنان بار بار بڑبڑاتے ہوئے بے چینی سے ہاتھ مسلتا۔

''وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔'' نعمان متانت سے جواب دیتا۔

''آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے بھائی جان! لیکن خدا بھی تو ان کی مدد کرتا ہے ناں جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔'' یہ آواز اور حقیقت پسند تجزیہ سولہ سالہ سلطان کا تھا۔

''کہہ تو تم بھی ٹھیک رہے ہو۔ محنت' خلوص' نیت اور ایمانداری ہی سے کوئی بازی جیتی جاسکتی ہے۔'' نعمان نے اتفاق کیا۔

میں ان سب کی یہ باتیں' تجاویز اور تبصرے اپنے کمرے میں بیٹھا سن رہا تھا۔ گزشتہ شب سے میرے گھٹنوں میں تکلیف کچھ بڑھ گئی تھی اس لیے نماز پڑھنے کے لیے مسجد نہ جاسکا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر نماز کی ادائیگی بھلے ہی میرے لیے آسان اور باسہولت سہی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس امر سے کبھی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ سالخوردہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے میں بمشکل اٹھا اور اپنی واکنگ اسٹک پکڑے ٹی وی لاؤنج میں چلا آیا جہاں بیٹھے ان نوجوانوں کی بحث مزید شدت اختیار کرگئی تھی۔

''تم لوگوں نے نماز پڑھ لی کیا؟'' میرے سوال پر وہاں یکدم سناٹا چھا گیا۔ اس خاموشی نے مجھے سب کا جواب سمجھا دیا۔

''نماز ہر حال میں افضل ہے بیٹا! اسے یوں نظر انداز مت کیا کرو۔'' میں نے ہزار دفعہ کی کہی ہوئی بات ایک بار پھر دہرائی۔

''اچھا دادا جی! ابھی تو کافی وقت پڑا ہے۔ ہم چلے جائیں گے پڑھنے۔'' حسب توقع جواب موصول ہوا۔

''کس بات کی پریشانی میں مبتلا ہو ویسے؟'' میں نے ان کے چہرے پر تناؤ اور آنکھوں میں بے چینی دیکھ کر استفسار کیا۔

''یہ لوگ ابھی کچھ دیر بعد ہونے والی 'جنگ عظیم' کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہے ہیں بڑے پاپا!'' میری پوتی نے معنی خیز انداز میں بتایا۔

''اوہ اچھا! میں سمجھ گیا۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ٹی وی لاؤنج میں افرادِ خانہ کی تعداد اب بڑھنے لگی تھی۔ ہر چہرہ فکرمند اور ہر آنکھ مضطرب تھی۔

''انتظام مکمل ہوگیا ہے۔ آجاؤ سب باہر لان میں۔'' معاذ نے پُرجوش انداز میں دھماکا کیا۔

لاؤنج میں اب ہلچل برپا تھی۔ سب شور مچاتے' تبصرے کرتے' اپنی رائے دیتے باہر کھسکتے گئے۔

''دادا جی! آپ بھی آجائیں ناں!'' میری بڑی پوتی سنبل برابر کمرے سے برآمد ہوئی۔ پیشانی تک لپٹا دوپٹا اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ نماز پڑھ آئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح موجود تھی جس کے دانے وہ کچھ وقفے سے گرا دیتی۔ وہ بار بار اپنے لب ہلا رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ یہ حالت رات تک یونہی برقرار رہے گی۔

''آج طبیعت بہت بوجھل ہے بیٹا! دل چاہ رہا ہے کہ لمبی تان کر سو جاؤں۔ ایسی نیند جو ہر فکر اور سوچ ختم کر دے۔''

''یہ تو بڑھاپے کی نشانی ہے دادا جی! کہیں آپ بوڑھے تو نہیں ہوگئے؟'' وہ شرارت سے بولی۔

''ارے میری چندا! تمہارا یہ دادا اس وقت چوہتر سال کا ہو چکا ہے۔ ایک ایوریج انسانی عمر سے کہیں زیادہ جی چکا ہوں میں۔ اپنی زندگی میں ہی دونوں بیٹوں اور بیٹی کے گھر بستے دیکھے ہیں' ان کی اولاد کے ساتھ وقت گزارا ہے' اپنی نئی نسل جوان ہوتے دیکھی ہے' اللہ کے گھر کی زیارت کر آیا ہوں۔ ایک زندگی میں اتنی نعمتیں پانے والا بوڑھا نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ اب تو بس چل چلاؤ کا وقت ہے۔ زندگی میں اب کیا رہ گیا ہے دیکھنے کو؟'' میں نے متانت سے کہا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ میں نے اس طویل زندگی میں وہ سب کچھ پایا تھا جس کی تمنا کرتے ہر انسان اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔

''ہو سکتا ہے دادا جی کہ ابھی قدرت کے پردہ غیب میں آپ کے لیے کچھ اور بھی رکھا ہو۔ اس کی حکمت ہم تھوڑے ہی سمجھ سکتے ہیں بھلا؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لان میں لے آئی جہاں نوجوان پارٹی کے ساتھ ان کے والدین بھی کرسیاں سنبھال چکے تھے۔ ایک صوفے پر مجھے بٹھانے کے بعد سنبل اپنا دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی واپس مڑی تو اس کی والدہ حیرانی سے بولی۔

''تم کہاں چلیں اب؟''

''ارے چچی جان! آپ نہیں جانتیں کیا؟'' معاذ ہنسا۔ ''ارے ہاں بھئی! کون نہیں جانتا بھلا؟ مگر ذہن سے نکل گیا تھا۔'' میری بہو فہمیدہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ سنبل ان سب باتوں سے بے نیاز تسبیح کے دانے گراتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ لان میں 'کورم' پورا ہو چکا تھا۔ ہر جگہ سبز ہلالی ٹی شرٹس یا سبز دوپٹے دکھائی دے رہے تھے۔ میں ان کی بے چینی سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ مناظر میرے لیے بالکل نئے نہیں تھے۔ میرا یہ مختصر سا خاندان ملک کی پچانوے فیصد عوام کی طرح کرکٹ کا دیوانہ تھا اور اگر یہ کرکٹ میچ روایتی حریف بھارت سے ہوتا تو جنون کا عالم ہی کچھ اور ہوتا۔ اب تو اس جنون نے ایک نئی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ عوامی مقامات' گھروں اور ہوٹلوں میں بڑی اسکرین نصب کر کے اجتماعی صورت میں کرکٹ میچ دیکھ کر اپنے جذبہ حب الوطنی کو خوب تسکین دی جاتی۔ میرا یہ گھرانا بھی انہی متاثرین میں سے تھا۔ میرے دونوں بیٹوں کے تین تین بچے تھے۔ بڑے بیٹے شہزاد کی اولاد میں عدنان' نعمان اور سنبل جبکہ بہزاد کے بچوں میں معاذ' امبر اور سلطان شامل تھے۔ ممکن ہے اس تعارف کے بعد آپ دل ہی دل میں یہ سوچ رہے ہوں کہ نجیب علی کا یہ گھرانا تو بہت مثالی اور 'ہم ساتھ ساتھ ہیں' جیسا ہوگا لیکن ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میرے نوکری پیشہ بیٹے اور مختلف اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے اپنی



معاشی مجبوریوں کے تحت ایک ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ مجھے ان کی مجبوریوں سے کوئی غرض تھی نہ علیحدہ ہونے سے کوئی مسئلہ۔ میں نے زندگی بھر ایک ہی اصول قائم رکھا تھا 'جیو اور جینے دو'۔ آغاز جوانی میں اپنائے گئے اس سنہری اصول پر میں آج بھی اسی طرح کاربند تھا۔ میری اولاد کے بعد اگلی نسل بھی اسی وجہ سے ہی تو میری گرویدہ تھی۔ میں ان کا بہترین رازدان اور دوست تھا۔ ان کی زندگیوں میں کبھی مداخلت نہیں کرتا تھا لہٰذا راوی چین ہی چین لکھتا۔

خیر! بات ہو رہی تھی اہلخانہ کے اضطراب کی۔ وہ سب اس میچ کے لیے بہت سنجیدہ تھے۔ دسویں عالمی کپ کا سفر اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔ اس ٹورنامنٹ کے آغاز سے قبل قومی ٹیم کو کسی شمار میں نہیں لایا جا رہا تھا لیکن حیران کن طور پر اس نے ایسی کارکردگی دکھائی کہ جذبات کے شکنجہ میں جکڑے عوام کی توقعات کا بار پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا۔ مختلف حریفوں سے پنجہ آزمائی پاکستانی ٹیم ٹائٹل کے حصول سے صرف دو قدم دور رہ گئی تھی۔ سیمی فائنل میں بھارت سے مقابلہ درپیش تھا اور یہی وہ نکتہ تھا جس نے ہر ایک کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انہیں بھارت سے بہر صورت جیت درکار تھی۔ اس روز گھر میں خصوصی کھانے بنے تھے' صدقے کا بکرا صبح ہی دیا جا چکا تھا۔ جیت کی صورت میں خصوصی نوافل اور مختلف مزاروں پر دیگیں چڑھانے کی منتیں تک مان لی گئی تھیں اور اب ٹاس ہونے کے بعد ہر ایک کی حالت ماہی بے آب کی طرح ہو گئی تھی۔

''ٹاس ہار کر بھارت کی پہلے بیٹنگ! ڈیم شٹ یار!'' نعمان جھلّایا۔

''دھیرج رکھو بیٹا! جو ہوگا بہتر ہی ہوگا۔'' میں نے مسکرا کر اسے حوصلہ دیا۔

''یہ تو ابھی سے ہی غلط ہو گیا بڑے پاپا!'' امبر نے کہا تو اس کے انداز پر میری مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟'' وہ رو دینے کے قریب تھی۔

''قسم سے گرینڈ پا! مجھے آپ کے اعصاب پر رشک آتا ہے۔ آپ آئرن مین ہیں۔ کوئی بھی ہار یا جیت آپ کو متاثر ہی نہیں کرتی۔'' عدنان نے کہا۔

''میرے پاپا شروع سے ہی ایسے ہیں۔ وہ اپنے اعصاب پر قابو رکھنا جانتے ہیں۔'' بہزاد نے فخر سے مجھے دیکھا۔

انہی باتوں اور چٹکلوں میں 'موہالی کرکٹ اسٹیڈیم' میں میچ کا آغاز ہو گیا۔ بھارت ابتداء سے ہی حاوی تھا۔ فاسٹ باؤلرز کی خوب پٹائی ہو رہی تھی۔ کھلاڑی ہمیشہ کی طرح کسی انجانے دباؤ کا واضح شکار دکھائی دے رہے تھے۔

''لعنت ہو یار! یہ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟'' عدنان نے سچن ٹنڈولکر کا ایک اور کیچ چھوٹ جانے پر چلّا کر کہا۔

''کیا ہوا؟ کیا صورتِ حال ہے؟'' سنبل ایک بار پھر باہر چلی آئی۔ وہ ہر دس' پندرہ منٹ بعد وہاں 'اپ ڈیٹس' حاصل کرنے کے لیے آجاتی تھی۔ ''او نو! ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اللہ جی! پلیز سچن کو آؤٹ کر دینا۔ میں آیندہ فجر میں کوئی ناغہ نہیں کروں گی۔'' وہ اپنے ہونٹ کچل کر بولی اور آنسو چھپاتی ہوئی دوبارہ اندر چلی گئی۔

اسی تناؤ زدہ ماحول میں لگ بھگ چار بجے کھانا کھایا گیا۔ اس بھاگ دوڑ میں بھارت نے پچاس اوورز کھیل کر نوجوانوں میں ایک نئی بحث کا محاذ گرم کر دیا۔ انہیں فیلڈنگ میں ٹیم کی مایوس کن کارکردگی پر بہت رنج تھا۔ اسکور زیادہ بڑا بھی نہ تھا لہٰذا امیدوں کے شجر پر ہنوز بہار تھی۔ پاکستان کی بیٹنگ کا آغاز ہوتے ہی ان کے چہروں پر زردی کھنڈتی چلی گئی۔ تاریخ نے اپنی روایت برقرار رکھی تھی۔ بڑے بڑے برج آسانی سے الٹتے چلے گئے۔ شکست کا بھیانک دیو منہ کھولے پاکستانی ٹیم کو نگلنے کے لیے تیار تھا۔ لان کی صورت حال بدل چکی تھی۔ امبر کی سسکیاں تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ سنبل کو بھی اب کسی معجزے کا انتظار نہیں تھا۔ اس کا سفید دوپٹا گلے میں جھول رہا تھا۔ نعمان اور سلطان کے گلے میں ڈوبتی' ابھرتی گلٹی اس بات کا ثبوت تھی کہ ان کے حلق میں آنسوؤں کا جان لیوا پھندا موجود ہے لیکن وہ اسے اخراج کا کوئی رستہ نہیں دینا چاہتے۔ مردانگی کا بھرم بھی تو برقرار رکھنا تھا۔ ان سب کی حالت پر تاسف سے سر ہلاتے میری نظر ٹی وی اسکرین کی طرف مڑی جہاں پاکستان کا نواں کھلاڑی آؤٹ ہو چکا تھا اور عوام کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ خوشی سے اچھلتے کودتے ان تماشائیوں میں ایک چہرے کی جھلک نے میرا وجود منجمد کر دیا۔ وہ صرف ایک ہی لمحہ کی دید تھی لیکن میری دنیا تہ و بالا ہو چکی تھی۔

''لعنت ہو یار! ہم پہ بھی لعنت ہے جو ہر بار امیدیں لگا بیٹھتے ہیں۔'' اب تک مکمل خاموش بیٹھے معاذ نے کرسیوں کو اپنی ٹانگ کی ضرب سے گرایا اور ریموٹ سے اسکرین آف کر کے تاریں بھی نکال کر پھینک دیں۔

''رکو معاذ! مت کرو! مجھے وہ...... وہاں...... اسے دیکھنا ہے۔''

''سوری دادا جی! میں آپ کی طرح 'آئرن مین' نہیں ہوں۔'' وہ دیوانگی میں مبتلا ہو چکا تھا۔ تاریں' کرسیاں سب کچھ تہس نہس کرتا وہ میری آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے آگے بڑھ کر اسے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن گھٹنوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ دوسرے ہی پل میں چکراتے ذہن کے ساتھ زمین بوس ہو چکا تھا۔ حواس میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ وہاں گری کرسی کا کنارہ سر پر لگتے ہی اذیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بے ہوشی کی وادی میں قدم رکھتے ہوئے بھی میرے پردہ تصور پر وہی شبیہہ تھی۔

☆☆☆

نیم تاریک کمرے میں لیٹا اپنے سر میں اٹھتی ٹیسوں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بڑے پاپا! یہ ہلدی والا دودھ پی لیجیے۔ ماما نے خاص طور پر آپ کے لیے بھیجا ہے۔'' امبر نے نظریں جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز شدید بوجھل اور آنکھیں متورم تھیں۔ سرخ ناک اس بات کی گواہ تھی کہ وہ خوب روتی رہی ہے۔

''مجھے نہیں پینا...... لے جاؤ اسے یہاں سے!'' میں نے غصہ سے کہا۔

''بڑے پاپا! ہم جانتے ہیں کہ آپ بھی اس ہار پر بہت اپ سیٹ ہیں۔ دشمن کی سرزمین پر سبز ہلالی پرچم لہراتے دیکھنا تو ہم سب کی ہی خواہش تھی اور مجھے علم ہے کہ آپ کے دل میں تو یہ تمنا شدید تر ہوگی۔'' اس کا لہجہ رندھ گیا۔ مجھے اس پر بہت طیش آ رہا تھا۔ اسی پل معاذ جوس کا گلاس لیے اندر چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں ضبط کے سرخ ڈورے تھے۔ اسے دیکھتے ہی مجھے وہ لمحات ایک بار پھر یاد آگئے۔

''چلے جاؤ یہاں سے سب! دور ہو جاؤ میری نظروں سے! ایک ہی بار آنسوؤں کے دریا بہا لو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' میں نے دایاں بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ کچھ دیر تو مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن پھر بوجھل قدموں سے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی میں بے تابی سے اٹھا اور کمرے کا دروازہ لاک کر کے صوفے کی سمت چلا آیا جہاں عدنان کا لیپ ٹاپ موجود تھا۔ وہ کافی عرصہ سے میرے ساتھ ہی کمرے میں رہتا تھا۔ چند سال قبل رات گئے بلڈ پریشر بڑھ جانے کے بعد طبیعت خراب ہونے پر اجتماعی فیصلہ کیا گیا تھا کہ اہلخانہ میں سے کوئی ایک ہمہ وقت میرے ساتھ رہا کرے گا۔ عدنان آئی ٹی کا طالبعلم تھا اور یہیں بیٹھ کر لیپ ٹاپ پر کام کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ رہنے سے مجھے بھی انٹرنیٹ کا کافی استعمال آچکا تھا۔ میں نے اپنی زخمی حالت نظر انداز کرتے ہوئے گوگل کھولا اور چند گھنٹے پہلے ہونے والے اس معرکہ عظیم کی مکمل ہائی لائٹس نکال کر اس ویڈیو کو ایک بار پھر اسی مقام پر لے آیا جہاں پاکستان کا نواں کھلاڑی آؤٹ ہوا تھا۔ منظر ایک بار پھر وہی تھا۔ تماشائیوں کا جوش بھی وہی تھا اور وہ چہرہ بھی وہیں تھا جس کی دید نے ایک ہی پل میں مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ میری کپکپاتی انگلیاں حرکت میں آئیں اور اسکرین ساکت ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے حس و حرکت ہو چکی تھیں۔ وہ وہی تھا...... وہ میرا واہمہ یا تخیل نہیں تھا۔ وہ میرے سامنے موجود تھا۔ یہ نقوش تو مجھے ازبر تھے۔ میں انہیں کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ میرا چہرہ ہی تو تھا۔ اسی وقت اسکرین دھندلا سی گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ کہیں لیپ ٹاپ خراب تو نہیں ہو گیا۔ عدنان بھی کچھ روز سے اس کی شکایت کر رہا تھا...... اف نہیں! ابھی تو مجھے اس کی بہت ضرورت ہے۔'' میں جھنجلا گیا۔ آستین سے اسکرین صاف کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر اپنا مطلوب دیکھنا چاہا لیکن نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ دھندلاہٹ پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اسی پل مجھے اپنے چہرے پر کسی سیال مادے کا احساس ہوا۔ میں نے اچنبھے سے بایاں ہاتھ گال پر پھیرا تو وہ تر نظر آیا۔ یہ سیال بے رنگ مادہ میری آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

''یہ کیا؟ میں رو رہا ہوں۔ نجیب علی عورتوں کی طرح آنسو بہا رہا ہے۔'' مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ آخری بار اس نمکین سیال کا ذائقہ میں نے کب محسوس کیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مسلتے میرے ذہن میں چند مناظر پوری شدت سے لہرا گئے۔ رات کا اندھیرا' بارش' بجلی کی چمک' دبی دبی سسکیاں' کسی انجان منزل کی جانب گامزن چند نفوس' بے بسی' لاچاری' نقاہت' ہاتھوں میں ہاتھ دیے دس سالہ دو بچے۔ پھر یکایک منظر بدل گیا۔ سسکیاں

وحشت زدہ چیخیں بن گئیں۔ بارش، بجلی اور اندھیرا شدید تر ہوگیا تھا۔ دس سالہ ایک لڑکا اب اکیلا کسی درخت تلے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود دوسرا ہاتھ چھوٹ چکا تھا۔ اس کا ہمزاد، ہم نوالہ و ہم پیالہ کہیں کھو گیا تھا۔ وہ لڑکا میں تھا۔ نجیب علی اپنے بھائی کے کھوجانے پر سراسیمہ تھا۔ اس سراسیمگی اور آنسوؤں تلے وہ کسی کے لیے شدید نفرت بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ چیختے ہوئے بھائی کو پکار رہا تھا لیکن جواب کہیں بھی نہ تھا۔

''وسیم......وسیم......میرے بھائی تو زندہ ہے......میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ تو زندگی میں اس موڑ پر یوں میرے سامنے آجائے گا۔'' میں نے بلکتے ہوئے کہا۔ اسکرین پر نظر آنے والے میرے اس جڑواں بھائی کی شبیہ بار بار دھندلانے لگتی تھی۔ میرے دل و دماغ پر ایک جنون طاری ہوگیا۔ دیوانہ وار ساکت اسکرین کو بوسے دیتے ہوئے میں نے لیپ ٹاپ اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

''میں تجھے ایک پل بھی خود سے جدا نہیں کروں گا۔ تو اب کبھی مجھ سے دور نہیں جائے گا۔'' میری بڑبڑاہٹ معدوم ہونے لگی۔ حواس مکمل طور پر وسیم کی مہک محسوس کر رہے تھے اور ذہن و قلب نیم بے ہوشی میں ڈھلتے ایک ہی جست میں سڑسٹھ سال پیچھے لوٹ گئے جہاں عیدالفطر کے روز دولڑکے نماز عید کی ادائیگی کے بعد ایک سرخ و سفید، باریش بوڑھے کے ساتھ خوش و خرم واپس لوٹ رہے تھے۔

☆☆☆

مہر سلطان علی تارانگر کی ایک ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ چھ فٹ سے متجاوز قد، سرخ و سفید رنگت، مضبوط کاٹھی، رعب دار چہرہ اور برمے کی طرح مقابل کی روح کو چھید دینے والی آنکھیں۔ اس بڑھاپے میں بھی ان کی کمر یا جسم میں کوئی خم نہیں تھا۔ تارانگر ضلع گورداسپور مضافاتی علاقہ تھا جہاں آبادی ایک ہزار سے کم ہی تھی۔ میرے دادا مہر سلطان اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ ہماری حویلی کی تاریخ دو سو سال پرانی تھی۔ عقبی جانب ایک شاندار باغ تھا جہاں موسم کے لحاظ سے ہر پھل اُگتا۔ اسے شہر میں فروخت کرنے کے علاوہ ٹوکرے بھر بھر کر گاؤں کے ہر گھر میں بھجوا دیا جاتا۔ سلطان علی تارانگر کے بے تاج سلطان تھے۔ یہاں ہندو اور سکھ گھرانے بھی آباد تھے۔ ان سے بالکل اسلامی قوانین کے مطابق مساوات کا سلوک ہوتا تھا۔ زندگی چین کی بنسی بجاتی ہوئی گذر رہی تھی۔ مہر سلطان کے دو بچے تھے۔ میرے والد مہر جہاں داد اور گلبدن خانم۔ ابا جان کی شادی محض سولہ سال کی عمر میں ہی ان کے قریب المرگ اکلوتے چچا کی بیٹی سے کی گئی تھی جنہیں قرآن ناظرہ کے سوا کچھ بھی لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ حویلی کے بڑوں اور ملازمین کی دبی سرگوشیوں میں مجھے سات سال کی عمر تک خوب اندازہ ہوگیا تھا کہ ابا جان کے لیے یہ رشتہ ایک بوجھ تھا جسے وہ اپنی خاندانی عزت و وقار اور والد کے دباؤ پر نبھانے کے لیے ڈھو رہے تھے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے۔ زہرا بیگم سے بے زاری اور نفرت کے اظہار کے لیے وہیں ایک کرائے کے مکان میں رہتے۔ ان دنوں وہ ایم اے کے پڑاؤ عبور کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شادی کے ایک سال بعد ہی زہرا بیگم نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ میں اور وسیم دادا کے بے حد لاڈلے اور یک جان دو قالب تھے۔ ابا جان جب بھی حویلی آتے تو ہم دونوں کے لیے ڈھیروں کتابیں اور تحفے بھی لایا کرتے۔ بیوی سے بے نیازی سے قطع نظر وہ اولاد پر جان چھڑکتے تھے۔ کچھ یہی حال ہماری اکلوتی پھپھی گلبدن خانم کا بھی تھا۔ وہ بیوہ اور بے اولاد تھیں۔ ان کی محبت کا محور بھی ہم دونوں بھائی ہی تھے۔ ہماری زندگی پیار، محبت، سکون اور آسائشات کا گہوارا تھی۔

اس روز دادا جی کے ساتھ مسجد سے واپس آتے ہوئے ہمارا جوش و خروش دیدنی تھا۔ روزے مکمل رکھنے اور نماز تراویح میں کوئی بھی ناغہ نہ کرنے پر دادا جی نے ہمیں خصوصی انعام دینے کا وعدہ کر رکھا تھا اور اغلب امکان یہی تھا کہ حویلی پہنچنے پر کوئی نہ کوئی حیرت ہماری منتظر ہوتی۔ ہم فی الحال جبری صبر سے اس موقع کا انتظار کر رہے تھے۔ اللہ اللہ کرکے رستہ ختم ہوا۔ حویلی کے وسیع و عریض ہال میں غیر معمولی رونق تھی۔ چاندنیاں بچھائی جاچکی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں مہمانوں کی آمدورفت شروع ہوگئی۔ دسترخوان پر ہر طرح کے کھانے موجود تھے۔ مہمانوں میں کسی مذہب یا ذات کی تخصیص نہیں تھی۔ مہر سلطان کی حویلی کے دروازے ہر ایک کے لیے وا ہوتے تھے۔ مہمانوں کی تواضع ٹھنڈے شربت سے کی گئی۔ ابا جان بھی ایک روز قبل حویلی آچکے تھے۔ وہ دادا جان کے دائیں جانب اور ہم دونوں بائیں جانب بیٹھے تھے۔ ماحول میں جانے کیوں کچھ خاموشی سی چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سبھی افراد کسی اضطراب میں

مبتلا تھے۔ اس سناٹے اور جامد کیفیت کو بالآخر افضال خان نے توڑا۔

''مہر جی! اس دعوت کے لیے ہم آپ کے بہت مشکور ہیں۔ اللہ پاک نے آپ کو بہت ہی خوبصورت دل سے نواز رکھا ہے۔'' اس نے کھنکار کر کہا۔

''شرمندہ مت کرو خان! میں نے ہمیشہ تارانگر کے ہر باسی کو اپنا ہی سمجھا ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''آپ کی ذرہ نوازی ہے مہر جی! میں بھی آپ سب کو پرسوں بیٹی کے نکاح پر مدعو کرنا چاہتا ہوں۔ بچی کو اپنی دعاؤں کے سائے تلے رخصت کیجیے گا۔''

''بالکل! ہم ضرور آئیں گے۔'' شہزاد سیال نے خلوص سے کہا۔

''جب تک ہم یہاں اکٹھے ہیں ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے رہیں گے۔ کون جانے زندگی ہمیں کہاں لے جائے؟'' یہ آواز ایاز شیخ کی تھی جس کا شمار تارانگر کے معتبر ترین افراد میں ہوتا تھا۔

''ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو شیخ! اللہ ان سب اور تارانگر کو ہمیشہ سلامت رکھے۔'' دادا جی نے فوراً انہیں ٹوکا۔

''مہر جی! حالات بہت عجیب رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ گیا ہے۔'' ایاز کی اس بات پر میں اور وسیم ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگے۔

''پاکستان صرف ایک دیوانے کا خواب اور بے ان سمجھا فیصلہ ہے شیخ! یہ کبھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ گا۔'' دادا جی ناگواری سے بولے۔

''معذرت چاہتا ہوں ابا جان! آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ پاکستان نوشتہ دیوار ہے۔ اس کا قیام ناگزیر ہو چکا ہے۔'' ابا جان نے ادب سے کہا۔

''یہی تو رونا ہے مہر جی! ہماری اس نوجوان نسل خاص طور پر علی گڑھ کے لونڈوں پر جناح اور اس کے ساتھیوں نے جانے کون سا منتر پھونک دیا ہے۔ وہ ہر رشتہ و نتائج بھول گئے ہیں۔'' چیتن نے دبے لفظوں میں کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو چیتن! یہ لونڈے واقعی اب نظر آنے لگے ہیں۔ میرا اپنا بیٹا بھی ایک ہی ضد لگائے رہتا ہے کہ بن کے رہے گا پاکستان...... بٹ کے رہے گا ہندوستان۔'' رفیق جٹ کی مونچھیں طیش سے پھڑکتے دیکھ وسیم اور میں کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ہماری ذہنی ہم آہنگی اور سوچ ہمیشہ ایک ہی تار سے جڑی رہتی تھیں۔ ہم بن کہے ہی ایک دوسرے کا مدعا بھانپ لیتے تھے۔ اس وقت بھی ہماری سوچ کا پنچھی ایک ہی سمت میں پرواز کر رہا تھا۔

''یہ پاکستان کون ہے نجیب؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

''شاید کوئی نیا مکان ہو۔'' میں نے اپنی محدود سوچ کے مطابق کہا۔

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ ہندوستان کو کیوں بانٹنا چاہتے ہیں؟'' وسیم الجھا۔ اسی کشمکش میں تو میں بھی مبتلا تھا۔ محفل کے ان شرکاء کا دباؤ ہمیں بالکل سمجھ نہیں آرہا تھا۔ تارانگر کے 'ایلیٹ' گھرانے سے تعلق رکھنے کی بدولت ہماری پرورش ناز و نعم اور مکمل پروٹوکول سے ہوئی تھی۔ عام بچوں کی طرح اسکول بھیجنے کی بجائے گھر پر پڑھانے کے لیے استاد مقرر کر رکھا تھا۔ یہ فیصلہ دادا جان کا تھا جس کی ابا جی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔

''یہ ضد نہیں ہے میاں رفیق! ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ تم لوگ جذبات کے دھارے میں بہہ کر شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دیے بیٹھے ہو۔ انگریزوں کے یہاں سے چل چلاؤ کا وقت بہت نزدیک ہے۔'' ابا جان نے کہا۔

''ارے تو کیا ہوا؟ وہ تو 'گھس بیٹھے' ہیں۔ آج نہیں تو کل انہیں یہاں سے نکلنا ہی تھا۔ ہم آپس میں کیوں لڑائی کریں؟ ہم پہلے بھی تو بھائیوں کی طرح رہ رہے تھے، اب بھی رہ لیں گے۔ کوئی اپنے گھر کا بٹوارہ بھی کرتا ہے کیا؟'' ہیمنت نے تیزی سے کہا۔

''واہ ہیمنت بابو! یہ بھی خوب کہی تم نے۔ اگر ہم لوگ بھائی ہیں تو ابھی ذرا اس طشتری سے گوشت اٹھا کر کھاؤ ناں۔''

''رام رام...... جہان بابو! تم جانتے نہیں ہو کیا کہ اس سے ہمارا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔'' وہ بدک کر کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

''ہاں! میں خوب جانتا ہوں۔'' ابا جی کی آواز بلند ہوگئی۔ ''اگر یہ نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنے گھر بلواؤ! ایک ہی برتن میں کھانا کھائیں گے۔''

''ہے بھگوان! یہ کیسا انرتھ کرنا چاہتا ہے؟'' وہ کانپنے لگا۔

''تم یہ سب کچھ کہہ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو جہان؟'' دادا جی جلال میں آگئے۔

”آپ لوگوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کررہا ہوں۔ ہندوستان اب کبھی متحد نہیں رہ سکتا۔ بٹوارہ وقت کی ضرورت بن چکا ہے۔اس حقیقت کو سمجھ لیجیے۔“ اباجی بولے۔

”خاموش ہوجاؤ جہان!“ داداجی گرجے۔ ”یہ ملک ہمارا ہے اور ہمارا جینا مرنا اسی کے ساتھ ہے۔مہر سلطان علی آج تارانگر کے ان معززین کے سامنے زبان دیتا ہے کہ میں مرتے دم تک بٹوارہ تسلیم نہیں کروں گا۔“

اباجان یہ سن کر غصہ کے عالم میں محفل سے اٹھ گئے۔ یہ امر آداب مہمانی کے سراسر خلاف تھا۔ہم دونوں کو انعام ملنے کا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا۔دیگر مہمان خاموشی سے اٹھے اجازت لے کر چلتے بنے۔ہال کمرے میں اب ہمارے سوا کوئی بھی نہ تھا۔

”وسیم! مجھے لگتا ہے کہ داداجان ابا کو ضرور ڈانٹیں گے۔“

”یعنی تم چاہتے ہو کہ ہم داداجی کے کمرے کی طرف چلیں۔“ وہ حسب معمول میرا مدعا بھانپ گیا اور ہم دبے قدموں اپنی منزل کی طرف بڑھ گئے جہاں ایک نئی بحث کا بازار گرم تھا۔

”اباجان! آپ جانے کس بھرم میں جی رہے ہیں۔آپ اپنی محبتیں، خلوص اور دولت ان لوگوں پر نچھاور کرتے رہیں لیکن موقع ملتے ہی یہ ڈسنے سے باز نہیں آئیں گے۔خدارا وقت کی نزاکت کو سمجھیے۔“

”ہمیں تمہاری بات کا بالکل بھی اعتبار نہیں ہے۔تم کبھی اپنی گھریلو زندگی میں توازن برقرار نہیں رکھ سکے تو اجتماعی اور قومی زندگی کو کیسے سنبھالو گے؟“ داداجی نے بھرپور وار کیا۔

”یہ شادی آپ کی مرضی سے ہوئی تھی۔ہمارا ذہنی معیار اور سوچ کبھی نہیں مل سکتی۔پڑھائی اور اعلیٰ تعلیمی ادارے یونہی انسان کا دماغ خراب کیا کرتے ہیں۔یہ غلطی اب میں دوبارہ زندگی میں کبھی نہیں دہراؤں گا۔“ اپنے والد اور دادا کو ایسے مزاج میں دیکھ کر ہم بہت گھبراہٹ محسوس کررہے تھے۔چھپ کر باتیں سننے کی یہ غیر اخلاقی حرکت پکڑے جانے کا خوف الگ تھا۔

”تو یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟“ دادا کی آواز ابھری۔

”جی ہاں! میرے لیے اس وقت پاکستان سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔“

”میں تمہیں اپنی جائداد سے عاق کردوں گا۔“ وہ چلّا اٹھے۔

”زمین، جائداد، دولت میرے لیے عزت و وقار سے بڑھ کر نہیں ہیں۔اور میری ایک بات لکھ لیجیے اباجی! خلوص، محبت، وفا اور مروت مسلم قوم کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ آپ اپنے اس چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے جن لوگوں پر اعتبار کی دولت لٹانے میں مگن ہیں ناں! بہت جلد یہی لوگ ڈنک ماریں گے۔“

”بکواس بند کرنا ہنجار! صحیح کہتا ہے چیتن۔اس جناح نے جانے کون سا منتر پھونک رکھا ہے تم جیسے احمقوں پر؟ میرا بس چلے تو میں اسے......“

”بس اباجان!“ انہوں نے قطع کلامی کی۔ ”آپ میری کھال بھی ادھیڑ دیں تو میں اف تک نہ کروں گا لیکن جناح صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔وہ میرے دل کی دھڑکن ہیں۔ان کا وجود اور دی ہوئی ہمت ہی تو ہے کہ ہم اپنی عزت نفس برقرار رکھے ہوئے ہیں۔“ مجھے جانے کیوں ان کی آواز بھیگی بھیگی سی محسوس ہورہی تھی۔

”ٹھیک ہے! تو پھر آج سے جناح تمہارا باپ ہوا۔ میرا اور میرے خاندان کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔“ داداجان کی بات سنتے ہی ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔نظریں ملیں اور باہمی ذہنی رو جڑتے ہی ہم اباجان کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ہمیں علم تھا کہ وہ یہاں ایک بار ضرور آئیں گے۔کچھ دیر بعد اباجان سرخ چہرہ لیے کمرے میں آئے اور ہمارے آنسوؤں سے بھیگے چہرے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

”اباجی! آپ داداجان سے معافی مانگ لیں۔ہمیں چھوڑ کے مت جائیں۔ہم آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ وسیم ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔میری زبان گنگ ہوچکی تھی۔

”میری بات غور سے سنو بچو! ہماری قوم اس وقت ایک بہت نازک موڑ سے گذر رہی ہے۔ہم میں سے ہر فرد ایک سپاہی ہے۔اگر ہم نے اپنے فرائض نہ پہچانے تو ہماری قوم مٹادی جائے گی۔“

مجھے ان کی کوئی بھی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔ہم تو ابھی خود بچے تھے تو سپاہی کیسے ہوسکتے تھے؟ ہمارے ذمہ کیا فرض تھے بھلا؟ وسیم کی حالت بھی مجھ جیسی ہی تھی۔

”تم ابھی تک یہیں ہو۔“ دروازے سے داداجان

کی آواز ابھری۔ ”ان بچوں پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔انہیں بہکانے کی کوشش مت کرو۔یہاں سے ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ۔“

”ٹھیک ہے اباجان! اگر آج میں یہاں سے نہ گیا تو ہزاروں بچوں اور مظلوموں کا روز قیامت مجرم و گناہ گار ٹھہروں گا۔“ وہ اب بھی اپنے مؤقف پر کسی چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔امی جان اور چھٹی بیگم بھی اس نئی صورت حال سے آگاہ ہوچکی تھیں۔ان کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

”بھائی جان! اپنے فیصلے پر نظرثانی کرلیجیے۔“ وہ تڑپتے ہوئے بولیں۔امی جان کی خاموشی میں بھی ہزاروں التجائیں تھیں۔ہماری حالت بھی بہت خراب ہونے لگی تھی لیکن اباجی نے کسی کی سن کے ہی نہ دی۔وہ اپنی کتابیں، اسناد لیے تن کے کپڑوں میں ہی روانہ ہوگئے۔یہ ’پاکستان‘ سے میرا پہلا تعارف تھا۔اس روز مجھے اس نادیدہ وجود سے بے پناہ وحشت محسوس ہوئی تھی۔اس روز کے بعد داداجی کی نظروں میں بے یقینی کی کیفیت نے مستقل ڈیرے جمالیے۔کچھ دن مزید گذرے تو انہوں نے ہمیں اپنے پاس بلا بھیجا۔وہ بہت دیر ہم سے بات چیت کرتے رہے جس کا لب لباب یہ تھا کہ مہر جہان دادا اور چند سرپھرے، بے وقوفوں کے سر میں الگ وطن کا سودا سما گیا ہے۔وہ صدیوں سے چلنے والے اس نظام کو برباد کرکے اپنے لیے ایک علیحدہ ملک حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ان کی یہ ضد بچگانہ اور ناقابل عمل ہے کیونکہ اس صورت میں ہمیں اپنے گھربار، دولت جائداد اور عیش و آرام سے دست بردار ہونا پڑے گا۔یہ پاکستان سے میرا دوسرا تعارف تھا جس نے ہمیں خوفزدہ کردیا تھا۔بچپن سے نازونعم میں پلنے اور شاہانہ زندگی بسر کرنے والے ہم بھائیوں کے لیے یہ انکشاف ہی بہت خوفناک تھا کہ ہمیں اپنے عیش و آرام سے دست بردار ہوکر جینا پڑے گا۔

”داداجی! میں ہر نماز کے بعد دعا کروں گا کہ پاکستان کبھی نہ بنے اور ہم ہمیشہ یہیں رہیں۔“ وسیم نے کہا۔

”شاباش! اللہ پاک بچوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔تم اپنے باپ کے لیے ہدایت بھی طلب کرنا۔“ ان کی بات پر ہم نے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆☆☆

وقت بیتتا رہا۔داداجان نے حویلی اور جائیداد وسیم

مشفق خواجہ (1935-2005)

19 دسمبر 1935 کو ماہر تعلیم خواجہ عبدالوحید کے گھرانے میں پیدا ہونے والے خواجہ عبدالحئی پاکستان کے ایسے محقق، ناقد، کالم نگار اور شاعر ہیں جن کے بارے میں بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شعر و ادب کی دنیا میں ان کا طوطی بولتا ہے۔ 1957 میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا 22 سالہ نوجوان معاون سولہ برس تک انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستہ سہ ماہی ”اردو“ اور ماہنامہ ”قومی زبان“ کی ادارت کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ تدوین و تحقیق میں دلچسپی کا جویا نظر آتا ہے۔ 1973 تک سعادت علی خان ناصر کا تذکرہ ”شعرائے اردو خوش معرکہ زیبا“ (1970/1972 دو جلدیں) مرتب کرنے کے بعد شعری مجموعہ ”ابیات“ 1978 جائزہ ”مخطوطات اردو“ پہلی جلد 1979۔ ”اقبال از احمد دین امرتسری“ 1979۔ ”غالب اور صفیر بلگرامی“ 1981 ”تحقیق نامہ“ (مقالات 1991) ”کلیات یگانہ“ اور ”خطوط یگانہ“ تک برصغیر میں منفرد و یکتا کہلانے والے خواجہ عبدالحئی مشفق خواجہ اور خامہ بگوش بن کر کالم لکھتے ہیں تو جسارت، تکبیر، زندگی، صداقت نامی اخبارات و ہفتہ وار کی مانگ ادبی حلقوں میں بڑھ جاتی ہے۔ تبصرہ، تنقید، جانچ، پرکھ انہیں قاضی عبدالودود کی صف میں لے آتی ہے۔خامہ بگوش کے قلم سے سخن در سخن، سخن ہائے گفتنی، اور سخن ہائے گسترانہ (2007 کی ترتیب دینے والے مظفر علی سید اور ڈاکٹر انور سدید کا نام بھی مشفق خواجہ کے کالموں کے باعث چاردانگ عالمی ادب میں گونجنے لگتا ہے)۔حکومت پاکستان نے 1994 میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی (تحقیق و ادب) کو ان کے لیے باعث اعزاز سمجھا۔ برصغیر میں ان کا کتب خانہ بے مثال و بے نظیر، پاکستان اور بھارت سے تحقیق کے جویا، ادیب عالم فاضل مذہبی اسکالر، جامعات کے اساتذہ، پی ایچ ڈی اور ایم فل کے طلباء و طالبات سب ان سے استفادہ کرتے۔ ان سے رہنمائی طلب کرتے۔ ”تخلیقی ادب“ پانچ جلدوں میں رسالے کا اجراء کیا۔ہر قلم کار اور شاعر کو معاوضہ دیا۔ان کے مکمل حالات شائع اشاعت کیے۔کئی نام ایسے ہیں جو ان کی نظر عنایت سے ادیب، افسانہ نگار اور ناشر بنے۔تاہم 21 فروری 2005ء کو خواجہ عبدالحئی مشفق خواجہ کی وفات ہوئی اور سوسائٹی قبرستان کراچی میں تدفین کے بعد سب انہیں بھلا بیٹھے۔ہاں ان کا کتب خانہ ابن انشاء کی قیام گاہ چاند نگر کے قرب و جوار میں اب بھی طلبہ و اسکالرز کے کام آرہا ہے۔نوجوان ناصر جاوید اس کے مہتمم اور خواجہ صاحب کے ہم زلف ذوالفقار مصطفیٰ اس کے نگران ہیں۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

اور میرے نام کردی۔ اس احساس ملکیت کے بعد ہمارے مزاج میں حاکیت اور دل و دماغ میں موجود خوف نے پہلے سے کہیں زیادہ شدت اختیار کرلی تھی۔ حویلی کے معمولات میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ امی جی کا زیادہ تر وقت عبادت میں گذرتا۔ شاید وہ بھی ہماری طرح ابا جان کی واپسی کے لیے دعا گو رہتی تھیں۔ انتظامی معاملات چھٹی بیگم کے ہاتھ میں تھے۔ دادا جی خاموشی سے اپنے کمرے میں وقت گذارتے یا باغات کے حساب کتاب کی دیکھ بھال کے لیے جاگیر کا چکر لگا آتے۔ دو سال اسی کشمکش میں گذر گئے۔ اس دوران ابا جی کی جانب سے کوئی بھی رابطہ نہ کیا گیا۔ گاؤں کے دیگر جوانوں کی زبانی علم ہوا کہ وہ مسلم لیگ کے ہراول دستے میں شامل ہو چکے ہیں۔ جلسوں' اہم ملاقاتوں اور احتجاجی مظاہروں میں وہ اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے۔ جناح' لیاقت اور دیگر قائدین ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس خبر کے بعد امی جان کی آنکھوں میں آنسوؤں نے مستقل ڈیرے جما لیے۔ دادا جی کی خاموشی مزید گہری ہوگئی۔ ان کا جسم خمیدہ رہنے لگا تھا۔

کچھ وقت مزید گذرا تو تارا نگر کے باسی ایک دوسرے سے کھنچے نظر آنے لگے۔ ہمیں ان کے عوامل کا اندازہ تو بالکل نہ تھا لہٰذا اپنی الجھن کا جواب خود ہی ایک دوسرے کو دے کر مطمئن ہو جاتے۔ ان باہمی سوالات وجوابات کے ڈانڈے پاکستان سے ہی جا کر ملتے تھے۔ انہی دنوں ایک ملازم سے علم ہوا کہ ابا جان ایک رات ہم سب سے ملنے آئے تھے لیکن بات ایک بار پھر وہیں آن رکی کہ انہیں پاکستان اور اہل خانہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ یہ سننے کے بعد وہ خاموشی سے لوٹ گئے۔ گذرتے وقت میں اس نادیدہ وجود سے میری وحشت اور خوف میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا وجود تھا جو خونی رشتوں کو ایک ہی جھٹکے میں صدیوں کے فاصلے پر لے آیا تھا۔ تارا نگر کی مجموعی صورتِ حال بھی بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ بہت سے گھرانوں نے نقل مکانی کا آغاز کردیا۔ دادا جی اس صورتِ حال پر بہت پریشان تھے۔ ان کے لیے یہ سلسلہ بہت صدماتی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ سن سینتالیس کا پانچواں مہینا تھا جب افضال خان بھی الوداعی ملاقات کے لیے حویلی چلا آیا۔

''یہ سب کیا ہے خان؟ تم لوگ پرکھوں کی زمین چھوڑ کر جا رہے ہو؟ آخر یہاں کس بات کی کمی ہے؟'' وہ افسردہ ہوگئے تھے۔

''کمی تو کسی بھی چیز کی نہیں ہے مہر جی! مگر اب یہاں رہا بھی نہیں جاسکتا۔''

''آخر کیوں؟ میرے ہوتے ہوئے تم لوگوں کے ساتھ کبھی کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔''

''فضائیں بہت زہریلی ہو چکی ہیں مہر جی! برسوں پرانے یارانے رکھائی اور بیزاری میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ میری بیٹی کو اس کے شوہر اور سسرالیوں کو کسی جانور کی طرح ذبح کر ڈالا۔ نہیں مہر جی! مجھ میں اب مزید کوئی نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں۔ میری مانیے تو آپ بھی بیٹے کے پاس چلے جائیں۔ جوان بیٹی اور بہو کو کب تک تحفظ فراہم کرسکیں گے۔''

''یہاں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم سب برسوں سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں اور مستقبل میں بھی ایسے ہی رہیں گے۔'' ان کی بات پر افضال خان خاموشی سے لوٹ گیا۔ علاقے کے مسلمانوں کی نقل مکانی کے بعد ہندو اور سکھ برادری کے بہت سے خاندان ان گھروں میں آکر آباد ہوگئے۔ دادا جان ان کی آؤ بھگت اور مالی مدد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ ان کی رحم دلی اور سخاوت میں ماضی کی نسبت کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔

ماہِ جون کا آغاز ہو چکا تھا اور پھر تقدیر کی ہولناک گپھا سے ایک ایسا دیو آزاد ہوا جس نے ایک ہی رات میں زندگی کے نقوش دائمی طور پر تبدیل کردیے۔ یہ وہ وقت تھا جب 'پاکستان' سے میرا ایک اور تعارف ہوا۔

☆☆☆

''گرینڈ پا! کیا ہوا ہے آپ کو؟ آر یو او کے؟'' عدنان... کی آواز کے ساتھ مجھے اپنے چہرے کو سہلائے جانے کا احساس ہوا۔ میرا ذہن قرب و جوار سے ناآشنا ہو چکا تھا۔ عدنان کے پاس کمرے کی زائد چابی موجود تھی اس لیے وہ خود ہی خاموشی سے اندر چلا آیا تھا اور غالباً لیپ ٹاپ بھی میرے سینے و بازوؤں سے نکال کر کہیں رکھ دیا تھا۔

لیپ ٹاپ کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہی میں دیوانہ وار اٹھ بیٹھا اور عالم جنون میں وسیم کو پکارنے لگا۔ عدنان نے میرے دونوں ہاتھ جکڑے اور مجھے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اس کے سامنے وہی منظر ساکت کردیا جسے دیکھ کر وہ بھی

ششدر رہ گیا تھا۔

''عدنان! مجھے اسے ہر قیمت پر ڈھونڈنا ہے۔ تم اپنا ہنر آزماؤ اور کسی بھی طرح میری وسیم سے ملاقات کروا دو۔''

''ٹھیک ہے گرینڈ پا! میں کچھ کرتا ہوں۔'' وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔ میری بے چینی کسی بھی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے جسم کا کوئی عضو ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ زندگی میں اس وقت سے آج تک کوئی وقت ایسا نہیں گذرا تھا جب میں نے اپنے بھائی کی کمی محسوس نہ کی ہو۔ ہر غم اور خوشی میں اسے یاد کیا تھا لیکن یہ جذبات تو میری رگوں میں قیامت برپا کررہے تھے۔ میری حرکتوں میں دیوانگی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس عالمی کپ میں بھارت کے فائنل میں پہنچنے کے بعد میں نے معاذ سے کہہ کر اسی طرح دوبارہ بڑی اسکرین نصب کروائی۔ ایک گمشدہ رشتہ دار کا بھارت میں اچانک دریافت ہونا ان کے لیے بھی کسی ایڈونچر سے کم نہیں تھا۔ ان سب نے میرے ساتھ مل کر تماشائیوں میں وسیم کو تلاش کیا لیکن میری نظریں پیاسی ہی رہیں۔ بھوک پیاس سمیت سبھی احساسات سے دھیرے دھیرے ناآشنائی ہونے لگی۔ ناکامی جھنجلاہٹ اور مایوسی بن کر میرے اعصاب شکستہ کرنے لگی تھی۔ میں ہر روز عدنان سے کسی خوش خبری کی بابت پوچھتا اور انکار سن کر اذیت سے مزید بے حال ہو جاتا۔ میرے احساسات اور جذبات وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو کسی امید کے بار تلے سانس لینے سے عاجز ہوں اور وہی امید ان کے لیے زندہ رہنے کا سامان بھی ہو۔ عدنان کے علاوہ دیگر سبھی افراد بھی وسیم کو تلاشنے کی مہم پر جت گئے۔ اس تلاش کا واحد رستہ 'سوشل میڈیا' ہی تھا۔ انہوں نے مختلف بھارتی اسپورٹس پیجز اور گروپس میں دھڑا دھڑ شمولیت اختیار کی۔ بھارتیوں کو اپنی فرینڈز لسٹ میں شامل کیا۔ میری سولو تصویر وہاں پوسٹ کر کے لکھا جاتا۔ ''ہمیں مہر وسیم علی کا پتا و نشان درکار ہے۔''

کئی ہفتے اسی کشمکش میں گذر گئے اور پھر بالآخر ایک سراغ مل ہی گیا۔ سنبل نے کسی بھارتی ادبی گروپ میں شمولیت اختیار کی تھی اور پہلے ہی روز اسے وہاں کسی لڑکی کی پروفائل دکھائی دی جس نے پروفائل پکچر میں اپنی اور وسیم کی موہالی کرکٹ اسٹیڈیم میں لی گئی تصویر لگا رکھی تھی۔

''اسے میسج کرو سنبل! پوچھو کہ یہ وسیم کی کیا لگتی ہے؟ اسے کیسے جانتی ہے؟'' میں ہیجان میں مبتلا ہوگیا۔ سنبل نے من و عن میری ہدایات پر عمل کیا اور اگلے روز اپنا موبائل فون میرے کان سے لگا کر مسکراتی ہوئی ایک جانب بیٹھ گئی۔

''ہیلو! نجیب...... تم نجیب ہو......'' فون سے آتی آواز پر میں بے اختیار اچھل پڑا۔

''وسیم...... تم! میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا...... یہ کہیں میرا واہمہ تو نہیں......'' میری آواز کپکپا رہی تھی۔ میرا ماں جایا' اکلوتا بھائی اتنے سالوں بعد ملا تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے فون سے ہی کسی طرح باہر لے آؤں' اپنے گلے سے بھینچ کر وجود میں سمو لوں اور پھر کہیں بھی جانے نہ دوں۔

''تو کہاں ہے نجیب؟ امی...... ابا...... دادا...... چھٹی بیگم...... سب کچھ کیوں اجڑ گیا؟'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ''آجا میرے پاس نجیب! میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے پاس محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنا ایڈریس بھیج دیتا ہوں...... تو بس کسی بھی طرح ایک بار......'' آنسوؤں نے اسے اپنی بات مکمل کرنے ہی نہ دی۔

''میں آؤں گا...... ضرور آؤں گا۔'' میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ اسی پل موبائل سے ٹوں ٹوں کی آواز نے یہ مواصلاتی رابطہ ختم کردیا۔

''بیلنس ختم ہوگیا ہے شاید۔'' میں نے مایوسی سے فون سنبل کو تھما دیا۔ میرا ذہن بگولوں کی زد میں تھا اور سماعت میں اب بھی اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ عدنان نے اگلے ہی روز اپنے اور میرے ویزا کی درخواست دائر کردی۔ ان سب بچوں نے زہرا کو اپنے فیس بک اور اسکائپ اکاؤنٹ میں ایڈ کرلیا تھا۔ وہ دہلی میں کسی مقامی یونیورسٹی کی طالبہ تھی اور کال سینٹر میں نوکری بھی کرتی تھی۔ وسیم سے ویڈیو کال پر رابطہ بھی زہرا کی فراغت سے ہی مشروط تھا۔ یہ مختصر سی ملاقات تشنگی مزید بڑھا دیا کرتی تھی۔ حیران کن امر تو یہ تھا کہ ان کالز میں روزمرہ کی بات چیت کرتے ہم نے ایک بار بھی اس 'رات' اور اس کے بعد ہونے والے واقعات کے متعلق کوئی ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ شاید ہم لاشعوری طور پر ان کرب انگیز لمحات کو دہرانے سے گریزاں تھے۔ اس کی بیوی بھی وفات پا چکی تھی۔ دو سال پہلے اکلوتی بیٹی اور داماد کی کسی حادثے میں موت نے اسے شکستہ کردیا تھا۔ زہرا اس کی نواسی اور مکمل خاندان تھی۔ میرے بھرے پرے گھر' اہل خانہ کی رونق دیکھ کر

وہ بہت خوشی اور جوش محسوس کیا کرتا لیکن جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری کشمکش میں مبتلا ہے۔ میرے اصرار پر وہ اس کیفیت کو مجھ سے ملاقات کی بے تابی قرار دے کر مجھے ٹال دیتا تھا۔

ویزا کے مراحل اپنی مخصوص رفتار سے طے ہوتے رہے اور پھر وہ لمحہ بھی چلا آیا جب ایک روشن صبح میں عدنان اور میں دہلی کے لیے روانہ ہوگئے۔ چونسٹھ سال بعد اس سرزمین کی طرف اڑان بھرتے ہی میری حالت ماہئی بے آب کی طرح ہونے لگی۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں میں نے زندگی کے ابتدائی دس سال کسی راجا کی طرح گذارے تھے ' تبدیلی کا کرب محسوس کیا تھا اور پھر ایک طوفانی رات میں سب کچھ کھودیا تھا۔ جہاز کی کھڑکی سے نظر آتے زمینی مناظر' بادل اور نیلے آکاش کو دیکھتے ہی میرے ذہن نے ایک بار پھر جست لگائی اور پانچ جون سن سینتالیس کی اس صبح تک جا پہنچا جب ہماری حویلی میں ایک لٹا پٹا خاندان پناہ لینے آیا تھا۔

☆☆☆

''مہر جی! ہمیں انیائے چاہیے۔ ہمارا دوش کیا تھا؟''

...سفید دھوتی کرتے میں ملبوس ایک شخص حویلی کے چوبی دروازے پر دہائیاں دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی تھا۔ دادا جی نے انہیں اندر بلالیا۔ وہ اس روز سخت بخار میں مبتلا تھے لیکن اپنے در پر آئے کسی سوالی کو ٹالنا ان کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔

''ہم سوناپور کے باسی ہیں جی! پرسوں ہونے والے آزادی کے اعلان نے تو وہاں ادھم مچادیا ہے۔ علاقے کے مسلمانوں نے ایکا کر کے مجھ جیسے کئی ہندوؤں کو گھروں اور زمین سے بے دخل کردیا ہے۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ کوئی بھی مسلمان اقلیت پر یوں ظلم نہیں ڈھا سکتا۔'' دادا جی بے یقین تھے۔

''جانے دو باپو! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ مسلمان ہیں اور اپنے دھرم کے لوگوں کا ہی ساتھ دیں گے۔'' اس لڑکے نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے جوان! ہم نے ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دیا ہے۔''

''تو پھر ہمیں کچھ دن کے لیے اپنی چھایا میں پناہ دے دیجیے۔ حالات قابو میں آتے ہی ہم دہلی میں اپنے رشتہ داروں کے پاس چلے جائیں گے۔'' تلک رام نامی اس بوڑھے نے لجاجت سے کہا۔ دادا جی نے انہیں اجازت دے دی اور ان کی خاطر داری میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اسی دن شام ڈھلے ابا جان اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ دادا جی سے ملاقات کے لیے چلے آئے۔ وہ انہیں ہندوستان میں پھوٹنے والے کچھ فسادات اور ممکنہ قتل وغارت سے آگاہ کرکے اپنے ساتھ چلنے کے لیے رضامند کرنے آئے تھے کہ تلک رام پر نظر پڑی تو چونک گئے۔

''تم! یہاں کیسے؟'' ابا جان اسے دیکھ کر چونکے۔

''تیرے ہی انتظار میں تیرے باپ سے کھاطر داری کروا رہے ہیں ہم۔ تجھے مارنے کا منصوبہ تو بہت پہلے ہی بن چکا تھا۔ بڑا نقصان پہنچایا ہے تونے ہندو مہاسبھا اور کانگریس کو۔ تجھے اس بستی میں داخل ہونے سے پہلے بھی قتل کرسکتے تھے لیکن دشمن کو گھر میں گھس کر مارنے کا مجا ہی اور ہے۔'' اس نے اپنی قمیص تلے چھپایا ایک خوفناک خنجر نکالا۔

''ان میں سے کسی کو بھی جندہ نہیں چھوڑنا باپو! تنظیم کے باقی ساتھیوں کے آنے سے پہلے ہی ان کا رام نام ستیہ کردو۔ ہماری 'دعوت' کے لیے اندر دو عورتیں بھی موجود ہیں۔'' بھولورام خباثت سے کہتا خنجر تھامے چلا آیا۔ ابا جان نے وقت ضائع کیے بغیر تلک رام پر جست لگا دی۔ انہوں نے بھی اپنے لباس سے ایک چاقو برآمد کرلیا تھا۔ بھولو نے مشتاق پر وحشیانہ حملہ کیا اور اس کا نرخرہ ادھیڑ کر دادا جی کی طرف متوجہ ہوگیا جو اس صورتِ حال پر ساکت ہوچکے تھے۔ تلک رام کی گردن ٹوٹنے کی آواز نے وسیم اور مجھ پر لرزہ طاری کردیا۔ اس سے چھٹکارا پاتے ہی اپنے زخمی پہلو کو دباتے ابا جی دادا جان کی طرف متوجہ ہوئے جن کے سینے اور پیٹ پر بھولورام کئی وار کرچکا تھا۔ ابا جی نے عقب سے اس کی گردن دبوچی اور رگیدتے ہوئے کمرے کے وسط تک لے آئے۔ میں نے اپنے لرزتے جسم پر قابو پاتے ہوئے ایک آرائشی گلدان اٹھایا اور پوری قوت سے بھولو کے سر پر دے مارا۔ وہ ابا جان پر غالب آتے ہوئے ان کے سینے پر سوار ہوچکا تھا۔ گلدان کی ضرب سے اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور خنجر کی نوک ابا جی کے حلق میں گھس گئی۔ وسیم نے اپنی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے تلک رام کی لاش سے اٹھا کر خنجر بھولو کی گردن میں گھسادیا۔ چشم زدن میں چار لاشوں کا یہ نظارہ ہم جیسے نازونعم اور سہل پسندی میں پلنے والے بچوں کے لیے ہولناک تجربہ تھا۔ دادا جی کی حالت بھی

بہت خراب تھی۔

''وسیم...... نجیب! امتیاز اور اپنی ماں' چچی کو بلالاؤ۔'' ان کی آواز نقاہت سے ڈوب رہی تھی۔ ہمارے دل ودماغ بھی آندھیوں کی زد میں تھے۔ امتیاز کے آتے ہی دادا جی نے اسے حویلی کے کاغذات اور کچھ رقم تھما کر ہم سب کو محمد نگر کے زمیندار تک بحفاظت پہنچانے کی ذمہ داری دے دی۔ ملازمین تک اس قتل وغارت کی خبر پہنچ چکی تھی۔ ان کے چہرے زرد اور آنکھیں نم تھیں۔ اکبری نامی ملازمہ کو بھاری رقم دے کر ملازمین میں بانٹنے کے لیے کہہ دیا گیا۔ اس ذرا سی دیر میں دادا جی کی سانسیں اب اکھڑنے لگی تھیں۔

''میں اعتبار اور نظریات کی یہ جنگ ہار گیا ہوں۔ میری کم فہمی نے خطرات تم سب کے سر پر لا کھڑے کیے ہیں۔ اپنی جانیں بچا کر یہاں سے چلے جاؤ۔ ان کے ساتھی کسی بھی وقت پہنچ سکتے ہیں۔'' ملازمین اس صورتِ حال پر اشکبار تھے اور ہم ہراساں۔ ایک طرف والد کی لہورنگ لاش پڑی تھی تو دوسری جانب دادا کے سر پر موت کا سایہ منڈلاتا دکھائی دے رہا تھا۔ شام کے سرمئی رنگ پر تاریک بادلوں نے غلبہ پالیا۔ تیز آندھی سے کھڑکیاں دروازے زور زور سے بجنے لگے۔ شاید وہ بھی مکینوں کی اس جبری منتقلی پر احتجاج کررہے تھے۔ دادا جی نے روتی تڑپتی بیٹی اور صدمہ سے ساکت بہو کو امتیاز کے ساتھ جس طرح روانہ کیا اس کا احوال لکھنے بیٹھوں تو صفحات سیاہ ہوتے جائیں لیکن وہ کرب' جذبات اور اذیت پھر بھی بیان نہ ہو پائے گی۔ حویلی سے نکلتے بارش نے طوفانی روپ اختیار کرلیا۔ کیچڑ اور پانی میں تانگہ اپنا توازن بہت مشکل سے برقرار رکھے ہوئے تھا۔

''یہ بے وقت' بے موسم بارش تو ایک نیا امتحان بن گئی ہے۔ یا اللہ! ہمیں کن گناہوں کی یوں سزا مل رہی ہے۔'' امی جان دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

''اپنے جوان بھائی اور باپ کو بے گوروکفن چھوڑ کر آنا پڑا ہے۔ زندگی میں اس سے بدتر مقام اور کیا ہوگا؟'' پھپی بیگم بھی اشکوں میں ڈوبی تھیں۔

''ہمت کریں بی بی جی! ہم اکیلے ہی اس آفت کا شکار نہیں ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم کی داستان میں اکثر مہر صاحب کو سنایا کرتا تھا لیکن وہ بضد تھے کہ تارا نگر ان فسادات کی لپیٹ میں نہیں آسکتا۔'' امتیاز نے کہا۔ وہ پھلوں کی ترسیل کے سلسلہ میں اکثر قریبی علاقوں کا سفر کیا کرتا تھا اس لیے خاصا' باخبر انسان تھا۔ انہی تسلی' دلاسوں اور اشکوں میں سفر جاری رہا۔ بارش تیز تر ہوگئی تھی۔ آسمان سے برستا پانی ایک چادر کی صورت میں نظروں کے سامنے تنا تھا۔ ہر سو خوف' وحشت' ہراس اور بے یقینی کا آسیب رقصاں تھا۔ امتیاز کو کافی امید تھی کہ صبح ہونے سے قبل ہی ہم مہر سلیم کی حویلی تک پہنچ جائیں گے لیکن اس روز تقدیر نے ہر تدبیر کند کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ محمد نگر کی سرحد میں داخل ہوتے ہی سوختہ گھروں اور ہولناک بدبو نے ہمارا استقبال کیا۔ مکانوں کی حالت بتاتی تھی کہ انہیں نذرِ آتش ہوئے کچھ گھنٹے ہی بیتے ہیں۔ قرب وجوار میں چکراتی بدبو یقیناً انسانی گوشت کی چراند تھی۔

''الٰہی کرم! اب کہاں جائیں گے ہم؟'' پھپی بیگم نے دہل کر کہا۔

''یہاں سے نکل چلتے ہیں بی بی جی! میری چھٹی حس کہتی ہے کہ سکھ اور ہندو شر پسندوں سے کسی بھی لمحہ سامنا ہو سکتا ہے۔ ان کے ہتھے چڑھے تو عزت وجان دونوں ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔'' امتیاز نے عجلت میں کہا اور تانگہ واپس موڑ لیا۔

''لیکن ہم جائیں گے کہاں؟'' وسیم نے غصہ سے کہا۔ ''خدا کی قسم! مجھے اس وقت اپنی ذات کسی بھکاری سے بھی بدتر محسوس ہورہی ہے جو ہر در سے دھتکارا جارہا ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کریں چھوٹے مہر جی! یہ وقت مشکل ضرور ہے لیکن کٹ ہی جائے گا۔'' امتیاز نے ادب سے کہا۔ وہ نہایت چابکدستی سے تانگہ دوڑا رہا تھا۔ محمد نگر کی حدود سے نکلتے ہی اس نے اپنا رخ دریا کی طرف کرلیا تھا۔ وہ ہم لوگوں کو کسی کشتی کے ذریعہ اپنے رشتہ داروں کے پاس لے جانا چاہتا تھا جو راوی پار مقیم تھے لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پھسلن اور بارش نے بالآخر اپنا کام کردکھایا اور ایک گڑھے سے غیر متوازن ہونے کے بعد بائیں جانب سے پہیا نکل گیا۔ دائیں سمت امی اور وسیم بیٹھے تھے۔ وہ اس جھٹکے سے الٹ کر باہر جاگرے۔ اس جانب کئی پتھر موجود تھے۔ امی جان کے سر پر لگنے والی ایک چوٹ ایسی مہلک ثابت ہوئی کہ انہیں کوئی آواز نکالنی بھی نصیب نہ ہوسکی۔ یہ علاقہ ایک سمت سے نشیبی تھا۔ وسیم اسی نشیب میں لڑھکتا ہوا اندھیرے میں جانے کہاں کھوگیا۔

''بھابی بیگم کو میں دیکھتی ہوں۔ آپ وسیم کو تلاش کیجیے۔'' چچی بیگم نے روتے ہوئے امتیاز سے کہا۔ بارش کی آواز کے علاوہ یہاں ایک نامانوس قسم کا شور سنائی دے رہا تھا لیکن ابھی اس پر غور کرنے کا وقت ہی نہ تھا۔ ہم نے امی جان کو سیدھا کرنے کے بعد انہیں کئی بار ہلایا جلایا لیکن ان کا بدن ساکت اور بے حس ہو چکا تھا۔ ہم دونوں ہی گھٹنوں کے بل جھکے انہیں صدائیں دیتے رہے لیکن وہ سماعت اور گویائی کا ہر تعلق منقطع کر چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد امتیاز ہانپتا ہوا نشیب سے برآمد ہوا۔ اس کا ستا ہوا چہرہ ناکامی کا منہ بولتا اعلان تھا۔

''اس طرف ایک نالہ ہے بی بی جی! مجھے لگتا ہے چھوٹے مہر صاحب اس میں بہتے......'' شدت غم سے وہ اپنے بال نوچتا زمین بوس ہو گیا۔ وہ لمحہ میرے لیے اذیت کی جان لیوا حد تھا۔ چند گھنٹوں میں ہی میں اپنے والدین، دادا، بھائی اور گھربار سے محروم ہو گیا تھا۔

''بی بی جی! وہاں ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں ہندو شرپسند لوٹ مار اور قتل و غارت پر تلے ہوئے ہیں۔ خدا کا واسطہ ہے نکل چلیے یہاں سے۔ ان درندوں کو لہو اور ماس کی چاٹ لگ چکی ہے۔ مہر جی کی نسل میں آپ اور نجیب صاحب ہی بچے ہیں۔ میں آپ دونوں کو راوی پار لاہور لیے چلتا ہوں۔ لاہور پاکستان کا ہی حصہ بنے گا۔ ہمارے لیے یہاں زمین تنگ کر دی گئی ہے۔''

امتیاز نے خلوص سے کہا۔ اس کے انکشاف پر ہمیں نامانوس شور کی حقیقت بھی سمجھ آ گئی۔ میرے دل میں اس وقت ایک آتش روشن ہو چکی تھی۔ پاکستان...... ہاں یہ پاکستان ہی تو تھا جس کی وجہ سے ہم لوگ اتنے سال اپنے والد کی شفقت سے محروم رہے اور بالآخر یتیم ہو گئے۔ یہ پاکستان ہی تو تھا جس کے باعث ہم راتوں رات اپنے سگے رشتوں کو بے گور و کفن چھوڑنے پر مجبور تھے۔ مجھے اس ان دیکھے وجود سے بے تحاشا نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ میں چیخ چیخ کر امتیاز کو اس فیصلہ پر عمل کرنے سے روکنا چاہتا تھا لیکن چچی بیگم نے میری ایک نہ چلنے دی۔ میرے دل و دماغ میں آندھیوں کے تیز جھکڑ تھے۔ میں اپنا بے جان پڑتا جسم گھسیٹتا ان کے ساتھ چلتا رہا۔ جانے کن رستوں اور فصلوں سے گزارتے ہوئے وہ ہمیں دریائے راوی تک لے آیا اور کسی ماہی گیر کو اس کا منہ مانگا معاوضہ طے کرنے کے بعد کشتی میں سوار کیے لاہور چلا آیا۔ میرا وجود برف بن چکا تھا۔ اس شہر میں آمد اور اپنی جان بچانے کے لیے میں نے بساط سے بڑھ کر تاوان ادا کیا تھا۔ امتیاز ہمیں انارکلی کے ایک پرانے سے مکان میں لے آیا۔ میری زندگی نے ایک ہی پل میں مجھے عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا اور اس کی وجہ صرف پاکستان تھا۔ میری ذات پر ایک جامد خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ میں گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھا خلاؤں میں تکتا رہتا۔ اگست میں بٹوارے کے نتیجہ میں ہونے والے غدر اور دو طرفہ خونی نقل مکانی بھی مجھے اس کیفیت سے رہائی نہ دلوا سکی۔ حالات معمول پر آتے ہی امتیاز نے بھاگ دوڑ کر کے حویلی کے کاغذات کی مدد سے کلیم دائر کر کے ایک ہندو خاندان کی چھوڑی ہوئی چھوٹی سی کوٹھی حاصل کر لی۔ چچی بیگم کا جذبہ ہمدردی بھی ان دنوں سوا نیزے پر پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے امتیاز اور اس کے ماموں زاد اور ان کے رشتہ داروں کو بھی اپنے ساتھ رہنے پر قائل کر لیا۔ اپنی روح پر لگے زخموں اور ان کی موجودہ صورتِ حال دیکھ کر میں مزید تنہائی کا شکار ہوتا گیا۔ مہر سلطان علی کا پوتا ایک معمولی سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ حویلی سے لائی گئی رقم سے امتیاز کے ماموں زاد بھائی نے پارٹنرشپ پر ایک لیدر کی فیکٹری قائم کر لی اور ہمیں طے شدہ معقول معاوضہ دینے لگا۔ تارا نگر کے سیاہ و سفید کا مالک مہر نجیب علی اپنے اخراجات کے لیے ایک چھوٹی ذات کے ملازم کا محتاج ہو چکا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرکاری بینک میں ملازمت ملتے ہی چچی بیگم نے میری رضامندی سے ایک سابقہ کلاس فیلو سے شادی کروا دی۔ چند سال بعد کچھ روز موسمی بخار میں مبتلا ہونے کے بعد وہ وفات پا گئیں۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا لہٰذا الگ گھر خرید کر امتیاز کے خاندان سے قطع تعلق کر لیا۔ اولاد کی پرورش بھی ذاتی میلان کے مطابق کی۔ میرے دل و دماغ میں ملک کے لیے کوئی مثبت جذبہ نہیں بیدار ہوا۔ میں نے قومی مفادات کے خلاف ہر وہ کام کیا جو مجھے ذرا سا بھی فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ زندگی کے اس اختتامی پڑاؤ تک آتے ہوئے جب میں فرشتہ اجل کی آہٹوں کا منتظر تھا تو تقدیر میرے سامنے وسیم کو لے آئی تھی۔ میرا وہ ماں جایا تن تنہا جانے کن حالات سے گزرا تھا۔ یہ خیال آتے ہی درد کی ایک ٹیس اٹھی اور میرے لبوں سے بے اختیار ایک کراہ نکل گئی۔

''کیا ہوا گرینڈ پا! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' عدنان نے میرا کندھا ہلایا۔ ایک طویل کرب، وچھوڑے، تڑپ اور دکھ بھرے مناظر نظروں سے اوجھل ہوئے تو جہاز کا اندرونی ماحول میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ''بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی والے ہیں۔'' اس کے دلاسہ بھرے انداز نے مجھے مزید بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ لمحے صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ فلائٹ لینڈ ہونے سے لے کر ائیرپورٹ پارکنگ میں وسیم اور زہرا سے ملاقات تک میرے حواس بالکل اپنے قابو میں نہ تھے۔ وسیم کو دیکھتے ہی میں اپنے سارے ضبط کھو بیٹھا۔ اس سے بغلگیر ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ میرا وجود برف زار سے پگھلنے لگا ہے۔ اس کے وجود کی خوشبو اپنی سانسوں میں محسوس کرتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ اس کے نقوش پر دیوانہ وار اپنے ہاتھ پھیرتے میں ایک بار پھر اپنے بچپن میں لوٹ گیا اور بے اختیار اس کی پیشانی، بالوں اور رخسارے پر بوسے دینے لگا۔ اس لمس میں مجھے اپنے سبھی گمشدہ رشتوں کی محبت کی خوشبو پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ وسیم کا حال بھی مجھ سے مختلف نہ تھا۔ آنسوؤں سے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''بس کر دیجیے نانا جان! آپ کی طبیعت خراب نہ ہو جائے کہیں!'' نیلی شلوار قمیص میں ملبوس زہرا نے کہا۔ وہ کم عمر سنجیدہ اور حساس طبیعت کی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم دہلی کے ایک نیم پسماندہ مضافاتی علاقہ میں پہنچ گئے۔ دو کمروں کے اس سادہ سے گھر کی چھتیں ٹین کی تھیں۔ گھر میں غربت کے باوجود در و دیوار میں سلیقہ کی جھلک نمایاں تھی۔ وسیم کی صحت کچھ قابل رشک نہ تھی۔ چہرے کی سختی اور آنکھوں کی افسردگی واضح بتاتی تھیں کہ اس نے زندگی کو نہیں بلکہ زندگی نے اسے برتا ہے۔

''معاف کرنا نجیب! تیری خاطرداری کے لیے میرے پاس اس غریب خانہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

''یہ بھی تو نے خوب کہی! تم سے ملاقات میرے لیے کسی دولت یا خزانے سے کم تو نہیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے تھام لیا۔ میری حالت اس وقت کسی ایسے شخص کی سی تھی جسے صحرا میں طویل مسافت کے بعد کوئی نخلستان یا میٹھے پانی کا چشمہ میسر آ گیا ہو۔ کمرے میں چارپائی، ایک میز اور کرسی کے سوا کچھ بھی نہ تھا لیکن مجھے وسیم کے سوا کسی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ ہماری گفتگو بلا تعطل جاری تھی۔ عدنان پہلے تو ہمارے ساتھ بیٹھا بات چیت میں حصہ لیتا رہا لیکن پھر اپنے موبائل فون اور سوشل میڈیا پر بھارت آمد کی اطلاع دینے میں مصروف ہو گیا۔ رات کے کھانے سے فراغت کے بعد زہرا کال سینٹر کی نوکری پر روانہ ہو گئی۔ چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے میں اپنے الفاظ مجتمع کرنے کی ہمت پیدا کرنے لگا۔ ہم دونوں کے درمیان یکدم ہی خاموشی کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہا تھا۔

''وسیم! تجھ سے ایک بات پوچھوں؟'' میں نے کپ سے نظریں ہٹا کر کہا۔

''جانتا ہوں کہ تم کیا پوچھو گے۔ تم یقیناً اس طوفانی رات کے بعد ہونے والے واقعات کے بارے میں متجسس ہو گے۔'' اس نے بوجھل سانس لی۔ میری خاموشی ہی میرا اقرار تھی۔

''میں آج تک اپنے ماضی کی بازگشت دفن نہیں کر سکا نجیب!'' وہ اذیت سے بولا۔ ''مجھے آج بھی وہ وقت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ مہر سلطان علی کی جائداد کے وارث کسی شاخ سے ٹوٹے پتوں کی طرح پناہ کے لیے دربدر بھٹک رہے تھے۔ مہر سلیم کے گاؤں سے نکلتے میرا غم و غصہ سے برا حال تھا۔ دل و دماغ میں دادا جان اور ابا جی کی گفتگو اور مباحثے گونج رہے تھے۔ ہم ہندوستانی سرزمین پر پیدا ہوئے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی ایک نئے ملک کی تشکیل اور اپنا گھربار چھوڑنے کا غلغلہ اٹھا تو نفرت و حقارت کی آندھی نے سب رشتے ملیامیٹ کر دیے۔ میں نے دادا جان کی ہدایت پر ہمیشہ یہی دعا کی تھی کہ یہ ملک کبھی وجود میں نہ آئے اور ہم ہمیشہ ہندوستان میں ہی عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے رہیں۔ اس وقت بھی میں یہی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اسی پل...... ٹھیک اسی پل تانگہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور میں نشیب میں لڑھکتا ہوا خودرو جھاڑیوں میں الجھ کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ میں مہر وسیم علی تھا جس نے کبھی زندگی میں کانٹا چبھنے کی تکلیف تک برداشت نہ کی تھی تو پچھلے کئی گھنٹوں سے جاری اس مشقت پر کس طرح اپنے حواس پر قابو رکھ سکتا تھا۔ مجھے ہوش آیا تو موسم ایک بار پھر اپنی کینچلی بدل چکا تھا۔ ماہِ جون کی وہ بارش حسب دستور اپنے ساتھ شدید حبس اور گرمی لائی تھی۔ ان کانٹے دار جھاڑیوں سے نکلتے میں مزید زخمی ہو چکا تھا۔ میں چاہ کر بھی تمہیں اس ہراساں اور وحشت زدہ لڑکے کی کیفیت نہیں سمجھا سکتا جس نے زندگی میں صرف آسائشیں ہی دیکھی

تھیں۔ میرے پردۂ تصور پر آج بھی وہ منظر نقش ہے جب وہ دس سالہ لڑکا چیختے ہوئے اپنی ماں، چچی اور بھائی کو پکار رہا تھا۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے تو گرتا پڑتا دوبارہ نشیب سے نکلنے کی کوشش کی اور پہلی ہی ملاقات اپنی ماں کی کٹی پھٹی لاش سے ہوئی جسے دو جنگلی جانور نہایت اہتمام سے نوچنے میں مصروف تھے۔ ایک درخت کی چند شاخیں توڑ کر جانوروں کو بمشکل وہاں سے ہٹایا اور بارش سے نرم ہوجانے والی زمین کھودی اور ہانپتے ہوئے امی جان کی باقیات کو اس گڑھے میں دفنا دیا۔ وہاں موجود اکلوتی بستی شاید پہلے ہی تباہ کی جاچکی تھی۔ اس ویرانے میں بھوک، پیاس اور زخموں سے نڈھال دو روز تک بھٹکتے رہنے کے بعد لکشمی پور گاؤں میں پہنچا تو بساط سے بڑھ کر کی گئی مشقت کے نتیجہ میں ہونے والی نقاہت سے نڈھال ہوکر جانے کب بے ہوش ہوگیا۔ بستی کے مکھیا نے بخار اور کمزوری میں کھانے پینے کا خوب خیال رکھا۔ ماضی کی شان و شوکت تو اب ایک خواب بن کر رہ گئی تھی اور مستقبل ہولناک آسیب۔ اس موڑ پر تقدیر ایک بار پھر میرے غرور اور بڑے بولوں کا تاوان وصول کرنے چلی آئی۔ لکشمی پور درحقیقت پیشہ ور بھکاریوں کی بستی تھی۔ مہر سلطان علی کا پوتا بھرپور تشدد اور ذلت سہنے کے بعد گورداسپور کے گلی کوچوں میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو چکا تھا۔ میری عزت نفس ہر ایک پل مجھے ذلتی اپنا ماضی یاد کرواتی۔ یہ وہ وقت تھا جب تقسیم کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات کی آگ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔ اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں ہاتھ میں کاسہ لیے در بدر پھرتے میں نے انسانیت کا ایک ایسا شرمناک ترین روپ دیکھا جو فسادات پر مبنی کسی فلم میں دکھایا گیا، نہ کسی کے نوک قلم سے آج تک نکل سکا۔ میں نے مساجد کو اصطبل بنتے دیکھا اور مسلمانوں کو برہنہ لاشوں کی صورت میں چیل کوؤں کی خوراک بنتے دیکھا۔ مسلمان لڑکیوں کو ممبئی اور دہلی کے بالا خانوں کی رونق بنا دیا گیا۔ اس وقت...... ہاں اس وقت مجھے ابا جان کے وہ الفاظ بہت یاد آتے تھے کہ ہم اپنے اعتبار کی دولت جن پر لٹا رہے ہیں وہ موقع ملتے ہی ہم سے بدترین انتقام لیں گے۔ مہر جہان داد کی جوانی، جوش اور بصیرت ہمارے دادا جان کے نظریات کو باطل ثابت کرچکی تھی لیکن اب کہیں کوئی مداوا نہیں تھا۔ ہندو اور سکھوں کی نفرت، طیش اور انتقامی کارروائیاں دیکھ کر میرے دل سے دعا نکلتی کہ امتیاز تم لوگوں کو بحفاظت کسی منزل تک پہنچا چکا ہو۔“

”تم...... بھکاری......؟“ میں صدمہ سے چور ہو گیا تھا۔ ”اس دلدل سے کیسے نکلے پھر؟“

”میرے آقاؤں کو شاید یقین ہو چکا تھا کہ اب میں اس قفس کا عادی ہوگیا ہوں لہٰذا میری پہرہ داری میں نرمی برتی جانے لگی۔ ان دنوں مجھے پھول نگر کا علاقہ سونپا گیا تھا۔ روز میرا کاسہ خلاف توقع جلد ہی بھر گیا۔ میں نے واپسی کا ارادہ کیا تھا کہ ایک شفیق آواز نے قدم جکڑ لیے۔ وہ ابا جان ہی کی عمر کا ایک شخص تھا جس نے میرے میلے چہرے، الجھے بکھرے بالوں اور بدبودار جسم میں بھی مہر جہان داد کی شباہت کھوج نکالی تھی۔ میں اپنی شناخت تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ اس کا نام نواز احمد تھا اور وہ ہمارے پس منظر اور حویلی پر ٹوٹنے والی قیامت سے مکمل آگاہ تھا۔ پھول نگر میں کسی رشتہ دار سے ملاقات کے بعد اسے دہلی واپس لوٹنا تھا۔ وہ اپنی حکمت سے مجھے بھی ساتھ لے آیا۔ علی گڑھ سے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مسلمان ہونے کی پاداش میں وہ کوئی نوکری حاصل نہیں کر پایا تھا اور دہلی میں ہی معمولی کریانہ فروش تھا۔ وہ مجھے بھی کسی اسکول میں داخل کروانا چاہتا تھا لیکن اس کی معاشی پسماندگی مجھے کبھی یہ احسان لینے کے لیے مائل ہی نہ کرسکی۔ میں دہلی کے نو تعمیر شدہ گھروں میں اینٹیں ڈھوتا رہا اور معقول رقم جمع ہوتے ہی جامع مسجد کے عقب میں ایک دکان کھول لی۔ نواز کے احسانات چکانے کا ایک ہی طریقہ سمجھ آیا کہ اس کی ایک پاؤں سے معذور اور عمر میں خود سے بھی بڑی بیٹی سے شادی کرلوں۔ سو میں نے کرلی۔ شائستہ میرے لیے بہترین شریک حیات ثابت ہوئی۔ آج اگر اپنی سابقہ زندگی پر نظر دوڑاؤں تو تارا نگر میں گذرے وقت کے بعد شائستہ ہی حاصل حیات نظر آتی ہے۔ ہمیں اولاد کی نعمت ایک دہائی کے طویل انتظار کے بعد نصیب ہوئی۔ گلبدن نے ہماری زندگی کو ایک نئی بہار عطا کردی۔ اس کی پرورش، پڑھائی، لکھائی اور شادی بیاہ کے معاملات نمٹاتے بالوں میں سفیدی اتر آئی لیکن اللہ گواہ ہے نجیب! کہ ایک لمحہ کے لیے بھی تارا نگر، والدین اور دادا جی کا غم دل سے فراموش نہ ہوا۔ کسی ایک لمحہ کے لیے بھی تمہارا اور چچی بیگم کا خیال میری سوچوں سے محو نہ ہوا۔ میرے کہے گئے نازیبا کلمات ہر موڑ پر مجسم سزا بن کر سامنے آتے رہے۔ دادا جی اور ہمیں بہت ناز تھا کہ یہاں ہم سب محفوظ اور مامون رہیں گے لیکن پچھلے چونسٹھ برسوں میں ہونے والے واقعات تمہیں سنانے بیٹھوں تو عمر کی نقدی ختم ہو جائے لیکن وہ اذیت بیان ہی نہ ہوسکے جو میں نے اعتبار کی کرچیاں ہونے پر محسوس کی تھی۔ شائستہ کے بھائیوں کو نماز عید کے اجتماع میں سوچی سمجھی سازش کے تحت کی جانے والی فائرنگ سے پروانۂ اجل تھما دیا گیا۔ گجرات میں مقیم رشتہ دار ہندو مسلم فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے اور میری بیٹی گلبدن کو اس کے شوہر کے ساتھ اس وقت گولیوں سے چھلنی کردیا گیا جب وہ عیدالاضحیٰ پر قربانی کے لیے گائے خرید کر واپس لوٹ رہے تھے۔“ وہ ہانپتے ہوئے خاموش ہوگیا۔ میرا حال اس وقت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق تھا۔

”اتنی تکلیفیں...... اتنی اذیتیں سہیں تو نے۔“ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

”صرف میں نے نہیں میرے بھائی! ہم میں سے ہر ایک نے یہاں سانس لینے کا بھی بھرپور تاوان ادا کیا ہے۔“ اس نے کپ ایک جانب رکھ دیا۔ چائے اب بالکل ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ خاموشی ایک بار پھر ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔

”نجیب! تجھے وہ نظم یاد ہے جو چچی بیگم نے ہمارے لیے بنائی تھی؟“

”یاد تو اسے کیا جاتا ہے وسیم! جسے ہم بھولے ہوں۔ میں تجھ سے متعلق کوئی بھی بات نہیں بھولا۔“ میں نے کہا اور پھر ہم بچپن ہی کی طرح یک زبان ہوگئے۔

”تارا نگر کے ہم دو تارے
والدین کو جان سے پیارے
دادا کے ہم راج دلارے
پھپھو کے جینے کے سہارے
جگمگ کریں گے نصیب ہمارے“

آخری مصرعہ پڑھتے ہی وسیم کی آواز رندھ سی گئی تھی۔ اسے حوصلہ دیتے ہوئے میں خود بھی اپنا ضبط کھو بیٹھا۔ رات دھیرے دھیرے پگھل رہی تھی۔ وسیم کے اصرار پر میں چارپائی پر اس کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔ وہ اب بھی اسی رات کی طرح میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ باتیں کرتے، بچپن کی یادیں دہراتے ہم نہ جانے کس وقت نیند کی وادی میں جا اترے۔ اگلی صبح اذان فجر کے وقت آنکھ کھلی تو ایک نیا صدمہ میرا منتظر تھا۔

☆☆☆

”بیٹی زہرا! تم نے ایک بار بھی ہم سے اس بارے میں ذکر نہ کیا۔ آخر کیوں؟“ شدت گریہ سے میری آواز بیٹھ چکی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں اپنے بھائی کو لحد میں اتار کر آیا تھا۔ اس رات جانے کب فرشتۂ اجل چپکے سے اسے اپنے سنگ لے گیا تھا۔

”نانا جان نے منع کیا تھا۔ انہیں جگر کا کینسر چھ ماہ پہلے تشخیص ہوا تھا۔ آپ سے پہلی بار بات ہونے کے بعد انہوں نے مجھ سے حلف لیا تھا کہ میں اس راز کو افشا کرکے کبھی آپ کی خوشی کو گرہن زدہ نہیں کروں گی۔“ وہ بھی غم سے نڈھال تھی۔

”اپنی زندگی میں اس قدر دکھ سہنے کے بعد ان کا جگر چھلنی نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟“ عدنان بھی مغموم تھا۔ میں نے اسے چیدہ چیدہ حقائق سے آگاہ کردیا تھا۔ اس کی بات پر زہرا بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”دیکھو بیٹی! تم مجھے وسیم ہی کی طرح عزیز ہو۔ خدا گواہ ہے کہ یہاں آمد کے ساتھ ہی ایک خواہش نے میرے دل میں جنم لیا تھا۔ میرا بھائی اگر زندہ ہوتا تو میں اس کے پاؤں

مختلف ممالک کے اعلیٰ فوجی اعزازات

1۔ ارجنٹائن، کراس ٹو دا ہیروؤک ویلر ان کمبٹ۔ 2۔ آسٹریلیا، وکٹوریہ کراس فار آسٹریلیا۔ 3۔ بنگلہ دیش، بیر سریشٹھو۔ 4۔ کینیڈا، وکٹوریہ کراس آف کینیڈا۔ 5۔ چین، ہیروز میڈل۔ 6۔ ڈنمارک، ویلر کراس۔ 7۔ فرانس، لیجن آف آنر۔ 8۔ بھارت، پرم ویر چکر۔ 9۔ اسرائیل، میڈل آف ویلر۔ 10۔ اٹلی، گولڈ میڈل آف ملٹری ویلر۔ 11۔ نیوزی لینڈ، وکٹوریہ کراس فار نیوزی لینڈ۔ 12۔ ناروے، وار کراس ود سورڈ۔ 13۔ پاکستان، نشانِ حیدر۔ 14۔ روس، گولڈ اسٹار کی۔ 15۔ اسپین، لاریٹ کراس آف سینٹ فرڈیننڈ۔ 16۔ برطانیہ، وکٹوریہ کراس۔ 17۔ امریکا، میڈل آف آنر۔

نازیہ ارسلان کا شاہد محمود ڈوگر کی تصنیف سے انتخاب کون کیا ہے؟

مرسلہ: محمد لطیف آئس کریم والا۔ فوجیوں والا

پڑ کر تمہیں عدنان کے لیے مانگ لیتا۔ اب ایک بزرگ کی حیثیت سے تم سے درخواست کرسکتا ہوں کہ میرے پوتے سے عقد کر کے ہمارے ساتھ پاکستان لوٹ چلو۔ تمہیں وہاں کوئی بھی تکلیف نہیں ہوگی۔'' میں نے عدنان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔ وسیم کی تدفین کے بعد ہی اس نے مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''پاکستان...... ہاں جی! ٹھیک کہا آپ نے! اس مظلوم نے مجھے کیا تکلیف دینی ہے؟ وہ تو خود نہایت تکلیف میں ہوگا۔'' وہ طنز سے بولی۔

''میں سمجھا نہیں تمہاری بات۔ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟'' میں چونکا۔

''یہی تو آپ کا المیہ رہا انکل! کہ آپ کبھی بھی سمجھ ہی نہ سکے...... حالات کو اور نہ ہی اپنے اردگرد انسانوں کو۔'' وہ سپاٹ انداز میں کہتی بہت پرائی محسوس ہونے لگی تھی۔ ''نانا جان نے مجھے آپ لوگوں کی تارانگر میں بیتنے والی زندگی کے متعلق سب کچھ بتا رکھا تھا۔ میں اس وقت ہونے والی نادانیوں کے لیے آپ کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتی۔ آپ اپنے دادا کی سوچ کے زیر اثر تھے۔ وہ بھی ہندوستان کے موجودہ تمیں کروڑ لوگوں کی طرح اس سرزمین سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے لیکن اس یک طرفہ سوچ و نظریات میں آپ کو پاکستان سے وحشت اور نفرت محسوس کرنے کا حق کس نے دیا؟ آپ کے لیے اس سے محبت کرنے کی کیا ایک یہی وجہ کافی نہیں تھی کہ آپ کے والد نے اس کے لیے اپنی زندگی تج دی؟''

''ان سب باتوں کو دہرانے کا اب کیا مقصد ہے یار!'' عدنان جھلا کر بولا۔

''مسٹر عدنان! مجھے یار کہہ کر مخاطب کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ اور آپ کی دوسری بات کا جواب بھی میں ضرور دوں گی لیکن پہلے ذرا ان سے نمٹ لوں۔'' وہ انگلی اٹھا کر سختی سے بولی۔

''انکل! آپ نے ویڈیو کالز کے دوران نانا جان سے اپنی موجودہ زندگی کے بارے میں جتنی بھی باتیں کیں اس سے کہیں زیادہ میں نے آپ کے گھرانے کو فیس بک کی دنیا میں پرکھ لیا تھا۔ آپ لوگ دیش سے محبت کرنے کا کوئی جذبہ ہی نہیں رکھتے۔ یہ دیش بھگتی صرف اس وقت جاگتی ہے جب بھارت اور پاکستان کھیل کے میدان خاص طور پر کرکٹ میچ میں آمنے سامنے ہوں۔ آپ کے یہاں نماز اور نوافل اس لیے نہیں پڑھے جاتے کہ اللہ پاک کی خوشنودی حاصل [illegible] صرف میچز کا مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے بطور ر[illegible] نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ لوگوں کو لائسنس حاصل [illegible] سوشل میڈیا کی عوامی زندگی میں کبھی بھی کہیں بھی اپنے [illegible] کو سنے دیتے رہو۔ آپ کو علم ہے کہ یہاں رہنے [illegible] کروڑوں مسلمان کبھی اس بات پر بہت خوشی محسوس کر[illegible] کہ ان کے ہمسایہ میں ایک دیش ایسا بھی ہے جو [illegible] قربانیوں سے بنا ہے اور جہاں اسلامی شعائر اپنی اصل حا[illegible] میں برقرار ہیں لیکن آپ کی نئی نسل نے انہیں صدمہ، مایوسی [illegible] ہندو برادری کو بے پناہ خوشیاں عطا کردی ہیں...... اور [illegible] سب کے ذمہ دار آپ ہیں۔''

''میں...... مم...... میں کیسے؟'' مجھے اس بالشت [illegible] لڑکی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

''جی ہاں! آپ...... اور آپ جیسے وہ ان گنت افرا[illegible] کبھی معاشی چکی میں پس کر اپنے فرائض بھول بیٹھے اور [illegible] آپ کی طرح ایک باعزت شناخت' وقار اور تحفہ خداوندی [illegible] حقوق کبھی ادا ہی نہ کرسکے۔ وہ اپنی نئی نسل کو ان قربانیوں [illegible] پاکستان کی اہمیت و عزت کرنا سکھا ہی نہ سکے۔ اب آ[illegible] چاہتے ہیں کہ میں عدنان صاحب سے شادی کرلوں جن [illegible] ترجیحات میں دہلی کی جامع مسجد کی بجائے یہاں [illegible] اداکارائیں پہلے آتی ہیں۔ میں ایک ایسی جگہ شادی کر کے [illegible] جاؤں جہاں میری نئی نسل دہری سوچ اور شخصیت کی حامل [illegible] اور دیش ان کے لیے سب سے آخری چوائس ہوا کرے۔ نہیں! میں یہ نہیں کہہ رہی کہ ہم لوگ یہاں کامل سوچ و فطر[illegible] کے مالک ہیں لیکن ہم کم از کم اپنے ملک کے لیے مخلص ض[illegible] ہیں۔ اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا پاتے تو نقصان پہنچا[illegible] کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

''تم کیا چاہتی ہو اب؟'' میں نے بدقت تمام کہا۔

''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ اپنے اس اجن[illegible] سوچ و نظریات سے عاری پوتے کو لیے واپس اپنی دنیا [illegible] لوٹ جائیں۔ اس مظلوم دیش میں جسے آپ جیسے جانے [illegible] لوگوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر ایک گہرے روگ میں [illegible] دیا ہے۔ میں اپنے ایک کولیگ عامر شاہ سے شادی کر[illegible] فیصلہ کرچکی ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو پرسوں ہونے والی رسم نکاح کی تقریب میں اپنی دعاؤں کے سائے تلے رخ[illegible] کرسکتے ہیں۔'' زہرا کی ہر ایک بات مجھے کسی کوڑے کی [illegible] لگ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے میری بچی! میں تمہارے اس فیصلے کو تسلیم کرلیتا ہوں۔'' مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے وسیم کو تیسری بار بھی کھودیا ہے۔

☆☆☆

لاہور ائیرپورٹ پر اترتے ہوئے میری طبیعت بے حد نڈھال ہوچکی تھی۔

ہندوستان کی اس سرزمین سے اس دفعہ بھی میں ایک کسک لیے لوٹا تھا۔ عدنان میری اس خاموشی اور اداسی کو اپنے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔

''کم آن گرینڈ پا! اتنے ٹینس کیوں ہو رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو وہ لڑکا عامر بالکل پسند نہیں آیا۔ اس کے پاس شکل تھی نہ ہی دولت۔ جانے کس ایٹی ٹیوڈ میں زہرا نے مجھے ریجیکٹ کر کے اسے اپنالیا۔ تھرڈ کلاس قسم کی فیملی تھی اس کی۔'' نفرت اور حقارت سے یہ الفاظ ادا کرتا عدنان مجھے مزید الجھی کر گیا۔

''میں اس کے انتخاب پر بہت خوش ہوں۔ کسی کے خاندان اور شخصیت کو یوں ڈی گریڈ کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔'' میں نے پہلی بار اسے ٹوکا۔ میرے انداز اور رویے پر وہ حیرت سے مجھے دیکھتا کندھے اچکا کر رہ گیا۔

اس روز کے بعد میری زندگی ایک نئی سزا کی زد میں آگئی۔ زہرا کی باتیں اور حقائق سے آگاہی نے مجھے آگہی کے عذاب میں مبتلا کردیا۔ میرے منع کرنے کے باوجود عدنان نے وسیم کی زندگی کے تمام گوشے گھر میں سب کے گوش گزار دیئے۔ وہ ہر روز زہرا اور وسیم کی بابت 'گوسپ' کرتے۔ عدنان کی انا کے لیے زہرا کا انکار ایک تازیانہ ثابت ہوا تھا جس کی خلش دور کرنے کے لیے وہ اس کے کردار کے بارے میں الٹے سیدھے واقعات منسوب کرنے لگا۔ میری تردید اور ممانعت کو ہمیشہ نظرانداز کردیا جاتا۔ ان سب کے لیے مہر نجیب علی اب ایک سنکی بوڑھا بن چکا تھا جو ان کی ذاتی زندگی میں دخل درمعقولات کرنے لگا تھا۔ اپنی نئی نسل کے رنگ ڈھنگ ایک غیر جانبدار نظر سے دیکھنے شروع کیے تو مجھے اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا احساس ڈسنے لگا۔ ان کے لیے ہماری یہ بھارت یاترا سوشل میڈیا پر بھارتیوں کو ان کا اصل چہرہ دکھانے کا ذریعہ بن کے رہ گئی۔ عدنان سمیت سب لڑکوں کی ہرزہ سرائی فرینڈز لسٹ میں ہونے کے سبب زہرا تک بھی جا پہنچی۔ اس نے مجھے صفائی کا کوئی بھی موقع دیئے بغیر تمام روابط مکمل طور پر ختم کردیئے۔

مہر نجیب علی کی غلطیوں نے وسیم کی آخری نشانی بھی بطور تاوان ہمیشہ کے لیے چھین لی۔

☆☆☆

آج اس واقعہ کو چھ سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔

تناور درخت کی حیثیت اختیار کر چکی ذہنی بے راہ روی اپنی نسل نو کی اصلاح کی کوششوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ میں قید تنہائی کا شکار بنادیا گیا ہوں۔ بستر مرگ پر لیٹے مجھے اپنے ابا جان سے وہ آخری ملاقات یاد آتی ہے جب انہوں نے ہمیں زادِ راہ تھماتے ہوئے کہا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک سپاہی ہے۔ دادا جی کا آخری لمحات میں کیا گیا اعتراف شکست یاد آتا ہے تو اپنے بال نوچنے لگتا ہوں کہ میں نے کس بھرم میں یہ زندگی گزار دی۔ میرے اہل خانہ آج بھی بھارت کے لیے نفرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن دوسری جانب ان کی ثقافت کو اپنانے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ ان کی سوچ ہر گزرتے دن کے ساتھ 'لبرل' ہونے لگی ہے اور میں عالم بے بسی میں اپنا وجود نوچ کر رہ جاتا ہوں۔

میں انہیں آج تک نہیں سمجھا پایا کہ پاکستان مہر جہان داد کے اس حوصلے کی نشانی ہے جو انہوں نے اپنے خاندان کو نظرانداز کر کے ہمیں دی۔

پاکستان ایک شجر ہے جس نے ہر بیرونی موسم کی گرمی اور سختی اپنے وجود پر جھیل کر ہمیں سایہ اور سکون مہیا کر رکھا ہے۔

میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ پاکستان ایک پناہ گاہ ہے جس کے باہر خونخوار بھیڑیئے ہمیں نوچ ڈالنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔

وہ کیسے جانیں گے کہ یہ ملک اگر ان کی کج رویوں کے باعث کوئی تاوان وصول کرنے کے درپے ہوا تو ان کی سہل پسندی تقدیر کے ظالم وار کا ایک جھٹکا بھی سہہ نہ پائے گی۔

وہ کیونکر سمجھ پائیں گے کہ ہزاروں برس پہلے ایک قوم کے لیے 'من و سلویٰ' کی ناقدری نے انہیں کس قدر عذاب میں مبتلا کیا تھا اور ان کی یہ پناہ گاہ کسی بھی من و سلویٰ سے بھی بیش قیمت ہے۔

میں نے ایک عمر گزار کر پاکستان کا اصل تعارف پہچانا ہے اور اب ڈرتا ہوں کہ میرے اہل خانہ اور ہم وطن اس آگاہی کے حصول میں کسی تاوان کے عمل سے نہ گزریں...... قسمت جب تاوان لینے پر آمادہ ہوتی ہے تو خدا کی قسم! کہیں جائے امان نہیں ملتی۔



قاتل ڈور

محترم و مکرم معراج رسول
السلام علیکم
یہ واقعہ بہت پرانا نہیں لیکن سبق آموز بھی ہے۔ پتنگ بازی سے شروع ہو کر موت پر ختم ہوئی ہے۔ ایسی موت لاہور کے مقدر میں گویا لکھ دی گئی ہے۔ شاید آپ بھی میرے اس خیال سے متفق ہوں گے اگر یہ تحریر پسند آجائے تو کسی نزدیکی شمارے میں لگا دیں۔

رائحہ مریم
(سیالکوٹ)

"چاند، تو جانتا ہے کہ پورے شہر میں تجھ سے بہتر پتنگ کسی کی نہیں اڑی۔"
"جانتا ہوں۔"
"پھر مان کیوں نہیں جاتا؟" مخاطب نے سگریٹ کا کش لیا اور اسی ہاتھ سے چاند کے شکن آلود شانے سے نادیدہ گرد کو جھاڑا۔
"کیونکہ تو بھول رہا ہے کہ یہ آج سے سات سال پرانی بات ہے۔" چاند کا لہجہ اور چہرہ سپاٹ تھا۔
"بات چاہے کتنی بھی پرانی ہو چاند، حقیقت یہ ہے کہ تو آج بھی پتنگ اڑانے میں ماہر ہے۔" مخاطب پر جیسے اس کی سرد مہری کا کوئی اثر نہ ہوا۔
"تو نے یہ بتانے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے۔" چاند نے اپنے شانے پر سے مقابل کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا، جیسے وہ وہاں سے جانے کے لیے پر تول رہا ہو۔
"نہیں بلکہ میں نے تو تجھے یہاں اس لیے بلایا ہے کہ تو میری بات مان جا۔ اس میں تیرا ہی فائدہ ہے چاند۔" آخری جملہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔ یوں مسکرانے پر اس کے اگلے دانت نمایاں ہوئے جو کہ چھالیا کھانے کی وجہ سے اپنی ابتر حالت کی نمائش کر رہے تھے۔
"جیدے! میرے فائدے اور نقصان کے متعلق تو نہ سوچ کیونکہ رشتے کے اعتبار سے تو میری ماں نہیں ہے۔ میرا جواب آج بھی وہی ہے جو اس دن تیرے سنگل پسلی پہلوان کے ہاتھوں کہلوایا تھا، وہ ہے نہیں اس لیے تیرے لیے پتنگ نہیں اڑاؤں گا، اب میں جاؤں؟" چاند نے جیدے کی آنکھوں میں آنکھیں گڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہاہا ہے...... تو بڑی مست چیز ہے چاند...... باتیں بڑی اچھی کر لیتا۔" جیدے نے لفظ "بڑی" کے "ڑ" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی ابھی تو آئے ہو...... کوئی چائے پانی"
"چائے میں اپنی جیب سے پیتا ہوں اور پانی رب سوہنے کی دین ہے، وہ بھی جیب سے نہیں پیا لیکن اس وقت دونوں کی طلب نہیں ہے۔" چاند نے جیدے کی بات کاٹتے ہوئے کہا جس کے جواب میں جیدے نے اپنی ٹھوڑی پر موجود گنے چنے بال جن کو وہ داڑھی کہتا تھا اسے چار انگلیوں سے [illegible] اور پھر بولا تو لہجہ سرد تھا۔
"وجہ...... کیوں نہیں اڑانی پتنگ؟"
چاند نے آنکھوں میں چیلنج لیے تمسخرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں، میں تیری ماں تو ہوں نہیں جو سوال پوچھا (چاند نے بھی ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔) تیرا ماں بھی نہیں جس سے تو ہر بات کر لیتا تھا۔" اس سے پہلے جیدے کی زبان سے ایسے الفاظ ادا ہوتے جو معاملے کو [illegible] کر دیتے چاند نے داہنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور بات کاٹتے ہوئے بولا۔
"میں نے آج تک صرف مانجے والی ڈور اڑائی جیدے، اور تو اچھی طرح جانتا کہ آج کے مانجے اور آج سے سات سال پہلے کے مانجے میں کتنا فرق ہے...... اور مانجا اب تو میرے سامنے دھاتی ڈور کی بات کرتا ہے کہ تیرے [illegible] دھاتی ڈور سے بازی لڑوں کیونکہ تیرے فارغ دماغ نے شراب کے زیر اثر رانا سکندر جیسے استاد کو پتنگ بازی کے اکسایا تھا ...... اور جب اس نے مقابلے کے لیے ہامی بھر لی تو تیری [illegible] میں دھاکے ہو رہے ہیں۔ وجہ بھی میں جانتا

تجھے پتنگ کی ڈور تک پکڑنی نہیں آتی لیکن جیدے ایک بات میری بھی سن لے، دھاتی ڈور پر میرا ہاتھ نہیں بیٹھتا۔"
جیدا جو کہ پلکیں جھپکائے بغیر چاند کو سن رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مقابلے سے بے خبر ہے اس کی آگاہی کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ آخری جملے پر اس کے چہرے کے تنے ہوئے تاثرات قدرے ڈھیلے ہوئے اور پھر وہ مسکرانے لگا۔
"ہاتھ نہیں بیٹھتا یا پولیس سے ڈرتا ہے۔" یہ ایسا پتا تھا جس کے پھینکنے کے بعد چاند کے تن بدن میں آگ کی چنگاری اٹھی۔
"اوئے...... چپ اوئے!" چاند دہاڑا اور ایک ہی جست میں جیدے کے کالر کو اپنے آہنی ہاتھوں کے شکنجے میں لے لیا۔ وہ اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے لڑکھڑایا لیکن چاند نے اسے گرنے بھی نہیں دیا۔ ایک دو جھٹکوں کے بعد چاند نے کالر چھوڑا تو کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔ جیدے کا ایک جانشیں اس عمل کا جواب دینے کو آگے بڑھا تو جیدے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ خود وہ لمبے لمبے سانس لے کر اپنی تتر بتر حالت کو سدھار رہا تھا۔
"جب میں نے کہہ دیا کہ دھاتی ڈور کے دھندے میں نہیں پڑنا تو مطلب...... کہہ دیا۔ اور جیدے! پولیس سے تو میرا ماں جایا تک نہیں ڈرا۔ اس نے تو سینہ تان کر میرے سامنے اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنی تھی اور خود چل کر پھانسی کے تختے پر چڑھا تھا۔ سنا تم نے سینہ تان کر...... کیونکہ اس نے جو کیا اس کا پچھتاوا رب سوہنے نے اس کے دل میں ڈالا تھا...... میں ایسا کوئی پچھتاوا نہیں پالتا اس لیے پتنگ اڑانا چھوڑ دیا...... آج بھی میرے بھائی کے نام کا اتنا ڈنکا ہے اتنی دہشت ہے کہ پولیس تھانے کے ویری کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ ہی نہیں سکتی ...... جیدے آج تو تو نے یہ بات کہہ دی۔ میں نے سن بھی لی۔ آئندہ کہی تو قسم ہے اپنے ماں جائے کے سر کی اس امر کو میں اپنے ہاتھوں سے یقینی بناؤں گا کہ تو جنت میں میرے ویرے سے ملے اور اسے بولے کہ تیرے ماں جائے نے میرے ہاتھوں سلام بھیجا ...... رب راکھا۔" اتنا کہہ کر چاند نے اپنی قمیص جھاڑی اور چل دیا۔
اس کے نکلنے کے بعد جیدے نے پہلے اس کرسی کو ٹھوکر ماری جس پر چاند بیٹھا تھا۔ وہ کرسی دور جا گری اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ جب اتنے سے بھی غصہ کم نہ ہوا تو اس نے میز پر رکھی چیزوں کو ہاتھ مار کر گرا دیا۔ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ اس نے شراب کے نشے میں آکر رانا سکندر جیسے پتنگ باز کو مقابلے کی پیشکش کر دی تھی جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا تھا۔
جیدا جہاں یہ جانتا تھا کہ اسے پتنگ بازی کا "پ" بھی نہیں آتا وہیں اسے علم تھا کہ پورے لاہور میں چاند سے بہتر کوئی پتنگ نہیں اڑا سکتا۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں بھی پتنگ اڑاتا تو پورا شہر حسرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ وہ اپنی ڈور خود بناتا تھا جس میں شیشہ برائے نام ہوتا۔ وہ ہاتھوں کی مہارت تھی جو اسے مقابلے میں کامیاب کرتی تھی۔ اس کی عقابی نظریں

مخالف کی ڈور کے کمزور حصے کو نہایت باریک بینی سے جانچ لیتیں اور پھر اس کا داؤ چلتا تو مخالف کو چاروں شانے چت کر کے ہی دم لیتا۔ اس کے بھائی شان نے بھی اس کی مدد سے کئی مقابلے جیتے تھے، لیکن جب 2007ء میں پتنگ بازی کی وجہ سے بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہوا تو ہر طرف پابندی عاید ہوگئی۔ جن دنوں پولیس سرگرم عمل تھی انہی دنوں پتنگ اڑاتے ہوئے شان کی ڈور سے ایک آدمی مرا اور شان کو جیل اور پھر پھانسی ہوئی تو چاند نے یہ کام چھوڑ دیا۔

اس لیے نہیں کہ وہ ڈر گیا تھا بلکہ اس لیے کہ شان نے پھانسی چڑھنے سے پہلے ہونے والی ملاقات میں اپنے بھائی سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اب ایسا کوئی کام نہیں کرے گا جس کا انجام کسی کی موت ہو۔

اس نے کہا تھا۔ ”میرے بھائی میں نے اس مرنے والی کی عورت کی آہیں سنی ہیں۔ اس کے بچے کو ”بابا، بابا“ چلاتے سنا ہے۔ یہ آوازیں مجھے سونے نہیں دیتیں۔ میں نے اس کی ماں کی آنکھوں میں جب سے آنسو دیکھے ہیں مجھے سکون نہیں ملتا۔ اس کی...... اس کی چار سال کی بیٹی دیکھی ہے جو اس کے بے جان ہاتھ کو ٹٹول رہی تھی کہ شاید اس میں جان باقی ہو، پر وہ ہاتھ نہیں ہلے چاند...... وہ میری وجہ سے جامد ہوگئے۔ میں اتنا بڑا بوجھ لے کر کیسے جیوں گا۔ میرا مر جانا ہی میرے حق میں اچھا ہے کہ شاید مجھے سکون مل جائے۔“

دوسری جانب جیدے کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر چاند نے پتنگ اڑائی تو پولیس بھی اس معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائے گی لیکن وہ مان نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک جانشین منگو کے ہاتھوں پیغام بھجوایا تھا۔ یہ منگو پہلوان ہی تھا جسے چاند نے اس کی جسامت کے لحاظ سے سنگل پسلی کہا تھا۔ جب اس کے کہنے پر وہ نہیں مانا تو جیدے نے بذاتِ خود اسے اپنے اڈے پر بلایا تھا۔

”آپ فکر نہیں کرو سرکار۔ میں خود پتنگ اڑاؤں گا۔ رانا استاد کو چھٹی کا دودھ نہ یاد دلا دیا تو......“ جیدا منگو کی بات کاٹ کر بولا۔

”پتنگ تو چاند ہی اڑائے گا۔ میں نے شرافت سے بات کر کے دیکھ لی، اب دوسرا راستہ اپنانا ہوگا۔ اس کی کوئی کمزوری ڈھونڈ کر بتاؤ مجھے۔“ جیدا یہ کہتا باہر چلا گیا۔ جبکہ اس کے پیچھے منگو خباثت سے مسکرایا۔

”کمزوری تو ہے جناب کی...... اور بڑی نازک سی ہے...... ہاہاہا، اب دیکھنا چاند کا یہ سنگل پسلی کیا کرتا ہے۔“

☆☆☆

اڈے سے واپس آتے ہوئے اس کے ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ چلنے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے جیدے کے دانت کیوں نہیں توڑے جب وہ سب بکواس کر رہا تھا...... پر کیا وہ واقعی پولیس سے ڈر گیا ہے...... نہیں نہیں!!! وہ نہ کبھی پولیس سے ڈرا ہے نہ ہی کبھی ڈرے گا۔ انکار کرنے کی واحد وجہ شان سے کیا گیا وعدہ ہے۔

یہ سوچ کر اس کی سوچ ایک ٹھکانے کو لگی اور وہ اپنا موڈ صحیح کرنے کے لیے ریاض پان والے کے پاس آگیا۔ ریاض کی دکان ایک کمرے پر مشتمل تھی، جس میں ضرورت کا سامان مل جاتا تھا۔ ریاض پانچ فٹ تین انچ کا درمیانے قد کا آدمی تھا۔ اس کی شادی کو بیس سال گزر چکے تھے لیکن ابھی تک اس کے ہاں قلقاریاں مار کر رونے والے ننھے مہمان کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ پہلے وہ سعودیہ میں کسی فیکٹری میں مزدور تھا پھر وہاں سے دل اچاٹ ہوا تو مستقل پاکستان آگیا۔ لاہور پرانے محلے میں اس نے اپنے ہی گھر کے کمرے کو بطور دکان استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ اس کا ہنر تھا یا پھر مہارت یادداشت کہ اسے یاد بھی رہتا تھا کہ فلاں کونے میں فلاں برانڈ کا سگریٹ ہے اور فلاں کونے میں گٹکا۔

”ایک تمباکو والا پان بناؤ۔“ ریاض نے پہلے غصے سے لال پیلے ہوتے چاند کو دیکھا پھر آگے کو جھک کر گلی کی نکڑ کو۔

”سونف والا بنا دوں چاند؟“ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”تجھ سے مشورہ نہیں مانگا۔ جو کہا ہے وہ کر۔“

”دراصل چاند ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی صاحبہ یہاں سے گزری ہے یہاں سے۔“ ریاض کے یوں کہنے پر چاند نے اسے گھورا تو وہ ہڑبڑا گیا۔

”تجھے کیسے پتا؟“ چاند نے آگے بڑھ کر اس کا کالر پکڑ لیا۔

”قسم لے لو استاد میں نے جان بوجھ کر نہیں دیکھا، وہ پروین باجی کے ساتھ ہنستے ہوئے جا رہی تھیں تو نظر اٹھ گئی۔ ابھی ابھی اپنی گلی کی طرف گئی ہیں دونوں۔“ ریاض نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا جس پر چاند کے کھنچے ہوئے تاثرات ڈھیلے پڑے۔

”رہن دے پان۔ پھر کبھی۔“ یہ کہہ کر چاند آگے بڑھ گیا۔

تھوڑا ہی دور چلنے سے اسے صاحبہ نظر آ گئی۔ بلکہ صاحبہ کے روپ میں اپنی زندگی نظر آ گئی۔ وہ ایک ہاتھ میں اپنا لال

جیسا پراندہ گھماتے ہوئے پروین کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ چاند نے اسے دیکھا تو ہمیشہ کی طرح دیکھتا ہی رہ گیا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ قد اور کمر تک آتے کالے سیاہ بال جن کو پراندے میں باندھ کر چلتی تو وہ دیکھنے والوں کو بل کھاتی ناگن جیسے لگتے۔ تیکھے نقوش بھوری آنکھیں جو کبھی بھی سرمے سے خالی نہیں ہوئیں اور اس کی آنکھوں میں سرمہ جچتا بھی بہت تھا۔ اٹھی ہوئی ناک اور گلابی ہونٹوں کے دائیں جانب ایک چھوٹا سا تل جو صرف غور کرنے پر ہی دیکھا جا سکتا تھا، دودھیا رنگت اور خوبصورتی سے تراشے ہوئے ہاتھ۔

وہ جو رنگ بھی پہنتی اس پر کھل اٹھتا...... یوں صاحبہ حسن کی کوئی دیوی معلوم ہوتی۔ اسی دیوی پر چاند نے اپنا دل ہارا تھا۔ آٹھ سال پہلے وہ لوگ پنجاب کے دیہی علاقوں سے ہجرت کر کے اس محلے میں آئے تھے۔ صاحبہ کے ابا حاجی ارسل جدہ کی کسی کمپنی کے ملازم تھے۔ اس کی اماں ثریا بی بی نے فارغ وقت گزارنے کے لیے محلے والوں کے کپڑے سینا شروع کر دیے ان کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ پروین بڑی اور صاحبہ چھوٹی تھی۔

پروین بھی صاحبہ ہی کی طرح خوش شکل تھی...... لیکن وہ بڑی سنجیدہ اور متین تھی۔ اس کی سنجیدگی شان کو بھا گئی۔ سفینہ اسے شان کے لیے مانگنے گئیں تو وہاں صاحبہ کو پہلی نظر دیکھتے ہی چاند نے فیصلہ کر لیا کہ اماں کی دوسری بہو بھی اسی گھر سے آئے گی۔ ان دونوں کی باقاعدہ منگنی یا نکاح کی رسم تو نہیں ہوئی تھی لیکن سارے محلے کے لیے صاحبہ، صاحبہ بھابی بن گئی۔

چاند اس کی خوبصورتی کے سحر سے نکلا تو درمیان کا فاصلہ کم کیا اور جا کر صاحبہ کا ہوا میں ہچکولے کھاتا پراندہ پکڑ لیا۔ صاحبہ رک گئی، مڑی نہیں۔ جانتی تھی کہ اس محلے میں پیچھے سے پراندہ پکڑنے کی جرأت ایک ہی مرد کر سکتا ہے۔ اسی طرح کھڑے کھڑے بولی۔ ”پروین باجی تو کار (گھر) جا، میں ہونے آندی آں۔“ پروین اپنی چھوٹی بہن کو تاسف سے دیکھتی وہاں سے چلی گئی۔

”کہاں سے آ رہی ہے؟“ چاند نے محبت سے چور لہجے میں پوچھا۔

”تینوں کیوں دساں؟“ صاحبہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے سامنے گہرے نیلے رنگ کی کھدر کی شلوار قمیص پہنے کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ مخصوص انداز سے سر کی پشت کو سہلا رہا تھا۔ بلاشبہ وہ مکمل مردانہ وجاہت کا حامل تھا۔ ایک پل کو صاحبہ کا دل کیا کہ سر کی پشت سے اس کا ہاتھ ہٹا کر خود اس کے بال سہلائے لیکن پھر ہنستے ہوئے اپنی سوچ کی نفی کرنی پڑی اور مسکرا دی۔ اس کو مسکراتا دیکھ کر چاند نے اس کا پراندہ ذرا آگے کو کھینچا تو وہ چاند کی طرف جھکی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ چاند سے ٹکراتی اس نے پراندہ چھوڑ دیا، وہ لڑکھڑائی لیکن سنبھل گئی۔ چہرے پر ناراضگی نے جگہ لے لی۔ چاند نے اس کے روٹھے مکھڑے کو دیکھا تو دل ہی دل میں محظوظ ہوا۔

”میں نے پوچھا کہاں سے آ رہی ہے؟“ اب کی بار چاند نے تھوڑا جھک کر کہا۔

”خالہ زہرا کے کار سے۔“ اس نے رخ پھیر لیا۔

”وہاں کیا کام تھا؟“

”بھائی کا سوٹ سل گیا سی، وہ دے کے آنا سی۔“

”مجھے کہتی......“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”کس خوشی نال؟...... اور تینوں کیوں کیندی۔“ آنکھوں میں چیلنج لے کر پوچھا۔

”خود دے آتا یا تجھے ساتھ لے جاتا۔“ چاند نے مسکرا کر کہا۔ ”اب اپنی منگ کے لیے اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔“

”ہاں...... ہاں پتا اے مینوں...... بس یہ ہی کر سکدا۔“ تڑخ کر جواب دیا۔

چاند نے کئی لمحے اسے دیکھا پھر بولا۔ ”ناراضگی چل رہی ہے؟“

صاحبہ نے کسی بھی شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں چلدی پئی اے ناراضگی۔“

”کس گل دی ہے؟“

”مجھے چوڑیاں چاہئیں۔“ منہ پھیر کر فرمایش کی۔

”بس اتی سی گل سی...... رنگ بتا دے مل جائیں گی۔ ابھی گھر جا۔“

”چاند۔“ اس نے تھوڑا رک کر تھوک نگلا اور بولی۔

”مینوں سونے دی چوڑیاں چاہئیں۔“ صاحبہ نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا تو چاند سوچ میں پڑ گیا۔

”چل تو نے کہا ہے تو شادی پہ دے دوں گا، تیری منہ دکھائی دا تحفہ۔“ اس نے دماغ میں کچھ حساب کر کے شوخ لہجے میں کہا۔

”منہ تو نے ویکھ لیا دا میرا...... مینوں عید تے ہی چاہیے۔“ صاحبہ نے ابھی بھی سر نہیں اٹھایا۔ نظریں جھکا کر فرمایش کرتی وہ سیدھی چاند کے دل میں اتر رہی تھی۔

”سمجھیا کر صاحبہ...... ابھی نہیں دلا سکتا۔“ چاند اسے سمجھانے کے لیے الفاظ کا چناؤ کر رہا تھا جب وہ دوبارہ بولی۔

’’تو ہمیشہ یوں ہی کہتا اے، کبھی کچھ مانگا تجھ سے...... کبھی نہیں مانگا۔ اج بڑا دل کر کے کج مانگا تے تو یوں کہہ رہیا۔ جا ٹھیک ہے مینوں نہیں چاہیئے کچھ بھی۔‘‘ وہ اس وقت گلہ کرتی اتنی اپنی لگی کہ چاند نے ایک روایتی عاشق ہونے کا پکا پکا ثبوت دے دیا۔ وہ یوں کہ اس نے اپنے محبوب کے لگائے زخموں پر پردہ ڈال دیا۔ اس کو اتنا بھی نہیں کہہ سکا کہ وہ آج تک اس کی ہر خواہش نامحسوس طریقے سے اس کے بنا کہے ہی پوری کرتا آیا ہے اور ان التفات کے بدلے میں اسے پیار کے دو بول تو کیا ہمدردی کے دو بول بھی نہیں ملے۔ پر وہ عاشق ہی کیا جو محبوب کے دیے ستم سہے اور مسکرائے نہیں۔

’’چل رو نہیں، گھر جا...... ولا دوں گا چوڑیاں۔‘‘ صرف ایک ’سوں‘ کرنے پر ہی وہ پتھر پگھل گیا۔

’’سچ؟‘‘ ساری اداکاری ہوا ہو گئی۔

’’ہاں سچ۔‘‘ اس نے چلتے ہوئے کہا تو صاحبہ بھی ساتھ چل پڑی۔

’’بھابی سمیرا جیسی۔‘‘ یہ اگلی فرمائش تھی۔

(اوہ...... تو بھابی کی چوڑیاں دیکھ کر آئی) اگلا سارا راستہ وہ اسے سمیرا کی چوڑیوں کا ڈیزائن بتاتی رہی۔

’’اس سے بھی اچھی دلا دوں گا۔ اب تو جا اندر۔‘‘ صاحبہ کا گھر آ گیا۔ وہ اسے دروازے پر چھوڑ کر جانے لگا۔

’’چائے تو پیتا جا۔‘‘ صاحبہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔

’’اگلی دفعہ آؤں گا تو ضرور پیوں گا۔‘‘ اس کے جواب سے صاحبہ مطمئن ہو گئی اور اندر کی طرف مڑنے لگی جب چاند نے بے اختیار اسے پکارا۔

’’صاحبہ!‘‘ وہ مڑی تو دیکھا کہ چاند اپنی کلائی سے تعویذ اتار رہا تھا۔

’’یہ رکھ لو اپنے پاس...... اسے اپنی کلائی میں پہن لو۔‘‘ وہ صاحبہ کی کلائی میں اپنے ہاتھوں سے وہ تعویذ پہنا رہا تھا جو اس کی اماں مزار سے لائی تھی، اس کی زندگی کی حفاظت کے لیے۔

صاحبہ نے حیرت سے اپنی کلائی کو دیکھا۔

’’مینوں کیوں دے رہا......؟ یہ تیرا ہے۔‘‘

’’تو کس کی ہے؟‘‘ صاحبہ خاموش ہو گئی۔

’’یہ تو تیری جان دی حفاظت کے لیے ہے نا۔ تو مت دے......‘‘ صاحبہ نے منع کرنا چاہا اور تعویذ کو اتارنے لگی۔

’’وہی کر رہا ہوں...... اپنی جان کی اور اپنی زندگی کی حفاظت...... جب چوڑیاں پہناؤں گا تب واپس لے لوں گا۔‘‘ چاند نے کلائی کو ہلکے سے دبایا اور واپس مڑ گیا۔

صاحبہ بھی بے پروائی سے چلتی اندر آ گئی۔ کچا صحن جس میں چاروں طرف کیاریاں بنا کر پودے اگائے ہوئے تھے۔ موتیے اور گیندے کی خوشبو سے آنگن مہک رہا تھا۔ ساتھ والوں کے گھر میں لگے بیری کے سوکھے پتے صحن میں گرے ہوئے تھے۔ صاحبہ ان پتوں کو روندتی اندر آئی جہاں پروین بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

’’بول چھڈ یا اونوں چوڑیاں دا؟‘‘

’’ہاں بول دیتا۔‘‘ صاحبہ بے پروائی سے کہتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

’’وہ من گیا؟‘‘ پروین نے بے یقینی سے پوچھا۔

’’وہ منع کر ہی نہیں سکدا۔‘‘ لہجے میں غرور اور مان دونوں تھے۔

’’صاحبہ، صاحبہ! تینوں کدوں عقل آوے گی۔‘‘ پروین خشمگیں نگاہوں سے دیکھتی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ’’فضول دیاں فرمائشاں مت کریا کر لکھ نہیں رکھیا ایناں وچ۔‘‘

’’فضول دی فرمائش کدوں سی ایے؟‘‘ صاحبہ نے اثر لیے بغیر کہا۔

’’تے فیر اے چوڑیاں...... اے کی نے......؟‘‘

’’مینوں بھابی دی چوڑیاں پسند نے...... بس...... ویسے بھی محبت (محبت) تے جنگ وچ سب جائز ہندا۔‘‘ صاحبہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ جس پر پروین نے افسوس سے اپنی بہن کو دیکھا۔

’’صاحبہ نہ ہی موت نے کدی جنگ دے میدان وچ کسی دا لحاظ کیتا...... تے نہ ہی محبت ایدی تتی نگاہ تو بچی اے...... چاند غلط کم چھڈ چکیا صاحبہ...... اے نہ ہوئے کہ تیری بے جا ضرورتاں واسطے او پھر اس دنیا وچ ٹر جائے جتھوں واپسی مشکل اے...... شان دی واپسی اوناں دی حیاتی وچ نہیں سی ہوئی۔‘‘ پروین جس نے شان کی یاد کے ساتھ بقیہ زندگی گزارنے کی ٹھان لی تھی، روتی ہوئی اندر چلی گئی۔ جبکہ صاحبہ نے بے چینی سے پہلو بدلا، پر جب نظر اپنی کانچ کی چوڑیوں پر پڑی تو ان کو نوچ کر اتار دیا۔

’’ہونہہ...... ہن تے سونے دیاں چوڑیاں ہی پاواں گی...... بس۔‘‘ ایک عزم لیے وہ بھی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

چاند اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھور رہا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ چاند کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ کالی اندھیری رات۔ ایسا لگتا تھا کہ کالے رنگ کا چمکتا تمبو سارے

محلے پر تان دیا ہو۔

اس کے ذہن میں سونے کی چوڑیاں ہی تھیں جن کو خریدنے کے لیے اسے پیسوں کی ضرورت تھی، لیکن کسی سے مانگنا گوارا نہیں تھا۔ اب جو طریقہ اس کے ذہن میں آ رہا تھا اسے وہ خود ٹھکرا چکا تھا۔ اگر اس راستے کو چنتا بھی تو ایک طرف بھائی سے کیا گیا وعدہ تھا اور دوسری طرف محبوب کی محبت سے کی گئی فرمائش۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کرے تو کرے کیا؟

پھر ایک گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا۔ دماغ کی بجائے دل کی سنی۔ دماغ کو دل کے ہاتھوں مات ہو گئی......

جیدا استاد کو میسج کیا کہ وہ اس کا کام کرنے کو تیار ہے لیکن اپنی منہ مانگی رقم پر اور اس کا جواب موصول ہونے سے پہلے ہی موبائل تکیے کے نیچے رکھ کر آسمان کو گھورنے لگا۔ اب کی بار اس کی نظر میں اضطراب نہیں تھا بلکہ ایک ٹھہراؤ تھا۔ جوابی میسج کی ٹون ابھری لیکن اس نے دیکھنے کا تکلف نہیں کیا۔ وہ جیدے کا جواب جانتا تھا۔ پھر کب اس پر نیند کی دیوی مہربان ہوئی اسے نہیں پتا چلا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ اٹھا، خوشبو والے صابن سے اچھی طرح نہانے کے بعد اس نے سفید کاٹن کی مایا لگی شلوار قمیص پہنی اور پاؤں میں اپنی پسندیدہ پشاوری چپل پہن کر باہر آ گیا۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارنے لگا، کنگھی موڑ کر اپنی مونچھوں پر پھیری اور ان کی نوک کو سیٹ کیا۔

’’لگتا ہے آج خیر نہیں ہے۔‘‘ سفینہ نے پیچھے سے آتے ہوئے اس کی چوڑی پشت پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور ناشتا لے کر چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ چاند مسکراتا ہوا ان کے قریب جھکا۔ سر پر پیار لیا۔ مکھن لگی روٹی کا ایک لقمہ توڑا اور منہ میں رکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ سفینہ اماں پیچھے سے ارے ارے کہتی رہیں لیکن اس نے نہیں سنی اور مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔ باہر آ کر چہرے پر سجائی مسکراہٹ بھک سے اڑ گئی، اور چہرے پر سنجیدگی کے سائے منڈلانے لگے۔

کیا میں نے ٹھیک کیا ہے؟

کیا بھائی سے کیا گیا وعدہ توڑ کر میں غلط کر رہا ہوں؟

کیا وہ روزِ محشر اپنے اس بھائی کو معاف کر دیں گے جو ایک وعدے کا پاس نہ رکھ پایا؟

سوچ سوچ کر اس کا ذہن مفلوج ہوتا جا رہا تھا پھر جب ذہن کوئی خاطر خواہ دلیل دے کر قائل نہ کر پایا تو چاند نے دل

ڈاکٹر سید عبداللہ کے والد حکیم سید نور احمد شاہ موضع منگلور، تحصیل مانسہرہ، ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ وہ عالم اور طبیب تھے۔ سید عبداللہ کی پیدائش اسی گاؤں میں 5 اپریل 1906ء کو ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ قرآن مجید کے ساتھ اردو کی درسی کتابیں، حساب، خوش خطی، ابتدائی فارسی اور خطوط نویسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر مقامی اسکول میں داخلہ لے کر پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ مڈل کا امتحان مانسہرہ کے ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل اسکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول ایبٹ آباد میں داخلہ لے لیا۔ نویں جماعت پاس کرنے کے بعد دسویں جماعت میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اسلامیہ ہائی اسکول نمبر 2 (بھاٹی دروازہ) میں داخلہ لے لیا۔ ایک سال اس اسکول میں پڑھتے رہے۔ جب داخلہ بھیجنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ ان کی عمر پندرہ سال سے دو تین ماہ کم ہے، اس امتحان کے لیے نام نہ جا سکا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید عبداللہ کے لکھنے کی ابتداء 1922ء کے قریب ہوئی۔ تحریک خلافت میں تھوڑی مدت کے لیے اسیر ہو گئے۔ رہائی کے بعد اپنے گاؤں ’’منگلور‘‘ میں دو تین ماہ قیام کیا۔ سہ روزہ اخبار ’’جاٹ‘‘ نکالا جس میں وہ ’’زبیر کہستانی‘‘ کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ اس میں زمیندار، مدینہ اور نجات کی خبریں نقل کرتے اور ایک مضمون خود لکھتے۔ اس کو گاؤں کی مسجد میں رکھا جاتا۔ خواندہ لوگ فرصت کے وقت میں اسے پڑھ لیتے۔ گاہے گاہے اس کو خود بھی پڑھ کر سناتے۔ اخباری مضمون نگاری کا آغاز 1927ء میں ہوا۔ زمیندار میں ’’داستان گو‘‘ اور دوسرے قلمی ناموں سے لکھتے رہے۔ ’’انقلاب‘‘ میں بھی کئی مضامین لکھے۔ ’’صحیفہ زندگی‘‘ کے نام سے روزنامچہ لکھنا شروع کیا جس کے کچھ اجزاء بعد میں اختر شیرانی کے رسالے ’’خیالستان‘‘ اور چراغ حسن حسرت کے رسالہ ’’شیرازہ‘‘ میں چھپے۔

اقتباس: سید عبداللہ۔ از۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین

کی آواز کو آزاد کر دیا۔

''وہ محبت ہے تمہاری..... محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے...... بس یہ پہلی اور آخری بار ہے۔ اس کے بعد میں یہ کام کبھی نہیں کروں گا۔ کسی کو علم بھی نہیں ہوگا کہ میں نے یہ کیا بھی ہے۔''

انہی سوچوں میں گھرا وہ اپنی کریانے کی دکان پر آ گیا۔ شٹر اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے مٹی جھاڑی، چند ٹین کے ڈبے اٹھا کر دروازے کے قریب رکھے اور اپنے کاؤنٹر پر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے ان چیزوں کی فہرست پر غور کیا جو ختم ہو چکی تھیں۔ اس نے ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلی کی، اتنے میں ایک بچہ ہاتھوں میں سکے لیے داخل ہوا۔ اس بچے کے پیچھے ایک عبایہ پہنے عورت بھی تھی۔ ان دونوں سے فارغ ہوا تو محلے کے کچھ آدمی آ گئے۔ اس کی دکان محلے کی وہ واحد دکان تھی جہاں سے معیاری اشیاء ملتی تھیں۔ اسی وجہ سے اس کی دکان پر اچھا خاصا رش لگا رہتا تھا۔ وہ رش میں اپنی فکروں سے آزاد ہو گیا۔

شام میں اس نے جلد ہی دکان بند کر دی۔ اس کے بعد گھر آنے کی بجائے قبرستان کی طرف جاتے راستے پر مڑ گیا۔ شان کی قبر پر گلاب کی پتیوں کی تہ لگائی۔ وہاں کھڑے ہو کر کافی دیر تک دعا اور فاتحہ میں مصروف رہا۔ جب دل کو تھوڑا سکون ملا تو جیدے استاد کے پاس اس کے اڈے پر چلا گیا۔ اپنی مطلوبہ رقم کی بات کی۔ جیدے نے کچھ پیش و پس کے بعد اسے مان لیا۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ چاند بغیر کسی دباؤ کے مان گیا ہے اور عین ممکن تھا......

کہ دباؤ کے زیر اثر وہ کارگر ثابت بھی نہ ہوتا۔

وقت اپنی رفتار سے زندگی کے سمندر میں جگہ بناتا بہتا گیا۔ ایک ہفتے بعد کی بات ہے۔ چاند بھورے رنگ کی شکن آلود شلوار قمیص میں جیدے کے کسی دوست کے گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو ہوا سے بچانے کے لیے پونی میں مقید کر رکھا تھا۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی رقم تھی تو آنکھوں میں عزائم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

اس گنجان آباد علاقے میں گھروں کی چھتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ کچھ چھتوں پر چادریں ڈال کر مرچیں سکھائی جا رہی تھیں تو کچھ پر کپڑے ہوا کے دوش پر جھولتے نظر آ رہے تھے۔ صرف ایک دو چھتوں پر کچھ بچے دکھائی دیے جو کہ معمول کے خلاف تھا۔ عورتوں کو شاید ان کے مردوں نے پتنگ بازی کے مقابلے کی خبر کے بعد چھتوں پر آنے سے باز رکھا ہوا تھا۔ اس کے ہمراہ جیدا خود بھی موجود تھا۔ جیدے کے چار ساتھی بھی وہیں کونڈے میں بھنگ کوٹ رہے تھے۔ چاند ان میں سے صرف منگو سے واقف تھا۔ باقیوں کو جاننے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ جلد از جلد اپنا کام ختم کر کے جانا چاہتا تھا۔

پھر چاند نے دیکھا کہ ان کی چھت سے بارہ گز دور گھر کی چھت پر مخالف پارٹی کے افراد کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے۔ چاند نے رانا سکندر کو پہچان لیا۔ اس نے مونگیا رنگ کی شلوار قمیص کے اوپر گولڈن واسکوٹ پہنی ہوئی تھی۔ جب دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تو سکندر کو اپنی دنیا گھومتی محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے جلد ہی خود قابو پا لیا اور سر کو تھوڑا سا خم کر کے سلام کیا۔ جس کا جواب چاند کی مسکراہٹ نے دیا۔

رانا سکندر نے جس آدمی کے ہاتھوں مقابلے کی ڈور دی تھی وہ بھی اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس کا نام سلمان تھا۔ اور صرف اس بات پر کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اسے ''سلو'' کہا جاتا تھا۔ سلو کے شادی نہ کرنے کی وجہ اس کی طبیعت میں فتور اور کبھی سیراب نہ ہونے والی فطرت تھی۔ عورت اس کی کمزوری تھی۔ اس بات کا علم جب جیدے کو ہوا تو اس نے ایک خبیث چال چلنے کا فیصلہ کیا۔

پہلا پیچا جب فیصلہ کن موڑ پر پہنچا تو جیدے نے نیچے سے دو لڑکیوں کو آواز دی جو چھن چھن کرتی چھت پر آ گئیں۔ وہ پہلے اس گھر میں موجود نہیں تھیں۔ غالباً ان کو بعد میں بلوایا گیا تھا۔ ان میں سے ایک نے گہرے نیلے جبکہ دوسری نے آتشی رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا جو کہ ان دونوں کے نوخیز جسموں کو ڈھانپنے کے بجائے نمائش کر رہا تھا۔

سلو یہاں مات کھا گیا۔ ایسا نہ بھی ہوتا تو مات اس کا مقدر تھی کیونکہ اس کا مقابلہ اس فن کے استاد سے تھا۔ پہلے پیچ کے دوران رانا سکندر کو بری طرح شکست ہوئی۔ جس سے ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ جیدے کے چیلوں نے زبردست نعرے بازی سے اپنی جیت کو منایا۔

مقابلہ چونکہ تین پیچوں کا تھا تو دوسرے پیچے کے شروع ہونے سے پہلے رانا سکندر نے سلو کو اچھی طرح جھاڑ پلائی۔ اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا تو چہرے سے ندامت ٹپکنے لگی۔ مقابلہ جیتنے کے لیے اگلے دونوں پیچے جیتنا ان کے لیے لازم ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب چاند ان قہقہے لگاتی لڑکیوں کو جنہیں وہاں ایک شوپیس کی حیثیت حاصل تھی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیدا اس کے یوں گھورنے پر چاند کے قریب آیا۔

''چاند! شاباش...... تم نے پہلی منزل پار کر لی لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ یہ لڑکیاں مقابلہ ختم ہونے تک تمہاری بہنیں ہیں۔ ہاں جیت کے بعد جو کہ مجھے نظر آ رہا ہے کہ آسان ہے ...... ان سے رشتے کا تعین تم اپنی مرضی سے کر سکتے ہو۔'' چاند نے قہر برساتی آنکھوں سے جیدے کو گھورا اور اپنے کندھے پر رکھا ہاتھ ایک جھٹکے سے ہٹا دیا۔ جب بولا تو اس کا لہجہ سرد تھا۔

''اگلا مقابلہ شروع ہونے سے پہلے یہ دونوں مجھے یہاں نظر نہ آئیں۔ میں یہاں مردوں کی طرح مقابلہ کرنے آیا ہوں ...... جنانیوں والے کام نہ مجھ سے ہوئے ہیں نہ مجھے کرنے آتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دوسری جانب چلا گیا اور چرخی پر ڈور چڑھانے لگا۔

جیدے نے ایک لمبی سانس اندر کو کھینچی۔ گویا اپنی تذلیل کو برداشت کیا اور اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر ادھر ادھر دیکھا۔ خوش قسمتی سے اس کے ساتھیوں نے یہ خفت آمیز منظر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جا کر لڑکیوں کو نیچے بھیجا اور خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ منگو نے جیدے کے چہرے کی بدلتی رنگت دیکھی تو اس کے پاس آیا۔ ہاتھ میں بھنگ کا گلاس تھا۔ ''کیا بات ہے استاد......!''

''یہ کمینہ چاند برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔''

''کچھ کہا اس نے؟'' سنگل پسلی کو غصہ آ گیا۔

''ہاں، کہتا ہے مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔ اس کے نزدیک ردا اور نمرہ کو بلا کر ہم نے کم ہمتی کا مظاہرہ کیا ہے۔''

''اسی لیے چھوکریوں کو نیچے بھیج دیا؟'' منگو کے سوال پر جیدے نے صرف سر ہلا دیا۔

اگلا مقابلہ شروع ہوا۔ کنی منگو نے دی۔ ہوا دونوں پتنگوں کے لیے موزوں تھی۔ چاند کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ رہی تھی جو زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ پھر جب پیچا شروع ہوا تو ناظرین نے دیکھا کہ لال پتنگ کٹ گئی ہے...... چاند کو اپنی بینائی پر شبہ ہوا۔ وہ تصور کی آنکھ سے کالی پتنگ کو کٹتے دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہاں اسے شکست ہوئی۔ سلو کا اور سکندر کا مشترکہ قہقہہ گونجا۔

ان کے آدمیوں نے جوش میں آ کر بڑی زبردست نعرے بازی کی جبکہ جیدا اپنا غصہ قابو میں کرنے کے لیے بھنگ کا ایک کے بعد ایک گلاس پی رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو چکا تھا۔ منگو نے تو اونچی بڑبڑاہٹ میں چاند کو سنا دیا کہ یہ سب لڑکیوں کو نیچے بھیجنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کا اپنا

علامہ رشید ترابی (1973-1908)

حیدر آباد دکن میں 9 جولائی 1908ء کو شرف حسین خان کے بیٹے رضا حسین خان نے حسین کی رضا کے لیے خود کو وقف کر دیا اور مومنین کو شام غریباں کے ذکر سے برسہا برس تک سرتاپا عزاداری میں مصروف رکھ کر مولائے کائنات کی قربت کا حقدار خود کو بنا لیا۔ شیعہ عالم دین کی حیثیت سے رشید ترابی علامہ کے درجے پر فائز ہوئے۔ ان کے برخوردار عقیل ترابی بھی اپنے باپ کی طرح محافل عزاداری و ذکر حسین میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ایک اور صاحبزادے نصیر ترابی اپنی طبع کے شاعر ناموری اور گوشہ نشینی کے بین بین رہے۔ علامہ رشید ترابی شاعر و مصنف بھی تھے ان کا مجموعہ کلام ''شاخ مرجان'' نہایت شاندار کاغذ پر اہتمام و سلیقہ سے شائع ہوا تھا۔ دو کتابیں نثر میں ہیں۔ ضیاء الدین اسپتال ناظم آباد کے بالمقابل امام بارگاہ حسینیہ سجادیہ کی حدود میں عالی شان مقبرے میں رضا حسین عرف علامہ رشید ترابی 18 دسمبر 1973 کو بعد از وصال محو استراحت ہوئے۔ جب کہ اس امام بارگاہ کے خطیب و پیش امام محبوب الحسن ہاشمی کو سخی حسن قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ شہر کراچی کے معتبر تذکرہ نویس محقق دبستانوں کا دبستان کراچی، احمد حسین صدیقی لکھتے ہیں کہ ''علامہ رشید ترابی تعلیم سے فارغ ہوئے تو کچھ عرصہ ملازمت کی پھر ملازمت چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ نواب بہادر یار جنگ اور خواجہ نظامی کے دوش بدوش تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظم نے ان کی خدمات کو بہت سراہا۔ قیام پاکستان کے بعد 1950 میں علامہ رشید ترابی پاکستان آ گئے اور محفل خراساں کراچی میں انہوں نے مجالس پڑھنا شروع کیں۔ علامہ نے اردو کا ایک روزنامہ ''المنتظر'' جاری کیا۔ 1956 میں اسلامی ممالک کی فلاسفیکل کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی اور مختلف علوم پر کتابیں لکھیں۔ علامہ رشید ترابی نے شاعری میں حضرت نظم طباطبائی (شارح غالب) کی شاگردی اختیار کی۔ ان کی تصانیف میں اسلامی دستور پر ایک کتاب ''دستور'' اور ''طب معصومین'' قابل ذکر ہیں۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

کوئی ہنر نہیں۔ چاند نے یہ فقرہ سن بھی لیا اور برداشت بھی کر لیا لیکن اس کے لیے تیسرا مقابلہ زندگی اور موت کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اور ایک مرتبہ پھر پتنگوں کو کنی دی گئی۔ ہوا نے انہیں اپنے بازوؤں پر اٹھایا اور وہ جھولتی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ دونوں پارٹیوں کی طرف سے زبردست نعرے بازی ہو رہی تھی۔ مقابلہ سخت تھا اور فیصلہ کن بھی۔ اور پھر پیچا پڑا...... چاند کی زیرک نگاہیں سلو کی پتنگ کی بجائے ڈور پہ ٹکی تھیں...... اور پھر چاند نے ڈور کو ڈھیل دے دی...... سلو کو لگا کہ وہ مقابلہ جیتنے کے قریب ہے لیکن اگر وہ چاند کے باریک ہونٹوں پر رینگنے والی مسکراہٹ دیکھ لیتا تو ایسا نہ سوچتا۔ چاند نے سلو کی ڈور کو نظروں میں رکھتے ہوئے ایک جھٹکے سے ڈور کھینچی......

وہ تالیوں اور نعروں کی آواز تھی جس نے رانا سکندر کو اس کی مات کا یقین دلایا۔ جیدا بھی بے یقینی کے عالم میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں موجود آدھا بھرا گلاس اس کی قمیص کا دامن بھگو گیا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ چاند نے اپنی پتنگ کی ڈور بھی چھوڑ دی اور رانا کی طرف دیکھ کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

جیدا نے جیت کی خوشی میں دعوتِ عام کا اعلان کیا لیکن چاند جشن تک وہ وہاں نہیں رکا...... جیدا اپنی جیت پر اتنا شاداں تھا کہ چاند سے اپنی خفگی کو خیر باد کہا اور بغیر کسی چوں چرا کے وہ رقم دے دی جس کا وعدہ ہوا تھا۔ منگو نے بھی اپنی ناراضگی اور حسد کو پسِ پشت ڈال کر چاند سے ہاتھ ملایا۔

جب چاند اس گھر سے نکلا تو اسے اپنے کندھوں سے ایک بڑا بوجھ سرکتا محسوس ہوا۔ وہاں سے وہ سیدھا اپنے خاندانی سنار کے پاس گیا۔ چوڑیاں پسند کیں اور ان کو لے کر صاحبہ کی گلی کا رخ کیا...... جہاں ایک ناگہانی آفت اپنا منہ کھولے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

کسی ریاست کے شہزادے کی مانند چاند نے محلے میں قدم رکھا تو وہاں کے ہر شخص نے اس کی چال میں شوخی اور غرور کو محسوس کیا۔ چوڑا سینہ اور اکڑے ہوئے کندھے، کشادہ پیشانی جس پر آگے کو جھکے ہوئے چند بال جو اسے جاذب النظر بنا رہے تھے، عنابی ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ جو سیدھی دلوں میں اترتی تھی، گھنی مونچھوں کی چھاؤں میں یہ مسکراہٹ اور زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے وہ اپنے مخصوص انداز میں سر کی پشت کو سہلا رہا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں ایک نفیس سی گول پلاسٹک کی ڈبی تھی اور غالباً یہی ڈبی اس کے غرور کی وجہ بھی تھی۔ آج اسے لگ رہا تھا کہ دنیا جہان کی دولت اس چھوٹی سی ڈبیا میں سمٹ گئی ہے۔ ریاض پان والے کے پاس رک کر اس نے اپنے لیے پان بنوایا اور اسے خاص تاکید کی کہ پان میں سونف زیادہ ہو۔ اور یہ بات پورا محلہ جانتا تھا کہ جب چاند زیادہ سونف والا پان کھاتا ہے تو وہ کہاں اور کس سے ملنے جاتا ہے۔

”کیا بات ہے چاند استاد؟ بڑے خوش نظر آرہے ہو؟“ ریاض نے شوخی سے کہا۔

”تم سے مطلب؟ اپنے کام سے کام رکھا کر ریاض۔“ چاند نے اسے جھاڑ پلا دی۔

”معافی چاہتا ہوں چاند استاد، آیندہ گستاخی نہیں ہو گی۔“ اس نے ڈر کر کہا اور جلدی جلدی ہاتھ چلانا شروع کر دیا۔ جبکہ چاند نے اس کی پتلی ہوتی حالت دیکھ کر ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر رسید کیا اور مسکرا دیا۔ ”تمہاری صاحبہ بھابی سے ملنے جا رہا ہوں۔“ آگے کو جھک کر اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ اس کے مسکرا کر بولنے پر ریاض بھی مسکرا دیا اور پان کے اجزا کو اچھے طریقے سے پتے میں لپیٹ کر چاند کو پیش کیا۔

اتنے میں پاس سے ایک ایمبولینس بجلی کی سی تیزی سے گزری۔ چاند کے دل میں ایک لمحے کے لیے کسی انہونی کا وہم ابھرا اور پھر صاحبہ سے مل کر ہونے والی خوشی کا سوچ کر وہ وہم بھی چلا گیا۔ پان منہ میں رکھ کر اس نے چلنا شروع کر دیا۔ اپنے ذہن میں وہ صاحبہ کے تصور سے ہم کلام تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ اس کی خواہش کی تکمیل کے بعد وہ کتنا شاداں ہے۔ وہ صاحبہ سے کہہ رہا تھا کہ اس کی ایک مسکراہٹ پر وہ اپنی زندگی تک قربان کر سکتا ہے۔ اس کے تصور میں صاحبہ اپنی تمام تر رعنائی سمیت مسکرائی تو چاند کو اپنا دل بلیوں اچھلتا محسوس ہوا۔ بے اختیار ہونٹوں پر آ جانے والی مسکراہٹ کو دانتوں میں دبا کر مقفل کیا۔

صاحبہ کی گلی میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ضرورت سے زیادہ رش ہے۔ چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ غم و غصے نے لے لی۔ وہ اتنے لوگوں کے جم غفیر کی امید نہیں کر رہا تھا۔ اسے تو تنہائی اور سکون درکار تھا کہ جس میں وہ صاحبہ سے بہ آسانی مل سکتا اور اس کی فرمائش پوری ہونے کی نوید سنا سکتا۔ اسے بتاتا کہ وہ اس کی خواہش پوری کر چکا ہے۔

لیکن...... وہاں موجود افراد کی عجیب و غریب نظریں دیکھ کر اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ کئی مرد تاسف سے اسے دیکھنے لگے جبکہ کئی عورتوں نے چاند کو دیکھ کر اپنے دوپٹے منہ میں رکھ لیے۔ وہ اپنی سسکیاں روکے ہوئے تھیں...... لیکن کیوں؟ اس سوال کا جواب بھی اسے جلد ہی مل گیا جب اس نے دیکھا کہ ایمبولینس کا پچھلا دروازہ کھلا اور اسٹریچر باہر نکالا گیا۔ اس پر ایک بے جان جسم تھا جسے سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ یکایک جھٹکا لگنے کی وجہ سے سفید چادر میں جنبش پیدا ہوئی اور ایک زنانہ بازو چادر سے نکل کر نیچے کو ڈھلک گیا۔ چاند نے اس بازو کو دیکھا...... اور دیکھتا رہ گیا۔

وہ بازو جانا پہچانا تھا۔ وہ جانا پہچانا کیوں تھا؟

کاش وہ اس بازو کو پہچانتا نہ ہوتا۔ یہ آرزو اس کے دل نے کی تھی اور بڑی شدت سے کی تھی۔

لیکن اس بازو پر ایک تعویذ بھی تو تھا۔ چاند اسے بھی جانتا تھا...... دودھیا رنگت کے خوبصورت مخملیں بازو پر موجود تعویذ کو اس نے تب تک دیکھا جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

مقابلہ وہ جیت گیا...... لیکن زندگی کی قیمت پر۔

”ثریا...... میں کیا کروں...... میں نے تو بچی کے ساتھ ساتھ اپنا دوسرا بیٹا بھی کھو دیا۔ وہ کچھ کھا نہیں رہا۔ کچھ پی نہیں رہا۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔“

”میں کی دساں...... میرے کار پہلے اک زندہ لاش سی...... اونوں تکدے میریاں انکھاں وگ وگ سکھ گئیاں۔ ہن میری دوسری بچی مٹی تھلے سو گئی۔ میں آپے کی کراں۔ چاند پتر نوں ویکھنی آں تے میرا سینہ پھٹدا...... اللہ غارت کرے اس منحوس مارے نوں جدی ڈور نال میری بچی دی گردن کٹی اے...... اللہ سوہنیا...... غارت کر دے اونوں...... اودے ہتھ ٹٹ جاں...... مرن جوگے نوں موت آ جائے۔“

”ایسے خبیثوں کو موت ہی آ جانی چاہیے...... ہم ماؤں کی گود اجاڑنے کے بعد بھی بے خبری میں مزے کی نیند سوتے ہوں گے...... ان کا کوئی پیارا چھنے ان سے تو ہمارے کلیجے کے درد کا احساس ہو...... ثریا جن کو گناہ کا احساس ہو جائے زندہ تو وہ بھی نہیں رہتے...... ہائے میرا شان وہ اس درد کو سمجھ کے چلا گیا۔ ہائے میری بچی صاحبہ اس کے قاتل زندہ ہیں۔“

برآمدے میں دو مائیں الگ الگ چارپائیوں پر بیٹھیں اپنی اپنی بے بسی پر بین کر رہی تھیں، ان کا ایک ایک لفظ کمرے میں بند چاند کے سینے کو چھلنی کر رہا تھا۔ وہ دنیا سے اور دنیا والوں سے دور کہیں کوچ کر جانا چاہتا تھا۔ جہاں اسے کسی کی آواز نہ آئے...... جہاں وہ کسی کو نظر نہ آئے...... جہاں اس کا ذہن یہ ملامت نہ کرے کہ تمہاری صاحبہ کی زندگی چھیننے والی ڈور پر تمہاری ہی انگلیوں کے نشان ہیں۔ چاند کا ضمیر لگاتار کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر برس رہا تھا اور اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

دفعتاً اس نے وہ تعویذ اپنی آنکھوں کے سامنے کیا جو صاحبہ سے آخری ملاقات کے وقت خود اس کی کلائی میں پہنایا تھا۔ چاند کو لگا جیسے اس نے تعویذ اپنے ہاتھوں سے اتار کر غلطی کی ہے۔ وہ تعویذ چاند کی زندگی کی حفاظت کے لیے تھا...... جب اتر گیا تو صاحبہ کی حفاظت نہیں کر سکا...... اس کی زندگی کی حفاظت نہیں کر سکا۔

یکایک چاند کو لگا کہ...... نہیں...... تعویذ میں ایسی کوئی جادوئی طاقت نہیں تھی جو صاحبہ کو بچاتی...... ہاں وہ تو چاند کی غلطی...... نہیں گناہ کی وجہ سے مری۔ پھر اسے لگا کہ اس کا سانس گلے میں اٹک گیا ہے...... جیسے ہوا کی نالی بند ہو گئی ہو...... وہ کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگا...... کامیابی نہ ہوئی۔ وہ کھانسنے لگا...... سفینہ دوڑتی ہوئی اندر آئیں۔ اسے پانی پلایا لیکن سانس کی آمد و رفت معمول پر نہ آئی......

پھر چاند اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سنجیدگی تھی...... اس کا رخ صدر تھانے کی طرف تھا...... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کا طریقہ کیا ہے...... ہاں وہ جانتا تھا۔

اور پھر دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی شام کو...... جب اندھیرے نے اپنے پر آہستہ آہستہ پھیلانے شروع کیے تو پھانسی گھاٹ کی طرف ایک آدمی کو لے کر جایا گیا...... اس کے ہاتھ کھلے تھے...... سینہ برف جیسا ٹھنڈا تھا...... اس کی آخری خواہش جو کہ اس کی محبوبہ کی قبر کی زیارت تھی وہ پوری ہو چکی تھی...... اس نے اپنی ماں اور ثریا بی بی کو سینے سے لگ کر سسکتے بھی دیکھ لیا تھا...... صاحبہ کی قبر کی مٹی کو اپنے منہ پر مل کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گیا...... اس کا ملامت کرنے والا ضمیر بھی سو گیا......

☆☆☆

یہاں میرا ایک سوال ہے کہ قصوروار کون ہے......؟

صاحبہ...... جس کی بے جا فرمائش اسے موت کے گھاٹ تک لے گئی......

چاند...... جو محبت میں اپنے کیے وعدے کے خلاف چل پڑا......

یا وہ ڈور...... جسے بنانے میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں...... اسے ہم خود اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں...... اور پھر جب کوئی معقول مجرم نہ ملے تو اس پر الزام لگا دیتے ہیں......

ہاں قاتل وہ ڈور ہے، وہ ڈور قاتل ہے۔



شبّن خالو

مجترم معراج رسول
سلام تہنیت
ہمارے آس پاس ایسے بہت سے کردارہیں جو خود میں منفرد نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار شبّن خالو ہے۔ ان کی زندگی کا عکس میں نے بحساطہ تحریر میں لایا ہے لیکن ذرا انداز جداگانہ ہے۔ امید ہے میری اس الگ انداز کی تحریر کو قارئین پسند کریں گے۔

طارق عزیز خان
(اسلام آباد)

شبن خالو بھی ہمارے جاننے والوں میں ایک دلچسپ کردار تھے۔ ان کی ہیت کچھ ایسی تھی کہ اگر ایک بار کسی اجنبی کی نظر پڑ جاتی تو وہ اوپر سے نیچے ایک گہری نظر ان پر ضرور ڈالتا تھا۔ درمیانہ قد، دبلا پتلا ڈیل ڈول، رنگ سانولا، باریک مونچھوں کے ساتھ ٹھوڑی کے نیچے بالشت بھر کی خشخشی داڑھی، تین چوتھائی سر پر موجود بال تیل کے ساتھ سلیقے سے جمے ہوئے۔ ہم نے انہیں ہمیشہ ایک ہی حلیے میں دیکھا۔ سفید اجلا کرتہ جس کے دامن پر کچھ شکنیں پڑی رہتیں۔ تنگ موری کا چست پاجامہ جس کی رومالی گھٹنوں سے کچھ اوپر تک لٹکی دکھائی دیتی۔ پاؤں میں سوفٹی جبکہ کام کے وقت کھسہ نما بند جوتا پہنتے۔ ضلعی انتظامیہ کے ایک محکمے میں ملازم تھے۔ دفتر جاتے وقت سر پر ترکی ٹوپی لازمی پہنا کرتے جس کی سوڈا ان کے ماتھے پر جھوما کرتی۔ نظر کا چشمہ لگایا کرتے۔ ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی ہوتی اور ہتھیلی سے اوپر کلائی میں پان کی پوٹلی سنہری دھاگے سے بندھی لٹکی ہوتی۔ پوٹلی میں ہروقت چار عدد تازے پان ہوتے۔ اصلی مرادآباد کا تمباکو استعمال کرتے جو ان کے ایک جاننے والے واہگہ کے راستے ہرسال باقاعدگی سے بھجوایا کرتے تھے۔ پان میں قوام لازمی تھا۔ کبھی کبھار سگریٹ بھی پیا کرتے لیکن سگریٹ کے باقاعدہ رسیا نہیں تھے۔ چائے مل جائے تو انکار نہیں کرتے۔ کبھی کبھار افیم کا شوق بھی کیا کرتے لیکن جب بھی افیم کھاتے پاؤ بھر بالائی کے ساتھ کھاتے۔ فرمایا کرتے کہ بالائی کے بغیر افیم شہدے لوگ کھاتے ہیں۔ خالو کے پاس سواری کے لیے ایک سائیکل تھی لیکن پیدل چلنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہم نے انہیں بیمار کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ صبح سویرے اٹھ کر سیر کیا کرتے اوز اپنی صحت کا راز پیدل چلنے کو بتاتے۔

شبن خالو جنگ عظیم اوّل کے بعد کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا پورا نام نواب شہاب الدین احمد خان تھا لیکن ہر چھوٹا بڑا انہیں شبن خالو کے نام سے جانتا تھا۔وہ بتایا کرتے کہ ان کے دادا، دھول پور کے راجا کے ہاں دیوان کے عہدے پر فائز تھے جبکہ نانا کی طرف سے ان کی رشتہ داری نواب بھوپال کے خاندان سے تھی اور اسی حوالے سے خود کو نواب کہتے تھے۔ ہندوستان میں جب راجوں نوابوں کو زوال آیا تو ان کا خاندان کانپور ہجرت کرگیا جہاں ان کے والد نواب شجاع الدین احمد خان المعروف چھٹن میاں ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ شبن خالو کی تعلیم میٹرک تھی جو انھوں نے کانپور سے کیا تھا۔ میٹرک کے فوری بعد وہ ریلوے میں بھرتی ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران انھوں نے اتر پردیش، مدھیہ پردیش سمیت ملک کے جنوب مغربی علاقوں کی خوب خاک چھانی۔ بریلی میں خاندان ہی کی ایک خاتون سے ان کی شادی ہوئی۔ جنگ عظیم دوم کے دوران انگریزی فوج کے لیے بھی خدمات سرانجام دیں جہاں ان کا تبادلہ رنگون ہوگیا۔ وہ جنگ کے بعد تک وہیں مقیم رہے۔ جنگ کے واقعات ہوں، برما کے گھنے برساتی جنگلوں میں گزارے ہوئے دن رات یا پھر ریلوے کی ملازمت کے دوران کیے گئے یادگار سفر، شبن خالو ان واقعات کو کچھ اس دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے کہ سننے والے دم بخود رہ جاتے۔ تقسیم ہند کے بعد خالو کی ریلوے اور فوج میں خدمات کے عیوض انہیں برطانوی دولت مشترکہ کے کسی بھی ملک کا مستقل شہری بننے کی پیش کش ہوئی لیکن انھوں نے پاکستان کا انتخاب کیا اور خاندان سمیت بحری جہاز کے ذریعے کراچی چلے آئے۔ کچھ عرصہ ریلوے میں گزارا اور پھر رحیم یارخان تشریف لے آئے۔ یہاں



ضلعی انتظامیہ کے ایک محکمے سے وابستہ ہوگئے اور پھر ریٹائر منٹ تک اسی جگہ جم کر کام کیا۔

شبن خالو سے متعلق یہ واقعات جو میں آپ کو سنا رہا ہوں یہ 80ء کی دہائی کے ہیں۔ خالو اس وقت ساٹھ کے پیٹے میں تھے لیکن اچھی صحت کے باعث پچاس کے دکھائی دیتے تھے۔ وہ دوست نواز انسان تھے۔ اچھا کھانا پکانے اور کھلانے کے شوقین تھے۔ ہفتے وار تعطیل کے دن خود جاکر سودا سلف خریدتے اور پھر دوستوں کے ساتھ ساتھ گھر بھر کے لیے پکوان کی تیاری میں جت جاتے۔ خالو کو اپنے زمانے کے کھانوں کی ترکیبیں ازبر تھیں۔ قلیا قوفتے، نگن کباب، آنت کباب، دم پخت کباب، مغلئی قورمہ، کھڑے مسور کی دال اور بوٹ پلاؤ پکا کر کھلاتے تو کھانے والے انگلیاں چاٹا کرتے۔ احباب کی دعوتوں کے دوران ہندوستان میں سیر وسیاحت کے قصے سناتے تو ترنگ میں آکر یہ بتانا نہ بھولتے کہ نواب بھوپال کی ایک دعوت میں انھوں نے شیر کا گوشت بھی چکھا تھا۔ حالات حاضرہ، معلومات عامہ، منطق، فلسفہ، صحت، ادب اور موسیقی سے متعلق ان کی معلومات بیش بہا تھیں۔

ہندو پاک کی ریلوے کا وہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ انہیں نہ صرف کراچی لاہور جانے والی تمام ریل گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل ازبر تھا بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ٹونڈلہ جنکشن سے ناگپور جانے والی لائن کن کن شہروں سے گزرتی تھی۔ وہ جدید ایلوپیتھی کے سخت خلاف تھے۔ روزمرہ کی بیماریوں کے سدباب کے لیے ان کے پاس پرانے حکما کے خاص نسخہ جات موجود تھے جنہیں ان کے قریبی احباب شہنشاہی نسخے کہا کرتے تھے۔

شبن خالو میں بہت سے گن تھے۔ ظرافت اور خوش طبعی ان کی جبلت میں شامل تھی لیکن ان کی سنک بھی بہت مشہور تھی۔ وہ مجموعہ اضداد کے مالک تھے، پل میں تولہ پل میں ماشہ، کبھی شعلہ کبھی شبنم، کبھی حدید تو کبھی حریر۔ اپنے آگے کسی کی رائے نہیں مانتے تھے اور دوسرں کے کام میں مین میخ نکالنا اپنا فرض اوّلین سمجھتے تھے۔ ”ہم تو پہلے ہی کہتے تھے“ ان کا تکیہ کلام تھا۔ کوئی بھی واقعہ کہیں بھی پیش آجاتا یا انہیں اپنی بات کو ثابت کرنا ہوتا تو ان کی تان اسی پر ٹوٹتی کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔ اختلاف رائے کو اپنا دائمی حق سمجھتے تھے، چاہے ان کی رائے غلط ہی کیوں نہ ہو اور بحث بحثی کرکے اپنی بات کو حرف آخر ثابت کرہی دیتے۔ محاوروں کا خوب استعمال کرتے اور فریق مخالف کو قائل کرکے ہی چھوڑتے۔ اگر کوئی کہہ دیتا کہ صاحب سورج مشرق سے نکلا کتنا حسین دکھائی دیتا ہے تو جھٹ انکار میں گردن

ہلاتے اور کہتے۔ ''یہ بھی خوب کہی آپ نے، کیا آپ روز صبح اٹھ کر یہ نظارہ دیکھتے ہیں؟ نہیں نا، تو پھر اتنے یقین سے کیوں کہہ رہے ہیں؟ ارے بھئی قطبین پر رہنے والوں کو تو وہ جنوب سے نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک بار چوہدری صاحب نے شمالی علاقہ جات کی تعریف کردی کہ گرمیوں میں پہاڑوں کی سیر کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ بس پھر کیا تھا خالو کو تو بولنے کا موقع مل گیا۔

''بھئی جو سکھ چوبارے، بلخ نہ بخارے۔ بال بچوں کے ساتھ گھر کی ٹھنڈی چھاؤں پہاڑوں کی ٹھٹھراتی ہواؤں سے کہیں بہتر ہے۔ ہوٹلوں کے گندے تاریک کمروں کے سیلن زدہ خنک ماحول کا خس خانے کی ٹھنڈی میٹھی فضا سے کیا مقابلہ؟ اور یہ کیا گرمی گرمی کی رٹ لگا رکھی ہے آپ نے؟ ارے بھئی موسم میں حدت نہ ہوتی تو خوشہ گندم نہ پکتا، آموں میں رس نہ گھلتا اور آپ چوستے رہتے زندگی بھر پھوس جیسے مالٹے۔'' تاہم اگر کبھی کسی کے منہ سے نکل جاتا کہ شکر ہے گرمی آئی اب ستو پینے کو ملے گا تو خالو ناک بھوں چڑھا کر فرماتے ''ارے بھئی گدھا پیٹنے سے گھوڑا نہیں بنتا۔ کیسا کٹیلا موسم ہے؟ نہ دن کا چین اور نہ رات کا سکون، آدمی نہ کھانے کا اور نہ پہننے کا۔ ارے صاحب پچھلے سال گرمیوں میں کشمیر کی سیر کا لطف ہی دوبالا ہوگیا۔ کیا بتائیں کیسا حسین موسم تھا؟ ایسا لگا جیسے جہنم سے جنت میں آگئے ہوں۔ کمرے میں آرام کر رہے ہوں تو لحاف کے اندر رگوں میں گدگداتی خنکی اور باہر کھلے میں سیر کو جائیں تو سرسراتی صحت افزاء پہاڑی ہواؤں کی کیا بات ہے؟ سیروں خون بڑھ جاتا ہے آدمی کا۔ مگر آپ کو کیا خبر آپ سوتے رہیں ستو پی کر۔''

ابھی پرسوں پرلے روز کی بات ہے کہ اگلے چوک پر ٹنڈے برف والے کے اڈے پر محفل لگائے بیٹھے تھے۔ اسی دوران کرنی خدا کی کیا ہوئی کہ ایک محلے دار جو سائیکل پر آرہے تھے عین برف کی دکان کے سامنے سلپ ہوکر گر پڑے۔ بھاگیو، دوڑیو کے شور میں خالو بھی لپک کر جائے وقوعہ پر جا پہنچے۔ مجمع کو چیرتے ہوئے اندر گھسے اور شور مچا دیا۔

''ارے بھئی کوئی دوڑے جاکر ٹھنڈے دودھ کا گلاس لائے۔'' کسی نے مشورہ دیا کہ قریب کی گلی میں واقع چوہدری صاحب کے گھر سے دودھ لایا جائے۔ ''عجیب بھلے لوگ ہیں باتوں میں وقت ضائع کیے دے رہے ہیں۔'' خالو مجمع پر چلائے ''ارے بھئی جاؤ دوڑو جاکر ٹھنڈا دودھ لاؤ۔''

ایک آدمی چوہدری صاحب کے گھر کی طرف دوڑا جبکہ دو ایک نے سہارا دے کر زخمی کو اٹھایا اور قریب موجود لکڑی کے بنچ پر لٹا دیا۔ خالو نے زخمی کا سر گود میں رکھ لیا اور لگے اس کا معائنہ کرنے۔ ایکسیڈینٹ کوئی خاص نہیں تھا بس معمولی خراشیں ہی آئی تھیں۔ مرزا باقر نے جھک کر زخمی کو دیکھا اور بولے۔ ''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے چوٹ زیادہ نہیں آئی۔''

خالو کو بھلا کب گوارا تھا کہ کوئی ان کے ہوتے ہوئے اپنی رائے پیش کرے۔ ان کی طبیعت کا اختلاف عود کر آیا۔ مرزا کو گھور کر دیکھا اور تنک کر بولے۔

''ارے بھئی ایسے کیسے حکم جاری کردیا آپ نے۔ دیکھ نہیں رہے کہ کیسے ہائے ہائے کر رہا ہے بیچارہ۔ ارے کوئی جاکر دیکھو، دودھ لانے والا کہاں مر گیا؟''

اتنے میں ایک آدمی دودھ کا لبا لب بھرا ہوا گلاس لے کر آگیا۔ تاہم اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا، خالو نے لپک کر گلاس پکڑا اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گئے۔ گردن کو جھٹکا دے کر ڈکار لی اور بولے۔ ''ارے بھئی، ہم سے نہیں دیکھا جاتا ایسا خوفناک حادثہ دل گھٹ رہا تھا ہمارا، اب جاکے قدرے سکون ملا ہے۔''

محلے داروں نے بجائے زخمی کے خالو کو دودھ پر ہاتھ صاف کرتے دیکھا تو ایک ٹک انہیں دیکھنے لگے۔ ''ارے بھئی، ہمارا منہ کیا تاک رہے ہو، ختم ہوا تماشا، جاؤ اپنا اپنا کام کرو ایسی چوٹیں تو جوانی میں لگتی رہتی ہیں۔ ابھی گھر جاکر گرم دودھ میں ہلدی ملا کر پیے گا تو بھلا چنگا ہوجائے گا۔'' خالو نے گلاس مرزا کی طرف بڑھایا، ہونٹوں پر زبان پھیری اور زخمی کو دیکھ کر بیزاری سے بولے۔ ''بھئی عجیب دستور دیکھا بیسویں صدی کے نوجوانوں کا، ذرا سا پاؤں کیا پھسلا کہ لگے ہائے ہائے کرنے۔''

☆......☆

خالو کے بقول ان سے بہتر اور معیاری خریداری کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ گوشت، سبزی، کپڑا لتا، جوتا، گھر کا سامان ہو یا پھر روزمرہ استعمال کی کوئی بھی شے، وہ خود خریداری کرتے اور کبھی کوئی چیز غلط خرید لاتے تو اسے سہی ثابت کرنے کے لیے خالہ کو بھی زچ کر دیتے۔ اگر کوئی ان سے مشورہ کیے بغیر دو گھوڑا بوسکی خرید لاتا تو وہ کپڑا دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھاتے اور اسے کھدر ثابت کرکے ہی چھوڑتے۔ محلے کے جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے اپنی خدمات

پیش کرنے سے نہ چوکتے۔ خالو کو کرکٹ کے کھیل سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ مارچ 1992ء میں پاکستان نے پہلی بار کرکٹ کا عالمی میلہ لوٹا تو خالو کی خوشی دیدنی تھی۔ کرکٹ کا وہ پورا ٹورنامنٹ میں نے ان کی بیٹھک میں بیٹھ کر دیکھا جہاں ان کے احباب کے ساتھ ہم جیسے بن بلائے بھی موجود ہوتے۔ ویسٹ انڈیز سے پہلا میچ ہارنے پر جہاں ہم لوگ مایوس تھے وہیں خالو پورے یقین کے ساتھ کہتے، ارے دیکھنا ہمارا خان کپ لے اڑے گا اور دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔

پچیس مارچ کی شام جب پاکستان نے انگلینڈ کو فائنل میں شکست فاش دی تو خالو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مسجد کے اسپیکر سے اعلان کرتے کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔ اسی سال وہ ریٹائر ہوئے اور اپنے بچوں کے ساتھ کراچی ہجرت کر گئے، جہاں ان کا بڑا بیٹا ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھا۔

سن 97ء کے دسمبر میں میری پہلی نوکری ہوئی۔ میں جس فیکٹری میں ملازم ہوا اس کی ایک شاخ سکھر میں بھی تھی۔ قریب ایک سال بعد مجھے ایک کام کے سلسلے میں سکھر فیکٹری جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں میرے ایک کولیگ اور قریبی دوست محمد سہیل میمن کے دفتر میں شبن خالو سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ آخری ان معنوں میں کہ اس کے ٹھیک ایک سال بعد خالو کا کراچی میں انتقال ہوگیا تھا۔ میں شبن خالو کو سہیل بھائی سے گپیں لگاتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہی گھن گرج وہی حلیہ جس میں انہیں دیکھتا آیا تھا۔ سہیل بھائی نے مجھے حیران دیکھا تو بولے کہ قریب دو سال پہلے رحیم یار خان سے کراچی جاتے ہوئے ان کی ٹرین میں خالو سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ خالو کے علم و ادب سے متاثر ہوئے اور خالو کو سہیل میمن کا ہمت و حوصلہ بھا گیا جنھوں نے اپنی معذوری کو زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے رکاوٹ نہ بننے دیا۔ سہیل بھائی رشتوں کو نبھانے کا گر خوب جانتے ہیں۔ ان کی ایک عادت ہے کہ وہ سفر کے دوران پڑھنے کے لیے ایک آدھ کتاب ضرور ساتھ رکھتے ہیں لیکن اگر کوئی ہمسفر ان سے صاحب سلامت کر بیٹھے تو مخاطب سے ایسے گھل مل جاتے ہیں جیسے ان کی ان سے برسوں کی شناسائی ہو۔ ایک بار ایسے ہی سفر کے دوران ایک آٹھ نو سال کی بچی نے جو اپنے والدین کے ساتھ سفر کر رہی تھی سہیل بھائی سے پڑھنے کے لیے کتاب مانگی۔ سہیل بھائی نے بچی سے شفقت کا اظہار کیا۔ چند گھنٹوں کے سفر کا یہ معمولی سا تعلق اس قدر توانا ہوا کہ کئی سال بعد انھوں نے

جمال ابڑو نے ایک ادیب کی حیثیت سے محسوس کیا کہ سندھ کے لوگ صدیوں سے اندھے عقیدوں اور رسموں کے اذیت ناک درد میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے سندھی ماحول میں جھانک کر دیکھا تو اسے ایسے بہت سے مجبور، بے بس اور لاچار انسان تڑپتے نظر آئے جو خود ساختہ قانون اور سماج کے بے جوڑ بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جہاں ہر ماحول کی پست حالی نے انسان کے جینے اور پھلنے پھولنے کی فطری امنگوں اور خواہشات کو کچل کر رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے سندھی ماحول کے قبیح اور دردناک منظر دیکھے اور بے بہا انسانی جانوں کو جانوروں کی طرح بکتے ہوئے دیکھا جہاں پر بچیوں کو بیچا جاتا، جہاں پر فطرت کے مجبور انسان کو کاروکاری بنا کر ذبح کیا جاتا اور اپنی بہیمانہ خواہش کو جھوٹی انسانیت کا لبادہ پہنایا جاتا ہے۔ جہاں ہر مسیحا بھی قصاب بنا ہوا ہے... شفا اور علاج جیسی انسان دوست خدمات بھی صرف طبقاتی مفاد اور تعلق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جہاں پر ذات پات (رنگ نسل) کے فرق کے ذریعے اپنی برتری قائم رکھنا اور طبقاتی نظام کو جاری رکھنے کے لیے معصوم انسانوں کو بھی بے دردی کے ساتھ کچلا جاتا ہے جہاں پر مُردوں پر زندوں کو قربان کیا جاتا ہے۔ جس سرزمین پر انسان مسکینیت کی حالت میں زندگی گزارتا، ہمیشہ تن کو ننگا اور پیٹ کو بھوکا رکھتا، جہاں پر ایسا سماج ہو جہاں ہر عام انسان فقط ظلم و ستم سہنے کے لیے جیتا ہو جب کہ مٹھی بھر لوگ زندگی کی جملہ برکات سے خوب فیض یاب ہو رہے ہوں۔ آفاقی مصیبتوں میں بھی جابر قوتیں انسان کو پیستی اور کچلتی ہوں۔ جمال ابڑو نے ایسی ہی سنگین حقیقتوں، کرخت واقعات اور بدصورت مناظر کو اپنے افسانوں کے موضوعات بنائے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے اندر اچھی طرح جھانکتا ہے۔ اس کی فن کارانہ بصیرت دل کے نہاں خانے میں بھی جھانکنے کا ہنر جانتی ہے اور انسانی کردار کے اندر پھوٹتی ہوئی درد کی لہروں کو بھی دیکھتی ہیں تو اس کے ساتھ ظلم و جبر کی پسِ پردہ قوتوں کو بھی ڈھونڈ نکالتی ہیں۔

اقتباس: جمال ابڑو، شخصیت اور فن
از منظور علی ویسریو

راولپنڈی میں اسی بچی کی شادی میں شرکت کی اور سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی دعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کیا۔ خالو سے ملاقات کے دوران سہیل بھائی نے یہ واقعہ سنایا تو خالو بھی کھل گئے اور پھر انھوں نے وہ دلچسپ قصہ سنایا جو آج میں آپ کے سامنے بیان کرنے جا رہا ہوں۔

☆......☆

بقرعید کو ایک ہفتے سے بھی کم وقت رہ گیا تھا۔ ایک دن خالو مغرب کی نماز پڑھ کر گھر لوٹے تو خالہ نے کھانے کی ٹرے لا کر رکھی اور بولیں کہ عید قریب ہے اور انہیں اس بار بڑے جانور میں حصہ ڈالنے کی بجائے اپنا خود کا بکرا خریدنا چاہیے۔

''ارے بھئی ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔'' خالو نے ٹرے اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے کہا ''ہر سال ضروری تھوڑا ہے کہ لازمی حصہ ہی ڈالا جائے۔''

''خیر سے اپنے مرزا صاحب بھی بکرا خرید لائے ہیں۔'' خالہ نے...... بات بڑھاتے ہوئے کہا ''آج بچے دیکھ کر آئے تو پوچھنے لگے ہمارا بکرا کب آئے گا؟''

''اچھا تو تم اس کمزور سے میمنے کو بکرا کہہ رہی ہو۔'' خالو نے نوالہ چباتے ہوئے ناک چڑھائی۔ ''ارے مرزا کی تو وہی مثال ہے کہ بدن پر نہ لتا پان کھائیں البتہ۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' خالہ نے چونک کر پوچھا۔

''ارے بھئی، جب خریدنے کی سکت نہ ہو تو آدمی کو صبر کر لینا چاہیے۔ مرزا سے اپنی مٹھائی کی دکان تو سنبھلتی نہیں اور چلے ہیں بکرا خریدنے۔'' خالو نے جواب دیا ''ہم نے کہا بھی تھا کہ ساتھ چلتے ہیں لیکن کر لی اپنی، اب اس میمنے کو باہر نکالتے ہوئے بھی شرما رہے ہیں۔''

''اجی چھوڑیں مرزا کو۔'' خالہ نے زچ ہو کر کہا ''آپ کل ہی جا کر بکرا خرید لائیں۔''

جب بچوں نے بھی زور و شور سے خالہ کی ہاں میں ہاں ملائی تو خالو بولے۔ ''ہاں بھئی، جس کے ہاتھ ڈوئی اس کا سب کوئی۔ ٹھیک ہے۔ آ جائے گا اپنا بکرا۔''

خالہ ڈرتے ڈرتے بولیں۔ ''میں کہہ رہی تھی کہ جاتے ہوئے۔ مرزا کو ضرور ساتھ لے جانا، سنا ہے بارہ سو میں مل گیا انہیں۔''

''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔'' خالو نے بگڑ کر کہا ''ارے بارہ سو میں تو اس مریل کے مقابلے میں کہیں توانا جانور مل جاتا ہے بس ذرا خریدنے کا سلیقہ ہونا چاہیے۔''

اس کے بعد خالو نے اپنے ہمسائے مرزا باقر کی نااہلی اور جانور کی خریداری پر ایک طویل لیکچر دیا۔ خالہ نے بے چینی سے پہلو بدل بدل کر خالو کی بات سنی اور جیسے ہی وہ دم لینے کو رکے انہیں پھر یاد دلایا کہ کل پرسوں تک بکرا لازمی خرید لائیں۔

ہمارے ہاں بقرعید کے لیے جانور کی خریداری بھی ایک پُرجوش تفریح سے کم نہیں۔ عید سے ہفتوں پہلے اس کی تیاری شروع کر دی جاتی ہے۔ کون سے جانور کا کیا ریٹ چل رہا ہے؟ شہر میں کس مقام پر اچھے جانور مل رہے ہیں؟ دوستوں، رشتہ داروں سے خوب مشاورت ہوتی ہے۔ ہمسایوں، قرابت داروں کے خریدے بکروں اور بچھڑوں کی چھان پھٹک ہوتی ہے تب جا کر خریداری کے دن کا تعین کیا جاتا ہے۔ خاص دوستوں کو شام ہی سے تاکید کر دی جاتی ہے کہ وہ اگلی صبح وقت مقرر پر پہنچ جائیں۔ ایک بزرگ رشتہ دار بھی نگرانی کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں جبکہ گھر کے بچوں میں سے بھی ایک آدھ کا ساتھ جانا ٹھہر جاتا ہے۔

خالہ نے بکرے کی خریداری کا کہا تو خالو نے بھی محلے میں سن گن لینا شروع کر دی۔ کون حصہ ڈال رہا ہے؟ کس کس نے بکرا خرید لیا ہے؟ کون خریداری کے لیے پر تول رہا ہے؟ کس نے کتنے میں بکرا خریدا؟ خالو نے حسبِ عادت ہر ایک کے جانور میں مین میخ نکالی اور دعویٰ کیا کہ جب وہ بکرا لائیں گے تو لوگ مہینوں یاد رکھیں گے۔

خیر بقرعید سے دو دن پہلے وہ روز سعید بھی آن پہنچا جب خالو کو بکرے کی خریداری کے لیے بکرا منڈی جانا تھا۔ اس دن صبح ہی سے گھر بھر میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ خالو نے صبح کی سیر سے واپس آتے ہی حجامت بنائی، صابن سے نہائے سر میں خوشبودار تیل ڈالا۔ اس دن کرتے کے نیچے بنیان کی جگہ شلوکا پہنا تاکہ خریداری کے ہنگام میں روپے محفوظ رہیں۔ خالہ نے گن کر پندرہ سو روپے خالو کو دیے جو انھوں نے رومال میں لپیٹ کر شلوکے کی جیب میں رکھ لیے۔

آرام سے ناشتا کیا اور پھر چائے کی پیالی لے کر بیٹھک میں چلے گئے جسے وہ دیوان خانہ کہا کرتے تھے۔ کچھ دیر آرام کرسی پر بیٹھ کر سوچ بچار میں وقت گزارا اور پھر اندرونی دروازے پر آ کر اعلان کیا کہ وہ بکرا منڈی جا رہے ہیں۔

خالہ نے بازو پر امام ضامن باندھا اور لین دین میں احتیاط برتنے کی ہدایت کی۔ خالو نے سب سے چھوٹے بیٹے للو کو ساتھ لیا اور گلی میں نکل آئے۔ گلی کی نکڑ پر ان کی مرزا صاحب سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے جو خالو کی تیاری دیکھی تو بھانپ گئے کہ بکرا منڈی کا ارادہ ہے۔ مرزا چاہتے تھے کہ خالو کے ہمرکاب ہو جائیں لیکن خالو کی یہ فطرت ہی نہیں تھی کہ خریداری کے موقع پر کسی دوست یا قرابت دار کو ساتھ لیا جائے وہ تن تنہا ہی یہ معرکہ سرانجام دینا چاہتے تھے۔ دونوں پڑوسیوں کی صاحب سلامت ہوئی تو مرزا بولے۔

''ہم تو آپ ہی کی طرف آ رہے تھے، اچھا ہوا یہاں ملاقات ہو گئی۔''

''سب خیریت تو ہے نا؟'' خالو نے چونک کر پوچھا۔

''یاد نہیں، چوہدری صاحب کے ہاں نیاز ہے۔'' مرزا نے جواب دیا ''آیئے دعا میں شریک ہو آئیں پھر ساتھ چلتے ہیں۔'' خالو نے بڑی مشکل سے مرزا سے پیچھا چھڑایا لیکن انہیں یہ یاد دلانا نہ بھولے کہ وہ شام کو گھر آ کر بکرا ضرور دیکھیں۔

''ہم نیاز سے فارغ ہو کر آتے ہیں منڈی کی طرف۔'' مرزا نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

''جہاں دیکھی تری وہیں بچھائی دری۔ سالا حلوائی کہیں کا، اپنے آپ کو طرم خان سمجھتا ہے۔'' خالو نے سر جھٹک کر مرزا کو کوسا اور منڈی کی راہ ہو لیے۔

اس زمانے میں شہر کی سب سے بڑی بکرا منڈی شہر کی مرکزی عیدگاہ کے قریب لگا کرتی تھی۔ شبن خالو منڈی جانے کے لیے جان بوجھ کر چوک سے گزرے تاکہ ہر کسی کو ان کے ارادے کی خبر ہو جائے اور ہوا بھی یہی۔ منڈی جانے والے راستے پر پیدل چلنے والوں کی ٹولیاں رواں دواں تھیں۔ لوگ باگ خوش گپیاں لگاتے جوش و خروش کے ساتھ بکرا منڈی کی طرف رواں دواں تھے۔ کالج روڈ سے پیدل مارچ کرتے ...... ہوئے وہ عیدگاہ کا موڑ مڑ کر بکرا منڈی پہنچ گئے۔ بکرا منڈی میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ بھانت بھانت کی بولیوں میں جانوروں کی آوازیں شامل ہو کر عجیب سا ماحول بنا ہوا تھا۔ ایک طرف بکرے، بھیڑیں اور دنبے جبکہ دوسرے کونے میں بڑے جانور جیسے اونٹ، گائے بیل وغیرہ فروخت کے لیے موجود تھے۔ منڈی میں پیدل چلنا دشوار تھا۔ ہر طرف جانور ہی جانور اور ان کی رسیاں تھامے مالکان، خریداروں کو لبھانے کے لیے طرح طرح کی آوازیں دے رہے تھے۔ فضا میں جانور، چارے اور گوبر کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جانوروں کے درمیان ہی کہیں کہیں شربت اور چاول چھولے والے بھی ریڑھیاں سجائے گاہکوں میں الجھے ہوئے تھے۔ منڈی کے ایک سرے پر خریداری کے بعد ایک بچھڑے کو لاری پر چڑھایا جا رہا تھا۔ ایک چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ دو نوجوان رسی تھامے بچھڑے کو لاری کی طرف ہانک رہے تھے۔ ایک بندہ لاری والے کو ہدایات دے رہا تھا۔ بزرگ رشتے دار نوجوانوں پر برس رہا تھا۔ کچھ بے فکرے گھیرا بنائے تماشا دیکھ رہے تھے۔ تماش بینوں میں سے بیشتر کی خواہش تھی کہ کاش بچھڑا رسی تڑا کر بھاگ جائے تو ایک مزیدار تماشہ دیکھنے کو ملے۔

خالو منڈی میں داخل ہوئے تو وہ ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔

ایک بچھڑا دولتیاں جھاڑتا ادھر سے ادھر پھلانگ رہا تھا۔ ہر طرف شور سا مچا ہوا تھا۔ کچھ لوگ بچھڑے کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ باقی جان بچا کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ خالو، جو منڈی میں انسانوں اور جانوروں کا بے ہنگم ہجوم دیکھ کر پہلے ہی حیران و پریشان تھے۔ انھوں نے وہاں کھلے میں بچھڑے کو دولتیاں جھاڑتے دیکھا تو بدحواس ہو گئے۔

ابھی اپنے بچاؤ کے لیے اِدھر اُدھر ہونے کا سوچ ہی رہے تھے کہ غصے میں بھرا بے قابو بچھڑا عین ان کے سامنے تھا۔ خالو کی تو جیسے سٹی گم ہو گئی۔ للو ہاتھ چھڑا کر ایک طرف بھاگ گیا جبکہ خالو اپنی جگہ جم سے گئے۔

''بڑے میاں، بچنا۔'' ایک آدمی کے چلّانے پر خالو ہوش میں آئے، انھوں نے ٹکر سے بچنے کے لیے جو طرح دے کر نکلنا چاہا تو پھسل کر گر پڑے۔ ٹکر سے تو بچ گئے لیکن دونوں ہاتھ کہنیوں تک قریب ہی تازہ گوبر پر جا پڑے۔ ہڑبڑا کر اٹھے اور بے خیالی میں ہاتھوں کو دامن سے پونچھ ڈالا۔

اسی ہڑبونگ میں عینک بھی زمین پر گر گئی۔ گوبر سے لتھڑے ہاتھ سے عینک اٹھا کر پہنی تو کچھ گوبر چہرے پر بھی لگ گیا۔ انھوں نے جیب سے رومال نکال کر منہ ہاتھ اور کپڑے صاف کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران بچھڑے کو لوگوں نے قابو کر لیا تھا۔ ہنگامہ کچھ سرد ہوا تو للو بھی ہجوم سے نکل کر خالو کے پاس پہنچ گیا اور ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ خالو کو اور کچھ تو نہ سوجھا جما کر ایک جھانپڑ بے چارے للو کو رسید کر دیا۔

''سالے بتیسی نکال رہا۔'' خالو غصے سے بے قابو ہو گئے اور للو کے ساتھ ساتھ وہاں موجود لوگوں کو بھی بے نقط سنانے لگے جن سے ایک بچھڑا نہیں سنبھالا گیا۔ بکرا منڈی میں یہ تماشا عام سی بات تھی۔ لوگوں نے کچھ دیر تک تو اس واقعے پر تبصرہ کیا پھر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ خالو نے ایک ریڑھی

والے سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھویا۔ کرتے اور پاجامے پر لگا گوبر رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ گوبر تو اتر گیا لیکن پیلا سا دھبا اور نمایاں ہو گیا۔ خالو نے گردن گھما گھما کر اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ دامن کی تو خیر تھی لیکن گھٹنوں کے درمیان جھولتی رومالی پر لگا پیلا سا داغ دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس سے آگے خالو کچھ نہ سوچ سکے۔ انھوں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بار تو جی آئی کہ بکرے کا خیال دل سے نکال کر واپس گھر چلے جائیں لیکن پھر مرزا کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا۔ مرزا کیا سارے محلے کو جتا کر آئے تھے کہ آج وہ ایسا جانور لائیں گے کہ لوگ اگلی عید تک اس کے قصے سناتے رہیں گے۔ اب واپس جاتے تو کس منہ سے جاتے۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا، خالو نے بڑبڑاتے ہوئے ایک طویل سانس لی اور للو کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئے۔

''شام کو گلی میں بکرے کو سیر کروانا۔'' خالو نے ایک ریڑھی والے سے قلفی خرید کو منہ بسورتے للو کو دی اور اسے چمکارا۔ ''اور دیکھ گھر جا کر زبان مت کھولیو۔''

اب خالو نے منڈی کا جائزہ لیا کہ کہاں پر اچھے جانور موجود تھے۔ چلتے چلتے ایک چتکبرے رنگ کے بکرے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی پسلیوں کو ٹٹولا اور قیمت پوچھی۔ بکرے کی رسی تھامے دیہاتی نے سر سے پیر تک خالو کو گھور کر دیکھا اور ایک شان بے نیازی سے بولا۔

''دو ہزار۔''

''کیا کہا؟'' خالو کو قیمت سن کر جھٹکا سا لگا۔ ''ارے بھائی بکرے کی قیمت پوچھی ہے بیل کی نہیں۔''

''بڑے صاحب بکرے کا قد اور وزن بھی تو دیکھو۔'' دیہاتی نے جواب دیا ''اس کے ساتھ کے جانور یہاں تین تین ہزار میں بک رہے ہیں۔''

''ہمیں نہیں خریدنا اتنے میں۔''

''خیر آپ سو کم دے دیجیے گا۔'' دیہاتی نے گاہک ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ہانک لگائی۔ خالو نے سنی ان سنی کر دی اور جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ''چلیں آپ کے لیے سترہ سو۔'' دیہاتی نے لپک کر خالو کو جا لیا اور بھاؤ تاؤ کرنے لگا۔ خالو نے ایک بار پھر بکرے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ بکرا واقعی صحت مند اور قد آور تھا۔ اگر خالو مول تول کرتے تو ممکن تھا کہ پندرہ سو میں سودا پٹ جاتا۔

''دیکھ بھائی۔'' خالو نے دیہاتی کو نظروں میں تولا اور بولے۔ ''پورے ایک ہزار دیں گے گن کر۔''

خالو کی پیش کش سن کر دیہاتی نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔ ''دیکھیے صاحب آپ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں، کہاں پوری منڈی میں خوار ہوں گے لائیے پندرہ سو دیجیے اور بکرا لے جائیے۔'' قیمت مناسب تھی لیکن خالو کے مزاج کا اختلاف عود کر آیا اور بے اعتنائی سے بولے۔

''بارہ سو میں سودا کرتے ہو تو ٹھیک ورنہ ہم چلے۔''

دیہاتی نہ مانا اور یوں خالو آگے بڑھ گئے۔ اگلے تین چار گھنٹے میں خالو نے چھ سات بکرے دیکھ ڈالے لیکن قیمت نہ ٹھہر سکی۔ حقیقت یہ تھی کہ خالو کے دماغ میں وہی چتکبرا بکرا سمایا ہوا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے جو بھی جانور دیکھا یا تو اس کی قیمت زیادہ تھی یا پھر وہ چتکبرے کے مقابلے میں کمزور تھا۔ کچھ سوچ کر خالو واپس پلٹے کہ چلو چودہ سو کہہ کر دیکھتے ہیں۔ اگر مان گیا تو ٹھیک ورنہ پندرہ سو دے کر بکرا خرید لیں گے۔ واپس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں وہی دیہاتی زمین پر اکڑوں بیٹھا نوٹ گن رہا تھا۔

''کیوں بڑے میاں، اب تک خالی ہاتھ گھوم رہے ہو۔'' دیہاتی نے طنزیہ لہجے میں کہا ''پندرہ سو دیتے تو کیا جاتا تمہارا؟ میں نے سولہ سو میں بیچ دیا۔''

خالو کو افسوس تو بہت ہوا لیکن چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور دیہاتی کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئے۔ اب سورج ڈھل رہا تھا۔ تاہم منڈی میں ابھی بھی دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔

خالو کو اُمید تھی کہ شام سے پہلے پہلے انہیں مناسب جانور مل جائے گا۔ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ اب کس سمت میں آگے بڑھیں کہ انہیں محسوس ہوا جیسے کوئی ان کے پیچھے کھڑا اُکھسر پھسر کر رہا ہے۔ گردن گھما کر جو دیکھا تو ایک بکرے کو اپنی رومالی سونگھتے ہوئے پایا۔ خالو ایک جھٹکے سے پیچھے مڑے اور بکرے کو گھور کر دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو بکرے نے شرما کر تھوتھنی اوپر اٹھائی اور دانت نکوسنے لگا۔

''لاحول ولا قوۃ۔'' خالو نے بلند آواز سے لاحول پڑھی اور چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''بڑے میاں خریدو گے؟'' بکرے کے بوڑھے مالک نے خالو سے پوچھا۔

''کبھی بھی نہیں۔'' خالو نے غصے سے جواب دیا۔ ''اس نانہجار بکرے کو تو ہم مفت میں بھی نہ لیں۔''

خالو نے للو کو ساتھ لیا اور آگے بڑھ گئے۔ ابھی کچھ

دور ہی گئے تھے کہ ان کی نظر ایک گدھا گاڑی پر پڑی۔ گاہکوں کی بھیڑ سے کچھ فاصلے پر موجود گدھے کے بغیر خالی گاڑی کا پچھلا حصہ زمین پر لگا تھا اور دونوں اگلے بمبوؤں کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ خالو کی دلچسپی کا باعث وہ آدمی تھا جو ایک صحت مند سفید بکرے کی رسی تھامے ریڑھی کے نیچے سائے میں بیٹھا تھا۔ دوسرے لوگوں کی نسبت یہ واحد بندہ تھا جو گاہکوں کو اپنی طرف بلانے کی بجائے چپ چاپ سر گھٹنوں میں دیے اداس بیٹھا تھا۔ خالو نے قریب جا کر کچھ دیر تک اس آدمی اور بکرے دونوں کا جائزہ لیا۔ بکرے کے سفید جسم پر مہندی سے خوبصورت دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ بکرا قد اور وزن میں مناسب تھا۔ تاہم ابھی یہ طے نہیں تھا کہ یہ برائے فروخت ہے بھی یا نہیں۔ خالو کو گھورتے دیکھ کر آدمی نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''کیوں بھائی، کیا گدھے کی جگہ گاڑی میں بکرے کو جوتنے کا ارادہ ہے؟'' خالو نے ریڑھی والے سے مسکرا کر پوچھا۔

''کیوں غریب کا مذاق اڑاتے ہو صاحب؟'' آدمی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا ''کاش میں اسے ریڑھی میں جوت سکتا۔''

''کیا مطلب؟'' خالو نے چونک کر پوچھا ''تمہارا گدھا کہاں ہے؟''

''گدھے کی بات چھوڑیں بڑے صاحب۔'' آدمی نے جواب دیا ''آپ نے بکرا خریدنا ہے تو بات کریں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' خالو نے جلدی سے کہا اور بکرے کو نظروں ہی نظروں میں تولنے لگے۔ اس کی پیٹھ تھپتھپائی، پسلیوں کو جانچا، گردن پر ہاتھ پھیرا اور تھوتھنی کھول کر دانت چیک کیے۔ ''دام بولو؟''

''آپ اٹھارہ سو دے دیں'' آدمی نے جواب دیا۔

خالو کی جان میں جان آئی۔ یہ بکرا پہلے والے چتکبرے سے زیادہ خوبصورت اور صحت مند تھا۔ چار پانچ گھنٹے منڈی میں خوار ہونے کے بعد خالو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ آدمی بکرے کی انتہائی مناسب قیمت مانگ رہا ہے۔ انھوں نے سوچا آدمی بیوقوف لگتا ہے نہ جانے بے چارے کے ساتھ کیا واقعہ پیش آ گیا ہے جو یوں اداس بیٹھا ہے۔ خالو نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس سودے کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ خالو نے بے پروائی سے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے انہیں بکرے سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو۔

''دیکھو بھائی ایک ہی بات کریں گے۔'' خالو نے سپاٹ لہجے میں پیش کش کی۔ ''پورے تیرہ سو میں دینا ہے تو دے دو؟''

''آپ سولہ سو دے دیں۔'' آدمی نے منت آمیز لہجے میں کہا۔

''چلو تمہارے لیے پندرہ سو۔'' خالو نے آدمی کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا ''اس سے اوپر ایک کوڑی نہیں۔''

''ٹھیک ہے صاحب۔'' آدمی نے مایوسی سے سر ہلایا ''پندرہ سو میں بکرا آپ کا ہوا، لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' خالو نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے اپنے بکرے کے بدلے پیسے نہیں بلکہ گدھا چاہیے۔''

''عجیب آدمی ہو۔'' خالو نے خفگی سے کہا ''ہم کہاں سے گدھا لا کر دیں؟ تم پیسے لے لو اور جا کر گدھا خرید لو۔''

''صاحب میں دیہاڑی دار آدمی ہوں، دو دن پہلے میرا گدھا مر گیا اور گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔'' آدمی نے غمگین لہجے میں کہا ''اب نیا گدھا دو سے تین ہزار سے میں ملتا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

''تو تم نے سودا کیوں طے کیا؟'' خالو نے غصے سے پوچھا ''آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں آپ کو پوری بات سمجھاتا ہوں۔'' آدمی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا ''دراصل منڈی کے دروازے کے پاس ایک آدمی اپنا گدھا فروخت کر رہا ہے، لیکن وہ دو ہزار سے کم پر نہیں مان رہا۔ آپ بات کریں گے تو شائد آپ کو قیمت کم کر دے۔'' آدمی نے ایک طویل سانس خارج کی اور بولا ''آپ وہ گدھا خرید کر مجھے لا دیں اور بکرا لے جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو سو پچاس اور بچ جائیں۔''

''جب تمہیں دو ہزار کا دے رہا ہے تو ہمارے ساتھ رعایت کیوں کرے گا؟'' خالو نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ کوشش کر کے دیکھ لیں، اگر بات بن جائے تو ٹھیک ورنہ میں تو گدھے کے بغیر سودا نہیں کروں گا۔'' آدمی نے حتمی لہجے میں جواب دیا اور سر جھکا لیا۔

خالو نے بے بسی سے بکرے کو دیکھا۔ سجا سنورا صحت مند بکرا کسی بھی طور دو ہزار سے کم کا نہیں تھا اور یہ بیوقوف

آدمی اسے پندرہ سو میں دینے کو تیار تھا لیکن پیسے کے بدلے گدھا چاہتا تھا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ خالو مایوسی سے ہاتھ ملتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی نظروں کے سامنے ایک بار پھر مرزا کا چہرہ گھوم گیا۔ اگر خالی ہاتھ گیا تو مرزا کو خوب بھد اڑانے کا موقع ملے گا اور اگر پندرہ سو میں کوئی اور بکرا ہاتھ آیا بھی تو وہ مرزا کے میمنے سے بڑھ کر کیا ہوگا؟

''ٹھیک ہے بھائی۔'' خالو نے ایک عزم کے ساتھ آدمی کی طرف دیکھا ''تم کہتے ہو تو ہم ایک کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔''

''میری اس گدھے والے سے کافی منہ ماری ہوگئی ہے اب وہ مجھے تو گدھا نہیں بیچے گا۔'' آدمی نے کہا ''اگر آپ کا سودا ہو جائے تو گدھا لے آیئے گا۔ آپ کی امانت سنبھالے میں ادھر ہی گاڑی کے نیچے بیٹھا ہوں۔''

خالو نے للو کو ساتھ لیا اور گدھے والے کی طرف چل دیے۔ آگے ایک موڑ گھوم کر انہیں ایک درخت کے ساتھ بندھا گدھا دکھائی دے گیا جس کے قریب ایک مدقوق سا دیہاتی زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ خالو اس کے قریب پہنچے اور تمہید میں وقت ضائع کرنے کی بجائے سیدھے سپاٹ بولے۔

''کیوں بھئی گدھا بیچنا ہے؟''

دیہاتی نے اوپر سے نیچے تک خالو کو گھور کر دیکھا اور پوچھا ''آپ گدھے کا کیا کریں گے؟''

''اچار ڈالیں گے اور کیا کریں گے۔'' خالو نے بھنّا کر کہا ''تمھیں بیچنا ہے تو سیدھی بات کرو؟''

''ٹھیک ہے دو ہزار دے دیں۔''

''نہیں بھئی۔'' خالو نے دو ٹوک لہجے میں کہا ''کمزور سا گدھا ہے۔ بارہ سو ٹھیک رہیں گے اس کے۔''

''چلیے آپ کے لیے سترہ سو۔''

خالو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، انہیں لگا سودا ہو جائے گا۔ ایک طویل سانس لے کر بولے۔ ''چودہ سو نقد دینگے، اگر ٹھیک لگے تو بولو ورنہ ہم چلتے ہیں۔''

''نکالیے چودہ سو۔'' گدھے والے نے جلدی سے کہا ''ویسے تو یہ گدھا اٹھارہ سے کم کا نہیں ہے لیکن شام ہونے کو آئی ہے بال بچے راہ دیکھ رہے ہوں گے، مجھے بہت دور جانا ہے۔''

خالو ایک لمحے کو ہچکچائے۔ ان کی سات پشتوں میں کبھی کسی نے گدھا نہیں خریدا تھا۔ تاہم اب انہیں یہ کڑوا گھونٹ نگلنا ہی تھا۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی واقف کار تو نہیں دیکھ رہا۔ پھر شلوکے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے گن کر چودہ سو روپے دیہاتی کے سپرد کیے جس نے جلدی جلدی گدھے کی لگام کھول کر خالو کی طرف بڑھا دی۔ خالو بدک کر دو قدم پیچھے ہٹے اور تھوک نگل کر منت آمیز لہجے میں بولے۔

''وہ دراصل ہمیں کسی اور کے لیے گدھا خریدنا ہے۔ کیا تم۔ اسے لے کر ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے؟''

''بڑے صاحب، مجھے بہت دور جانا ہے میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ گدھا لیے آپ کے ساتھ چلتا رہوں۔'' دیہاتی نے خفگی سے کہا اور لگام خالو کے ہاتھ تھما کر وہاں سے چل دیا۔

خالو نے ایک طویل سانس لی اور گدھے کو پیار سے پچکارتے ہوئے لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ گدھے نے فرما برداری سے گردن ہلائی اور خالو کے ساتھ چلنے پر تیار ہوگیا۔

خالو ایک ہاتھ سے للو اور دوسرے ہاتھ سے لگام تھامے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے بکرے والے آدمی کی جانب چل پڑے۔ واپسی کا موڑ گھوم کر پہلے والی جگہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گدھا گاڑی اپنی جگہ موجود تھی لیکن وہاں موجود آدمی بکرے سمیت غائب تھا۔ خالو نے گدھے کو گاڑی کے پہیے کے ساتھ باندھا اور بے چینی سے پہلو بدل بدل کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ شاید کسی کام سے گیا ہو اور واپس آجائے۔ ایک گھنٹا دو گھنٹا دھیرے دھیرے گزرتے وقت کے ساتھ خالو کی بے چینی گھبراہٹ میں تبدیل ہونے لگی۔ آخر کار للو کو وہیں گدھے کی نگرانی پر چھوڑا اور خود بکرے والے کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر گھومنے لگے۔ ایک دو سے پوچھا بھی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ تیز تیز چلتے ہوئے گدھے والے کی طرف گئے لیکن وہ بھی غائب۔ خالو کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ سمجھ گئے کہ معصوم دکھائی دینے والے دونوں دیہاتی دراصل ٹھگ تھے جو انہیں چونا لگا گئے۔ کچھ دیر تک وہیں بیٹھ کر سانس درست کی اور تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹ کر للو کے پاس پہنچ گئے۔ خونخوار نظروں سے گدھے کو گھور کر دیکھا جو گاڑی کے پہیے کے ساتھ بندھا بے پروائی سے آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ اب شام ہونے کو آئی تھی لیکن منڈی میں گاہکوں کے رش کا وہی عالم تھا۔ تھکن بھوک اور صدمے سے خالو کا برا حال تھا۔ انھوں

نے ایک پھل والے سے اپنے اور للو کے لیے کیلے خریدے۔ کیلے کھالیے اور چھلکے گدھے کے آگے پھینک دیے جو وہ شوق سے کھانے لگا۔ وہ دونوں ٹھگوں کو کوستے ہوئے وہیں گدھے کے پاس زمین پر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کریں؟ عجیب صورتِ حال تھی کہ کھایا پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا بارہ آنے۔

خالو کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ بھلے خسارے میں سہی ادھر منڈی میں ہی گدھے کو بیچ ڈالیں لیکن گاہک کیسے تلاش کریں؟ کیسے آواز دیں؟ کیا بولیں؟ انھوں نے کبھی کوئی چیز بیچی نہیں تھی اور یہ تو پھر ایک جیتا جاگتا گدھا تھا۔ اسی کشمکش میں سورج غروب ہوگیا۔ خالو نے تصور کی آنکھ سے محلے داروں کو دیکھا جو ان کے گھر کے باہر بندھے گدھے کی بابت طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ ان سب میں مرزا کا چہرہ اور اس پر موجود طنزیہ سی ہنسی سب سے نمایاں تھی۔ مرزا جائیں بھاڑ کی بھٹی میں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ خالو نے سوچ لیا کہ چودہ سو کا گدھا یونہی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ گدھے کو گھر لے جائیں گے اور پھر کل سوچیں گے کہ اس کا کیا کرنا ہے؟

ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاہم ابھی انھوں نے گدھے کی لگام کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک آدمی کو سر پر سبز چارے کا گھٹا اٹھائے اپنے قریب آتے دیکھا۔ آدمی تیز تیز قدم اٹھاتا گدھا گاڑی کے قریب پہنچا۔ چارا زمین پر پٹخا اور گدھے کو پیار سے پچکارنے لگا۔ گدھے نے بھی یوں گردن ہلائی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ خالو بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹے اور تھوک نگل کر ڈرتے ڈرتے آدمی سے پوچھا۔

''بھائی صاحب، کیا یہ آپ کی گدھا گاڑی ہے؟''

''ہاں جی بزرگو۔'' آدمی نے اثبات میں گردن ہلائی اور پیار سے گدھے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

''وہ دراصل!'' خالو نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

''بڑا شیطان ہے جی'' آدمی نے گدھے کو پیار سے ریڑھی کی طرف ہنکارتے ہوئے خالو کی بات کاٹ کر کہا ''میں تو سوچ رہا تھا کہ روز کی طرح اس خبیث نے رسی تڑالی ہوگی اور پھر رہا ہوگا کہیں آوارہ۔''

''آوارہ ہی پھر رہا تھا۔'' خالو نے تاسف بھری ٹھنڈی سانس بھری اور دھیرے سے بولے ''ہم پکڑ کر لائے ہیں۔''

خالو، گدھا گاڑی سے کچھ فاصلے پر چپ چاپ کھڑے گدھے کو ریڑھی میں جُتا دیکھتے رہے۔ کیا یہ آدمی بھی ان دونوں ٹھگوں کے ساتھ ملا ہوا تھا؟ ہوسکتا ہے ملا ہوا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے پورے واقعے کی خبر تک نہ ہو۔ خالو نے سوچا مزید اپنا تماشا بنانے سے بہتر ہے کہ گھر کی راہ لیں۔ انھوں نے للو کا ہاتھ پکڑا اور سر جھکائے منڈی سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیے۔ گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں مرزا اپنے پورے خاندان سمیت وہاں براجمان ہے۔

''سالا مردود!'' خالو بڑبڑائے۔ ''پورا تماشا دیکھ کر ہی جائے گا۔''

''آگئے بھائی صاحب'' خالو پر نظر پڑتے ہی مرزا بے چین ہو کر اٹھے اور سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ ''کہاں ہے بکرا؟ کتنے میں لیا؟ اور یہ کیا ہوا آپ کہیں گر تو نہیں گئے؟ چوٹ تو نہیں لگی؟ خالو نے بڑی مشکل سے مرزا کو ٹالا۔''

ان کی تان اس بات پر ٹوٹی کہ مہنگے اور کمزور جانور خریدنے سے بہتر ہے کہ گائے میں حصہ ڈالا جائے۔ اس دوران للو کو پلو سے باندھ کر بیٹھے رہے کہ کہیں وہ منہ نہ کھول دے۔ مرزا کے رخصت ہوتے ہی للو نے ہاتھ چھڑایا اور چہک کر بولا۔

''ابا میاں نے گدھا خریدا ہے۔ ہم صبح اس کی سواری کریں گے۔''

خالو نے لپک کر للو کا کان پکڑ لیا اور اسے مروڑتے ہوئے بولے ''سالے بکواس کرتا ہے، آموختہ یاد ہوتا نہیں اور چلا ہے گدھے کی سواری کرنے۔''

اس سے پہلے کہ خالہ کچھ سمجھتیں خالو لپک کر بیٹھک میں گھس گئے اور اندر سے کنڈی لگالی۔ خالہ نے پیار سے للو کو پچکارا تو اس نے منہ بسورتے ہوئے ساری داستان بیان کر ڈالی۔

خالہ نے سر پیٹ لیا۔ کچھ دیر بعد خالو بیٹھک سے باہر نکلے تو خالہ بھری بیٹھی تھیں۔ خالو نے انہیں کیا کہا سنا کچھ پتا نہیں بس اتنا معلوم ہے کہ پھر دونوں میں خوب جم کر لڑائی ہوئی۔

''زیادہ مزاج دکھانے کی ضرورت نہیں ہم کو۔'' خالو نے بھنّا کر کہا ''ارے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے، ٹھگ بھرے ہوئے ہیں منڈیوں میں، مگر تمہارے جیسی کوڑھ مغز کو یہ بات کون سمجھائے؟'' لیجیے خالو نے بات ہی ختم کردی اور اس کے ساتھ ہی یہ قصہ تمام ہوا۔

صبر کا پھل

مکرمی مدیراعلیٰ
السلام علیکم
یہ روداد آصفہ مظہر کی ہے، اس نے مشرقی تہذیب کی سچی تصویر کشی کی ہے، خود کو اچھی لڑکی ثابت کرنے کے لیے کیا جتن نہ کیے، اس کی اسی خوبی نے اسے ممتاز بنایا، اگر یہ خوبی ہماری دیگر بہنیں بھی اپنا لیں تو ہمارا معاشرہ جو بگاڑ کی طرف بڑھ رہا ہے، بالکل صحیح سمت گامزن ہو جائے گا اور جس طرح آصفہ مظہر کی زندگی سنور گئی اسی طرح ہر ایک کی زندگی مثالی ہو جائے گی۔

افسانہ آفتاب کاوش
(اورنگی،کراچی)

"میں ایک اچھی لڑکی ہوں۔" اس ایک جملے نے میری زندگی سنوار دی۔ جب میں اسکول میں پڑھتی تو فری پیریڈ میں بار بار رف کاپی پر ایک ہی جملہ لکھتی "میں ایک اچھی لڑکی ہوں۔" آپ لوگ بھی کیا سوچ رہے ہوں گے کہ میں کتنی خود پسند ہوں جو اپنی تعریف خود کر رہی ہوں، تو میں آپ کو بتاؤں کہ میں خود پسند نہیں بلکہ واقعی اچھی لڑکی ہوں۔ آپ لوگ ضرور جاننا چاہیں گے کہ کیسے تو اس کے لیے آپ لوگوں کو میری کہانی سننی پڑے گی۔

میرا نام آصفہ مظہر ہے۔ میں نے ایک مڈل کلاس گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میں جب اسکول جایا کرتی تو باقاعدگی سے ہوم ورک کیا کرتی، بے حد محنت و لگن کے ساتھ پڑھتی اور ہر سال اپنی کلاس میں پوزیشن لیتی، میری ہر کامیابی مجھے مہمیز کرتی اور پھر میں کامیاب ہوتی چلی گئی۔

اسکول ختم ہو گیا۔ میں کالج جانے لگی۔ میں اب بھی اسی محنت و لگن سے پڑھتی پھر ایک دن میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی، یوں سمجھ لیں فرسٹ سائٹ لو کا شکار ہو گئی۔ میں اسے بے حد چاہنے لگی۔ خود سے بھی زیادہ۔ میں جانتی تھی کہ میرے گھر والے اس کے لیے کبھی نہیں مانیں گے۔ دل نے کہا اپنی دل کی سنو، پر دماغ نے کہا، تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ ایک اچھی لڑکی اپنے والدین کا غرور ہوتی ہے۔ پھر میں کیسے اپنے والدین کا سر جھکاتی۔ میں نے اپنے ارمانوں کا خون کر ڈالا لیکن ان کا غرور ان کا مان پاش پاش ہونے نہیں دیا۔ اچھی لڑکیاں چراغوں کی مانند ہوتی ہیں، جن کا کام خود کو جلا کر دوسروں کو روشنی فراہم کرنا ہوتا ہے۔ میں سمیر سے بے حد محبت کرتی، ہاں بے حد محبت، میں اعتراف کرتی ہوں اپنی محبت کا اور مجھے پتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے مگر مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں اس کا ذکر اپنے گھر والوں کے سامنے کرتی اور یہی کمزوری مجھے میرے خوابوں سے دور کرتی چلی گئی۔

میں ٹھہری ہمیشہ سے بزدل، ڈرپوک، کم ہمت، یہی خوبیاں کمزوری بھی ہوتی ہیں۔ میں گھر والوں کی بچپن سے ہر بات مانتی چلی آ رہی تھی۔ اپنی بات منوانا، اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا، غلط کو غلط کہنا، میں نے سیکھا ہی نہیں۔ سمیر اور میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے، سمیر مجھ سے بات نہیں کرتا مگر مجھے اس کا اپنے آس، پاس رہنا اچھا لگتا۔ وہ اکثر میرے لیے چیزیں لے کر آتا اور بریک میں چپکے سے مجھے دے جاتا اور میں اسے دیکھتی رہ جاتی۔ حالانکہ امی نے مجھے سمجھایا کہ کسی سے کوئی چیز مت لینا مگر وہ کوئی اور نہیں۔ وہ تو سمیر تھا، میرا اپنا جسے دیکھ کر ہی مجھے سکون ملتا تھا پھر سمیر کے ابو کا ٹرانسفر دوسرے شہر ہو گیا تو وہ لوگ چلے گئے۔

سمیر نے جاتے ہوئے بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں اس کی جانب سے منتظر ہی رہی کہ شاید وہ مجھ سے کچھ کہے۔ کوئی پیار بھرا جملہ، جیسے ناولوں میں ہیرو، ہیروئن سے کہتا ہے مگر وہ خاموشی سے چلا گیا اپنی پوری فیملی سمیت۔

حقیقی زندگی قصوں، کہانیوں سے جدا بے حد الگ ہوتی ہے۔ مختلف رنگوں سے سجی ہوتی ہے۔ میں بھی زندگی کے مختلف رنگوں کو دیکھتی رہی۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے۔ ایاز بھائی کی شادی ہو چکی تھی اور شرجیل بھائی کے لیے ہم لوگ ان دنوں لڑکی کی تلاش میں مصروف تھے۔ بالآخر کافی چھان پھٹک کے بعد امی کی منظور نظر ان کی اپنی بھتیجی ٹھہری۔

ایمن مجھے بھی بے حد پسند تھی۔ ہم دونوں میں دوستی بھی تھی۔ میں اکثر چھٹیوں میں ماموں کے گھر جایا کرتی۔ ہم دونوں اکٹھے کھیلتے، ایمن ہمارے گھر بڑے چاؤ کے ساتھ بیاہ کر آئی۔ شروع شروع میں تو سب ٹھیک رہا پھر نہ جانے انہیں کیا ہو گیا کہ ان کا رویہ سب سے برا ہوتا چلا گیا۔ وہ بات بات پر ہم سے لڑتیں۔ جھگڑا کیا کرتیں۔ اپنے حصے کا کام بھی ڈھنگ سے کرنا یاد نہیں رہتا۔ میں ڈرپوک ان کے غصے سے خائف ہو کر خود ہی ان کے حصے کا کام بھی کر دیا کرتی۔

بڑے بھائی کے دو بچے تھے۔ میں ان بچوں سے بہت محبت کرتی۔ وہ بچے بھی میرے ساتھ خوش رہتے۔ میں ان کا دھیان بھی تو رکھتی تھی۔ یونیورسٹی سے واپسی میں اکثر ان کے لیے چاکلیٹس لے کر آتی۔ میں نوٹ کر رہی تھی کہ اب بچے میرے پاس نہیں آتے اگر آتے بھی ہیں تو بھابی انہیں ڈانٹ کر اپنے کمرے میں جانے کو کہتیں اور میں انہیں خاموش نظروں سے دیکھتی رہ جاتی۔ مجھے لڑنا، جھگڑنا نہیں آتا اس لیے میں خاموش ہو جایا کرتی، بڑی بھابی تیسری مرتبہ اُمید سے ہوئیں تو طبیعت کے باعث وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتیں۔ وہ بھی معمول کے کام وقت پر نہیں کر پا رہی تھیں۔ اس طرح گھر کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا کیونکہ نزہت بھابی ہی دوپہر کا کھانا اور رات کا سالن بنایا کرتی تھیں۔ چھوٹی بھابی صبح کا ناشتا بناتیں اور میں رات کی روٹی بناتی۔ دوپہر اور رات کے برتن دھوتی۔ رات کے برتن دھونے کے بعد صبح کے لیے آٹا گوندھ کے رکھ دیتی تاکہ صبح ایمن بھابی کو ناشتا بنانے میں آسانی ہو جائے لیکن پھر بھی وہ اکثر دیر سے اٹھتی تھیں۔ میں ہی جلدی جلدی ناشتا بنا دیتی۔ حالانکہ مجھے خود بھی یونیورسٹی جانا ہوتا تھا لیکن ڈرتی کہ گھر میں کوئی فساد برپا نہ ہو جائے پھر بھی بھابی کو لگتا کہ میں ان کے کام میں ٹانگ اڑا رہی ہوں اور بقول ان کے مجھے تو دوسروں کا کام کر کے اپنا نمبر بڑھانے کا شوق ہے، وغیرہ وغیرہ۔ امی مجھ سے کہتی کہ تم جہاں غلط ہو وہاں بولا کرو مگر میں انہیں بھی سمجھا دیتی کہ کیا فائدہ گھر کا ماحول فضول میں خراب ہوگا۔ ویسے بھی بڑے بھائی جس کمپنی میں جاب کرتے تھے وہ کمپنی اچانک بند ہو گئی۔ سارے ورکرز نے مل کر کمپنی مالکان کے خلاف چار ماہ کی تنخواہ نہ دینے کے عوض کیس دائر کر دیا۔ بھابی کی ڈلیوری کے دن بھی نزدیک آ رہے تھے۔ ٹینشن کی وجہ سے اکثر بھائی کا موڈ خراب رہتا۔ بعض اوقات تو وہ ابو سے بھی الجھ پڑتے۔ بھابی کا میکہ بھی کوئی خاص اسٹرونگ نہیں تھا کہ وہ لوگ بھائی کو سپورٹ کریں، بچوں کے خرچے، گھر کے اخراجات نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ ابو جاب نہیں کرتے تھے۔ ان کی ماہانہ پینشن سے امی کی میڈیسن آتی اور وہ تھوڑے پیسے میرے لیے جوڑتے تاکہ میری شادی آسانی سے ہو جائے۔ وہ میرا بوجھ خود اٹھانا چاہتے تھے۔

شرجیل بھائی کی تنخواہ زیادہ نہیں تھی۔ وہ جو کماتے بیوی پر خرچ کرتے اور بقیہ پیسے Save کرتے۔ ان کے ذمے صرف مہینے کا راشن ڈلوانا تھا۔ مہینے میں پانچ، چھ ہزار کا راشن لا کر وہ اپنا فرض پورا کر دیا کرتے اور کمرے میں بند ہو کر خوب



دعوتیں اڑایا کرتے۔ اکثر وہ بھابی کے لیے کھانا باہر سے لایا کرتے، چاہے گھر والے روکھا، پھیکا ہی کیوں نہ کھائیں۔ میں رات کا کھانا امی ابو کو جلدی کھلا دیتی، کھانے کے بعد وہ لوگ اپنے کمرے میں چائے پیتے۔ بھائیوں کی شادیوں سے پہلے ہم سب اکٹھے ہی کھانا کھاتے اور چائے پیتے لیکن شادی کے بعد سب اپنے روم میں کھانا کھانے لگے۔

وقت اور حالات کتنی جلدی بدل جاتے ہیں بلکہ انسان خود بدل جاتا ہے۔ ان کے رویئوں میں بھی تغیر آجاتا ہے۔ شرجیل بھائی کو اکثر میں دیکھتی کہ وہ شاپر میں کچھ لے کر آتے ہیں مگر میں دیکھ کر بھی انجان بن جاتی جیسے کہ میں نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔ ایمن بھابی دوپہر کے کھانے کے بعد جو اپنے روم میں جاتیں تو دوسری صبح ہی ان کی صورت ہمیں دیکھنے کو ملتی۔ شرجیل بھائی ہی فریش ہونے کے بعد کچن میں کھانا لینے آجاتے اور میں خاموشی سے انہیں ٹرے میں کھانا سجا کر دے دیتی پھر چائے بناتی۔ وہ برتن رکھنے آتے تو چائے لے جاتے۔ وہ مجھ سے برائے نام بات کرتے۔ نجانے انہیں بھابی نے میرے خلاف کیا پٹی پڑھائی تھی۔ شرجیل بھائی کی آدھی سیلری بھابی کے علاج میں صرف ہو جاتی کیونکہ وہ لوگ دو سال بعد بھی اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ وہ بڑے بھابی کے بچوں سے حسد کیا کرتیں۔ بچے ان کے کمرے میں چلے جاتے تو وہ انہیں فوراً بھگا دیتیں اور میں اگر انہیں جاتا دیکھ لیتی تو انہیں منع کر دیتی کہ چچی جان آرام کر رہی ہیں۔

نزہت بھابی کو اللہ نے تیسری بار بھی ایک چاند سا بیٹا دیا۔ ایاز بھائی نے بڑی محنت سے دوسری جاب حاصل کی۔ گھر کا ماحول کچھ بہتر ہوا۔ بلال کو امی سنبھالتیں اور بھابی معمول کے کاموں میں حصہ لینے لگیں۔ دیورانی، جٹھانی میں بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک گھر میں ایک ساتھ رہنے کے باوجود دلوں میں بے حد دوریاں تھیں۔ ایاز بھائی کے حالات قدرے بہتر ہوئے تو بھابی نے ان سے الگ رہنے پر زور دینا شروع کر دیا۔ وہ ایمن بھابی کی کام چور عادت سے بدظن ہو چکی تھیں۔ آپس میں دونوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کئی مرتبہ لڑائیاں بھی ہو چکی تھیں۔ ایمن بھابی کو بھابی کے بچے زہر لگتے۔ وہ باہر صحن میں بھی کھیلتے یا شور مچاتے تو انہیں برا لگتا۔ جن کی خود کی اولاد نہ ہو انہیں دوسروں کی اولاد کہاں اچھی لگتی ہے؟

نزہت بھابی صفائی پسند تھیں۔ جب وہ دوپہر کا کھانا بنانے آتیں تو کچن اپنے حالتِ زار پر ماتم کناں ہوتا کیونکہ رات کو تو میں کچن سمیٹ دیتی تھی مگر صبح ناشتے کے بعد کی صفائی ایمن بھابی کی ذمہ داری تھی اور وہ سدا کی بے پرواہ، انہیں پرواہی کب تھی کسی کی۔ وہ اپنی ذات میں مست ملنگ رہنے والی، انہیں صرف اپنے میاں سے مطلب تھا ان ہی کی فکر رہتی۔ ایک بار ہاشم، بھابی کے پانچ سالہ بیٹے نے ان کے کمرے میں رکھے گلدان کو توڑ دیا تو انہوں نے گھر میں خوب آفت مچائی اور معصوم بچے کو مارا بھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں اپنے روم میں پڑھ رہی تھی کہ ہاشم روتا ہوا میرے پاس آگیا، کہا کہ چچی نے مارا ہے۔ میں نے اسے بڑی مشکلوں سے چپ کروایا اور باتوں باتوں میں بچہ بھول بھال گیا۔ بھابی بھائی کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں ورنہ ایک معرکہ اور ہوتا ابو، امی خاموش تماشائی کی مانند سب کچھ دیکھتے رہتے۔ بھابیوں کی حرکتوں پر کڑھتے رہتے۔ ان ہی دنوں ابو کے قریبی دوست کے بیٹے کا میرے لیے رشتہ آگیا۔ لڑکا بینک میں جاب کرتا تھا اور شام میں اپنے ذاتی کوچنگ میں پڑھاتا تا۔ میرے فائنل سیمسٹر شروع ہوگئے۔ میں نے خوب محنت کی کیونکہ یونی ورسٹی کا میرا آخری سال تھا۔ میں چاہتی تھی میرا رزلٹ اچھا آئے۔ میں آخری پیپر دے کر گھر آئی تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ تھکن اور بھوک سے میرا برا حال، فریش ہونے کے بعد میں ڈرائنگ روم میں گئی۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد امی نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا تو میں اٹھ کر کچن میں آگئی اور کھانا نکال کر کچن میں لگے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ آج بھابی نے میرے پسندیدہ مٹر چاول اور چکن آلو بنائے تھے۔ ساتھ میں رائیتے اور سلاد نے میری بھوک کو اور بڑھا دیا۔ میں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں آگئی۔ کچھ دنوں بعد مجھے پتا چلا کہ ان لوگوں کو میں پسند نہیں آئی۔ مجھے دکھ ہوا لیکن میں نے خود کو بہلایا۔ میں خود بھی اس رشتے کے لیے مطمئن نہیں تھی۔ وجہ بینک کی کمائی۔ خیر جو ہوا اچھا ہوا۔ میں نے نوٹ کیا دونوں بھابیوں نے مجھ سے بات چیت بند کر دی ہے۔ دونوں بھائی بھی مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے ہیں، خیر سے میرے پیپرز بھی اچھے ہو گئے۔ میں اب زیادہ تر گھر میں ہی رہتی۔ آہستہ آہستہ کچن کی ساری ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑی۔ اب بہانے بہانے سے نزہت بھابی مجھے اپنے حصے کے کام بھی سونپ جاتیں۔ کبھی انہیں بچوں کو

پڑھانا یاد آجاتا، کبھی بچوں کو سلانے چلی جاتیں۔ ایمن بھابی کی دیکھا دیکھی وہ بھی ہم سب سے الجھ پڑتیں۔ میں اب ان سے بھی خوفزدہ رہنے لگی۔ ایک دن میں ان کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ میں نے سنا کہ ان کا بھائی مجھے پسند کرتا ہے۔ میں قطعاً اس بات سے لاعلم تھی۔ وہ اپنی بہن سے کہہ رہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اپنی کم صورت نند سے اپنے بھائی کی شادی کیوں کرواؤں۔ دنیا میں حسین وخوب صورت لڑکیوں کا کیا کال پڑ گیا ہے۔ وہ اور نہ جانے کیا کچھ میرے خلاف اپنی بہن سے کہہ رہی تھیں۔ مجھ میں اور کچھ سننے کی سکت نہ تھی۔ میں وہاں سے ہٹ گئی۔ میری عادت نہیں کہ میں چھپ چھپ کر باتیں سنوں مگر اپنا نام سن کر میرے قدموں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ میرے متعلق اتنا برا سوچ سکتی ہیں۔ اس بات کا ذکر بھی میں نے امی سے نہیں کیا۔ پھر بھائی، بھابی کو لے کر الگ شفٹ ہو گئے اور ہم انہیں جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ روکا تو انہیں جاتا ہے جو رکنا چاہیں، جانے والے کو روک کر بھی کیا فائدہ۔ امی، ابو کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ ہم سب کو چھوڑ گئے۔ سچ کہتے ہیں اگر عورت اپنی ضد پر آجائے تو اپنی بات منوا کر ہی دم لیتی ہے۔ بھائی بھی کب تک بھابی کی بات ٹالتے۔ نزہت بھابی کے جانے کے بعد، ایمن بھابی نے اسی گھر میں اپنا کچن الگ کرلیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ان سے اتنے لوگوں کا کھانا نہیں پکایا جائے گا اور اگر ان کا یہ مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو وہ لوگ بھی گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے اسی لیے ان کا کچن علیحدہ کر دیا گیا۔

ابو، ایاز بھائی کے جانے کے بعد ٹوٹ گئے۔ انہیں بے حد صدمہ پہنچا۔ انہیں دل کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا لیکن بھائی میں اتنی انسانیت باقی تھی کہ وہ ہر ماہ ابو کے ہاتھ پر ایک معقول رقم رکھ دیا کرتے تھے جس سے گھر کا خرچ اور ان کا علاج ہوتا۔ پھر میں نے بھی گھر کے حالات کے پیش نظر قریبی اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا اور شام میں اسکول کے بچے مجھ سے پڑھنے آنے لگے۔ میں سارے پیسے ابو کو دیا کرتی۔ وہ کہتے بھی کہ اپنے پاس رکھا کرو مگر میں انہیں دے دیا کرتی۔ بھائی کے گھر سے جانے کا صدمہ امی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ خاموشی سے ایک دن ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔

امی کی موت ہم سب کے لیے بہت بڑی محرومی تھی۔ جب ماں ہو تو احساس نہیں ہوتا اور جب نہ ہو تو یہ احساس بے حد جان لیوا ہوتا ہے کہ کیا کھویا اور کیا پایا۔ ابو اب چاہتے کہ میں جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جاؤں کیونکہ شرجیل بھائی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے، یہ گھر بڑے بھائی کے نام تھا کیونکہ انہوں نے شروع سے بے حد محنت کی تھی اور شرجیل بھائی شروع سے ہی گھر میں کم پیسے دیتے۔ ایاز بھائی نے ان سے گھر خالی کرنے کو کہہ دیا اور وہ لوگ بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہو گئے۔ اب گھر میں صرف ابو اور میں رہ گئے۔ ابو کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی، گھر کا سامان لانا، بازار جانا، ابو کو اسپتال لے کر جانا، گھر کے کام سب میری ذمہ داری میں شامل ہو گیا۔ میں تو روز بروز زندگی کے نت نئے رنگ دیکھ کر حیران ہوتی۔ ان ہی دنوں سمیر سے میری ملاقات مارکیٹ میں ہو گئی۔ اس نے ہی مجھے پہچانا، میں تو اپنی دھن میں مگن سامان لیے چلی آرہی تھی۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ ہمارے دوسرے بلاک میں آگیا ہے۔ اس کے ابو کا انتقال ہو گیا ہے اور بہن کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ گھر میں اب صرف صفیہ خالہ اور وہ ہیں پھر اس نے میرے گھر رشتہ بھیج دیا۔ آنٹی ہمارے گھر آئیں۔ ابو سے میرا ہاتھ مانگا تو ابو نے سوچنے کے لیے وقت مانگا پھر بھائیوں سے مشورہ کیا تو ان لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ اگر سمیر سے شادی ہو گئی تو ہم دونوں بھائی شرکت نہیں کریں گے۔ ابو نے انہیں کافی سمجھایا مگر وہ نہیں مانے اور کہا کہ سمیر کا کردار ٹھیک نہیں ہے۔ ابو نے میری مرضی پوچھی تو میں نے کہا جو آپ کا فیصلہ وہی میرا فیصلہ ہوگا پھر انہوں نے بھائیوں کی ناراضگی مول لے کر میرا رشتہ سمیر سے طے کر دیا۔

میں ہواؤں میں اڑنے لگی لیکن اندر ہی اندر بھائیوں کی ناراضگی کا خیال میری جان نکال رہا تھا۔ ہمارا رشتہ طے ہوئے صرف دو ماہ ہی ہوئے ہوں گے کہ سمیر کا رویہ مجھ سے بدل سا گیا۔ وہ اب مجھ سے اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا۔ رشتہ طے ہونے کے بعد وہ مجھے روز کال کیا کرتا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کی کال آنا بند ہو گئیں۔ ابو چاہتے تھے کہ میری شادی جلد از جلد ہو جائے مگر سمیر کا انداز میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ ایک دن صفیہ خالہ آئیں اور مجھ سے معافی مانگنے لگیں۔ بیٹا تم اس رشتے سے انکار کر دو۔ میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ ان کی بیٹی سمیرا کی نند سمیر کو پسند کرتی ہے اور اس نے رشتہ طے ہو جانے کے بعد دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کی ہے اور سمیرا کے شوہر عقیل نے اسے طلاق کی دھمکی دی ہے کہ اگر سمیر نے اس کی بہن سے شادی نہ کی تو وہ اسے چھوڑ دے گا۔

میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ یہ مسئلہ سن کر میں الجھ کر رہ گئی۔ میں نے ان سے کہہ دیا آپ ساری باتیں ابو سے کہیں پھر انہوں نے ابو سے اس مسئلے کا ذکر کیا۔ ابو نے مجھے بلایا۔ اس تمام صورتِ حال میں سمیر خاموش رہا۔ تماشائی بنا سب کچھ دیکھتا رہا۔ انہوں نے ایک بار پھر میری مرضی پوچھی۔ میں نے کہا آپ کا فیصلہ میرا فیصلہ۔ پھر ابو نے انہیں سوچ بچار کے بعد انکار کر دیا۔ صفیہ آنٹی مجھے دعائیں دیتی چلی گئیں۔ پھر ابو کے چچا زاد بھائی کے بیٹے کا رشتہ آیا اور انہوں نے بنا مجھ سے پوچھے میرا رشتہ طے کر دیا۔ انہیں پتا تھا میں انکار نہیں کروں گی۔ انہوں نے مجھے تصویر دکھائی اور تمام تفصیلات سے آگاہ کیا کہ لڑکے کا گاڑیوں کا شوروم ہے۔ اسٹرونگ فیملی ہے۔ ان لوگوں کو ایک گھریلو، سلیقہ شعار بہو کی ضرورت تھی، اس لیے وہ لوگ ابو کے در پر چلے آئے کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ ابو کی بیٹی کتنی فرمانبردار ہے اور واقعی یہ بات سچ ہے کہ جو دوسروں کا برا نہیں کرتے اللہ بھی ان کے ساتھ کچھ برا نہیں کرتا اور جو بے جا کسی کو ستاتے ہیں انہیں ساری زندگی اپنے اعمال کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ جیسے ایمن بھابی چار سال بعد بھی اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ نزہت بھابی کے حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ ایاز بھائی کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور وہ ڈائیلاسس پر ہیں۔ صحیح کہتے ہیں کسی کے ساتھ ہم غلط یا زیادتی کر کے کبھی آسودہ نہیں رہ سکتے۔

جواد بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ سسرال کا ماحول بھی مجھے بے حد سلجھا ہوا ملا۔ ابو کو میں نے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا کیونکہ بھابیوں کو ابو کا وجود برداشت نہیں تھا۔ شروع میں، میں سسرال والوں کے ساتھ ہی رہی پھر چار سال بعد جواد کی امی نے ہمیں الگ کر دیا۔ ہم اسی بلاک میں رہتے۔ سسرال میں میرا روز کا آنا جانا تھا۔ میرے دو بچے ہیں۔ طلحہ اور سمعیہ۔ میں خوش اور آسودہ زندگی گزار رہی ہوں۔ اللہ نے مجھے مکمل جہاں دے دیا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ سمیر کا سیریشن ہو گیا اور وہ دوسرے شہر شفٹ ہو گیا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتی۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کیا واقعی میں ایک اچھی لڑکی ہوں؟

ابا جان نے فورڈ کار لے لی۔ 1928ء میں کسی کے پاس کار ہونا بڑی بات تھی۔ والد صاحب ڈاکٹر تھے اور مریضوں کو دیکھنے کے لیے وقت بے وقت جانا ہوتا تھا۔ انہوں نے کار ضرورت کے تحت لی تھی مگر اکثر لوگ نام ونمود کے لیے بھی لیتے تھے۔ شہروں کے اندر چند ہی لوگ ایسے تھے جن کے پاس کاریں تھیں اور جن کے پاس تھیں، ان کی حیثیت مقتدر اور نمایاں مانی جاتی تھی۔ وہ کار غالباً دو ہزار آٹھ سو روپے میں ملتی تھی۔ ان کاروں کے دروازوں میں شیشے نہیں ہوتے تھے۔ دروازوں کا اوپری نصف حصہ جس میں آج کل شیشے ہوتے ہیں وہ کھلا ہوتا تھا۔ اوپر چھت ایک خاص قسم کے کپڑے کی ہوتی تھی اور کھلنے اور بند ہونے والی ہوتی تھی، جب کھول دی جاتی تھی تو وہ کئی پرتوں میں سمٹ کر پیچھے جمع ہو جاتی تھی۔ شام کے وقت صاحب کار لوگ اپنی آل واولاد کے ساتھ کھلی ہوئی کار میں بیٹھ کر سیر وتفریح کے لیے نکلتے تھے، اگر بارش ہو جائے تو مسئلہ ہوتا تھا۔ آج کل تو انگلی کی ایک جنبش سے شیشے اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ ہماری فورڈ میں صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ کار کو کھڑا کیا جاتا تھا پھر کوئی شخص جا کر پیچھے کے حصے کو کھولتا تھا، فرش پر سے ربر کی چادر کو ہٹاتا تھا۔ فرش میں بڑا خانہ ہوتا تھا جس میں کھڑکی کے پردے جو کہ ٹاٹ پارچہ Canvas کے ہوتے تھے، رکھے رہتے تھے۔ ان کو نکال کر ایک کھڑکی میں لگے ہوئے ہکس (Hooks) تک پہنایا جاتا تھا۔ اگر بارش تیز ہوتی تھی تو اس سارے عمل کے دوران وہ شخص تو اچھی طرح بھیگ چکا ہوتا تھا اور بسا اوقات اندر بیٹھی ہوئی سواریاں بھی کسی حد تک متاثر ہو چکی ہوتی تھیں۔ ٹائروں میں ہوا ہاتھ کے پمپ (Hand Pump) سے بھری جاتی تھی۔ ان تمام کاموں کو سرانجام دینے کے لیے ایک ڈرائیور کا ہونا ضروری تھا جو ہمہ وقت کار کی ڈیوٹی پر موجود ہو۔ بغیر ڈرائیور کے کار رکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کار کی ہیئت ڈبا نما ہوتی تھی اور ظاہری آرائش وزیبائش پر زور نہیں دیا جاتا تھا۔ فی زمانہ تو ہر سال ماڈل بدل جاتے ہیں اور اب اپنی حیثیت عرفی کے اظہار کے لیے صرف کار ہی ضروری نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ کس سال کا ماڈل ہے اور برانڈ کون سا ہے۔

اقتباس: ڈوبتے جہاز کے عرشے سے۔ از: فضا اعظمی

انتظار

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم
ایک لڑکی کی زندگی الجھے دھاگوں کی مانند ہوتی ہے جس کا سرا تلاش کرتے کرتے زندگی گزر جاتی ہے، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے اپنی پسند کا جیون ساتھی منتخب کیا مگر مجھے کیا ملا؟ انتظار، انتظار اور انتظار۔

افشاں
(کراچی)

میری نسبت بچپن میں ہی ماموں زاد بھائی عمر سے طے پا گئی تھی لیکن اس کا مجھے بہت بعد میں پتا چلا۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھ رہی تھی۔ فائنل ایئر میں پہنچی تو میرے لیے رشتے آنا شروع ہو گئے لیکن امی کو کوئی رشتہ پسند نہیں آ رہا تھا اور وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر انکار کر دیتی تھیں۔ میں خود بھی ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک تو یہ کہ میں گریجویشن کے بعد ماسٹرز کرنا چاہ رہی تھی اور شادی ہونے کی صورت میں یہ خواب پورا نہ ہوتا دوسرے یہ کہ میں دل ہی دل میں اپنے چچازاد انور کو پسند کرنے لگی تھی گو کہ ہمارے درمیان ساتھ مرنے اور ساتھ جینے کے وعدے نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی اس نے مجھ سے کبھی اپنے دل کی بات کہی لیکن وہ بچپن سے ہی میرے بہت قریب تھا اور ہمارے درمیان دوستی کا ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو چکا تھا جو کسی بھی وقت محبت میں تبدیل ہو جاتا۔

کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے میں اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتانا چاہوں گی۔ میرا نام افشاں ہے۔ ابو سرکاری افسر ہیں اور امی اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہوں۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن مہ جبیں اور دو بھائی امجد اور ارشد ہیں۔

پہلے ہم جہانگیر روڈ کے سرکاری کوارٹر میں رہا کرتے تھے پھر جب گلشن اقبال کی اسکیم آئی تو اس کی قرعہ اندازی میں دو سو چالیس گز کا پلاٹ نکل آیا۔ ابو نے ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن سے قرض لے کر مکان بنانا شروع کر دیا۔ امی نے کمیٹی ڈال کر کچھ رقم پس انداز کی تھی۔ وہ بھی اس میں لگ گئی۔ جب مکان مکمل ہو گیا تو انہوں نے اسے کرایہ پر اٹھا دیا اور اس سے ہاؤس بلڈنگ کی قسطیں ادا ہونے لگیں۔ پہلے ابو کا خیال تھا کہ وہ ریٹائرمنٹ تک سرکاری مکان میں رہیں گے لیکن جب قرض اتر گیا تو وہ ذاتی مکان میں شفٹ ہو گئے کیونکہ ہم سب بڑے ہو گئے تھے اور دو کمروں کے کوارٹر میں گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا۔

چچا جان کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ وہ ہول سیل مارکیٹ سے دوائیں خرید کر میڈیکل اسٹورز پر سپلائی کیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنا ایک دفتر بنا رکھا تھا جہاں وہ دوائیں اسٹاک کرتے اور ان کے تین چار سیلز مین دکانوں سے آرڈر لے کر مال سپلائی کیا کرتے۔ وہ کوئی لکھ پتی یا کروڑ پتی نہیں تھے لیکن ان کا شمار خوش حال لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ بہت معمولی کمیشن پر کام کرتے اور سارا منافع دکاندار کو منتقل کر دیتے۔ اس وجہ سے مارکیٹ میں اچھی ساکھ تھی اور ان کی سیل بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ان کی بھی رہائش گلشن اقبال میں تھی۔ بڑا بیٹا انور انجینئرنگ کا طالب علم تھا اور بیٹی شگفتہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔

اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے وہ ابو سے بہت قریب تھے اور کاروباری مصروفیت کے باوجود چھٹی والے دن بیوی بچوں سمیت ہمارے گھر ضرور آتے۔ اسی طرح ابو بھی ہم لوگوں کو لے کر گاہے بگاہے ان سے ملنے جاتے۔ شگفتہ تھوڑی سی ریزرو تھی لیکن انور بہت ہنس مکھ خوش مزاج اور ملنسار واقع ہوا تھا۔ اسی لیے اس سے میری خوب بنتی تھی۔ اس کے شوق اور مشغلے بھی مجھ سے ملتے جلتے تھے۔ میری طرح اسے بھی ادب، سیاست اور فلموں سے دلچسپی تھی۔ اس کے پاس معلومات کا خزانہ تھا۔ ہر سیاست داں، ادیب، شاعر اور فلم یا ٹی وی اسٹار کے بارے میں اس کے پاس تازہ ترین معلومات ہوتی تھیں۔ وہ ہفتے میں دو تین مرتبہ ہمارے

گھر ضرور آتا اور ہم گھنٹوں بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے۔ وہ میرے بہت سے کام کر دیا کرتا تھا اور میں اسے صرف کزن ہی نہیں بلکہ اپنا مسیحا اور مخلص دوست بھی سمجھتی تھی۔

امی کا میکہ بہت بڑا تھا۔ ان کے دو بھائی چار بہنیں اور کئی کزنز تھے۔ ان کا بہن بھائیوں میں دوسرا نمبر تھا۔ سب سے بڑے ماموں سلیم پہلے میونسپل کارپوریشن میں کلرک تھے، ان کی تنخواہ تو کم تھی لیکن ان کی تعیناتی اس سیکشن میں ہو گئی جہاں مکانوں اور عمارتوں کے نقشے منظور ہوتے تھے۔ اس لیے ان کی اوپر کی آمدنی اچھی خاصی تھی۔ وہ بڑے چالاک اور ہوشیار تھے۔ جب تک ملازمت میں رہے انہوں نے اپنا رہن سہن تبدیل نہیں کیا۔ ہمیشہ سادہ لباس پہنتے، بس میں سفر کرتے اور کرایہ کے مکان میں رہتے۔ ان کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں تھا اور وہ اپنی ساری کمائی پراپرٹی میں لگا رہے تھے۔ جہاں انہیں کوئی سستا پلاٹ نظر آتا اسے خرید لیتے پھر انہوں نے دکانیں اور فلیٹ خرید کر انہیں کرایہ پر چڑھانا شروع کر دیا۔ جب ان کے پاس ٹھیک ٹھاک سرمایہ جمع ہو گیا تو انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے کر کنسٹرکشن اور پراپرٹی کا کاروبار شروع کر دیا جو خوب پھل پھول رہا تھا۔

میں نے اپنے ننھیال والوں میں ایک بات دیکھی کہ وہ بیٹی بیاہ کر اسے بھول جاتے تھے۔ میرے دونوں ماموؤں کا یہی حال تھے۔ بظاہر وہ امی سے بہت اچھی طرح ملتے لیکن کبھی انہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بہن کا حال ہی پوچھ لیں۔ آنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ان کے پاس فون کرنے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔ اس کے برعکس امی ان کی محبت میں مری جاتی تھیں۔ وہ نہ صرف باقاعدگی سے انہیں فون کرتیں بلکہ پندرہ بیس دن میں ان کے گھر کا ایک چکر بھی لگا لیتیں۔ ابو صاف دل انسان ہیں۔ انہوں نے بھی ان باتوں کو محسوس نہیں کیا اور نہ ہی امی سے کبھی ماموں کے رویے کی شکایت کی بلکہ وہ خود بھی امی کے ساتھ ان کے گھر جایا کرتے تھے لیکن مجھے ان کا رویہ پسند نہ تھا اور ایک دن میں نے امی سے کہہ ہی دیا۔

”اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔“

”ہاں ہاں ضرور پوچھو۔“

”امی میں بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں کہ آپ تو اپنے بہن بھائیوں پر دل و جان سے فدا ہیں لیکن انہیں آپ کی بالکل بھی پروا نہیں۔ خالائیں تو پھر بھی کبھی کبھار چکر لگا لیتی ہیں لیکن ماموں تو جیسے ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ جب بھی موقع ملتا ہے وہ آ ہی جاتے ہیں۔“

''ہاں مجھے یاد ہے۔ دو مہینے پہلے وہ ابو کو دیکھنے آئے تھے جب ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ شاید آپ نے ہی انہیں فون کرکے بتایا ہوگا یا پھر عید بقرعید پر دنیا دکھاوے کے لیے ایک چکر لگا لیتے ہیں۔''

''بیٹی بری بات ہے۔ بڑوں کے لیے ایسا نہیں سوچتے۔''

''امی میں خدانخواستہ ان کی برائی تو نہیں کررہی۔ جو دیکھا اور محسوس کیا وہی بیان کررہی ہوں۔''

امی ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹی کسی کو مجبور تو نہیں کیا جاسکتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہر انسان کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ ویسے وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے ہیں اور خاص کر تمہیں تو بہت چاہتے ہیں۔''

مجھے امی پر ترس آنے لگا۔ بے چاری کس معصومیت سے اپنے میکے والوں کا بھرم رکھنے کی کوشش کررہی تھیں جب کہ ماموں نے کبھی رسمی سلام ودعا کے علاوہ مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ممانی ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھیں۔ وہ انتہائی تنک چڑھی، بدمزاج اور مغرور عورت تھیں۔ غصہ تو ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ وہ اپنے مقابلے میں دوسروں کو بہت حقیر سمجھتی تھیں۔ تاہم امی کے ساتھ ان کا رویّہ قدرے بہتر تھا۔ وہ ان کی بہت عزت کرتی تھیں اور ہم جب بھی ان کے گھر جاتے تو وہ بڑی خاطر تواضع کرتیں۔ انہوں نے کبھی کھانا کھائے بغیر ہمیں واپس نہیں آنے دیا۔ خدا جانے یہ دنیا دکھاوا تھا یا واقعی وہ اپنے سسرال والوں کو اہمیت دیتی تھیں۔

ماموں کا بیٹا عمیر اپنی تعلیم مکمل کرچکا تھا اور اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرلی تھی۔ ماموں نے بہت چاہا کہ وہ ان کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹائے لیکن اسے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اسے یہ پسند تھا کہ وہ اپنا کام نکلوانے کے لیے سرکاری اہلکاروں کی خوشامد کرے۔ انہیں رشوت دے اور دفتروں کے چکر لگائے۔ وہ من موجی آدمی تھا اور اس کے لیے نو سے پانچ کی ملازمت ہی مناسب تھی۔ وہ کام سے واپس آنے کے بعد آرام کرتا، ٹی وی دیکھتا یا دوستوں سے ملنے چلا جاتا۔ اسے کولہو کے بیل کی طرح چوبیس گھنٹے کام کرنا پسند نہیں تھا بلکہ اس نے ایک دفعہ مجھ سے بھی یہ بات کہی تھی کہ میری قسمت میں جو بھی لکھا ہے وہی ملے گا۔ میں اپنے حصے کا کام کررہا ہوں آگے اللہ کی مرضی۔

اس کے برعکس میرا چچا زاد انور خواہشوں کے انبار تلے دبا ہوا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں کئی خواب سجا رکھے تھے اور آج کل کے نوجوانوں کی طرح وہ بھی بیرون ملک جانے کا خواہش مند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انجینئرنگ کی ڈگری ملتے ہی وہ امریکا کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے اپلائی کردے گا۔ وہ اپنی ہر بات مجھے بتایا کرتا تھا۔ جب اس نے مجھ سے امریکا جانے کا ذکر کیا تو میرا دل انجانے اندیشوں میں گھر گیا۔ میں نے اس کے پروگرام کی تفصیل جاننے کے لیے کہا۔ ''امریکا جانے اور تعلیم حاصل کرنے میں تو بہت خرچ ہوگا۔ کیا چچا جان یہ برداشت کرسکیں گے۔''

''نہیں میں وہاں رہنے اور اپنی تعلیم کے اخراجات خود اٹھاؤں گا۔ انہیں صرف جانے کا کرایہ اور ایک سمسٹر کی فیس دینا ہوگی۔''

''میں سمجھی نہیں۔ تم وہاں کے اخراجات کیسے برداشت کروگے؟''

''میں نے اس بارے میں پوری پلاننگ کرلی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہاں ایک سمسٹر کے بعد پارٹ ٹائم ملازمت کی اجازت مل جاتی ہے۔ جس سے میں اپنے اخراجات پورے کرسکوں گا۔ میرے کئی جاننے والے اور سینئرز ایسا ہی کررہے ہیں۔ میں بھی ان سے رابطے میں ہوں۔ وہ میری رہنمائی کریں گے۔''

''لیکن اس طرح تمہاری پڑھائی متاثر ہوگی۔''

''بالکل نہیں اور اگر ایسا ہوا تو ایک دو سمسٹر ڈراپ بھی ہوسکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ چار کی جگہ پانچ سال میں ڈگری ملے گی۔''

اس نے پورا پلان سوچ رکھا تھا لیکن میں اس میں کہیں بھی فٹ نہیں ہورہی تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی یہ نہیں کہا کہ وہ مجھے بہت یاد کرے گا یا کوئی ایسا اشارہ دیا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہو یا مجھے اپنا شریک سفر بنانا چاہتا ہے۔ میں بری طرح مایوس ہوگئی لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، میں نے اپنی طرف سے پتا پھینکا۔ ''لیکن چچی جان تو بڑی بے چینی سے تمہاری تعلیم مکمل ہونے اور جاب ملنے کا انتظار کررہی ہیں تاکہ تمہارے لیے چاند سی دلہن لاسکیں۔''

''نہ جانے ماؤں کو بیٹوں کی شادی کی اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے؟'' وہ چڑ کر بولا۔ ''شادی کے لیے ساری زندگی پڑی ہے لیکن یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کبھی نہیں آئے گا۔ میں ان کی اس خواہش کی خاطر اپنا مستقبل خراب نہیں کرسکتا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ امریکا جانے سے مستقبل سنور جائے گا۔ میں نے تو سنا ہے کہ نائن الیون کے بعد وہاں مسلمانوں کے لیے حالات سازگار نہیں رہے۔''

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو نائن الیون کے بعد امریکا گئے اور وہاں کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ احتشام بھائی کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ وہ صرف میٹرک پاس ہیں۔ ان کے سالے نے اسپانسر کیا اور وہ بیوی بچوں سمیت امریکا چلے گئے۔ شروع شروع میں انہوں نے ہوٹلوں میں برتن دھوئے۔ گیس اسٹیشن پر ملازمت کی پھر آہستہ آہستہ حالات ان کے حق میں بہتر ہونے لگے۔ آج وہ ایک سپر اسٹور کے مالک ہیں۔ ذاتی مکان ہے۔ بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کسی غیر قانونی سرگرمی میں ملوث نہیں ہیں تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔''

اس کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں جان گئی تھی کہ میری کمزور اور بودی دلیلیں اس کا ارادہ نہیں بدل سکتیں پھر میں نے دوسرے انداز سے سوچنا شروع کردیا۔ آخر میں کیوں چاہتی تھی کہ وہ امریکا نہ جائے اور یہیں کوئی ملازمت کرلے۔ صرف اس لیے کہ میری اس سے شادی ہوجائے لیکن یہ میں نے کیسے فرض کرلیا کہ وہ مجھ سے ہی شادی کرے گا۔ اب تک تو اس نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ بس ایک موہوم سی اُمید تھی کہ ہماری یہ دوستی اور حد درجہ قربت کسی بھی لمحے محبت میں بدل سکتی ہے اور مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔

شاید خاندان میں کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ میری نسبت عمیر سے طے پا چکی ہے۔ یہ بات صرف امی اور ماموں ممانی کے درمیان تھی۔ مجھے بھی اتفاقاً ہی معلوم ہوئی۔ ہوا یوں کہ میں یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تیاری کررہی تھی کہ ایک دن امی کی کوئی سہیلی اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آگئیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور ان کی خاطر مدارات کا انتظام کرنے کچن میں چلی گئی۔ میں نے ان کے لیے چائے بنائی اور دیگر لوازمات ٹرے میں رکھ کر ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ میں دروازہ پر ہی تھی کہ اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی۔ وہ دونوں میرے بارے میں ہی گفتگو کررہی تھیں۔

''راشدہ! تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے ہمیں اس

انتظار حسین کہتے ہیں۔ ''میرا گھرانا زرخیز علمی وادبی پس منظر رکھتا تھا اور جہاں تک میری بات ہے تو مجھے پاکستان آنے تک صوفیائے کرام سے کوئی گہری عقیدت نہیں تھی لیکن جب میں نے حضرت امیر خسرو کے حوالے سے حضرت سلطان جی، شیخ نظام الدین اولیاء کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا تو مجھے ان کی ذات میں ایک کشش محسوس ہوئی۔ ان کے بارے میں مجھے اردو، فارسی اور انگریزی میں جو کچھ ملا وہ میں نے پڑھا، تصوف کی بنیاد محبت ہے اور یہ محبت وقت کے ساتھ پروان چڑھی۔ میں حضرت سلطان جی کے عرس میں کئی مرتبہ شریک ہوا اور مجھے وہاں ذہنی اور روحانی تجربے ہوئے، میری محبت ان تجربات سے مزید مستحکم ہوئی پھر میں نے ان پر ایک خاکہ لکھا جس کا عنوان ''نظام رنگ'' تھا۔ مجھے ذاتی معرفت کا شرف تو حاصل نہیں تھا مگر وہاں کے بزرگوں سے مل کر اور خود کئی روحانی تجربوں سے گزر کر میں نے ان پر لکھنا شروع کیا۔ میرے اس خاکہ پر ایک صحافی دوست نصراللہ خان نے تبصرہ کیا کہ حضرت امیر خسرو سے ملاقات ہو تو میں ان سے پوچھوں گا کہ یہ لڑکا کہاں چھپا ہوا تھا، آپ نے کہیں اس کا تذکرہ نہیں کیا اور ایسا لگتا ہے کہ یہ کہیں آپ کے آس پاس ہی تھا۔'' اس طرح کے کئی تبصرے آئے جب میں نے حضرت سلطان جی پر لکھنا شروع کیا۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے آپ کا حاصل زندگی کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ میرا حاصل زندگی ''دبستانِ نظام'' ہے جو کتاب میں نے تحریر کی۔

اقتباس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے۔ از۔ خرم سہیل

☆☆☆

وزارت تعلیم نے کتبہ مزار قائداعظم کے اردو ترجمہ کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ کا انتخاب کیا۔ سید صاحب نے یکم مارچ 1981ء کو اس کا موزوں ترجمہ مکمل کرکے وزارت تعلیم کو ارسال کیا جس کے بعد اسے مزار قائد پر کتابت کروایا گیا لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ کے لیے قومی سطح پر سب سے نمایاں اعزاز یہ ہے کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے 23 اکتوبر 1978ء کو پاکستان بھر میں پڑھی پڑھائی جانے والی نصابی کتب کی نظرثانی کے لیے ایک سہ رکنی کمیٹی بنائی۔ سید صاحب اس کے کنوینر وصدر منتخب ہوئے۔ سید صاحب نے تقریباً سال بھر میں پورے پاکستان میں رائج نصابی کتب پر نظرثانی کا کام مکمل کرلیا جس سے انہوں نے اہم خدمت انجام دی۔

اقتباس: سید عبداللہ۔ از۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین

قابل سمجھا لیکن میں مجبور ہوں۔"

"کھل کر بات کرو فہمیدہ۔ آخر میرے بیٹے میں ایسی کیا کمی ہے جو تم بیٹی کا رشتہ دینے سے ہچکچا رہی ہو؟"

"یہ میں نے کب کہا کہ خدانخواستہ تمہارے بیٹے میں کوئی کمی ہے لیکن میں نے کہا نا کہ میں مجبور ہوں۔"

"میں وہی تو جاننا چاہ رہی ہوں کہ ایسی کیا مجبوری ہے کہ تم نے میرے لائق فائق بیٹے کو ٹھکرا دیا؟" آنٹی راشدہ نے ناگواری سے کہا۔

"دراصل افشاں کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔" امی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اچھا کب! کس سے؟"

"اس کے ماموں زاد بھائی سے۔ دراصل میں نے ابھی کسی کو نہیں بتایا۔ جب کوئی رسم وغیرہ ہوئی تو اعلان کردوں گی تم بھی اسے فی الحال اپنے تک ہی رکھنا۔"

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ کھڑے کھڑے میرے پیر شل ہونے لگے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں خاموش ہوگئیں۔ میں نے ٹرے میز پر رکھی اور الٹے قدموں واپس آگئی۔ میرے ہوش وحواس قابو میں نہیں تھے۔ دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اتنی بڑی بات کا مجھے پتا نہیں؟ امی نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرا رشتہ کردیا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ امی نے اپنی سہیلی کو ٹالنے کے لیے یہ بہانا بنایا ہو۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ خاموشی اختیار کرلوں اور یہ ظاہر کروں کہ میں نے کچھ نہیں سنا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خود ہی بتا دیں لیکن اتنی بڑی بات مجھ سے ہضم نہیں ہو رہی تھی اس لیے آنٹی کے جاتے ہی میں نے امی کو آڑے ہاتھوں لیا اور انتہائی گستاخانہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ عمیر سے میرا رشتہ کب طے ہوا اور آپ نے اس بارے میں میری مرضی جاننے کی زحمت بھی نہیں کی۔"

"اوہ تو تم نے سن لیا؟" وہ تھوڑا سا پریشان ہوتے ہوئے بولیں۔

"جی ہاں اور ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ورنہ لاعلمی میں ماری جاتی۔ اس کے باوجود مجھے یہ خوش فہمی ہے کہ آپ نے آنٹی کو ٹالنے کے لیے یہ بات کہی ہو۔"

"نہیں یہ سچ ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا؟" میں نے ایک زوردار چیخ ماری۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"وہی جو حقیقت ہے۔ تمہارا رشتہ واقعی عمیر سے طے ہو چکا ہے۔"

"کیا آج کے دور میں یہ ممکن ہے کہ ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی کا رشتہ اس کی مرضی جانے بغیر کردیا جائے؟"

"یہ اس وقت کی بات ہے جب تم پڑھی لکھی اور باشعور نہیں تھیں۔ یہ تمہاری نانی کی خواہش تھی۔"

"نانی بیچ میں کہاں سے آگئیں؟" میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"جب تم پیدا ہوئیں تو انہوں نے تمہیں دیکھتے ہی کہا۔ اسے تو میں اپنے عمیر کی دلہن بناؤں گی۔" اس وقت تمہارے ماموں اور ممانی بھی موجود تھیں۔ پھر انہوں نے بڑے جذباتی انداز میں کہا" ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک میں زندہ نہ رہوں لیکن تم لوگ اسے میری وصیت سمجھنا۔" یہ بات تمہارے ماموں اور ممانی کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ تمہارے ابو بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"اور آپ اس وصیت کو سینے سے لگائے بیٹھی ہیں کیا میں کوئی بھیڑ بکری ہوں کہ جہاں دل چاہا ہانک دیا۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو افشاں۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ کبھی بھی تمہارا برا نہیں سوچ سکتی۔"

"اس وصیت پر عمل کرنے کی ذمہ داری صرف آپ پر نہیں بلکہ ماموں اور ممانی پر بھی عائد ہوتی ہے۔ یہ بتائیں کبھی انہوں نے آپ سے اس موضوع پر بات کی؟"

"شروع شروع میں تو وہ تمہارے بہت لاڈ اٹھاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کی گرم جوشی کم ہوتی چلی گئی اور اب تو تم دیکھ رہی ہو کہ وہ خود چھ چھ مہینے اپنی شکل نہیں دکھاتے۔"

"اس لیے کہ ان کی گردن میں سریا فٹ ہوگیا ہے۔ پہلے وہ ایک معمولی کلرک تھے اس لیے زمین پر قدم جما کر چلتے تھے۔ اب ان کے پاس پیسا آگیا ہے اور وہ صرف رشتہ داری نبھانے کی خاطر سال میں دو چار مرتبہ آجاتے ہیں۔ آپ کو نانی کی وصیت کا بہت پاس ہے لیکن شاید انہیں یہ بات یاد بھی نہ ہو اور اگر یاد بھی ہو تو وہ اس پر عمل نہیں کریں گے۔ انہیں سترہ گریڈ کے ایک ایمان دار افسر کے یہاں سے کیا ملے گا۔"

امی میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔ "سوچ رہی ہوں کہ ان سے فون کر کے پوچھوں کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔ اب تو عمیر کی ملازمت بھی ہوگئی ہے۔ آخر میں کب تک لوگوں سے بہانے بناتی رہوں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں فون کرنے کی۔" میں نے غصے سے کہا۔ "اگر وہ بھی آپ کی طرح نانی کی وصیت پر عمل کرنے میں سنجیدہ ہیں تو خود ہی بات چھیڑیں گے اور جہاں تک لوگوں کو ٹالنے کی بات ہے تو آپ سب سے کہہ دیں کہ لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس کی شادی دو تین سال بعد کریں گے۔"

مجھے عمیر سے ذاتی طور پر کوئی پرخاش نہیں تھی اور یقیناً اسے بھی معلوم نہ ہوگا کہ اس کی دادی اور میری نانی نے بچپن میں ہمیں ایک دوسرے سے منسوب کردیا تھا ورنہ وہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی انداز میں اس کا اظہار ضرور کرتا۔ ہم جب بھی ان کے گھر جاتے تو وہ بالکل نارمل انداز میں مجھ سے ملتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوجاتا۔

کچھ ہی دن بعد بلی تھیلے سے باہر آگئی اور امی کے سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ایک دن خلاف توقع ماموں اور ممانی ہمارے گھر آئے اور مٹھائی کا ڈبہ امی کو پکڑاتے ہوئے اطلاع دی کہ عمیر کا رشتہ اس کی ایک سابق کلاس فیلو سے طے ہوگیا ہے۔ وہ اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ لڑکی کا باپ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں اونچی پوسٹ پر ہے اور وہ لوگ ڈیفنس میں رہتے ہیں۔

عمیر نے بہت اونچی جگہ ہاتھ مارا تھا۔ ممانی کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی لاٹری نکل آئی ہو۔ انہوں نے فخریہ انداز میں امی سے کہا۔ "ہم اپنے بیٹے کی منگنی بڑی دھوم دھام سے کریں گے۔ تم ابھی سے تیاری شروع کردو، کوئی کمی نہ رہ جائے۔ وہ بڑے لوگ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے سامنے ہماری سبکی ہوجائے۔"

مجھے بہت غصہ آیا۔ جی چاہا کہہ دوں کہ اگر آپ کو اتنا ہی اپنی بے عزتی کا ڈر ہے تو ہمیں ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے جس طرح آپ نے خاموشی سے رشتہ طے کرلیا۔ ویسے ہی منگنی بھی کرلیں بلکہ برأت میں بھی ہمیں لے جانے کی ضرورت نہیں لیکن امی کے ڈر سے خاموش رہی۔ البتہ امی نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا۔ "تم بالکل فکر نہ کرو۔ ہم پورا خیال رکھیں گے کہ تمہاری عزت پر حرف نہ آئے۔"

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے راستے کا ایک کانٹا خود بخود ہی ہٹ گیا۔ البتہ امی کو جو افسوس ہوا، اس کا اظہار الفاظ میں کرنا ممکن نہیں۔ وہ سیدھی سادی پرانے زمانے کی عورت تھیں۔ اپنی ماں کی خواہش کو دل سے لگا کر بیٹھ گئیں۔ انہیں یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ وقت بہت آگے نکل گیا ہے اور ماموں جیسے لوگوں کی سوچ پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اس لیے ان سے یہ توقع رکھنا بے کار ہے کہ وہ اپنی ماں کی خواہش کا احترام کریں گے۔

میرا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوگیا تھا اور میں نے یکسو ہو کر پڑھائی پر توجہ دینا شروع کردی۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ کم از کم دو سال تک میری شادی کا مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا اور اس دوران میں انور سے اس کے دل کی بات کہلوانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ اس کی آمد ورفت بدستور جاری تھی۔ اس نے انجینئرنگ کا امتحان پاس کرلیا تھا اور اب امریکا کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

چچا اور چچی اس کے حق میں نہیں تھے کہ وہ امریکا جائے۔ چچا چاہتے تھے کہ وہ پاکستان میں ہی کوئی ملازمت کرے۔ وہ انجینئر تھا اور اسے کوئی بھی اچھی جاب مل سکتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور اس عمر میں انور کا انہیں چھوڑ کر جانا ٹھیک نہیں جب کہ چچی کچھ اور سوچ رہی تھیں۔ انہیں کسی نے بتا دیا تھا کہ پاکستانی لڑکے وہاں جا کر امریکا کی شہریت حاصل کرنے کی خاطر مقامی لڑکیوں سے کاغذی شادی کرلیتے ہیں اور بعد میں وہی لڑکی ان کے گلے کا ہار بن جاتی ہے۔

میرا صرف ایک ہی مسئلہ تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جانے سے پہلے اپنے دل کی بات کہہ دے تاکہ میں یکسو ہو جاؤں اور میرے پاس کسی رشتے کو انکار کرنے کا کوئی جواز ہو لیکن وہ تو اپنے ہونٹ بند کیے ہوئے تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا منہ کیسے کھلواؤں۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ جب تک وہ یہاں ہے۔ میں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کروں گی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کمزور لمحہ کی گرفت میں آکر وہ دل کی بات زبان پر لے آئے لیکن یہ بھی تو یقین سے کہنا مشکل تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ ہے یا یہ یک طرفہ ٹریفک چل رہا ہے۔

اس روز میں نے کسی کام کے بہانے سے اسے فون

کر کے بلایا اور خود نہانے چلی گئی۔ گرمیوں کے دن تھے میں نے نہانے کے بعد لون کا سفید کرتہ اور گلابی رنگ کی شلوار پہنی اور اسی رنگ کا چنا ہوا دوپٹا گلے میں ڈال لیا جب میں نہا کر باہر نکلی تو وہ آچکا تھا اور ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے بال خشک کرنے کا موقع نہیں ملا اور میں تولیہ سے سر کے بالوں کو جھٹکتے ہوئے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”کیا کام ہے۔ مجھے کیوں بلایا تھا؟“

میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسی جلدی کیا ہے۔ تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔“

”نہیں رہنے دو۔ دیر ہو جائے گی۔ پہلے تم کام بتاؤ۔“

”وہ دراصل مجھے اردو بازار جانا ہے۔ ایک دو کتابیں لینی ہیں۔“

اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”اس وقت تو بہت رش ہوگا۔“

” اسی لیے تو تمہارے ساتھ جارہی ہوں۔ اس وقت تو بس میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔“

”اچھا تو پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

”تیاری کیا کرنی ہے۔ ابھی تو یہ کپڑے تبدیل کیے ہیں، بس بال بنالیتی ہوں۔“

میں نے تیاری میں پانچ منٹ کی بجائے آدھ گھنٹا لگا دیا اور جب اپنا پرس جھلاتی ہوئی کمرے سے باہر آئی تو انور بھی مجھے دیکھ کر پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ میری سج دھج سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کتابیں خریدنے نہیں بلکہ انور کے ساتھ ڈیٹ پر جارہی ہوں۔ میں نے صرف لپ اسٹک پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ گالوں پر غازہ اور آنکھوں میں مسکارا بھی لگایا۔ بالوں کو سیدھا کر کے شانوں پر کھلا چھوڑ دیا اور پورے جسم پر دل کھول کر پرفیوم اسپرے کیا۔ انور تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکا اور بولا۔ ”تم کتابیں خریدنے جارہی ہو یا کسی شادی میں؟“

”پاگل ہو گئے ہو۔ شادی میں کوئی اس طرح جاتا ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف تھوڑا سا حلیہ ٹھیک کیا ہے۔ کیا ایسے ہی سر جھاڑ منہ پھاڑ تمہارے ساتھ چل دیتی۔“

”تم سے باتوں میں جیتنا بہت مشکل ہے۔“ وہ کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔

میں ایک فاتح کی طرح مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ چل دی۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اس کی بائیک میں کیریئر نہیں تھا اور میں کیریئر کا سہارا لینے کی بجائے اس سے چپک کر بیٹھ سکتی تھی۔ اس نے شاید میرے دل کی بات پڑھ لی اور بائیک اسٹینڈ سے اتارتے ہوئے بولا۔ ”سنبھل کر بیٹھنا۔ میری بائیک میں کیریئر نہیں ہے۔“

”فکر نہ کرو۔ میں گرنے والی نہیں ہوں۔“ میں اس کا کندھا پکڑ کر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

گلشن اقبال سے بندر روڈ تک ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ اسے بہت احتیاط سے بائیک چلانا پڑ رہی تھی۔ دوسری گاڑیوں سے بچنے کے لیے وہ بار بار بریک لگاتا اور میں اس پر گر جاتی۔ میں نے اس سے بچنے کے لیے اس کے کندھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور بالکل اس سے چپک کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میرے جسم کی حدت اسے پگھلا کر رکھ دے گی اور وہ زیادہ دیر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے گا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ اپنی دھن میں مگن بائیک چلاتا ہوا اردو بازار پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے مطلوبہ کتابیں خریدیں اور بلا وجہ ہی دوسری دکانوں میں اِدھر اُدھر کی چیزیں دیکھتی رہی دراصل میرا مقصد اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا تھا۔ ایک گھنٹے تک بلا وجہ اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد جب ہم مارکیٹ سے باہر آئے تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی ادا سے کہا۔ ”انور میں بہت تھک گئی ہوں۔ چلو تھوڑی دیر کہیں بیٹھتے ہیں۔“

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا۔ ”کہاں بیٹھو گی۔ یہاں تو کوئی ڈھنگ کا ریسٹورنٹ بھی نہیں ہے۔“

”خالد بن ولید روڈ پر ایک اچھا ریستوران ہے۔ میں ایک دفعہ وہاں جاچکی ہوں۔ وہیں چلتے ہیں۔“

اس نے سر تسلیم خم کر دیا اور ایک بار پھر ٹریفک کے رش میں سے گزرتے ہوئے مطلوبہ ریستوران تک پہنچ گئے۔ اس بار بھی سارے راستے وہی کچھ ہوتا رہا۔ میں اس کے ساتھ بالکل چپکی بیٹھی رہی۔ دل میں یہی خواہش ابھر رہی تھی کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ اس نے ریستوران کے باہر بائیک کھڑی کی اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ اس وقت وہاں بہت کم لوگ تھے۔ ہم نے ایک نسبتاً پرسکون گوشہ منتخب کیا اور میں نے اپنا پرس میز پر رکھ کر ایک گہری سانس لی جیسے بہت طویل سفر طے کر کے آئی ہوں۔

”کیا پیو گی؟“ اس نے پوچھا۔

”اس وقت تو چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔“

اس نے بیرے کو بلا کر چائے اور اسنیکس کا آرڈر دیا اور بولا۔ ”میں کل ہی اپنی بائیک میں کیریئر لگواتا ہوں تاکہ آیندہ تمہیں تکلیف نہ ہو۔“

”مجھے بالکل تکلیف نہیں ہوئی بلکہ بہت مزہ آیا۔“ میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ ”کیریئر لگوانے کی ضرورت نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے۔ ویسے بھی اب تم چلے ہی جاؤ گے۔“

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”دعا کرو کہ یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے پاجائے۔ فی الحال تو بڑی رکاوٹیں ہیں۔“

”کیسی رکاوٹیں، میں کچھ سمجھی نہیں۔“

”پہلا مسئلہ ایڈمیشن کا ہے۔ میں نے اپلائی تو کر دیا ہے۔ دیکھو کب جواب آتا ہے لیکن اس سے بھی بڑا مسئلہ گھر والوں کی مخالفت ہے۔ ابا جان مجھے اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتے ان کا خیال ہے کہ مجھے یہیں کوئی ملازمت کرلینی چاہیے۔ تم ہی بتاؤ یہاں کیا رکھا ہے، میرے جیسے انجینئر سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ باہر سے ڈگری لے کر آؤں گا تو بہت اچھی ملازمت مل جائے گی۔“

”وہ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ اس عمر میں والدین اولاد کو اپنے سے دور کرنا نہیں چاہتے اور تمہارا کہنا بھی درست ہے۔“

”ابا جان کو تو میں نے کسی حد تک قائل کر لیا ہے اور وہ نیم راضی ہیں لیکن امی کی ایک ہی رٹ ہے وہ جانے سے پہلے میری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ نہ جانے کس نے ان کے کان میں پھونک دیا ہے کہ میں امریکی شہریت حاصل کرنے کی خاطر وہاں کی لڑکی سے شادی کرلوں گا۔ تمہی بتاؤ میں اسٹوڈنٹ ویزے پر وہاں پڑھنے کے لیے جارہا ہوں۔ مجھے امریکی شہریت حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”ان کے خدشات اپنی جگہ درست ہیں۔ کیا پتا وہاں کا عیش و آرام اور چکاچوند دیکھ کر تمہارا ارادہ بدل جائے اور تم وہیں پر سکونت اختیار کرلو۔“

وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ”تم عورتوں کی سوچ شادی سے شروع ہو کر شادی پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے ذہن میں کوئی بات نہیں آسکتی۔ جب کہ میرا مسئلہ شادی نہیں بلکہ اپنا مستقبل ہے۔“

”شادی کا تعلق بھی مستقبل سے ہے۔“ میں اسے

Death by thousand cuts

قدیم چین میں مجرموں کو طرح طرح کی اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک سزا کا نام لنگاچی تھا۔ اس سزا کے تحت جلاد مجرم کی گردن کو فوری طور پر نہیں اڑاتا تھا بلکہ تیز چھری سے کھال کا ذرا سا حصہ ایسی مہارت سے کاٹتا تھا کہ بہت زیادہ خون بھی نہ نکلے اور مجرم تڑپتا بھی رہے۔ اس طرح روزانہ کھال کا ایک حصہ کاٹ لیا جاتا اور ماہر جلاد وہ ہوتا تھا جو مجرم کی کھال ایک ہزار حصوں میں کاٹے۔ آخر میں جب کھال نہیں رہتی تھی تو مجرم کی گردن اڑا دی جاتی یا اس کے دل میں چھری گھونپ دی جاتی۔ اس اذیت ناک اور بھیانک موت کو انگریزی میں Deth by thousand cuts کی اصطلاح دی گئی۔ چینی یہ سمجھتے تھے کہ جسے لنگاچی کی سزا ملتی ہے بعد از مرگ اسے مکمل جسم نصیب نہیں ہوتا۔

مرسلہ: آغا نیاز مگسی۔ شہداد کوٹ

چھیڑتے ہوئے بولی۔ ”تم ان کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔“

”پاگل ہو گئی ہو۔ ابھی تو میرا اپنا کچھ پتا نہیں۔ کس طرح اپنا گزارہ کروں گا۔ کہاں رہوں گا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ مجھے نوکری بھی کرنا ہوگی۔ بیوی کے لیے وقت کہاں سے لاؤں گا۔“

”فی الحال تم اکیلے ہی چلے جاؤ۔ جب حالات سازگار ہو جائیں تو اسے بلا لینا۔“

”یہ ناممکن ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ میں یہاں بیٹھ کر کچھ نہیں کہہ سکتا کہ حالات کب سازگار ہوں گے اور نہ ہی میں کسی کو انتظار کی اذیت میں مبتلا کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے لیے جو پلان بنایا ہے فی الحال اس میں شادی شامل نہیں۔ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آجاؤں پھر دیکھا جائے گا۔“

”میں پھر کہوں گی کہ تمہیں چچی کی بات مان لینی چاہیے۔ میں کئی لوگوں کو جانتی ہوں جو وہاں پڑھنے کے لیے گئے تھے لیکن انہوں نے ایک سال بعد ہی بیوی کو بھی بلا لیا۔“

”میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر بیوی کو بلا بھی

لیا تو میں سکون سے پڑھ نہیں سکوں گا اور چار سال کا کورس دس سال میں بھی مکمل نہیں ہوگا۔"

جب میں نے دیکھا کہ وہ کسی طرح قابو نہیں آرہا تو میں نے ایک اور پتا پھینکا۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم فی الحال نکاح کرلو، رخصتی بعد میں بھی ہوسکتی ہے۔"

"کیا ایسی کوئی بے وقوف اور جذباتی لڑکی ہوگی جو چار سال تک میرے نام کی مالا جپتی رہے؟"

"تم اپنے اردگرد نگاہ دوڑاؤ۔ بہت مل جائیں گی۔" میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہاری نظر میں کوئی ایسی لڑکی ہے تو مجھے ضرور بتانا۔" وہ مجھے چھیڑتے ہوئے بولا۔

"شاید تمہاری نظر کمزور ہوگئی ہے۔ قریب کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں۔" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"واہ۔" وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "تم نے تو سارا مسئلہ ہی حل کردیا، میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔"

"اسے کہتے ہیں دیر آید درست آید۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں چچی جان کی بات ماننے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"سوچوں گا۔" وہ شرارتی انداز میں بولا۔ "پہلے ایڈمیشن تو آجائے۔"

میں اپنی کامیابی پر بے حد مسرور تھی۔ گھر آکر میں نے نئے سرے سے اس بارے میں سوچا تو مجھے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ ویسے بھی مجھے اپنے پروگرام کے مطابق ماسٹرز کرنے کے بعد ہی شادی کرنا تھی۔ دو سال تو اسی طرح گزر جاتے۔ اس کے بعد مزید دو سال انتظار کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا اور یہ بھی ممکن ہوتا کہ سیٹل ہونے کے بعد وہ مجھے اس سے پہلے ہی اپنے پاس بلالیتا۔ اگر وہ نکاح کے بغیر چلا جاتا تو میں چار سال تک اس کا انتظار نہیں کرسکتی تھی اور اس کے پیچھے اگر کوئی اچھا رشتہ آجاتا تو میرے پاس اسے مسترد کرنے کا کوئی جواز نہ ہوتا۔

میں اسے نکاح پر قائل کرنے میں کسی حد تک کامیاب تو ہوگئی تھی لیکن اس کے گرد جال کو مضبوط کرنے کے لیے مزید کام کرنا تھا۔ اگر یہ تجویز اس کے گھر والوں تک پہنچ جائے تو یہ کام آسان ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اس کی بہن شگفتہ کو استعمال کرنے کے بارے میں سوچا۔ دوسرے دن میں اس کے ڈیپارٹمنٹ گئی۔ اس کا فائنل سمسٹر چل رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔ "افشاں کہاں غائب ہوگئی ہو۔ اتنے دن سے تمہاری شکل ہی نہیں دکھائی دی۔"

"بس کیا بتاؤں، جب سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا ہے، فرصت ہی نہیں ملتی۔ اتوار کا دن بھی گھر کے کاموں میں گزر جاتا ہے۔"

"آؤ کینٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے کہا۔

میں بھی یہی چاہتی تھی اس لیے فوراً ہی اس کے ساتھ چل دی۔ اس نے میرے لیے چائے اور سموسے منگوائے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "اور سناؤ کیا حال ہے؟"

"کیا بتاؤں۔" وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ "ہمارے گھر میں تو اس وقت زبردست ٹینشن چل رہی ہے۔"

"کیوں خیریت تو ہے کیا ہوا؟"

"وہی انور بھائی کے جانے کا مسئلہ۔ پہلے ابا جان راضی نہیں تھے۔ اب وہ نیم رضامند ہوئے ہیں تو امی نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کردیا۔"

"وہ کیا؟" میں انجان بنتے ہوئے بولی۔

"وہ کہتی ہیں کہ شادی کرکے جاؤ۔ انہیں ڈر ہے کہ انور بھائی وہاں شادی نہ کرلیں۔"

"میرا خیال ہے کہ انور کو چچی جان کی بات مان لینی چاہیے۔"

"وہ کہتے ہیں کہ وہاں پڑھنے جارہے ہیں۔ بیوی کو بلالیا تو پڑھائی ڈسٹرب ہوگی۔"

"ایک کام ہوسکتا ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟"

"ایسا کرو کہ ان کا نکاح کردو۔ چچی جان کا خدشہ بھی دور ہوجائے گا اور انور کو بھی مہلت مل جائے گی اور وہ بیوی کو اپنی سہولت کے مطابق وہاں بلاسکیں گے ورنہ چار سال گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کوئی لڑکی چار سال تک ان کا انتظار کرسکتی ہے؟"

"کیوں نہیں، امریکا جانے والوں کو تو لوگ آنکھ بند کرکے لڑکی دے دیتے ہیں۔"

"تجویز تو تمہاری معقول ہے، دیکھو میں امی سے

بات کرتی ہوں۔ دعا کرو کہ انور بھائی بھی مان جائیں۔"

میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ شگفتہ میری باتوں سے پوری طرح متفق تھی۔ اس نے گھر جاکر چچی جان کے سامنے یہ تجویز رکھی تو وہ بھی نکاح کے لیے تیار ہوگئیں۔ انہوں نے چچا جان سے مشورہ کیا اور انور سے کہا۔ "ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ بے شک تم شادی مت کرو لیکن تمہیں بھی ہماری ایک بات ماننا ہوگی۔" پھر سانس لے کر بولیں۔ "ہم اپنی تسلی اور اطمینان کے لیے تمہارا نکاح کیے دیتے ہیں۔ رخصتی تمہاری مرضی اور سہولت کے مطابق ہوگی۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔" انور نے اعتراض کیا۔ "نکاح کے چھ ماہ بعد ہی لڑکی کے گھر والے رخصتی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کردیتے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" چچی بولیں۔ "یہ بات پہلے ہی طے کرلی جائے گی۔ اگر تم کسی لڑکی میں دلچسپی لے رہے ہو تو ہمیں بتادو۔ ورنہ ہم پر چھوڑ دو۔"

انور نے کہا۔ "مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔"

"ٹھیک ہے تمہارے پاس وقت ہی وقت ہے جب فیصلہ کرلو تو ہمیں بتادینا۔"

دو دن بعد انور ہمارے گھر آیا تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی تو وہ بولا۔ "افشاں میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں کہو۔ میں سن رہی ہوں۔"

"یہاں نہیں ہم کہیں باہر ملتے ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "سات بج رہے ہیں۔ اس وقت تو تمہارے ساتھ باہر جانا ممکن نہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں تمہیں کل یونیورسٹی سے پک کرلیتا ہوں۔ وہی ریستوران ٹھیک رہے گا جہاں ہم اس روز گئے تھے۔"

"اوکے کس وقت آؤ گے؟"

"تم بتاؤ تمہاری کلاس کب ختم ہوگی؟"

"ایک بجے تم کینٹین میں میرا انتظار کرنا۔"

اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گئی کہ ایسی کیا بات ہے جو وہ گھر میں نہیں کرسکتا تھا اور اس کے لیے مجھے ریستوران لے جارہا ہے۔ ضرور اس کا تعلق نکاح والی تجویز سے ہے۔ گویا میرا پھینکا ہوا پتا کام آگیا۔ شگفتہ نے چچی جان سے کہا ہوگا اور وہ اس تجویز سے متفق ہوگئی ہوں گی۔ اب گیند انور کے کورٹ میں ہے۔ دوسری طرف میں نے بھی اشاروں کنایوں میں اس کی منکوحہ بننے پر آمادگی ظاہر کردی تھی اور وہ یقیناً اسی سلسلے میں بات کرنا چاہ رہا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا اور میں مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھوگئی۔

دوسرے دن میں نے یونیورسٹی جانے کے لیے غیر معمولی تیاری کی۔ بہترین لباس زیب تن کیا اور ہلکا سا میک اپ کرکے عبایا پہن لیا تاکہ کلاس کے دوران کسی کی نظر میری سج دھج پر نہ جائے ویسے بھی میں عبایا پہن کر یونیورسٹی جاتی تھی۔ اس روز خاص طور پر حجاب بھی لے لیا۔ اب صرف میری آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ یونیورسٹی میں کوئی بھی لڑکی یا لڑکا دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیتے اس لیے مجھے یقین تھا کہ کوئی بھی مجھ سے حجاب لینے کی وجہ نہیں پوچھے گا۔

کلاس ختم ہونے کے بعد میں کینٹین میں گئی تو وہ ایک کونے کی میز پر بیٹھا میرا انتظار کررہا تھا۔ وہ مجھے اس روپ میں دیکھ کر حیران رہ گیا بولا۔ "تم حجاب لیتی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے حجاب اتار کر بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "لوگوں کی چبھتی ہوئی نظروں سے بچنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔"

"کاش یہ بات دوسری لڑکیوں کی سمجھ میں آجائے جو بے پردہ پھرتی ہیں۔"

"تمہارا بیٹھنے کا ارادہ ہے یا چلیں۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں چلتے ہیں۔ میں تو تمہارے انتظار میں بیٹھ گیا تھا۔"

میں نے اس روز کی طرح ایک بار پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس سے بالکل لگ کر بیٹھ گئی۔ راستہ میں بار بار جھٹکے لگتے رہے اور میں اس سے ٹکراتی رہی لیکن اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ شاید وہ بھی میرے جسم کے لمس سے لطف اندوز ہورہا تھا۔

ریستوران میں پہنچ کر میں نے عبایا اتار کر بیگ میں رکھا اور بولی۔ "تم بیرے کو آرڈر دو میں واش روم سے آتی ہوں۔"

"کیا منگواؤں؟" اس نے پوچھا۔ "ویسے تو یہ کھانے کا وقت ہے۔"

"نہیں، کھانا گھر جا کر کھاؤں گی۔" میں نے بیگ سے اپنا چھوٹا سا پرس نکالتے ہوئے کہا جس میں میک اپ کا سامان تھا۔ "اس کے علاوہ کچھ بھی منگوالو۔"

میں نے واش روم میں جا کر اپنا میک اپ درست کیا اور تازہ دم ہو کر واپس آ گئی۔ اس نے چائے اور اسنیکس منگوائے تھے۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی اور بولی۔ "ہاں اب بتاؤ وہ کیا خاص بات ہے جس کے لیے تم مجھے یہاں لے کر آئے ہو؟"

"پہلے مجھے ایک بات کا جواب دو۔"

"کیا؟" میں چونکتے ہوئے بولی۔ "کیا تم ٹیلی پیتھی جانتی ہو؟"

"نہیں، مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"پھر نکاح والی تجویز امی کے دماغ میں کیسے آئی؟"

"جس طرح میرے دماغ میں آئی۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "جب انسان کسی مسئلہ کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دماغ میں اس کے ممکنہ حل آتے رہتے ہیں۔ انہوں نے بھی اس مسئلے کا یہی حل سوچا ہوگا۔ کیا انہوں نے بھی تم سے یہی بات کہی ہے؟"

"ہاں ان کا کہنا ہے کہ وہ میری شادی پر اصرار نہیں کریں گی اگر میں امریکا جانے سے پہلے نکاح کرلوں۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"تم سے پوچھے بغیر کیا جواب دیتا اسی لیے تو تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔"

"میں...... میں بیچ میں کہاں سے آ گئی؟" میں نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ تم ہی میری مخلص اور سچی دوست ہو جو میری مدد کر سکتی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"اگر تم مجھ سے نکاح کرلو تو یہ مسئلہ بآسانی حل ہو جائے گا۔ تم اتنی سمجھ دار اور باشعور ہو کہ میرے لیے اس دوران کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کروگی اور میں اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کر سکوں گا۔"

"نکاح کی بات آئی تو میں یاد آ گئی۔ اس سے پہلے تو تم نے کبھی ایسی بات نہیں کہی جس سے پتا چلتا کہ تم مجھے پسند کرتے ہو یا مجھ میں دلچسپی لے رہے ہو؟"

"میں ہمیشہ سے ہی تمہیں پسند کرتا ہوں اور میں نے کبھی کسی دوسری لڑکی کے بارے میں نہیں سوچا لیکن میں وقت سے پہلے کوئی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میرا خیال تھا کہ جب شادی کی بات چلے گی تو امی کو اپنی پسند بتا دوں گا۔"

"اور اگر اس سے پہلے میرا کسی دوسری جگہ رشتہ ہو جاتا تو؟"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمہارے رشتے کی بات چلے اور ہمیں معلوم نہ ہو۔ میں ایسی صورت میں فوراً کود پڑتا۔"

"اور اگر میں کسی دوسرے کو پسند کر رہی ہوتی تو پھر تم کیا کرتے؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں لکھی ہوئی تحریر پڑھ لی تھی۔ یہ لطف و کرم، قربت کی خواہش بلاوجہ تو نہیں تھی۔"

اس کے بعد میرے پاس پوچھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "جیسے تمہاری مرضی میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میری محبت کی فتح ہوئی میں جیت گئی۔ انور نے چچی جان کو اپنی پسند بتائی تو وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ میری طرف تو ان کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ چچا جان بھی بہت خوش تھے۔ ان کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی تھی کہ ان کی عزیز از جان بھتیجی بہو بن کر آ جائے۔ وہ تو شادی کرنا چاہ رہے تھے لیکن انور اس پر تیار نہیں ہوا۔ چنانچہ بات نکاح پر ہی آ کر رک گئی۔

چند روز بعد چچی جان نے امی سے فون پر بات کی اور کہا کہ وہ انور کے رشتے کے سلسلے میں آنا چاہتی ہیں۔ امی نے یہ کہہ کر انہیں ٹال دیا کہ وہ ابو سے پوچھ کر بتائیں گی۔ ابو کا تو ایک بہانا تھا۔ دراصل وہ میرا عندیہ لینا چاہ رہی تھیں۔ اس روز جب میں یونیورسٹی سے گھر آئی تو امی نے مجھے چچی کے فون کے بارے میں بتایا۔ میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولیں۔ "ویسے تو انور میں کوئی برائی نہیں۔ ہر لحاظ سے معقول ہے لیکن ابھی وہ صرف نکاح کرنا چاہ رہے ہیں۔ رخصتی چار سال بعد ہوگی۔ کیا تم اتنا عرصہ انتظار کر سکتی ہو؟"

"ضروری نہیں کہ اتنا عرصہ لگے۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو اس سے پہلے بھی رخصتی ہوسکتی ہے۔"

"اوہ۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔ "تو تمہارے درمیان ساری باتیں پہلے ہی طے ہو چکی ہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ابو سے مشورہ کر کے انہیں جواب دے دیتی ہوں۔"

ابو کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ ان کے لیے بھائی سے بڑھ کر کون تھا۔ انور بھی ان کا بھتیجا تھا اس لیے انہوں نے فوراً ہی ہاں کردی۔ امی نے چچی کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ کسی دن آ کر نکاح کی تاریخ مقرر کرلیں۔

میرا نکاح انور سے ہوگیا۔ اس میں چند قریبی رشتے داروں نے ہی شرکت کی۔ ماموں اور ممانی بھی شریک ہوئے۔ ماموں نے حسب معمول منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے امی اور ابو کو مبارک باد دی لیکن ممانی کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں کہ میں شادی کے بعد امریکا چلی جاؤں گی۔ بالآخر ان سے رہا نہ گیا اور وہ بول پڑیں۔ "اے ہے ہم نے تو سنا ہے کہ وہاں پاکستانیوں کو برتن دھونے اور چوکیداری کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ملتا۔"

"محنت کر کے کمانا جائز ہے۔" امی نے کہا۔ "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ وہاں کام کرنے نہیں بلکہ پڑھنے جا رہا ہے۔"

"سب پڑھائی کے بہانے ہی جاتے ہیں۔" ممانی بولیں۔ "پھر جب پیسے ختم ہو جائیں تو پڑھائی چھوڑ کر کام میں لگ جاتے ہیں۔"

"بھابی کبھی تو اچھی بات منہ سے نکال لیا کرو۔" چھوٹی خالہ نے انہیں ٹوکا۔

"مجھے کیا، کوئی کچھ بھی کرے۔ میں نے تو حقیقت بیان کی تھی۔" ممانی منہ بناتے ہوئے بولیں۔

تین ماہ کے اندر انور کے جانے کے انتظامات ہو گئے۔ رخصت ہونے سے قبل وہ مجھ سے ملنے آیا اور صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں جھوٹی تسلی نہیں دے سکتا کہ سال چھ مہینے بعد اپنے پاس بلالوں گا۔ یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہوگا کہ اس میں کتنا وقت لگ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چار سال گزر جائیں اور میں تمہیں نہ بلا سکوں اس لیے تم اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔"

"تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں نے پہلے سے ہی اپنا ذہن بنا لیا ہے۔ وعدہ کرو کہ روزانہ فون کروگے۔"

"یہ وعدہ بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ جب یہاں رات ہوتی ہے تو وہاں صبح [illegible] صبح ہو تو وہاں رات۔ یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہوگا کہ میں [illegible] وقت فون کر سکتا ہوں۔"

میں نے زندگی میں اتنا [illegible] اور صاف گو شخص نہیں دیکھا تھا۔ جھوٹے وعدے اور جھوٹی تسلی جیسے الفاظ اس کی ڈکشنری میں نہیں تھے۔ بہرحال وہ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا۔ کچھ دن تو اس کے فون باقاعدگی سے آتے رہے پھر ان میں کمی واقع ہوگئی اس کی وجہ یہ بتائی کہ بہت محنت کرنا پڑ رہی ہے۔ وہ کلاس ختم ہونے کے بعد بھی لائبریری میں بیٹھا پڑھتا رہتا ہے۔

پہلا سمسٹر ختم ہونے کے بعد اسے یونیورسٹی کی لائبریری میں ہی پارٹ ٹائم جاب مل گئی اب وہ پہلے سے زیادہ مصروف ہوگیا تھا۔ صبح آٹھ سے دو بجے تک یونیورسٹی، پھر دو سے رات آٹھ بجے تک ملازمت اور رات کو پھر پڑھائی۔ جاب ملنے سے یہ فائدہ ہوگیا کہ وہ یونیورسٹی کی فیس اور اپنے کھانے پینے کا خرچا نکالنے لگا لیکن اس کی اتنی آمدنی نہیں تھی کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر مجھے اپنے پاس بلاتا۔

چار سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اس دوران شگفتہ کی شادی ہوگئی۔ وہ اس میں بھی شریک نہ ہوسکا پھر ایک دن اس نے خوش خبری سنائی کہ اس کی تعلیم مکمل ہوگئی ہے اور وہ کانووکیشن کا انتظار کر رہا ہے۔ ڈگری ملتے ہی وہ پاکستان واپس آ جائے گا۔

دونوں گھروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امی نے میری رخصتی کی تیاری شروع کردی اور جہیز اکٹھا کرنے لگیں۔ میں اس کے انتظار میں ایک ایک دن گن رہی تھی کہ اس کا فون آ گیا کہ اسے پی ایچ ڈی کرنے کے لیے اسکالرشپ مل گیا ہے۔ وہ اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا اس لیے اب پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ہی واپس آئے گا۔ اس میں مزید دو سال لگ سکتے ہیں۔

اس خبر کو سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا اور میں ایک بار پھر انتظار کی سولی پر لٹک گئی۔ کون جانے یہ انتظار کتنا طویل ہو کیونکہ میں نے اپنے لیے خود ہی تو یہ سزا تجویز کی تھی سوا اپنی محبت کو پانے کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا ضروری ہے اور یہی اب دعا ہے کہ کسی طرح ترقی کی بھوک ختم ہو اور وہ مجھے مزید انتظار کی کوفت میں مبتلا نہ کرے جلد لوٹ آئے۔

بدمعاش

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
کہانیاں کہیں اور نہیں، ہمارے آپ کے اردگرد بکھری ہوئی ہیں۔ اسے حاصل کرکے الفاظ میں پیرو دینا ہی میرا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں محلوں میں، ریلوے اسٹیشنوں پر، اسپتالوں میں، بازاروں میں ایسے کردار تلاش کرتا رہتا ہوں۔ یہ سچ بیانی میں نے ایک اسپتال میں داخل مریض سے حاصل کی۔ کتنی سبق آموز ہے کہ ایک بہت بڑے بدمعاش کی زندگی بدل گئی۔

آصف علی
(لاہور)

وہ اسپتال کا ایسا وارڈ تھا جس میں صرف دس بستر لگے ہوئے تھے۔

میں اپنے ایک جاننے والے کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اس بے چارے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا اس لیے وہ اس اسپتال میں علاج کروا رہا تھا۔ اس کی مالی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی مہنگے پرائیویٹ اسپتال کے اخراجات برداشت کرسکتا۔

یہ حادثہ ایسا نہیں تھا کہ جس میں کوئی اور بھی ملوث ہو جاتا ہے اور علاج کا خرچ دوسری پارٹی برداشت کرتی ہے بلکہ یہ حادثہ سیڑھیوں سے گرنے سے ہوا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ میں فریکچر ہوگیا تھا۔

اس کے گھر والے اس کو اٹھا کر اسپتال میں لے آئے تھے اور وہ کئی ہفتوں سے اس اسپتال میں تھا۔ اس کی ٹانگ پر موٹا سا پلاسٹر چڑھا تھا۔

میرا گھر اس اسپتال کے راستے میں پڑتا تھا اس لیے میں شام کے وقت اس کے پاس چلا جایا کرتا۔ اس بے وقوف نے پورے وارڈ میں یہ بتا دیا تھا کہ میں کہانیاں لکھا کرتا ہوں۔ ایک رائٹر ہوں وغیرہ وغیرہ۔

اس لیے وارڈ کے مریض سے لے کر نرسیں اور ڈاکٹر تک میری عزت کیا کرتے۔ ویسے ہمارے معاشرے میں ابھی تک یہ بات اچھی ہے کہ رائٹر کو چاہے پیسے ملیں یا نہ ملیں کسی نہ کسی طرح عزت ضرور مل جاتی ہے۔

میں ایک شام جب اس سے ملنے گیا تو اس کے برابر والے بستر پر نیا مریض تھا جب کہ پرانا مریض صحت یاب ہوکر گھر جاچکا تھا۔

نجیب نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”آصف بھائی! آپ اس بندے کو جانتے ہیں۔“ اس کا اشارہ نئے مریض کی طرف تھا۔

میں نے اس مریض کی طرف دیکھا۔ اس کے سر پر موٹی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ چہرے پر بھی نشانات تھے۔ وہ ایک صحت مند انسان تھا۔ باڈی بلڈر قسم کا۔ اس کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا ہی لگ رہا تھا۔

”یار چہرہ کچھ جانا پہچانا تو لگ رہا ہے لیکن یاد نہیں آرہا۔“ میں نے کہا۔

”یہ دلاور دادا ہے۔“ نجیب نے بتایا۔

مجھے اچانک سے یاد آگیا۔ دلاور دادا ایک مشہور آدمی تھا۔ بہت بڑا غنڈا۔ اس کی بہت دہشت تھی۔ دلاور دادا کا یہ حال دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

میں کچھ دیر بیٹھ کر واپس آگیا۔ دوسری شام کو جب میں نجیب کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔ ”یار! یہ دلاور دادا تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

”مجھ سے!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

”اسے معلوم ہوگیا ہے کہ تم کہانیاں لکھتے ہو۔“ نجیب نے بتایا۔ ”مجھ سے کہہ رہا تھا کہ جب تمہارا دوست آئے تو مجھ سے ملوا دینا۔“

”پتا نہیں کیا چکر ہے۔“

”ارے تم چلے تو جاؤ۔ دیکھو کیا بات ہے۔“

میں دلاور دادا کے بستر کے پاس آگیا۔ میں نے اسے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں یار، بیٹھ جاؤ۔“ اس نے بستر کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم سے ایک کام ہے۔“

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”جی دلاور صاحب فرمائیں۔“

”تم کہانیاں لکھتے ہو نا؟“

”جی ہاں۔“ میں نے گردن ہلائی۔

”تم کو میری کہانی لکھنی ہے۔“ اس نے کہا۔

”آپ کی کہانی۔ یعنی آپ کی پوری زندگی کی کہانی۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بھائی، پوری زندگی کی کہانی تو یہاں اسپتال میں بیٹھ کر نہیں لکھ سکتے۔“ اس نے کہا۔ ”صرف ایک واقعاتی کہانی۔ وہ واقعہ جس نے مجھے اسپتال تک پہنچا دیا ہے۔“

میں خوش ہوگیا کیونکہ میں تو خود بھی یہی جاننا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے اس جیسے آدمی کا یہ حال کس نے کیا ہے، اب وہ خود ہی بتا رہا تھا۔

”ضرور، ضرور دلاور صاحب میں ضرور لکھوں گا۔“ میں جلدی سے بولا۔

پھر اس نے جو کچھ بتایا، وہ میں لکھ رہا ہوں۔ اس اُمید پر کہ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات۔

☆......☆

میں نے ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح زندگی گزاری ہے۔ اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو روندتا ہوا بڑھتا گیا ہوں۔ میں نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ میرا نظریہ یہ رہا ہے کہ جس کام کا موقع نہ مل سکا وہ جرم ہے اور جس کا موقع مل جائے اس سے فائدہ اٹھالو۔ اس کے بعد بھول جاؤ کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا۔

ایسا نہیں ہے کہ میرے سینے میں دل نہیں رہا۔ حالانکہ میں صرف ایک ہی واقعے کی کہانی سنا رہا ہوں لیکن اس کے سلسلے بہت دور تک چلے گئے ہیں۔ اس کے راستے رضوانہ سے جاکر ملتے ہیں۔

”اور یہ رضوانہ کون ہے دلاور صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”میری پہلی محبت۔“ اس نے بتایا۔ ”ویسے تو رضوانہ کے بعد اور بھی لڑکیاں میری زندگی میں آتی رہیں لیکن جس کو محبت کہتے ہیں وہ میں نے رضوانہ ہی سے کی تھی اور اس نے مجھے ایک سیدھے سادے بندے سے ایک بدمعاش بنا دیا۔“

”دلاور صاحب اب وہ رضوانہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھو یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں تو تمہیں صرف وہ خاص واقعہ بتا رہا ہوں۔ رضوانہ کا ذکر اس لیے آگیا کہ اس سے بچھڑے ہوئے بارہ تیرہ برس ہوچکے ہیں لیکن پچھلے دنوں وہ اچانک میرے سامنے آگئی۔“

”اوہ یعنی وہ لڑکی واپس آگئی۔“

”یہ وہ نہیں بلکہ کوئی اور تھی بالکل رضوانہ کی طرح۔ اب سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی رضوانہ۔ اس کے چلنے کا انداز، اس کا قد، اس کا چہرہ، سب کچھ میری رضوانہ کی طرح ہے۔



میں تو اس کو دیکھ کر بے خود ہو گیا تھا۔ دراصل یہی وہ واقعہ ہے، جس کی کہانی میں لکھوا رہا ہوں۔"

"سمجھ گیا۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "یعنی اس کہانی کی ابتداء وہاں سے ہوتی ہے جب آپ نے رضوانہ کی کسی ہم شکل کو دیکھ لیا۔"

"ہاں وہیں سے اس واقعے کی ابتداء ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "میں تو اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا اور میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ یعنی میں اس کا پیچھا کرنے لگا۔ بالکل کسی لوفر کی طرح۔ جیسا کہ لڑکے عام طور پر کیا کرتے ہیں کیونکہ اس کے سامنے میں دلاور دادا نہیں بلکہ سترہ اٹھارہ سال پہلے کا نوجوان دلاور تھا۔ اگر یہ دلاور آج کا ہوتا تو پھر مجھے اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے ایک اشارے پر میرے آدمی اسے اٹھا کے لے آتے لیکن میں اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔"

"اس سے یہ بات بھی سامنے آئی دلاور صاحب کہ اس رضوانہ سے بھی آپ کے تعلقات صاف ستھرے رہے ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

وہ ہنس پڑا۔ "رائٹر ہونا اس لیے معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔ ہاں بہت صاف ستھرے تعلقات تھے کیونکہ میں نے اس سے محبت کی تھی۔ صرف وقت نہیں گزارا تھا۔ بہرحال وہ ایک دوسری کہانی ہے۔ تمہیں اس کی ہم شکل کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ میں نے اس کا کئی بار پیچھا کیا اور اس کا گھر معلوم کر لیا۔"

"کیا آپ اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بالکل بھی نہیں۔" اس نے نفی میں اپنی گردن ہلائی۔ "صرف اس کو دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں تم اس کیفیت کو محسوس کر سکو یا نہ کر سکو لیکن بات صرف اتنی ہے کہ میں اس کی طرف دیکھنا چاہتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دیر تک کیونکہ اس کو دیکھ کر رضوانہ یاد آ جاتی تھی۔"

میرے سامنے اس بدمعاش شخص کی فطرت کا ایک مختلف پہلو سامنے آنے لگا تھا۔ اس کا دل نرم جذبات اور احساسات سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کسی کی محبت کو جگہ دے رکھی تھی۔

عام طور پر اس قسم کے لوگ ایسا سافٹ کارنر نہیں رکھتے۔ بے بس ہوا کرتے ہیں کوئی لڑکی جب تک ان کے ساتھ ہے ٹھیک ہے پھر کہاں کی یاد اور کیسی یاد لیکن اس نے تو اپنے دل میں اپنی رضوانہ کی یادوں کو بسا رکھا تھا۔

"پھر یہ ہوا بھائی کہ وہ لڑکی مجھ سے چڑنے لگی۔ اس نے پھر اپنی کہانی شروع کی۔ "وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی۔ ظاہر ہے اس نے مجھ سے بات تو نہیں کی تھی لیکن اس کے تاثرات یہی بتاتے تھے۔"

"دلاور صاحب میرا خیال ہے کہ اس میں اس لڑکی کا کوئی قصور نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔ "کسی بھی لڑکی کا اگر اس طرح پیچھا کیا جائے تو اسے برا تو لگے گا۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اس لیے میرے دل میں اس کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں آئی جب کہ اس نے ایک بار میری طرف دیکھ کر برا سا منہ بنا کر زمین پر تھوک بھی دیا تھا لیکن پھر بھی مجھے اس پر غصہ نہیں آیا اگر اس کی جگہ کسی مرد نے ایسی حرکت کی ہوتی تو میں اسے پھاڑ کر رکھ دیتا۔"

"آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس کو بتا دیتے کہ آپ کس لیے اس کا تعاقب کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ کیا وہ میرا یقین کر لیتی، کبھی نہیں اس لیے میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور ایک دن وہ خود ہی میرے پاس آ گئی۔"

"آپ کے پاس آ گئی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میرے پاس آ گئی۔" اس دن بھی میں اس کے پیچھے تھا کہ اس نے گھر کی طرف جاتے جاتے اپنا رخ بدلا اور تیر کی طرح چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ وہ غصے سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ "بدمعاش انسان تم نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔ آئندہ اگر تم نے میرا پیچھا کیا تو میرے بابا تمہیں پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ میں نے ابھی تک انہیں کچھ نہیں بتایا ہے لیکن اب بہت ہو گئی۔"

اور اس وقت میرے اندر کا الاؤ جاگ اٹھا۔ میں نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ "اوہو اپنے بابا کی دھمکی دے رہی ہو۔ کون ہے تمہارا بابا۔"

"رستم نام ہے میرے بابا کا۔" اس نے بتایا۔ "اور وہ رستم ہی ہیں۔"

"تمہارا بابا بے چارہ صرف نام کا رستم ہو گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے تم یقین کرو کہ... میں لاکھ بدمعاش سہی لیکن تمہارے معاملے میں بے حس ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں تو خود تم سے بات کر کے بتانے والا تھا کہ میرے اس پاگل پن کا سبب کیا ہے کہ وہ چمک کر بولی۔ "ٹھیک ہے، اب میرے بابا ہی تم سے نمٹ لیں گے۔"

اتنا کہہ کر وہ تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ مجھے اس کی معصومیت پر پیار آنے لگا تھا۔ وہ بے چاری مجھ جیسے انسان کو اپنے بابا کی دھمکی دے رہی تھی۔ بابا سے ڈرا رہی تھی۔ خیر میں ہنستا ہوا واپس آ گیا۔

دوسرے دن میں نے پھر اس کا پیچھا کیا اور تیسرے دن اس کا بابا یعنی رستم میرے سامنے آ گیا۔

"تو وہ رستم ہی کی طرح ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں تو اس کہانی کا اصل موڑ سامنے آتا ہے۔ وہ بے چارہ ایک مریل سا بوڑھا آدمی تھا۔ جب کہ وہ رستم کہہ رہی تھی اور جس کا نام ہی رستم تھا اور جس کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے پھاڑ کر رکھ دے گا، وہ تو بے چارہ ایسا تھا کہ میں اگر زور سے ڈانٹ دیتا تو اس کی ہوا خراب ہو جاتی۔"

"کمال ہے۔" میں بڑبڑایا۔

میں اس وقت اپنے دو چار دوستوں کے ساتھ محلے کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مریل سا انسان میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کی سانسیں بھی پھول رہی تھیں۔ "تم ہمارے محلے میں آ کر لڑکیوں کو پریشان کرتے ہو۔" اس نے غصے سے پوچھا۔

"بڑے میاں کون ہو تم!" میں نے پوچھا۔

"وہ میری بیٹی ہے۔ تم جس کے پیچھے پڑے ہو۔" اس نے کہا۔

"اوہ تو تم ہی رستم ہو۔" میں ہنس کر بولا۔ "بڑے میاں تمہاری بیٹی نے تو مجھے بڑی دھمکیاں دی ہیں کہ تم مجھے پھاڑ کر رکھ دو گے۔ چیر دو گے مجھے۔"

"ہاں اگر تم نے آئندہ اس کی طرف دیکھا بھی تو میں تمہاری آنکھیں نکال لوں گا۔" وہ غصے سے غرایا۔ "تو نہیں جانتا کہ میں کتنا طاقت ور ہوں۔ ایک جوان لڑکی کا باپ ہوں اور کسی لڑکی کے باپ کو کمزور سمجھنے کی غلطی کبھی مت کرنا۔"

"ارے جاؤ بڑے میاں۔" میں نے اس بے چارے کو ہلکا سا دھکا دے دیا۔ کمزور تو تھا ہی وہ اچھل کر ایک میز سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ میرے دوست سب ہنسنے لگے تھے اور اس وقت اچانک میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی لہرا گئی۔ جب ایک پہاڑ سر پر آ گرا ہو۔ بڑے میاں جس میز سے ٹکرا کر گرے تھے اس پر شیشے کا ایک جگ رکھا ہوا تھا، اس نے پوری طاقت سے وہ جگ میرے سر پر دے مارا۔ یہ ناگہانی چوٹ تھی اس لیے برداشت نہیں کر سکا۔ میرا سر پھٹ گیا تھا۔ خون بہتا ہوا آنکھوں پر آنے لگا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اسی وقت بڑے میاں نے میز پر رکھا ہوا گلاس بھی میرے چہرے پر دے مارا۔ ذرا سی دیر میں اچھا خاصا زخمی کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد مجھے برا بھلا کہتے ہوئے ہوٹل سے باہر چلے گئے۔ میرے دوست اور دو چار آدمیوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے منع کر دیا کہ کوئی اس کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ میرے دوست مجھے اٹھا کر اسپتال لے آئے، بس یہ ہے وہ کہانی وہ واقعہ جس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔"

"کمال ہے دلاور صاحب آپ ایک کمزور بوڑھے سے مار کھا گئے۔" میں نے کہا۔

"میں نے بچپن میں ایک کہانی سنی تھی اگر کہو تو تمہیں بھی سنا دوں۔ معاملہ خود تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔"

"جی دلاور صاحب سنائیں کیا کہانی ہے۔"

"کہانی یہ ہے کہ بڑے دریا کے کنارے ایک درخت تھا۔ اس درخت پر ایک چڑیا نے اپنا گھونسلا تیار کر رکھا تھا۔ وہ گھونسلا جس شاخ پر تھا وہ شاخ دریا کی طرف جھکتی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ چڑیا کا ایک بچہ شاخ سے دریا میں جا گرا۔ دریا نے اس بچے کو چھپا لیا۔ چڑیا نے بے قرار ہو کر اِدھر اُدھر اڑنا شروع کر دیا۔ اس نے دریا سے کہا۔ "دریا میرے بچے کو باہر نکال دے ورنہ میں تیرا سارا پانی پی جاؤں گی۔ تو سوکھ جائے گا۔ کچھ دیر بعد دریا نے اس بچے کو باہر پھینک دیا۔ درخت یہ تماشا دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ دریا نے پوچھا۔ "کیوں ہنس رہے ہو۔" درخت نے کہا۔ "کمال ہے تم اتنے بڑے دریا ہو، اتنے خطرناک دریا ہو اور ایک چھوٹی سی چڑیا سے ڈر گئے۔" دریا نے جواب دیا۔ "بے وقوف درخت میں اس چڑیا سے نہیں ڈرا بلکہ اس کی ممتا سے ڈر گیا ہوں۔ سمجھ گئے۔ تو میں نے بھی اس آدمی سے مار نہیں کھائی بلکہ ایک باپ کی شفقت اور محبت سے مار کھائی ہے اور اس واقعے سے تم کہانی لکھ کر سب کو بتا دو کہ کسی باپ یا بھائی کی غیرت کو چیلنج کرنے کی کوشش کوئی نہ کرے ورنہ ماں کی ممتا اور باپ کی غیرت بہت کچھ کر سکتی ہے۔"

میں نے فرطِ عقیدت سے دلاور کا ہاتھ تھام لیا۔ "دلاور صاحب! تم ایک بہت بڑے انسان ہو۔ تم نے اس واقعے کے ذریعے بہت سے لوگوں کو بہت بڑا سبق دے دیا ہے۔ میں یہ کہانی ضرور لکھوں گا ضرور لکھوں گا۔"

پشیمانی

ڈیئر ایڈیٹر
السلام علیکم
مجھے اردو سے بس اتنا شغف ہے کہ کبھی کبھی اردو کے رسائل پڑھ لیتا ہوں جس میں سرفہرست سرگزشت ہے۔ اس میں معلومات زیادہ ہیں اس لیے میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے سوچا کہ اپنی کہانی بھی لکھ لوں جو میرے ضمیر پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ جو موبائل فون پر ایس ایم ایس بھیجنے کا شوق رکھتے ہیں وہ سبق حاصل کر لیں۔

نفیس کمال
(فیصل آباد)

میں اس وقت اپنے کام کے سلسلے میں ایک ضروری میٹنگ میں تھا کہ موبائل پر کسی کے میسج کا سگنل آ گیا۔
میں نے ساتھ والوں کو سوری کہہ کر موبائل دیکھا۔ اس پر درخشاں کا میسج تھا۔ اس نے پوچھا تھا۔ ''اب تمہاری کھانسی کیسی ہے۔''
غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے اس میسج کا جواب دے دیا۔ ''اب ٹھیک ہے میں اس وقت ایک ضروری میٹنگ میں ہوں۔'' ابھی دو چار ہی باتیں کی تھیں کہ موبائل پھر سگنل دینے لگا۔ اس بار اس نے لکھا تھا۔ ''دیکھو تم زیادہ دیر تک میٹنگ میں نہ بیٹھو۔ تمہاری کمزوری ابھی گئی نہیں ہے۔''
میں نے ایک بار پھر جواب دیا۔ ''درخشاں میں اس وقت بزی ہوں پلیز۔''
درخشاں سے میری ملاقات دو چار مہینے پہلے ہی ہوئی تھی۔ وہ میرے ایک جاننے والے کے توسط سے مجھ تک آئی تھی۔ انتہائی خوب صورت اور انتہائی معصوم۔ اس کو دیکھ کر اس بات کا افسوس ہوا تھا کہ اس جیسی لڑکی شوبز کے چکر میں تھی۔
اتنے برسوں کے بعد اس بات کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہے کہ اس فیلڈ میں آنے والی مختلف لڑکیاں کس انداز کی ہوتی ہیں۔ ان کو شوق لے کر آتا ہے۔ تفریحاً اور ایڈونچر کے لیے آتی ہیں۔ شہرت کی تمنا ہوتی ہے اور کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو مجبوریاں اس میدان میں کھینچ لاتی ہیں۔
ان کی آنکھوں میں خواب ہوتے ہیں۔ ان کی چھوٹی بہنیں ہوتی ہیں، ماں ہوتی ہے، باپ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اور وہ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس کوچے میں قدم رکھ دیتی ہیں۔
پھر ان کے ساتھ بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ انہیں برباد کر دیا جاتا ہے، انہیں سنہرے خواب دکھا کر انہیں کسی قابل نہیں رہنے دیا جاتا۔
یہ لڑکی جو میرے پاس آئی اس کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی مجبوریاں اس کو یہاں تک لے آئی ہیں۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور بہت معصوم۔ اس کے بات کرنے کا انداز ہی بہت دل کش تھا۔ بار بار پلکیں جھپکا کر بولا کرتی۔ کسی نے اسے میرے پاس بھیجا تھا۔
اس کو دیکھ کر مجھے افسوس بھی ہوا تھا اور غصہ بھی آیا تھا۔ ''تم کیوں اس فیلڈ میں آنا چاہتی ہو۔'' میں نے پوچھا۔
''یوں ہی۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''بس یونہی۔''
''دیکھو میرا اندازہ ہے کہ تم کو اس فیلڈ کا نہ تو شوق ہو گا اور نہ ہی کوئی تجربہ ہو گا، کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''
''جی...... جی ہاں وہ تو میری ایک جاننے والی نے کہا تھا۔ اس نے حمید صاحب سے بات کی تھی۔ حمید ان کا نام تھا جن کے حوالے سے وہ میرے پاس آئی تھی۔''
''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے گھر کے حالات



ٹھیک نہیں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔
اس نے اپنی گردن جھکا لی۔ اس کا مطلب اعتراف تھا۔
پھر بڑی مشکلوں سے اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا تھا۔ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ باپ ایک محنت کش تھا۔ ماما شوگر کی مریضہ تھی۔ ہر مہینے اس کی دوائیاں آیا کرتیں جو اچھی خاصی مہنگی ہوتیں، اس نے کسی طرح بی اے کر لیا تھا۔ نوکری تلاش کرتی رہی، لیکن نہیں ملی۔ اس کا خواب یہ تھا کہ وہ کسی طرح اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کو اچھی تعلیم دلوا سکے۔
اس لڑکی کی دو باتیں ایسی تھیں جو بہت اچھی بھی تھیں اور بہت خطرناک بھی۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ وہ اچھی خاصی خوب صورت تھی، میرا خیال تھا کہ شوبز میں موجود بہت سی لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت اور یہی اچھائی اس کے لیے مصیبت بن جاتی تھی۔
وہ جہاں جاتی، نگاہوں نگاہوں میں اس کا آپریشن شروع ہو جاتا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو بچا کر رکھا تھا لیکن کب تک۔ بھیڑیوں کے جنگل میں ایک کمزور لڑکی اپنے آپ کو کیسے بچا سکتی تھی اور دوسری بات اس کی معصومیت تھی اگر حسین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ تیز اور طرار بھی ہوتی تو شاید اپنے آپ کو بچا کر نکال لیتی، لیکن وہ معصوم تھی جس کو ہمارے یہاں بھولا کہا جاتا ہے ایسی لڑکی کے ساتھ کہیں بھی کچھ بھی ہو سکتا تھا۔
مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی۔ دل چاہا کہ اس کی حفاظت کروں، اس کو زمانے کی نگاہوں سے بچا لوں۔ اس فیلڈ میں بہت سی لڑکیوں سے واسطہ رہا ہے لیکن کسی کے لیے ایسے جذبات نہیں جاگے تھے۔
میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس کو بھٹکنے نہیں دوں گا اور ہر ممکن حد تک اس کی مدد کروں گا۔
میں نے اس سے کہا۔ ''درخشاں! تمہارا پرابلم بھی ہے نا کہ تم اپنا گھر چلانا چاہتی ہو۔''
''جی ہاں۔'' اس نے معصومیت سے گردن ہلا دی۔ ''اور مجھے کیا چاہیے اس لیے تو ٹی وی پر آنا چاہتی ہوں۔''
''اب اس کی ایک شرط ہے۔'' میں نے کہا۔
''شرط۔'' وہ کچھ گھبرا گئی۔ ''کیسی شرط۔''
''تم گھبراؤ نہیں میں دوسروں سے مختلف انسان ہوں۔ میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری یہ اچھائی برقرار رہے۔''
''بتائیں میں کیا کروں۔''
''پہلے تو اس بات کا وعدہ کرو کہ تم مجھے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھو گی۔ اس کے بعد کچھ بتاؤں گا۔''
کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر گردن ہلا دی۔ اس کا یہ انداز بھی بہت خوب صورت تھا۔ ''جی ہاں میں آپ کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھنے لگی ہوں۔'' اس نے کہا۔
''اور میں جو مشورہ دوں گا تم مانو گی۔''
''جی ہاں آپ جو مشورہ دیں گے وہ مانوں گی۔''

"تو پھر میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ تم یہ شوبز کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔" میں نے کہا۔ "تم یقین کرو اس میں تمہاری بھلائی ہے۔"

پھر میں اس کو سمجھاتا رہا کہ اس جیسی لڑکی کے لیے یہ فیلڈ کس طرح مناسب نہیں ہے۔

میرے خاموش ہو جانے کے بعد پھر اس نے کہا۔ "تو پھر آپ بتائیں میں کیا کروں۔"

"ہاں یہ ایک اہم سوال ہے۔ میں کسی مناسب جگہ تمہاری جاب کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور وہاں سے جو کچھ ملے اسی میں گزارا کرنے کی کوشش کرو، یاد رکھو لڑکیوں کے لیے ان کی عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی اگر دامن پر ایک دھبا بھی آ گیا تو ساری زندگی کا پچھتاوا ہو گا۔"

"آپ پہلے آدمی ہیں جس نے مجھ سے ایسی باتیں کی ہیں۔" وہ مجھ سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔

"اس لیے کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ بہر حال اب تم جاؤ اور مجھ سے رابطہ رکھنا۔ تمہارے پاس کوئی نمبر تو ہو گا۔"

"ہاں میں نے پچھلے مہینے ہی پیسے جمع کر کے یہ موبائل سیٹ خریدا ہے۔" اس نے اپنے بیگ سے ایک موبائل سیٹ نکال کر دکھایا۔ جو بہت سستا سا سیٹ تھا۔

"ہاں بہت اچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب اپنا نمبر بھی دے دو۔"

اس نے اپنا نمبر دے دیا تھا۔ پھر وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ میں اس کے لیے واقعی سنجیدہ اور مخلص ہو رہا تھا اس لیے میں نے اس کی جاب کی کوشش شروع کر دی۔

میرا ایک دوست ٹریول ایجنسی چلاتا تھا۔ میں نے اس سے بات کی تو اس بھلے انسان نے فوراً ہی آمادگی ظاہر کر دی۔

"مکرم! وہ لڑکی بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ جہاں جائے اس کو پروٹیکشن ملتی ہے۔"

"اوہو، کیا معاملہ اتنا ہی سیریس ہے۔" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"ہاں یار! کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

"پھر تو کوئی بات ہی نہیں۔ بے کھٹکے ہونے والی بھابی کو میرے پاس بھیج دو۔" اس نے کہا۔

میں نے دوسرے ہی دن درخشاں کو اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس نے اپنی جاب شروع کر دی۔ اس کی تنخواہ بھی معقول مقرر ہوئی تھی۔

دو چار دنوں کے بعد دوست نے مجھے فون کر کے درخشاں کی تعریف کی۔ "یار وہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔" اس نے بتایا۔ "ماشاء اللہ خوب صورت تو ہے ہی اس کے ساتھ وہ ذہین اور محنتی بھی ہے۔ اس نے بہت جلدی نہ صرف کام سیکھ لیا ہے بلکہ بڑی خود اعتمادی سے معاملات کو ہینڈل بھی کر لیتی ہے اور ہر وقت تمہاری تعریف کرتی رہتی ہے۔"

"اب تم مجھ سے جیلس مت ہو جانا۔"

"یار وہ تو ہونے لگا ہوں۔"

رفتہ رفتہ میں اور درخشاں ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے، بے تکلفی یہاں تک ہو گئی کہ اب میں اس کے لیے آپ نہیں بلکہ تم تھا۔

وہ بے تکلف کسی بھی چیز کی فرمائش کر دیا کرتی۔ "سنو مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے میرے لیے زنگر برگر بھجوا دو پلیز۔"

میں اس کی بات ٹال نہیں پاتا تھا۔ اس کے لیے برگر بھجوا دیتا یا جو وہ کہتی۔

کچھ دنوں تک تو اسی طرح چلتا رہا پھر اس کی ایک عادت نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ وہ عادت تھی اس کی حد سے بڑھی ہوئی توجہ۔

ذرا ذرا سی بات پر اس کا میسج آ جاتا۔ کیا کر رہے ہو؟ تم نے ناشتا ٹھیک سے کیا ہے۔ ہاں دودھ پینا تو بھول گئے ہو گے، سگریٹ کم کر دو خدا کے لیے۔ تمہاری چائے کی عادت بہت خراب ہے۔ خود پر کنٹرول کرو، کل تم جس ڈریس میں آئے تھے وہ ڈریس تم کئی دنوں سے پہن رہے ہو، اتنا ہی نہیں بلکہ ہر وقت اور ہر موقع پر اس کا میسج آ جاتا۔

شروع شروع میں تو یہ سب بہت اچھا لگا تھا۔ ایک عجیب سے فخر کا احساس ہوتا تھا کہ کوئی ہے جس کو میرا اتنا خیال ہے، جو مجھ سے اتنا پیار کرتا ہے جس کو ہر دم میری صحت کی فکر لگی رہتی ہے۔

یہ سب شروع شروع میں ٹھیک تھا۔ بعد میں بوریت سی ہونے لگی۔ میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ میسج آ گیا کسی میٹنگ میں ہوں میسج آ گیا۔ پرابلم یہ تھی کہ میں اس کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ناراض ہو جاتی تھی۔

ایک بار میں نے میسج کا جواب ذرا تلخی سے دیا تھا تو اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا۔ تقریباً بیمار ہی پڑ گئی تھی۔

میرے جاننے والے میری قسمت پر رشک کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ دوست جس کے پاس میں نے درخشاں کو جاب دلوائی تھی۔ وہ کہا کرتا۔ "یار! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے اسے کیا گھول کر پلا دیا ہے یا اس پر کون سا جادو کر رکھا ہے۔"

"کیوں کیا پھر کوئی بات ہو گئی۔"

"بات تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ پوری دنیا میں اسے تمہارے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ وہ کسی کو بھی تمہارے مقابلے کا.... نہیں سمجھتی۔ صرف ایک کام آتا ہے تمہاری باتیں کرنا۔"

"یار سچ یہ ہے کہ مجھے خود اس کی ایسی محبت سے خوف آتا ہے۔"

"خوف کی کیا بات ہے۔ نہ شک کرو اپنے آپ پر۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ کیا کمی ہے اس میں۔"

"بڑی بڑی فلم اسٹار اس کے آگے جھاگ کی طرح ہیں۔ خدا نے اسے حسن کے ساتھ ذہانت اور وفاداری کا جذبہ بھی دیا ہے۔ ایسی مثال بہت کم ملتی ہے۔"

"یہ تو ہے۔" میں اعتراف کرتا ہوں۔ "درخشاں ایک بے مثال لڑکی ہے۔"

لیکن اس بے مثال لڑکی نے اب بور کرنا شروع کر دیا تھا۔

انسان کی نیچر بھی کیا ہوتی ہے اگر کوئی توجہ نہ دے تو شکایت اور توجہ مل رہی ہو تو شکایت۔ میرا خیال ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی توجہ بھی باعث زحمت ہو جاتی ہے۔

ایک بار مجھے معمولی سا نزلہ زکام ہوا تھا۔ جو عام طور پر ہو جاتا ہے۔ خدا کی پناہ اس نے تو پریشان کر کے رکھ دیا۔

اس کے اتنی میسجز آئے تھے کہ میرے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ "بھاپ لی یا نہیں لی، جوشاندہ استعمال کیا، دن میں کتنی بار استعمال کیا، ٹھنڈا پانی تو نہیں پی رہے، ریفریجریٹر کو کچھ دنوں کے لیے بند ہی کر دو اور ہاں جب باہر نکلو تو اپنے ساتھ رومال رکھ لیا کرو، وغیرہ وغیرہ۔"

میں اسے سمجھاتا۔ "خدا کی بندی اتنے میسجز نہ کیا کرو۔ تمہاری توجہ سے میں مغرور ہوتا جا رہا ہوں۔"

"یہی تو میں چاہتی ہوں کہ تم مغرور ہو جاؤ۔" وہ ہنس کر کہتی۔ "میری طرح، میں بھی تو تمہارے لیے مغرور ہوں۔"

میں نے اب اس کے گھر بھی آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کے گھر والے بھی بہت اچھے تھے۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھا کرتے لیکن اتنا پاگل پن نہیں تھا، جتنا پاگل پن اس لڑکی میں تھا۔

میں نے ایک بار اس سے کہا۔ "درخشاں! میں اب تمہارے لیے سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب!" وہ چہک کر بولی۔ "کیا اب تک سنجیدگی سے نہیں سوچ رہے تھے۔"

"تمہارے لیے تو میں شروع سے سنجیدہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس تعلق کو کسی رشتے کی زنجیر سے منسلک کر دیا جائے۔"

"اوہ، سمجھ گئی۔" اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ "اب میں کیا کہہ سکتی ہوں تم نے جو سوچا ہے ٹھیک ہی سوچا ہو گا۔"

"اگر میں تمہارے گھر والوں سے بات کر لوں تو۔" میں نے پوچھا۔

"اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔ آ جاؤ کسی دن؟"

اس کے گھر والے شاید میرے پہل کرنے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ "ارے بیٹا! ہمارے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو گی کہ درخشاں کو تم جیسا خیال رکھنے والا جیون ساتھی مل جائے۔" اس کی ماں نے کہا۔

"آنٹی میرے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسا بڑا نہیں ہے جس کو میں اس قسم کی بات کرنے کے

لیے آپ کے پاس بھیجتا۔ اس لیے خود ہی اپنا پیغام لے کر آ گیا ہوں۔"

"بیٹا اتنے دنوں میں ہم نے تم کو بہت اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ درخشاں کے لیے تم سے بہتر کوئی نہیں ہوسکتا۔ ہم تیار ہیں تم جو رسم مناسب سمجھو وہ کرلو۔"

فی الحال شادی یا نکاح چونکہ نہیں ہوسکتا تھا اس لیے میں نے منگنی کی تجویز پیش کی۔ وہ بے چارے تو ہر حال میں تیار تھے۔ فوری طور پر ہاں کر دی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر درخشاں سے میری منگنی ہوگئی۔

اس موقع پر دوستوں نے کھل کر مبارک باد دی۔ خاص طور پر میرا وہ دوست بہت خوش تھا جس کے یہاں درخشاں جاب کر رہی تھی۔ اس نے اس موقع پر درخشاں کو اس کی سیلری میں ہزار روپے اضافہ کا تحفہ بھی دیا تھا۔

پرابلم یہ ہوئی کہ منگنی کے بعد درخشاں کی توجہ میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

اب اس کے میسیج ذرا ذرا سی دیر میں آجایا کرتے۔ ایک بار اس کا فون آیا۔ "مجھ سے جلدی ملو، تم سے ایک ضروری کام ہے۔"

"کام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اس وقت میں اپنے کام کے سلسلے میں کسی کے پاس میٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔"

"میٹنگ ہوتی رہے گی۔ یہ کام بہت ضروری ہے۔ تم آدھ گھنٹے کے اندر اسکائی میں پہنچ جاؤ۔"

اسکائی ایک معقول ریستوران کا نام تھا۔ میں کبھی کبھی درخشاں کو وہیں لے جایا کرتا اس لیے اسے اسکائی یاد رہا تھا۔

میں نے میٹنگ والوں سے کہہ دیا کہ یہ میٹنگ کل پر رکھی جائے اور خود اسکائی پہنچ گیا۔ درخشاں وہاں پہلے سے انتظار میں تھی۔

"ہاں بھئی کیا مسئلہ درپیش ہوگیا۔" میں نے پوچھا۔

"ہے ایک مسئلہ۔" اس نے کہا۔ "تمہاری ساری شرٹس پرانی ہوچکی ہیں ایک دو ہیں تو وہ تم پر سوٹ نہیں کرتیں۔"

"تو پھر۔"

"پھر یہ کہ میرے ساتھ سامنے شاپنگ مال میں چلو تمہارے لیے تین چار شرٹس لینی ہیں۔"

"اوہو، بس یہ کام تھا جس کے لیے تم نے اتنی ایمرجنسی میں بلایا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "تم دن میں دس لوگوں سے ملتے ہو۔ تمہاری میٹنگز چلتی رہتی ہیں تو کیا تمہارا لباس اچھا نہیں ہونا چاہیے۔"

"بے وقوف لڑکی اگر تم یہ پہلے سے بتا دیتیں تو میں کچھ پیسے لے کر آتا۔"

"اس کی پروا مت کرو۔ مجھے کل ہی سیلری ملی ہے۔" اس نے کہا۔ "بہانہ نہیں چلے گا۔ چلو میرے ساتھ۔"

وہ مجھے لے کر مال میں آ گئی۔ اسے یہ اندازہ تھا کہ میرے پسندیدہ رنگ کون کون سے ہیں۔ اس وقت کچھ لوگ بہت حیرت اور دلچسپی سے یہ سب دیکھ رہے تھے جب وہ پوری توجہ اور محبت کے ساتھ مختلف رنگ کی شرٹس مجھے دکھا کر پوچھتی کہ یہ کیسی رہے گی یہ کیسی رہے گی۔

درخشاں جیسی خوبصورت لڑکی جب کسی پر اتنی توجہ دے رہی ہو تو لوگ ویسے ہی جیلس ہونے لگتے ہیں۔

بہر حال اس کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی۔

میں اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا کہ مجھے ایسی بیوی ملنے والی ہے جو میرے ایک ایک اشارے کو سمجھتی ہے۔ جو مجھ سے والہانہ پیار کرتی ہے۔

یہ سب اپنی جگہ درست تھا لیکن اس کی وہی ہر وقت کی توجہ، ہر وقت کے میسیجز، اس نے میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اسے سمجھایا۔ "درخشاں اتنے میسیج مت کیا کرو، میں پریشان ہو کر رہ جاتا ہوں۔"

"نہ جانے کیوں مجھے سکون نہیں ملتا۔" اس نے کہا۔ "ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ جب تک تمہارے جواب سے میری تسلی نہ ہو جائے۔ مجھے چین نہیں ملتا۔"

"یہ بتاؤ کیا شادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "یہ اور بات ہے کہ شادی کے بعد تو بہت کچھ بدل جائے گا۔ کیا کر رہے ہو۔ تمہاری سیکریٹری تو تمہارے سامنے نہیں بیٹھی، لنچ لیا یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔"

اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔

میں ایک پارٹی کے ساتھ ڈنر میں تھا کہ موبائل پر میسیج وصول ہوا۔ اسی کا میسیج تھا۔ میں نے پڑھے بغیر موبائل کو آف کر دیا۔ کچھ دیر بعد دوسرا میسیج آیا۔ پھر تیسرا

میں نے میسیج کھولا ہی نہیں۔ اتنا غصہ آرہا تھا کہ اگر وہ سامنے ہوتی تو میں اسے جی بھر کے باتیں سنا ڈالتا۔

رات گئے گھر واپس آ کر موبائل آف کر کے سو گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ صبح اٹھتے ہی فون کر کے اسے خوب ڈانٹوں گا۔

لیکن صبح میرے فون کرنے سے پہلے ہی اس کا فون آ گیا۔ میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف درخشاں کی امی کی آواز آئی وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھیں۔

میں بھی گھبرا گیا تھا۔ "کیا ہوا آنٹی خیریت تو ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بیٹا خدا کے لیے جلدی آ جاؤ درخشاں کا قتل ہوگیا ہے۔"

"کیا!" مجھے ایک زبردست جھٹکا سا لگا تھا۔ "درخشاں کا قتل؟"

"ہاں بیٹا وہ رات نو بجے کے قریب سامنے مارکیٹ کی طرف گئی تھی۔ وہاں سے کچھ غنڈے اس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگتی رہی لیکن انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ میری بیٹی کے ساتھ زیادتی بھی کی اور اسے مار کر بھی پھینک دیا۔"

میرے خدا میں نے یہ کیا کیا کیسی نیوز سن لی تھی۔

میں نے اپنے موبائل کو دیکھا۔ اس کا آخری میسیج آیا تھا۔ "خدا کے لیے میری مدد کے لیے آ جاؤ۔ کچھ غنڈے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں عثمانیہ ہال کے پیچھے جا کر چھپ گئی ہوں۔ آ جاؤ جلدی آ جاؤ پلیز۔"

اس کے بعد اس کا کوئی میسیج نہیں تھا۔ وہ مجھے مدد کے لیے بلا رہی تھی اور میں نے اپنا موبائل آف کر دیا تھا۔ میں نے اس کے میسیج کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

خدا نہ کرے کہیں آپ کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ نہ ہو۔ اگر کسی کا میسیج آئے تو آپ چاہے اسے جواب نہ دیں لیکن میسیج کو پڑھ ضرور لیں ورنہ ساری عمر کا پچھتاوا آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اور التجا ہے، خدارا کسی کو خوامخواہ میسیج نہ کریں، ہوسکتا ہے وہ کسی کام میں بزی ہو اور میسیج ٹون اس کی یکسوئی کو توڑ دے، فارورڈ میسیج کی جو بیماری پھیلی ہے اس سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔ کسی کا ان باکس بھرنے، جنک فائل جمع ہونے سے وہ غصے میں بھی آسکتا ہے۔ اگر درخشاں میسیج پر میسیج نہ کرتی تو میں اس کا میسیج ضرور پڑھ لیتا۔

کھڑکی خوابوں کی

محترم مدیر
السلام علیکم
پہلی بار سرگزشت کے لیے ایک سچ بیانی ارسال کررہی ہوں، کیسی ہے اس کا فیصلہ قارئین کریں گے لیکن میں نے انداز تحریر دانستہ ویسا ہی رکھا ہے جس انداز سے خواتین کے ڈائجسٹوں میں لکھا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ میرا یہ انداز بھی قارئین کو گراں نہیں گزرے گا۔

حمیرا تبسم
(بہاولپور)

وہ سوئمنگ پول کے کنارے چکنے فرش پہ سر جھکائے اداس بیٹھی تھی۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کر رکھے تھے اور اپنا چہرہ گھٹنوں پہ ٹکائے اور رخ شفاف پانی کی جانب موڑے ہوئی تھی۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا اور ماحول پہ عجب سوگواریت طاری تھی۔ بہت کچھ کھونے کا احساس اس پہ کوڑے کی طرح برسا تھا اور پچھتاوے کے انمٹ نشان چھوڑ گیا تھا۔ اس کی فطرت میں کبھی پچھتانا تھا ہی نہیں۔ وہ تو تب بھی نہیں پچھتائی تھی جب آنگن میں لگے آم کے پیڑ سے گر جانے کی وجہ سے درد سے کراہتی اور شدت کرب سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ دوسرے دن پھر سے سب بھلائی نئے سرے سے پیڑ پہ چڑھتی جاتی، وہ درد اور ڈر کو مات دینے کی کوشش کرتی تھی اور امی کی جھڑکیوں کی پرواہ کیے بغیر کچی کیریاں توڑ کے کھاتی تھی زیادہ وقت تو پیڑ پہ بیٹھے ہی گزار دیتی تھی۔ جب وہ میٹرک میں بری طرح سے فیل ہوئی تو امی نے کافی مارا تھا اسے۔ پچھتائی تو وہ پھر بھی نہیں تھی اور تب بھی جب اس نے سجاول کا دل توڑا تھا اور کتنی بار توڑا تھا شاید گنتی کرنا ناممکن تھا لیکن آج وہ پچھتا رہی تھی۔ آنکھوں میں چمکتے لو دیتے خوابوں کے دیپ بجھ چکے تھے، اور وہ ویران آنکھیں لیے تماشا دیکھ رہی تھی۔

یادیں کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں، دبے پاؤں دل پہ قدم رکھتی ہیں، چاہے وہ یادیں خوشگوار ہوں چاہے پچھتاوے سے بھری۔ ان کا کام صرف آنا ہے اور آ کے ہی دم لیتی ہیں۔

امی، آپ یہ مت سوچیں کہ میں اس پینڈو سجاول سے شادی کرلوں گی۔ دیکھا نہیں آپ نے کس طرح بنا شرمائے ہاتھ میں چھابیاں پکڑے لایا تھا اور بڑے فخر سے کہہ رہا تھا، خالہ جان یہ چھابیاں امی نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہیں لیکن کھجور کے پتے میں لایا تھا۔ توبہ توبہ اس کے ہاتھ میں چھابیاں دیکھ کے لوگ کتنا ہنسے ہوں گے۔ مجھے شوق نہیں ہے مذاق بننے کا۔"

نازیہ جیسے پھٹ ہی پڑی تھی اور ویسے بھی کسی کی تذلیل کرنے میں اسے مہارت حاصل تھی، اپنے پرائے کی پہچان ہی نہ تھی اسے، سجاول اس کا خالہ زاد تھا، اور اسے پسند بھی کرتا تھا، تب ہی خالہ نے رشتہ مانگا تھا اور زبیدہ بیگم کی تو جیسے مراد بر آئی تھی، جھٹ سے ہاں کہہ دی تھی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نازیہ چہرہ پہ غصہ سجائے ان کے سر پہ کھڑی تھی۔

زبیدہ بیگم نے کڑھائی کا سامان پرے دھکیلا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے سامنے چارپائی پہ بٹھایا، لیکن انداز میں واضح



غصہ تھا اور آنکھوں کی نرمی سختی میں بدل چکی تھی۔

"شریف لڑکا ہے وہ، سیدھا سادہ معصوم، اور تم بھی کونسا شہر میں رہتی، ہو تم بھی تو پینڈو ہی میٹرک فیل کہیں کی، دوسروں میں اچھائی ڈھونڈنے کی کوشش کیا کرو، بس میں نے فیصلہ کردیا تمہاری شادی ہوگی تو صرف سجاول سے۔"

ان کی دوٹوک بات سننے کے بعد نازیہ کی آنکھوں میں نمی جھلکی، مزید کچھ بھی بولنے کا ارادہ ترک کرکے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، زبیدہ بیگم پہ شکوہ بھری نگاہ ڈالنے کے بعد وہ کمرے میں چلی آئی۔

میٹرک فیل ہونے کا مطلب یہ ہرگز تھوڑی ہے کہ میرا رشتہ کسی بھی انسان کے ساتھ طے کردیا جائے، سجاول خود کو سمجھتا کیا ہے، میرے خوابوں کی تعبیر وہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جسے فصل، سبزی اور گنے کے بھاؤ کے علاوہ کچھ بولنا ہی نہیں آتا۔ عورتوں کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ مرد تو وہ اچھے لگتے ہیں جو شوخ جملے بولیں، اونچے اونچے قہقہے لگائیں، اور عورت کے حسن کو سراہیں۔ بس جو بھی ہو جائے میں اس سجاول نامی بلا سے شادی ہرگز نہیں کرنے والی، میں کیوں بند کروں خوابوں کی کھڑکی۔ انہی سوچوں میں گم فیصلہ کن انداز میں ایک گہری سانس بھری اور مطمئن ہونے کی ناکام کوشش کی۔ خوبصورت آنکھوں میں من پسند سپنے اترے تو خوبصورت مسکان نے لبوں کا احاطہ کرلیا۔

☆......☆

لان میں لگے آم کے درخت سے کیری گرنے کی آواز آئی تو اس نے سر اٹھا کر چونک کے اس جگہ دیکھا جہاں کیری گری تھی اور درخت پہ بیٹھے شور مچاتے پرندوں کو، یہ پرندے روز ہی کچی کیریوں کو چھیڑتے اور وہ ٹوٹ کے زمین بوس ہو جاتیں، اکثر ٹھیک ہوتیں جب کہ کچھ آدھی۔ وہ تھکے وجود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے سوئمنگ پول کے کنارے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ننگے پاؤں نرم نرم گھاس پہ ڈال لیے، آج تو اسے یہ نرم گھاس بھی آگ کی مانند محسوس ہوئی جو پیروں کو جھلسا رہی تھی۔ تنہائی اس کی ذات کا حصہ بن چکی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اکتا جاتی اور بے آواز آنسو بہانے لگتی، خود کو کوستی، یہ زندگی اس نے خود ہی تو چنی تھی۔ ایسا ہی بڑا گھر اسے پسند تھا، جس میں زندگی کی ہر سہولت موجود ہو پودے ہوں پھول ہوں اور گاڑی کے ساتھ نوکر چاکر ہوں۔ یہ سب پانے کے بعد بھی وہ افسردہ تھی۔

اب وہ سمجھ چکی تھی کہ ضروری نہیں سنہرے خوابوں کی کھڑکی صرف جنت کی طرف ہی کھلتی ہو کبھی کبھار ذرا سی چوک سے جہنم کی جانب بھی کھل سکتی ہے۔ پیروں میں صدیوں کی مسافت جیسی تھکاوٹ تھی اور خوبصورت آنکھیں نمکین اشکوں سے لبالب بھر چکی تھیں۔ اس نے لان میں کھڑے ہو کے چاروں جانب نظر گھمائی تو محسوس ہوا یہ گھر نہیں گھٹن زدہ بھٹی ہے جو انگاروں سے بھری ہے اور رفتہ

رفتہ تن من کو جھلسا کے رکھ دے گی لیکن اب اسے یہیں جینا تھا، یہ اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ ان خوابوں کی جو اس نے اپنوں کا دل کچل کے حاصل کی تھی۔

اس نے کلائی میں باندھی رسٹ واچ پہ نگاہ ڈالی اور تیزی سے کمرے کی جانب دوڑی، اس کے شوہر کے گھر آنے کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ آئینے میں اپنا عکس بغور دیکھنے لگی۔ میک اپ کی تہہ جمانے کے بعد اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے حلقے اور چہرے پہ چھایا زردپن چھپ گیا تھا۔ خوبصورت چہرے کے نقوش واضح ہو چکے تھے، وہ خود کو سرتاپا دیکھتے ہوئے زخمی انداز میں مسکرائی اور لپ اسٹک کا آخری ٹچ دیتے ہوتے ہوئے خود کلامی کی۔ آخرکار، مصنوعی مسکراہٹ لبوں پہ سجانا مجھے آ ہی گیا۔ میں نے بھی سیکھ لی منافقت۔ پچھتاوے، نارسائی کا احساس ہونے کے باوجود بھی خوش نظر آنے کا فن بھی کتنا نرالا ہے۔'' پھر بے اختیار ہی اس نے قہقہہ لگایا جب کہ دل اندر سے رو رہا تھا۔

تم ہمیشہ کی طرح شاندار ہو۔ تمہاری اسی مسکراہٹ نے میرا دل اسیر کیا تھا، وہ کمرے میں آ چکا تھا اور اس کے پیچھے کھڑا مسکراتی نظروں سے دیکھ کر بولا تو وہ اس کی طرف گھوم گئی۔ اس کے چہرے پہ کچھ کھوجنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی نگاہیں جھکا لیں۔

''کیا ناراض ہو؟'' وہ اس کے قریب ہوا تو وہ ذرا پیچھے ہوئی، چہرے پہ زبردستی مسکراہٹ سجاتے ہوئے شکوہ کناں نظروں سے اس کی جانب دیکھا جس کے چہرے پہ سکون رقم تھا، واقعی مطلب پرست اور خود غرض انسان کے چہرے پہ سکون ہونا ہی چاہیے۔ ایسی ہی سوچوں میں گھری وہ بے اختیار شکوہ زبان تک لے ہی آئی۔ ''مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے، مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ تم کئی دنوں بعد گھر آتے ہو، مجھے بھی تمہاری ضرورت ہے، بس تم مجھے چھوڑ کر کہیں مت جایا کرو۔''

وہ منت بھرے لہجہ میں بولی تھی اس شخص کے چہرے پہ پھیلی نرمی نے سختی کا روپ دھار لیا، وہ اس کو کلائی سے تھامے بیڈ تک لے آیا اور دوسرے ہی پل بیڈ پہ دھکا دینے والے انداز میں بٹھایا۔ ''آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ لگتا ہے تمہیں خوشیاں راس نہیں ہیں، سب جانتے ہوئے بھی میرا جینا حرام کرتی ہو۔ میں نے تمہیں اس وڑبے نما گھر سے اٹھا کے اس عالیشان گھر میں جگہ دی، تم سے شادی کی، لیکن تم ناشکری ہو۔ پینڈو کہیں کی۔''

وہ اس کے سامنے کھڑا حلق کے بل چلّایا تو وہ تڑپ کے ہی رہ گئی۔ تو یہ تھی میری اوقات جو اس نے دکھا دی، اس نے دکھی دل سے سوچا تو چند آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کے گالوں پہ آ ٹھہرے، کاجل کی ایک لمبی لکیر سی بن گئی۔ اس نے شاکی نگاہ اس بے رحم پہ ڈالی جو اس کا شوہر تھا۔ دولت تو دی تھی لیکن قربت میں فاصلے حائل کر رکھے تھے۔ نہ ہی کبھی زیادہ وقت دے سکا تھا۔

آنکھوں میں اجنبیت سموئے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''تو نہ کرتے مجھ سے شادی، اس عالیشان گھر سے بہتر تو میرے ماں باپ کا وہ وڑبہ نما گھر تھا، جس میں رشتوں کا مان رکھا جاتا ہے، دکھ سکھ میں شریک ہوا جاتا ہے، وہاں انسان بستے ہیں، وحشت نہیں۔ حارث! میں بیوی ہوں تمہاری، حق مانگتی ہوں اپنا۔'' وہ پورے یقین سے بولی تو حارث نے طنزیہ مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی، اور درشتی سے بولا:

''تمہیں کتنی بار یاد دلاؤں کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں، دو بچوں کا باپ ہوں۔ ان کو بھی ٹائم دینا ہوتا ہے۔ امی بڑی مشکل سے مانی تھیں ہماری شادی کے لیے۔ ابو جان کو تو ابھی معلوم نہیں، اور میں بتانا بھی نہیں چاہتا۔ میں کوئی اور عذاب پلے نہیں باندھنا چاہتا، تم ایک عذاب ہی کافی ہو۔''

وہ لفظوں کے تیر چلاتا اسے پاتال کی گہرائیوں میں دھکیل رہا تھا، اس بات سے قطع نظر کہ اس کے الفاظ سامنے بیٹھی لڑکی کو کتنے گراں گزر رہے ہیں۔ اس کے انداز میں پہلے والی چاہت مفقود تھی اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا، آئے روز یہی تماشا دُہرایا جاتا، اس میں کچھ قصور اس لڑکی کا تھا، خواب دیکھ لیے، منزل پالی لیکن سمجھوتا اور صبر کرنا نہ سیکھ سکی۔

''تو کیا میں تمہاری زندگی سے چلی جاؤں؟ یا پھر میرا وجود ارزاں ہے جس کی اہمیت نہیں۔ میری خواہش مادی اشیاء نہیں تم ہو حارث، میں کئی کئی دن تمہاری صورت دیکھنے کو ترس جاتی ہوں، تمہیں میں بجی سنوری مسکراتی ہوئی ملوں اس بات کا خیال رکھتی ہوں، کیا تمہیں میرے مسکراتے چہرے کے پیچھے چھپا دکھ دکھائی نہیں دیتا؟ یعنی تم اتنے اجنبی بن چکے ہو کہ سمجھ نہیں پاتے؟'' وہ منت کر رہی تھی، جب کہ وہ مسکرا رہا تھا۔

تمہاری ان فضول باتوں کا جواب فی الحال میرے پاس نہیں ہے، تیار ہو جاؤ کچھ دیر بعد ایک پارٹی میں جانا ہے، اور وہ میرون رنگ کی ساڑی پہن لینا، تم پہ جچتی ہے اور خدا کے لیے اپنا حلیہ درست کرو۔'' وہ کوفت سے بولتا ہوا واش روم میں گھس گیا اور وہ بے حس و حرکت وہیں بیٹھی رہ گئی۔ اب وہ ایسے نہیں جی سکتی تھی، جینا بھی نہیں چاہتی تھی۔ جب رشتے درد کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے دور چلے جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا اور آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو بے رحمی سے ہتھیلی کی پشت سے رگڑ ڈالا۔

☆......☆

''ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں......''

ٹی وی پہ فل والیم میں گانا دیکھتے ہوئے وہ مزے سے خود بھی ساتھ گنگنا رہی تھی اور امی کے کپڑے بھی استری کر رہی تھی، امی چونکہ ساتھ والی پڑوسن، خالہ جمیلہ کے ہاں گئی ہوئی تھیں اس لیے وہ بے فکر تھی ورنہ امی کی صلواتیں سن رہی ہوتی، یہ ڈش بھی اس نے منت کر کے لگوایا تھا ورنہ امی اس کے حق میں نہیں تھیں، پورے محلے میں واحد ان کا گھر تھا جہاں ڈش موجود تھا ورنہ لوگ ٹی وی انٹینا کی بدولت ہی چند چینلز دیکھ پاتے۔

وہ بڑے مزے سے کپڑوں پہ استری چلاتے ہوئے گنگنا رہی تھی کہ اچانک سجاول کمرے میں چلا آیا، اس کو دیکھتے ہی نازیہ گنگنانا بھول گئی اور بے اختیار ہی اس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹا جبکہ اس کی حالت پہ شک کرتا سجاول ہونق بنا اسے حیران نظروں سے دیکھنے لگا۔

اسے پریشان سا یوں اپنی جانب دیکھتا پا کے نازیہ نے بمشکل ہنسی کو کنٹرول کیا۔

''مجھے دیکھتے ہی ہنسنے لگ گئی، وجہ کیا ہے؟ سجاول کے چہرے پہ الجھن در آئی۔ اس نے سوالیہ نگاہیں نازیہ کے چہرے پہ ٹکا دیں

نازیہ نے استری کا پلگ نکالا اور ریموٹ سے ٹی وی کا والیم کم کرتے ہوئے ایک بھرپور نگاہ سجاول پہ ڈالی تو وہ مزید پریشان ہو گیا۔

ان آنکھوں کی مستی کے...... پھر سے گنگناتے ہوئے اس نے سجاول کی سرمے سے بھری آنکھوں پہ شرارت بھری نگاہ ڈالی۔ ''ویسے یہ گانا تم پہ بڑا فٹ ہوتا ہے، سرمے سے بھری کالی سیاہ آنکھیں، قسم سے لڑکیوں کی آنکھوں کو مات دیتی آنکھیں۔'' وہ ایک ہی سانس میں بول گئی تو سجاول کا منہ بن گیا۔

''اب تم میرا مذاق اڑاؤ گی؟ سچ میں مجھے آنکھوں میں سرمہ لگانا بالکل پسند نہیں، وہ تو بس اماں لگا دیتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں میں اب تک بچہ ہی ہوں۔'' سجاول نے شرمندہ ہوتے ہوئے صفائی پیش کی۔

''ہاں جانتی ہوں کتنے معصوم بچے ہو، اپنی اماں سے شادی کی بات کر سکتے ہو اور میرے سامنے بھولے بنتے ہو

بہت خوب۔'' نازیہ نے آج دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی اور سامنے رکھی بان کی چارپائی پہ ٹک گئی۔

سجاول کے چہرے پہ خوشی کے رنگ بکھرے اور اس کی سرمہ بھری آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ وہ دھڑکتا دل لیے نازیہ کی معصوم صورت دیکھنے لگا اور بمشکل بولا۔ ''جی شادی کی بات تو میں نے کی تھی۔ آپ کیا کہتی ہیں؟ راضی ہیں کیا؟'' .... سجاول امید بھرے لہجے میں بولا تو نازیہ کا حلق تک کڑوا ہوگیا، وہ درشتی سے بولی۔

''میں تم جیسے پینڈو اور ان پڑھ بندے سے شادی نہیں کرسکتی، عورتوں کی طرح سرمہ لگاتے ہو، شلوار قمیض پہنتے ہو اور تم مجھے دے بھی کیا سکتے ہو؟ نہ ہی اچھا گھر نہ ہی خوشیاں اور ویسے بھی میرے خواب بہت بلند ہیں، تم ان میں دور تک نہیں ہو۔ بہتر ہے میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔''

اس کا زہر خند لہجہ، نفرت بھرے الفاظ سن کے سجاول کے چہرے پہ پھیلی مسکراہٹ سمٹ گئی، سرمہ بھری آنکھوں میں امید کی کرن مدھم ہوئی تو دکھ، نارسائی کا غم نمی کی مانند چمکا اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے اپنی ذات کی نفی ہوتی دکھائی دی تو وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا لیکن شدت غم سے اس کا وجود ناسور کی طرح دکھ رہا تھا۔

''میں ہمیشہ سمجھتا تھا کہ تمہاری مجھ سے بے زاری ایک بچپنا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائے گی لیکن تمہارے رویے اور اپنے متعلق تمہاری نفرت جان کے میری خوش فہمی ختم ہوگئی ہے، تم ٹھیک کہتی ہو میں واقعی پینڈو اور عقل سے عاری شخص ہوں جو تمہیں سمجھ نہیں پایا، تمہیں چاہتا رہا اور عزت سے اپنانا چاہا۔ خواب تو سب کے ہوتے ہیں میرے بھی ہیں لیکن پورے وہی ہوتے ہیں جو حد میں رہ کے دیکھے جائیں۔ ایسے خواب جو کسی کا دل کچل دیں اس کی عزت نفس مٹا دیں ان کی تعبیر کبھی خوبصورت نہیں ہوسکتی۔'' وہ دکھ سے چور لہجے میں بولا اور زخمی نگاہ پہ ڈالی جس کی آنکھوں میں سوائے نفرت کے وہ کچھ نہیں کھوج پایا۔ وہ بھی خاموش بیٹھی اس کی بات پہ غور کیے گئی جو اتنے عرصہ بعد آج اتنی روانی سے بول پایا تھا۔

''میں جارہا ہوں، کبھی سامنے نہیں آؤں گا۔ دعا ہے تمہیں خوابوں کی تعبیر مل جائے۔ مجھے تو ملی نہیں۔'' وہ زبردستی ہنسا اور کمرے سے باہر کی جانب قدم موڑ لیے۔ نازیہ نے اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ واضح محسوس کی لیکن جلد ہی رخ موڑ لیا اور اپنی کامیابی پہ مسکرائی۔

''ارے سجاول بیٹا تم کب آئے اور جا کیوں رہے ہو، خیریت تو ہے؟'' زبیدہ بیگم نے گھر میں قدم رکھا تو سجاول پہ نگاہ پڑی جو واپس جانے کے لیے دروازہ پر کھڑا تھا۔

''جی خالہ وہ میں یہاں سے گزر رہا تھا سوچا آپ سے ملتا چلوں، آپ تھیں نہیں اس لیے واپس جا رہا ہوں۔'' سجاول نے اصل بات چھپائی اور زبردستی مسکرایا لیکن سامنے زبیدہ بیگم تھیں اس کے چہرے پہ رقم دکھ محسوس کیا تو کھوجنے والی نگاہ اس پہ ڈالی۔

''نازیہ نے کچھ کہا کیا؟'' زبیدہ بیگم نے تصدیق چاہی

''نہیں۔'' سجاول نے کمال مہارت سے جھوٹ بولا اور گھر کا دروازہ پار کر گیا۔ زبیدہ بیگم سب سمجھ گئی تھی، ان کی بیٹی ناسمجھ ثابت ہوئی تھی جس نے اپنی خوشیوں میں خود ہی انگارے بھر دیے تھے سچے اور معصوم انسان کو ٹھکرا دیا تھا۔

☆......☆

سجاول کے رشتے سے انکار کرنے کے بعد نازیہ پھر سے خوابوں میں ڈوب چکی تھی، اس پہ زبیدہ بیگم کی ملامت کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنی خوشی عزیز تھی، زبیدہ بیگم نے اس سے بات چیت کرنا کم کردی تھی اور ضرورت کے تحت ہی مخاطب ہوتیں۔

محلے میں نازیہ کی ایک ہی دوست تھی نیلم۔ جس کا کردار مشکوک تھا اور وہ تھی بھی کافی آزاد خیال۔ ہر وقت فون پہ لڑکوں سے باتیں کرتی رہتی اور بازار کے چکر بھی ضرور لگاتی۔

نازیہ اس کے گھر آئی ہوئی تھی جبکہ زبیدہ بیگم نے روکا تھا لیکن وہ کہاں سننے والی تھی۔ یہاں آکے ہی دم لیا اور اپنے خیالات نیلم کے گوش گزار کراتے ہوئے رائے طلب نگاہ اس پہ ڈال دی۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہاری اپنی زندگی ہے۔ اپنے خواب ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ تمہارے خواب چھینے اور سجاول تو ویسے بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم نے اسے منع کردیا بہت اچھا کیا، نیلم نے چائے کا کپ اس کے آگے رکھتے ہوئے مصروف انداز میں کہا تو نازیہ کو مزید حوصلہ ملا۔

''صرف تم ہی تو ہو جو میری بات سمجھتی ہو ورنہ امی تو مجھے عقابی نگاہوں سے گھورتی ہیں۔ تمہارے گھر آؤں تو منع کرتی ہیں، اب بتاؤ کیا میں کھل کے سانس بھی نہیں لے

سکتی؟'' نازیہ نے کہتے ہوئے منہ بنایا۔

اس سے پہلے کہ نیلم جواب دیتی اس کا موبائل بج اٹھا، کال اٹھاتے ہی نیلم کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی جب کہ نازیہ نے نگاہیں وال کلاک پہ ڈال لیں اسے آئے کافی ٹائم گزر چکا تھا اب اس کا ارادہ گھر واپس جانے کا تھا۔

''اتنی دیر بعد کال کیوں کی؟ کب سے تمہاری کال کا انتظار کر رہی تھی۔'' نیلم موبائل کان سے لگاتے ہی اس طرح بولی جیسے وہ کسی شناسا سے بات کر رہی ہو۔

کچھ دیر خاموش بیٹھی وہ کال کرنے والے کی بات سنتی رہی پھر ایک نگاہ نازیہ پہ ڈالی جو گھر جانے کے لیے اجازت طلب نگاہوں سے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''اچھا بات سنو، میری سہیلی سے بات کرو گے؟ بہت اچھی ہے۔ نیلم نے نازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے موبائل پر کہا تو نازیہ اپنی جگہ سے اچھل ہی پڑی، بھلے وہ ضدی تھی لیکن کسی اجنبی انسان سے بات کرنا اسے ہرگز گوارا نہ تھا جبکہ نیلم موبائل فون اس کی جانب بڑھا چکی تھی۔

''یار لائف انجوائے کرو، اچھا انسان ہے کرلو بات اور دولت مند بھی ہے۔'' یہ بات اس نے سرگوشی میں کہی تو نہ چاہتے ہوئے بھی نازیہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ موبائل فون کان سے لگا لیا جبکہ نیلم کسی کام کا بہانہ کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

''کیسی ہو آپ؟'' ایک نرم اور گھمبیر آواز نازیہ کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کا دل نئی لے پہ دھڑک اٹھا۔ وہ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بمشکل بولی۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں۔'' آہستہ آواز میں بولتے ہوئے نازیہ خاموش ہوئی تو دوسری طرف جاندار قہقہہ ابھرا۔

''لگتا نہیں کہ آپ نیلم کی دوست ہو، وہ بلا کی پُراعتماد بولڈ اور آپ ڈری سہمی خوبصورت آواز کی مالک لڑکی۔''

نازیہ کو لگا جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی ہو، اسے بات کرنا اچھا لگنے لگا۔ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا اور وہ بھی ہنسنے لگی۔

مسکرا مسکرا کے اس کی باتوں کا جواب دینے لگی، وہ ایک پل میں اجنبیت کا پردہ چاک کیے اپنائیت اور چاہت کا لبادہ اوڑھے دوسری ہی دنیا کی سیر کرنے لگی، جہاں پہ دولت تھی، پیار تھا اور چاہنے والا ہمسفر۔

پھر اکثر ہی ایسا ہونے لگا۔ وہ بے قرار دل لیے نیلم

اُمید فاضلی ڈبائیوی

(1923-2005)

محمد ارشاد 7 نومبر 1923ء کو ڈبائی ضلع بلند شہر (بھارت) میں پیدا ہوئے، گھریلو ماحول ادبی تھا جس کی وجہ سے کم سنی میں ہی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ 9 سال کی عمر میں پہلی غزل کہی۔ استاد دعا ڈبائیوی ان کے چچا تھے ان سے اصلاح لینے لگے۔ بعد ازاں اس عہد کے نامور استاد نوح ناروی کی شاعری میں شاگردی اختیار کرلی۔ شعر گوئی کی مشق تمام عمر جاری رکھی۔ تمام اصناف شعری غزل، نظم، نغمات، مراثی اور مناقب وسلام جیسے کلام پر توجہ مرکوز رکھی۔ امید ڈبائیوی کو جب احساس ہوا کہ ''ڈب ڈبائیو'' قسم کی آوازوں سے نام بگڑ جاتا ہے تو انہوں نے اپنا خاندانی نام ''امید فاضلی'' استعمال کرنا شروع کردیا۔ امید فاضلی نے علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ وہاں علمی و ادبی ماحول سے ان کے شعر گوئی کے ذوق کو جلا ملی۔ کچھ عرصہ ماہنامہ ''الفاظ'' کے مدیر اعلیٰ کے فرائض بھی ادا کیے۔ ان کا پہلا مجموعہ ''دریا آخر دریا ہے'' 1979 میں شائع ہوا جسے ان کے تیکھے لہجے کی بنا پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ عروس البلاد کراچی کے بڑے بڑے مشاعروں کے انعقاد اور ان کی کامیابی کے لیے امید فاضلی کا نام مستند تھا۔ اگرچہ امید فاضلی نے آخری برسوں میں محفلوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ تاہم شعر و ادب کی رفتار سے وہ باخبر رہتے تھے۔ ''سر نینوا'' مرثیے اور مناقب اور قومی نغمات کا مجموعہ ''پاکستان زندہ باد'' کے علاوہ نعتیہ مجموعہ ''مرے آقا'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی۔ موصوف کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''تب وتاب جاوداں'' بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ 28 ستمبر 2005ء کو 82 برس کی عمر میں ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔ سخی حسن قبرستان ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء سٹی، کراچی

کے گھر آنے لگی اور اس شخص سے کال پہ ڈھیروں باتیں کرتی، نیلم کی امی تک خاموش رہتیں یا پھر سارا دن گھر سے باہر، اس لیے وہ آزادی سے بنا خوف کے نیلم کا موبائل استعمال کرنے لگیں۔ نیلم بھی اس کا ساتھ دیتی، پھر یوں ہوا کہ زندگی میں پہلی بار نازیہ نے امی کو بتائے بنا ہوٹل میں قدم رکھا اور نیلم کے ساتھ چلتے ہوئے اس شخص کے سامنے والی کرسی پہ جابیٹھی۔

وہ ایسا شخص تھا کہ کوئی بھی لڑکی اس کا ساتھ پانے کی طلب گار ہوسکتی تھی، اس کی شخصیت سے امارت ٹپک رہی تھی، وہ شخص بھی نازیہ پر والہانہ نگاہیں ٹکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ وقت کیسے گزرا پتا ہی نہ چلا۔ دونوں میں عہد وپیماں ہوئے، جبکہ حارث پہلے سے شادی شدہ تھا، لیکن نازیہ کو اس کی دولت سے غرض تھی، اس کے خوابوں کی کھڑکی خوشیوں کی جانب کھلے گی اسے یقین ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ نیلم کی شکر گزار تھی جس نے ان دونوں کی بات کروائی تھی۔ حارث نے شادی کا کہا تو وہ مزید ہواؤں میں اڑنے لگی۔ جلد ہی اس نے زبیدہ بیگم سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

☆☆☆

زبیدہ بیگم سبزی فروش سے سبزی خریدنے میں مصروف تھیں کہ وہاں موجود ایک عورت نے دوسری عورت کے کان میں سرگوشی کی۔ مگر آواز اتنی بلند تھی کہ زبیدہ بیگم نے بھی سن لیا۔

''زبیدہ کے چہرے پہ موجود سکون دیکھ کے لگتا ہے جیسے یہ بھی بیٹی کے ساتھ ملی ہوئی ہے، کل بھی میرے میاں نے نازیہ کو ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے دیکھا ساتھ میں ایک مرد تھا اور دوسری نیلم۔''

ان کی آواز زبیدہ کی سماعت سے ٹکرائی تو خفت سے ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی، سبزی وہیں چھوڑی اور بوجھل دل لیے گھر میں داخل ہوگئیں، جبکہ سبزی والا پکارتا رہا باجی سبزی تو لیتی جاؤ، لیکن سبزی کی فکر کسے تھی، جہاں بیٹیاں رسوا کروادیں وہاں دم گھٹنے لگتا ہے، جان سانسوں میں اٹک جاتی ہے اور زمانہ جینے نہیں دیتا، وہ غصے بھرے انداز میں اندر داخل ہوتے ہی نازیہ کو پکارنے لگیں۔

نازیہ، کہاں ہو تم، مجھے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا اور خود سکون میں ہو؟ شرم نہیں آئی تمہیں۔ نازیہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں گھماتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

وہ کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی کہ زبیدہ بیگم کی آواز پہ ڈرتے ڈرتے باہر صحن میں آگئی، دل میں خوف سا پیدا ہوا، کیونکہ آج سے پہلے زبیدہ بیگم نے اسے اتنے غصے سے نہیں پکارا تھا، آج تو ان کی آواز بھی اچھی خاصی بلند تھی اس لیے وہ سہمی نگاہوں سے روتی زبیدہ کو دیکھنے لگی۔

نازیہ پہ نگاہ پڑتے ہی زبیدہ بیگم کسی چیل کی مانند اس پہ لپکیں اور بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اسے پیٹنا شروع کردیا نازیہ اچانک اس افتاد پہ گھبرا سی گئی۔

''امی چھوڑیں مجھے، یہ کیا کررہی ہیں آپ؟'' وہ خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگی لیکن زبیدہ بیگم کی گرفت مضبوط تھی، ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا، نازیہ کو دائیں گال پہ ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تو درد کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے گال دہکنے لگا۔

''بتا کون ہے وہ جس سے تم ملنے جاتی ہو؟'' زبیدہ بیگم غم سے چور لہجے میں بولی تو نازیہ ساری بات سمجھ گئی، یعنی امی کو معلوم ہو ہی گیا۔ یہ سب سوچتے ہوئے وہ گال سہلانے لگی اور مضبوط لہجے میں بولی۔ ''چلو اچھا ہوا امی، آپ کو معلوم ہو ہی گیا، اس کا نام حارث ہے، اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، میں بھی اسے پسند کرتی ہوں، بات مکمل کرتے ہی وہ نگاہیں جھکا گئی کیونکہ زبیدہ ناقابل یقین نگاہیں اس پہ ٹکائے کھڑی تھی۔

''اچھا ہوا، تمہارا باپ یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی مر گیا، اگر زندہ ہوتا تو ضرور آج مر جاتا، سب لوگ ہماری عزت پہ انگلیاں اٹھا رہے ہیں، وہ بھی صرف تمہاری وجہ سے، تم نے اپنے ماں باپ کی سالوں سے بنائی عزت داؤ پہ لگادی، تمہارا دل نہیں پھٹا؟'' زبیدہ بیگم کے چہرے پہ حزن وملال بکھرا تھا، وہ ویران آنکھوں سے اس بیٹی کو دیکھ رہی تھیں جس کو آج تک کسی شے کی کمی نہیں آنے دی، لیکن آج اسی بیٹی نے ان کا مان چھینا تھا۔

''امی ہر انسان کو اپنی مرضی سے جینے کا پورا حق ہے، اور مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔ میں آپ کی طرح گھٹ گھٹ کے زندگی نہیں گزار سکتی، بس میں شادی کروں گی تو حارث سے ورنہ کسی سے نہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولتے ہوئے کمرے میں جانے لگی تو زبیدہ بیگم دہاڑیں، ان کی آواز سن کے وہ رک گئی۔ ''تمہاری شادی اس سے ہرگز نہیں ہوسکتی، یہ میرا اٹل فیصلہ ہے، اپنا سامان پیک کرو اور چچا کے

گھر جانے کی تیاری پکڑو، اب یہاں میں تمہیں ایک منٹ نہیں رکنے دوں گی، تمہارے چچا نے بھی ارباز کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے اور میں نے ہاں کردی ہے۔''

یہ الفاظ تھے یا کوئی انگارے جو سیدھے نازیہ کے دل پہ لگے اور تن من جھلسا گئے، اس کے چہرے کا رنگ تاریک ہوا اور دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے، وہ بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے زبیدہ بیگم کی جانب مڑی اور تنفر سے بولی۔ آپ نے اپنا فیصلہ سنا دیا اب میرا بھی سنیں، اگر آپ نے میری شادی حارث سے نہیں کی تو میں اس کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔'' نازیہ کا لہجہ کافی جارحانہ تھا اور آنکھوں میں واضح بغاوت تھی۔ وہ باغی بنی زبیدہ بیگم کے سامنے ڈٹ گئی تھی، اور یہ تک بھول گئی تھی کہ وہ ماں ہیں، وہی جس نے بہت پیار سے پالا، اس کو کسی شے کی کمی نہیں آنے دی، مشکلات کے آگے خود دیوار بن کے کھڑی ہوگئیں اور مایوسی وفکر کی سلگتی دھوپ اس پہ نہ پڑنے دی، چند لمحے کے پیار نے اس کو ماں کا قیمتی پیار بھلا دیا تھا۔

زبیدہ بیگم نے دہل کے اسے دیکھا، جو اپنی بات مکمل کرتے ہی تن فن کرتی کمرے میں چلی گئی تھی۔ جس کو کوکھ میں پالا تھا وہی کوکھ میں آگ لگا رہی تھی، کاش تم نہ پیدا ہوتی، میں بے اولاد ہی رہتی تو اچھا تھا۔ وہ زار وقطار روتے ہوئے ڈوبتا دل لیے چارپائی پہ بیٹھ گئیں، انہیں اپنی ہی بیٹی نے توڑ ڈالا تھا۔ جب غم دینے والا اپنا ہو تو دوا بھی نہیں ملتی آرام بھی نہیں آتا ان کے سینے میں بھی درد بڑھتا جارہا تھا۔

☆☆☆

وہ پارٹی میں نہ چاہتے ہوئے بھی شریک ہوئی تھی۔ چاروں جانب رنگ وبو کا سا عالم تھا۔ چہرے پہ میک اپ کی تہہ جمائے گہرے رنگوں کے ملبوسات زیب تن کیے خواتین عجیب مضحکہ خیز دکھائی دے رہی تھیں۔ حارث اپنے کولیگ کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ کسی بات پہ اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا تو اس نے افسردہ سانس خارج کی۔ ''میرا جینا حرام کرکے موصوف خود انجوئے کررہے ہیں۔ آج پارٹی میں نہ آنا ہوتا تو شاید یہ اپنی پہلی بیوی کے پہلو سے چپکے ہوتے اور میرے پاس بھی نہ آتے۔'' ان گنت سوچوں میں گھری وہ حارث پہ نگاہ جمائے کھڑی تھی۔ جلد ہی اکتاتے ہوئے اس نے نخوت سے سر جھٹکا اور رخ دوسری جانب پھیر لیا۔ جہاں کچھ مرد آپس میں سرگوشیاں کرتے اس کے سراپے کا جائزہ لینے میں مشغول تھے۔ ان کی بے باک نگاہوں کی تپش کے زیر اثر اس نے سٹپٹاتے ہوئے ساڑی کا پلو ٹھیک کیا اور جھنجلاہٹ بھرے انداز میں دوسرے کونے میں چلی آئی لیکن وہاں بھی چند خواتین ڈگمگاتے قدم لیے کسی گانے کی دھن پہ بے ڈھنگے انداز میں جھوم رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ مزید بدمزہ ہوئی، جبکہ وہ ایسی ہی پارٹیوں کی خواستگار تھی لیکن آج اسے سب برا لگ رہا تھا۔ دل چاہا یہاں سے بھاگ جائے لیکن حارث کی وجہ سے خاموش کھڑی رہی۔ اس کا پارہ تب ہائی ہوا جب ایک جھومتی ہوئی لڑکی حارث کے قریب آئی اور اس کا گال چھوتے ہوئے ڈانس کی پیشکش کی اور بغیر ایک لمحہ ضائع کیے حارث مان بھی گیا۔ مسکراتے ہوئے بانہیں اس کی کمر کے گرد حائل کیے جھومنے لگا۔

''میں واپس جانا چاہتی ہوں، سر چکرا رہا ہے میرا۔'' وہ حارث کو شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے قریب آئی اور تیز آواز میں بولی۔

حارث نے لڑکی کو خود سے دور کیا اور معذرت کرتے ہوئے کھا جانے والی نگاہ اپنی بیوی پہ ڈالی۔

''یار کیوں تنگ کرتی ہو، تم ایسا کرو بس کچھ دیر ویٹ کرلو پھر ہم چلتے ہیں۔'' وہ عادت کے برخلاف غصہ پیتے ہوئے نرم لہجے میں بولا تو اس کے چہرے پہ ناگواری پھیل گئی۔

''بس جانا ہے مجھے۔'' وہ ضدی پن سے بولی تو وہ ہار مانتے ہوئے سب سے معذرت کرنے لگا اور اسے بازو سے دبوچ کلب سے باہر لے آیا۔

''ویسے تو بہت پسند تھی تمہیں ایسی پارٹیاں؟ پھر تبدیلی کیسے آئی؟'' وہ طنزیہ مسکرایا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولتا ہوا گاڑی کا دروازہ کھولے اسٹیرنگ سیٹ سنبھال چکا تھا وہ بھی تپتے ہوئے ساتھ والی سیٹ سنبھال چکی تھی۔

''مجھے اب ایسی پارٹیوں میں آنا بالکل پسند نہیں اور تم نہ جانے کس طرح لڑکیوں سے فری ہوجاتے ہو۔'' وہ استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولی تو وہ سرتاپا سلگ گیا لیکن لبوں پہ خاموشی کی دبیز چادر اوڑھے انہماک سے ڈرائیو کرتا رہا۔

''مجھے امی کے گھر چھوڑ دو۔'' وہ خاموشی کو توڑتے ہوئے ہمت کرتے ہوئے بول ہی پڑی، کیونکہ وہ جانتی تھی حارث امی کا نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ جاتا تھا۔

اس کی بات سن کے حارث نے بغور سخت نگاہ اس پہ

اگر میت کو خلا میں چھوڑ دیا جائے تو کیا ہوگا؟

اگر کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے جسدِ خاکی کو خلا میں چھوڑ دیا جائے جبکہ وہ کسی حفاظتی خول وغیرہ میں بند بھی نہ ہو تو چند گھنٹوں، چند دنوں، چند مہینوں اور یہاں تک کہ کئی برسوں کے بعد اس کے جسم پر کیا بیتے گی؟

اب تک اس بارے میں کوئی تجربہ تو نہیں کیا گیا لیکن کچھ سائنسی اندازے ضرور لگائے گئے ہیں جو بڑی حد تک مناسب بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اندازے کیا ہیں؟ ملاحظہ کیجیے:

خلا میں نہ تو ہوا ہوتی ہے اور نہ ہی نمی، یعنی اگر کسی مردہ جسم کو خلا میں چھوڑ دیا جائے تو اس میں موجود نمی بڑی تیزی سے ختم ہو جائے گی۔ چونکہ انسانی جسم کا 80 فیصد حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے ماہرین کا اندازہ ہے کہ مُردہ جسم کے خلا میں چھوڑے جانے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی اس کی کمیت صرف 20 فیصد رہ جائے گی۔

زمین پر زندہ حالت میں 100 کلوگرام وزنی انسان جب مرنے کے بعد خلا میں پہنچے گا تو کچھ ہی دیر میں وہ صرف 20 کلوگرام وزنی رہ جائے گا۔ وہ ہڈیوں کا ایک ایسا ڈھانچا بن چکا ہوگا جس پر کھال منڈھی ہوگی۔ یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف ایک گھنٹے میں وہ شخص ایک ''خشک ممی'' میں تبدیل ہو چکا ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ پانی وہ مادّہ ہے جو زندگی کی اہم ترین ضرورت بھی ہے اس لیے پانی کی عدم دستیابی پر انسانی جسم میں موجود تمام جراثیم بھی بڑی تیزی سے ختم ہو جائیں گے یعنی خلا میں مُردہ انسانی جسم گلنے سڑنے سے بھی محفوظ رہے گا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خلا میں مُردہ جسم کو جراثیم مرجانے کے بعد گلنے سڑنے کا سامنا نہیں ہوگا تو کیا وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا؟ اس سوال کے مختلف جوابات ہیں۔ اگر مُردہ جسم زمین کے گرد نچلے مدار میں گردش کر رہا ہوگا تو اس کا مدار بتدریج مختصر ہوتا چلا جائے گا اور چند گھنٹوں سے لے کر چند دنوں کے اندر اندر ہی وہ زبردست رفتار کے ساتھ زمینی کرہ ہوائی میں داخل ہو جائے گا۔ یہاں ہوا کے ذرّات سے شدید رگڑ اور زبردست درجہ حرارت کی وجہ سے وہ صرف چند لمحوں میں جل کر راکھ ہو جائے گا اور بالائی کرہ ہوائی میں بکھر جائے گا۔ زمین سے دیکھنے پر یہ منظر شہاب ثاقب کی طرح دکھائی دے گا۔ اس سے کچھ زیادہ بلندی پر وہ مدار ہے جہاں خلائی ملبے (space debris) کی بڑی مقدار زمین کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ صرف چند ملی میٹر باریک ذرّات سے لے کر چند سینٹی میٹر جتنے بڑے ٹکڑوں پر مشتمل اس خلائی ملبے کا بڑا حصہ پرانے مصنوعی سیارچوں اور خلائی راکٹوں کی باقیات پر مشتمل ہے اور اس کی رفتار کئی کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ اگر کوئی میت اس مدار میں ہوگی تو قوی امکان ہے کہ خلائی ملبے کے ٹکڑے اس سے بھی ٹکرائیں گے اور اپنی غیر معمولی تیز رفتار کی وجہ سے لاش پر گڑھے ڈال سکتے ہیں اور اگر ٹکرانے والے ملبے کی جسامت زیادہ ہوئی تو ایسا ایک ہی ٹکڑا میت کے پرخچے اُڑا دینے کے لیے کافی ہوگا۔ اس سے بھی اوپر تقریباً 36 ہزار کلومیٹر کی بلندی پر وہ مدار ہے جس میں مواصلاتی سیارچے زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں اور جسے ''ارض ساکن مدار'' (جیو اسٹیشنری آربٹ) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مدار قدرے پُرسکون ہے اور یہاں پہنچنے والی میت کے لیے خلائی ملبے سے ٹکرانے کے امکانات خاصے کم ہیں۔ البتہ، مدار چاہے کوئی بھی ہو لیکن اتنا ضرور طے ہے کہ خلا میں بھیجی جانے والی کسی بھی میت کو (خصوصی حفاظتی انتظامات کے بغیر) سورج سے آنے والی خطرناک شمسی ہواؤں اور کائناتی شعاعوں کی بڑی مقدار کا سامنا کرنا پڑے گا جو اسے کچھ ہی عرصے میں جھلسا کر کوئلے جیسا سیاہ کر دیں گی۔ تب یہ خلائی لاش کسی بے ہنگم پتھر کی طرح دکھائی دے گی۔

یہ تو ہوئی زمینی مدار میں میت پہنچانے کی بات لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی لاش زمین کی بجائے سورج کے گرد مدار میں پہنچا دی جائے۔ تب کیا ہوگا؟ اگر سورج کے گرد ایسی کسی لاش کا مدار چھوٹا ہوا یعنی اس کا فاصلہ سورج سے کم ہوا تو اس کا حشر بھی کم و بیش وہی ہوگا جو زمینی مدار میں چکر لگانے والی کسی لاش کا ہو سکتا ہے، اور جس کا تذکرہ اوپر کی سطور میں کیا جا چکا ہے۔ تاہم اگر وہ میت کسی بہت بڑے مدار میں پہنچا دی جائے جہاں وہ سورج سے بہت فاصلے پر رہتے ہوئے اس کے گرد چکر لگا رہی ہو تو اس تک پہنچنے والی شمسی ہواؤں کی شدت بھی بہت کم رہ جائے گی یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے انتہائی سرد اور قدرے محفوظ ماحول کا سامنا ہوگا جہاں وہ ہزاروں لاکھوں سال تک اسی حالت میں رہتے ہوئے چکر لگاتی رہے گی۔ دور دراز خلا کا ماحول انتہائی سرد بھی ہوتا ہے جس کا اوسط درجہ حرارت صرف 2.73 ڈگری کیلون یعنی منفی 270 ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی کم ہوتا ہے۔ خلا کے اس تاریک اور شدید سرد ماحول میں کوئی بھی لاش برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی رہے گی اور اگر اسے کسی ناگہانی آفت کا سامنا کرنا نہیں پڑا تو وہ کروڑوں اربوں سال تک تقریباً اسی حالت میں رہے گی۔

مرسلہ: ثمینہ خانم۔ ملتان

ڈالی اور پیشانی پہ کئی ناگواری کے بل سجاتے ہوئے اونچی آواز میں بولا،

''تمہیں روکا تھا ناں وہاں زیادہ جانے سے؟ بس اب چپ رہو، میرے صبر کا امتحان مت لو۔'' وہ درشتی سے بولتا ہوا اس کا دل توڑ گیا، اس کی آنکھیں نمکین آنسوؤں سے بھر آئیں، اس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری اور نگاہیں جھکاتے ہوئے الفاظ جوڑنے لگی۔

''پلیز آج جانے دو۔ وہ التجائیہ انداز میں گویا ہوئی تو حارث کے چہرے پہ پھیلی سختی میں مزید اضافہ ہوا اور وہ نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے درشتی سے بولا۔

''ٹھیک ہے آج مل لو اپنی امی سے، لیکن پلیز مجھے بھی سمجھنے کی کوشش کرو، تمہاری ماں ہماری شادی کے حق میں نہیں تھی اس لیے میرے دل سے اتر گئی اور میرے آگے بار بار اس ماں کا نام لے کے ڈسٹرب مت کیا کرو۔''

وہ اس پہ حکم صادر کیے اس کی حالت سے بے نیاز ڈرائیو کرنے میں مگن تھا اور کار اس کی امی کی طرف جانے والی روڈ کی جانب موڑ دی تھی۔ وہ سر جھکائے اداس چہرہ لیے خاموش بیٹھی رہی بالکل بے جان گڑیا کی طرح جسے چابی سے چلایا جاتا ہو۔

اس کے خیال میں دیر سے سہی لیکن حارث نے اسے امی سے ملنے کی اجازت تو دی تھی۔ دل میں وہ مکمل طور پہ حارث سے بدظن ہو چکی تھی اور اس کا ارادہ امی کے گھر جا کے واپس نہ لوٹنے کا تھا۔

☆☆☆

سجاول کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو چکی تھی، خالہ کارڈ دینے آئیں تو نازیہ کو نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے حسرت بھری آواز میں گویا ہوئیں۔ ''میرا سجاول واقعی بیوقوف ہے، نازیہ جیسی سگھڑ اور خوبصورت لڑکی کو ٹھکرا کے اپنے چاچا

کی بیٹی عالیہ کو پسند کر لیا۔''

توے پہ روٹی ڈالتی نازیہ نے حیران انداز میں خالہ کی جانب دیکھا جب کہ زبیدہ بیگم نے ملامت بھری نگاہ نازیہ پہ ڈالی۔

''کیا واقعی سجاول اتنا اچھا ہے، سارا الزام اپنے سر لے لیا اور میری عزت بچا لی۔ نازیہ شرمندہ ہوئی روٹی ڈالتے ہوئے سوچنے لگی، لیکن اس کی شادی کا سن کے بوجھل دل کو قرار سا آ گیا یعنی اس کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔

''عالیہ بہت سگھڑ لڑکی ہے اور پڑھی لکھی بھی بہت ہے، سجاول سمجھدار ہے کہ عالیہ کا انتخاب کیا، زبیدہ بیگم نے اپنی بہن عبیدہ بیگم کو دیکھ کے نرمی سے کہا اور ایک کٹیلی نگاہ نازیہ پہ ڈالی، اپنی امی کی بات سن کر نازیہ گڑبڑا سی گئی اور انجان نظر آنے کی اداکاری کرنے لگی۔

''بس بہن کیا بتاؤں، میرے دل میں ارمان تھا کہ نازیہ میری بہو بنے لیکن ہوتا وہی ہے جو رب سوہنڑے کو منظور ہو۔'' عبیدہ بیگم نے عاجزی سے کہا تو زبیدہ بیگم سر ہلا کے رہ گئیں، اب وہ بہن کو کیسے بتاتیں کہ کھوٹ تو ان کی اپنی بیٹی میں ہے، ان کا بیٹا تو لاکھوں میں ایک ہے جس کا دل اتنا بڑا ہے کہ سارا الزام اپنے سر لے لیا، رشتے سے انکار نازیہ نے کیا جبکہ سجاول نے انکار کا لیبل اپنے اوپر سجا لیا، یہ سب سوچتے ہوئے زبیدہ بیگم کی آنکھیں دکھ سے نم ہو گئیں، سجاول کو داماد کے روپ میں نہ دیکھ پانے کا غم ان کے چہرے پہ رقم تھا۔

''لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا، کچھ ہی دیر میں عبیدہ بیگم نے اجازت چاہی اور شادی پہ آنے کی یاددہانی کروائی تو نہ چاہتے ہوئے بھی زبیدہ بیگم نے جانے کی ہامی بھر لی۔

نازیہ نے کمرے میں جاتے ہی ٹرنک میں چھپایا ہوا موبائل نکالا اور حارث کو کال کر کے سجاول کی شادی کی

خوشخبری سنائی ،حارث یہ سن کے بہت ہی خوش ہوا کیونکہ اب ان کا راستہ صاف ہو چکا تھا، وہ با آسانی نازیہ کو اپنی دلہن بنا سکتا تھا لیکن دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ وہ اپنے والدین کو کیسے مناتا، اگر وہ کنوارا ہوتا تب انہیں منانا آسان تھا، امی تو پھر بھی مان جاتیں لیکن ابا جان بالکل نہ مانتے، الٹا جائیداد سے بھی عاق کر دیتے جبکہ پہلی شادی والدین کی مرضی سے کی تھی۔لڑکی اسے پسند نہ تھی اس لیے اس نے شرط یہ رکھی تھی کہ دوسری اپنی مرضی سے کروں گا۔تو بس اس نے امی کو منانے کا عہد کیا اور نازیہ کو پُرسکون رہنے کا عندیہ دینے کے بعد کال بند کر دی۔نازیہ کی آنکھوں میں اپنی من پسند زندگی گزارنے کے خواب اترنے لگے اور دل میں سکون اترتا چلا گیا۔جلدی سے موبائل ٹرنک میں واپس رکھا کیونکہ یہ موبائل حارث نے اسے لے کر دیا تھا جو کہ نازیہ نے امی کی آنکھوں سے پوشیدہ رکھا تھا اور جولڑکیاں اپنی من مرضی کرتی ہیں وہ ندامت کے سوا کچھ نہیں پاتیں، اندھیرے راستے پہ قدم رکھ دینے سے منزل روشن نہیں ہو پاتی نہ ہی سب کچھ ویسا ہوتا ہے جیسا دکھتا ہے۔

سجاول کی شادی کا دن بھی آن پہنچا، زبیدہ بیگم نازیہ سے خفا تھی لیکن پھر بھی اسے ساتھ چلنے کا کہا۔وہ دل سے تیار ہوئی کیونکہ سجاول نے خود انکار کر کے اس کا سر جھکنے سے جو بچا لیا تھا، وہ سوچ رہی تھی عالیہ بے حد عام شکل وصورت کی حامل غریب لڑکی ہوگی کیونکہ وہ سجاول کے ابو کی جانب سے رشتہ داروں کو زیادہ نہیں جانتی تھی اور اتنا زیادہ آنا جانا بھی نہیں تھا، لیکن اسٹیج پہ دلہن بنی بیٹھی عالیہ کو دیکھ کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی، وہ بہت خوبصورت تھی اور شرمگیں مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ ہمیشہ عام سے شلوار قمیص میں ملبوس رہنے والا سجاول آج بلیک کلر کے تھری پیس سوٹ میں کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔وہ دونوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔نازیہ کو اپنا آپ ان کے سامنے نہایت چھوٹا لگنے لگا تو وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی سر درد کا بہانہ کیے آخری والی کرسی پہ جا بیٹھی۔زبیدہ بیگم نے بھی اس کے چہرے پہ پچھتاوے کا عکس دیکھا لیکن خاموش بیٹھی رہیں۔واپسی پہ نازیہ بہت اداس تھی اس کے خیال میں خاندان بھر میں اس کے جیسی خوبصورت لڑکی موجود نہیں تھی لیکن عالیہ کے حسن اور تعلیم نے اسے مات دے دی تھی لیکن ایک بات اس کے لیے سکون بخش تھی کہ سجاول کے پاس دولت نہیں تھی۔یہ خیال آتے ہی اس کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔گھر آتے ہی اس نے جیسے ہی موبائل آن کیا حارث کی کال آ گئی۔حارث کی بات سنتے ہی نازیہ کا دل بے اختیار دھڑکا کیونکہ اس نے اپنی امی کو منا لیا تھا اور جلد ہی ان کے گھر رشتہ لے کر آنے والا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنی امی کو بھی ہماری آمد کا پہلے سے بتا دینا اور یہ بھی کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں لیکن تمہیں خوش رکھوں گا۔

باقی سب تو ٹھیک تھا لیکن نازیہ امی کا سوچ کے پریشان ہو گئی کیونکہ زبیدہ بیگم بالکل نہ مانتی لیکن اب جو بھی کرنا تھا نازیہ کو کرنا تھا اس نے امی سے بات کرنے کی ہامی بھری اور بات کر بھی لی۔زبیدہ بیگم کو جب یہ بتایا کہ حارث شادی شدہ ہے تو اس نے نازیہ کو کافی ملامت کی۔

جولڑکیاں کسی کا گھر اجاڑتی ہیں وہ کبھی خوش نہیں رہ پاتیں ، میں ہرگز تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔تمہاری شادی جنید کے ساتھ ہوگی کچھ دنوں تک تمہاری چچی اور چچا رشتہ لے کر آرہے ہیں سمجھیں تم؟ زبیدہ بیگم نے سختی سے کہا تو نازیہ خاموش رہی اور دل میں پیچ وتاب کھاتی حارث کو سب بتا دیا۔

میں کچھ نہیں جانتا بس تم چاہو تو اپنی امی کو منا سکتی ہو ورنہ بھول جاؤ مجھے۔حارث درشتی سے بولا تو نازیہ کی جان ہی نکل گئی، اس نے پھر سے کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور یقین دہانی کروائی کہ امی مان جائیں گی۔

اس کے چچا اور چچی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان کا بیٹا جنید نازیہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے تو زبیدہ بیگم کافی پریشان ہوئیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی حارث کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دی۔نازیہ نے جلدی سے حارث کو خوشخبری سنائی تو وہ اپنی امی کو لے کر ان کے گھر آ گیا، اس کی امی برا سا منہ بنائے ناقدانہ نظروں سے ان کے گھر کا ہی جائزہ لیتی رہیں۔دوسرے ہی دن ان کا نکاح ہو گیا اور وہ رخصت ہوتے ہوئے زبیدہ بیگم کے گلے لگی بے حد روئی۔زبیدہ بیگم ویران آنکھوں سے بت بنی کھڑی رہیں۔"

"امی مجھے دعا نہیں دیں گی؟" روتی اور سوجی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ رخ موڑتے ہوئے سخت لہجے میں بولیں۔

"جو بیٹیاں ماں باپ کے گھر سے بھاگ جائیں ان کو دعا نہیں دی جاتی۔"

امی کے منہ سے اتنی سخت بات سنتے ہی وہ سناٹے میں آ گئی۔وہ روتے ہوئے بولی۔

"امی! میں تو رخصت ہو رہی ہوں ، بھاگ تو نہیں رہی۔"

"اپنی مرضی کرنا، ماں باپ کی عزت خاک میں ملانا اور کسی عورت کا گھر اجاڑنا بھاگنے جیسا ہی تو ہوتا ہے۔"

زبیدہ بیگم نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا دیں اور غم سے چور لہجے میں بولتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں تو نازیہ بت بنی ان کے قدموں کو تکتی رہی جبکہ حارث زبیدہ بیگم کا یہ رویہ دیکھ کر دل میں ارادہ کر چکا تھا کہ وہ نازیہ کو یہاں زیادہ نہیں آنے دے گا۔

حارث نے واقعی نازیہ کو کسی شے کی کمی نہیں دی، اسے ہنی مون کے لیے نیویارک لے گیا، ان کا ہر دن عید ہوتا تھا لیکن جلد ہی وہ بدلنے لگا زیادہ تر وقت اپنی پہلی بیوی کے پاس گزارتا اور وہ تنہا رہتی۔کبھی تو راتوں کو ڈر جاتی اور جب شکوہ کرتی تو وہ لڑائی کرتا اور الٹا اسی سے شکوہ کرتا۔اسے امی سے بھی نہ ملنے دیتا۔ان دو سالوں میں وہ چار مرتبہ امی سے ملی تھی لیکن زبیدہ بیگم کا روکھا لہجہ دیکھ کر لوٹ آتی، زبیدہ بیگم ابھی تک خفا تھیں اس سے۔حارث کے دوستوں کا حلقہ احباب بھی خاصا وسیع تھا۔زیادہ تر تو لڑکیاں ہی شامل تھیں نازیہ جلے دل کے ساتھ یہ سب برداشت کرتی رہتی لیکن ایک لفظ تک نہ بولتی، حارث آئے دن ان کی دعوت کرتا، جب نازیہ نے نیلم کو بھی دعوت پہ بلانے کی بات کی تو حارث نے منع کر دیا۔

"جانتی ہو۔" نیلم نے تم سے بات کروانے کے عوض مجھ سے کافی رقم بٹوری تھی اور مجھے منع بھی کیا تھا کہ تم سے شادی نہ کروں صرف ٹائم پاس کروں اور ویسے بھی بلانا بھی چاہو تو وہ نہیں آ سکتی کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے وہ کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور اس کی ماں مارے صدمے کے گھر تبدیل کر چکی ہے، اللہ بچائے ایسی گھٹیا لڑکیوں سے جو ماں باپ کی عزت نیلام کر دیتی ہیں۔" حارث نے نیلم کے بارے میں نیا انکشاف کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

زدیا نے چاہا کہ وہ پوچھے کہ اس نے تمہیں مجھ سے ملوایا گویا اس سے تم پہلے سے واقف تھے مگر وہ کچھ بولی نہیں۔وہ خود ہی بولتا گیا۔"یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں نے انور کے ذریعے اس سے دوستی کی۔تمہیں یاد ہوگا کہ انور کی بہن کی شادی میں تم اور وہ آئی تھیں۔ میں تمہارے

مرد نقاب پہنتے ہیں

آپ یقیناً یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ نائیجیریا (افریقا) میں کوارح نامی قبیلہ کے مرد نقاب پہنتے ہیں۔

علی حنان۔فوجیوں والا

دنیا کی سب سے چھوٹی کار

☆اب تک جو سب سے بونے یا چھوٹے قد کی کار بنائی گئی ہے وہ چھت کی بالائی سطح سے نیچے سڑک تک صرف ساڑھے 29 انچ اونچی ہے۔ اس ہل میں امپ دی امریسڈ کار کو برطانیہ کے پیری ویکنس اور ڈینی کونس نے تیار کیا تھا۔

☆کولمبیا میں دنیا کا سب سے زہریلا جانور ایرومینڈک پایا جاتا ہے۔

☆واحد ممالیہ جو زہریلا ہوتا ہے وہ ڈک بل پلیٹس ہے۔

انتخاب: ردا نور۔فوجیوں والا

معصوم چہرے کی وجہ سے دھوکے میں آ گیا اور انور سے تعارف پوچھا تو اس نے نیلم کی حقیقت بتا کر ملاقات بھی کرا دی اور اس نے تم سے تعارف کرا دیا مگر تم نیلم کی طرح بری صحبت والی نہیں تھیں اسی لیے تم سے شادی کر لی۔

یہ بات سنتے ہی نازیہ سکتے میں آ گئی اور ندامت سے سر جھکا لیا گھر سے بھاگنے والی بات تو اس نے بھی اپنی امی سے کی تھی شکر ہے حارث کو یہ بات معلوم نہ ہو سکی ورنہ نہ جانے کیا ہوتا، اسے نیلم سے اس فعل کی امید ہرگز نہ تھی۔اسے اب سمجھ آنے لگ گیا کہ امی اس کے گھر جانے پہ کیوں منع کرتی تھیں۔

نازیہ کے پاس دولت تو تھی لیکن سکون نہیں تھا۔اس کے خواب سراب بن گئے تھے جن میں وہ بھٹک گئی تھی۔حارث کبھی تو بہت ہی اچھا بن جاتا لیکن اچانک ہی جنونی۔سجاول کا نام لے کر اس پہ شک کرتا تو وہ تڑپ ہی اٹھتی۔

آج کئی ماہ گزر جانے کے بعد وہ امی سے ملنے جا رہی تھی، تھوڑی دیر کے لیے سر سیٹ کی پشت سے لگایا تھا اور ماضی کے اوراق پلٹتے چلے گئے۔آنکھ تب کھلی جب کار ایک

جھٹکے سے رکی تو سامنے وہی گلی تھی جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اس کے گھر کا وہی دروازہ تھا جو ہمیشہ اس پہ مہربان رہا وہ ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھولتے باہر نکلی اور حارث کو بھی آنے کا کہا لیکن وہ تنفر بھری نگاہ اس پہ ڈالتا ہوا کار زن سے بھگا لے گیا لیکن آج وہ خود میں بے پناہ ہمت سمیٹے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

اس نے جیسے ہی دروازہ بجانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، دروازہ خود ہی وا ہو گیا وہ دھڑکتے دل کے ساتھ جیسے ہی اندر گئی ایک تین سالہ بچے سے ٹکرا گئی، خوبصورت سا معصوم بچہ اس کو دیکھ کے سہم سا گیا جبکہ نازیہ کے سینے میں پنپتی ممتا اُمڈ آئی اس نے بے اختیار ہی بچے کو چھونا چاہا کمرے سے باہر آتی زبیدہ بیگم ایک لمحے کو ٹھٹکی، نازیہ کی نگاہ جیسے ان پہ پڑی وہ دوڑتی ہوئی زبیدہ بیگم کے گلے سے جا لگی اور کسی بچے کی مانند آنسو اس کے گال بھگونے لگے۔ دل ہی دل میں اپنی بیٹی سے خفا زبیدہ بیگم کا دل پسیج گیا۔ وہ نازیہ سے لاکھ خفا سہی لیکن تھیں تو ماں نا، اور ماں کا سینہ بے حد فراخ ہوتا ہے جو اولاد کو سینے سے لگا ہی لیتا ہے۔

''خالہ، معیز کہاں ہے، میں نے کہا بھی تھا کہ اس کے لاڈ مت اٹھایا کریں بہت تنگ کرے گا۔'' اچانک کمرے سے نکلتی عالیہ نے عجلت میں زبیدہ بیگم کو آواز دی تو سامنے کا منظر دیکھ کر وہیں کھڑی رہ گئی اس کے پیچھے سانول بھی تھا، وہ بھی ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

''اب روتی ہی رہو گی یا اندر چل کے بیٹھو گی بھی۔'' زبیدہ بیگم نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے شیریں لہجے میں کہا تو نازیہ کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں، اس نے نگاہ اٹھا کے سامنے دیکھا جہاں عالیہ اور سانول کھڑے اسے ہی دیکھ رہے تھے، اس سے پہلے کہ وہ عالیہ کو گلے لگاتی عالیہ نے خود ہی آگے بڑھتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔

''اچھا ہوا تم آ گئی ورنہ خالہ تو ہر وقت تمہیں ہی یاد کرتی ہیں، کیا حارث بھائی نہیں آئے۔'' عالیہ نے متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن ناکام ہو رہی۔

''وہ آفس کے کام میں مصروف ہوگا اس لیے نہیں آ سکا، تم لوگ اندر چل کے بیٹھو میں شربت بناتی ہوں گرمی بھی تو بہت ہے۔'' زبیدہ بیگم نے عالیہ کے سوال پہ پریشان صورت بنائے کھڑی نازیہ کو پیار سے دیکھا اور خوبصورتی سے بات تبدیل کر لی۔

نازیہ نے مسکرا کے تشکر بھری نگاہ امی کی جانب ڈالی اور ان کے ساتھ کمرے میں چلی آئی، سانول بھی ننھے معیز کو سنبھالے ان کے پیچھے چلا آیا۔

''آپ کیسے ہیں؟'' نازیہ نے سوال کیا تو سانول نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جیسے پوچھ رہا ہو تم کیسا دیکھنا چاہتی ہو، لیکن جلد ہی نگاہیں جھکاتے ہوئے بولا۔

''بالکل ٹھیک ہوں۔ عالیہ نے میری زندگی جنت بنا دی ہے۔'' اس کے لہجے میں عالیہ کے لیے مٹھاس تھی۔

نازیہ نے بغور اس کا مشاہدہ کیا، وہ پہلے والا سانول تو کہیں کھو ہی چکا تھا، اس کی شخصیت میں جھلکتا وقار خوشیوں بھری زندگی کو ظاہر کر رہا تھا، وہ بات بھی پُراعتماد لہجے میں کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے وہ وارفتگی مفقود تھی جو کبھی نازیہ کے لیے ہوتی تھی، اب اس کی آنکھوں سے عالیہ کی محبت کا عکس جھلک رہا تھا، جبکہ عالیہ پہلے سے بھی زیادہ نکھر چکی تھی۔ معیز کی صورت میں ان کی زندگی مکمل ہو چکی تھی۔

نازیہ کے دل میں پچھتاوا کچوکے لگا رہا تھا، بہت کچھ کھونے کا احساس اس کی آنکھوں سے عیاں ہو رہا تھا، وہ نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھی تھی، جن خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے اس نے کئی دل توڑے تھے اب وہ ان سے شرمندہ تھی، حارث تو اسے ماں بننے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا اس کے خیال میں اس کی پہلی بیوی سے دو بچے تھے۔ وہ مزید بچے نہیں چاہتا تھا، اس لیے نازیہ کی گود ابھی تک خالی تھی۔ نٹ کھٹ سے معیز نے جب اس کی ساڑی کا پلو پکڑا تو نازیہ نے اسے گود میں اٹھا کر چوم لیا، اس کی پیاسی ممتا سیراب ہونے لگی، سانول نے ایک لمحہ لگایا سب سمجھنے میں، نازیہ کی آنکھوں سے اُمڈتا درد، چہرے پہ نارسائی کا کرب، لبوں پہ پھیکی مسکراہٹ، سب ہی تو نقلی لگا اسے، اور یہ سب محسوس کرنے کے بعد سانول نے اپنا دل ڈوبتا دیکھا تو کچھ ہی دیر میں عالیہ نے معیز کو لیے واپسی کی اجازت مانگی۔ زبیدہ بیگم انہیں روکتی رہ گئیں لیکن وہ نہ رکا اور واپس چلا گیا۔ عالیہ سانول کی اچانک واپسی کے فیصلے پہ چونک سی گئی لیکن کوئی سوال نہ پوچھا کیونکہ اس کی سرشت میں شوہر کا کہنا ماننا شامل تھا اس لیے وہ بھی نازیہ کو اپنے گھر آنے کا کہہ کے روانہ ہو گئی، اب کمرے میں سوائے نازیہ اور زبیدہ بیگم کے کوئی نہ تھا۔

زبیدہ بیگم نے محسوس کیا کہ نازیہ کے چہرے پہ تھکن کے ساتھ ساتھ دکھ بھی رقم تھا۔ ان کا دل مٹھی میں بند ہونے

لگا۔

''امی مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ کا دل دکھایا، اب دیکھیں نہ میں کتنی اکیلی ہوں۔'' نازیہ کی آنکھوں میں آنسو در آئے اور وہ شکست خوردہ انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا، وہ پچھتاوے اور کرب کی انتہا پہ تھی۔ زبیدہ بیگم نے نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

''دیکھو بیٹا، میں نے تو ہمیشہ تمہیں سمجھانا چاہا کہ زندگی کا فیصلہ سوچ سمجھ کے کرنا چاہیے لیکن تم نہیں سمجھیں، ہمیشہ اپنی مرضی کی، اور اب بیٹھی رو رہی ہو، یہ سوچے بنا کہ تمہیں یوں روتا دیکھ کے مجھے کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔'' زبیدہ بیگم نے نرم لہجے میں شکوہ کرتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو صاف کیے۔

''امی، حارث کئی دنوں تک اپنی پہلی بیوی کے ہاں رہتا ہے، مجھے تنہائی کاٹتی ہے، اور اولاد بھی نہیں چاہتا۔'' نازیہ نے بمشکل بات مکمل کی اور نگاہ چرا گئی۔

''ظاہر ہے وہ پہلی بیوی کے پاس ہی رہے گا اور اس کے پہلے سے ہی بچے موجود ہیں پھر وہ تم سے کیوں بچے چاہے گا، بیٹا قصور اس کا نہیں تمہارا ہے۔ اس نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ وہ شادی شدہ ہے پھر تم کیوں اس کی جانب مائل ہوئی اور اب اسے ہی موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو، بری بات۔'' زبیدہ بیگم نے اسے سمجھانا چاہا۔

نازیہ امی کے منہ سے کڑوا سچ سنتے ہوئے ندامت سے سر جھکا گئی لیکن دل میں ابھی بھی حارث سے بدظن تھی، وہ اس موڑ پہ تھی جہاں سے واپسی کے تمام راستے دھندلے تھے یا پھر بند پھر بھی لوٹنا چاہتی تھی۔ بیتے دنوں کو پھر سے کشید کرنا چاہتی تھی۔ جو رشتہ اس نے محبت سے سینچا تھا اب وہی اسے بوجھ لگنے لگا تھا۔ وہ اب اکتا چکی تھی اور دل کے نہاں خانے میں سجاول کو کھونے کا دکھ بھی ابھرنے لگا تھا۔ وہ خود کو اس سے برتر سمجھتی تھی لیکن بھول چکی تھی کہ کایا پلٹ بھی سکتی ہے۔ بے اعتنائی کے خود کے کھودے گڑھے میں وہ خود بھی گر سکتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں امی سے آنے کا مقصد بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ جوڑنے لگی۔

''امی، میں حارث کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی، وہ ہر وقت مجھے کم مائیگی کا طعنہ دیتا ہے، دل چاہے تو پیار سے بات کرتا ہے ورنہ خوامخواہ ہی موڈ خراب کر لیتا ہے، مجھے اس

وادی سندھ کی تہذیب

وادی سندھ کی پرانی تہذیب کا شمار جس کے آثار قدیمہ آج بھی ہڑپہ اور موئنجوداڑو کی شکل میں پاکستان میں موجود ہیں۔ زمانہ مسیح سے قبل دنیا کی تین بڑی تہذیبوں میں ہوتا تھا۔ دوسری دو تہذیبیں مصر میں دریائے نیل کے کنارے فرعونوں کی تہذیب اور مشرق وسطی میں میسوپوٹیمیا کی تہذیب تھیں۔ ان تینوں ہم عصر تہذیبوں کا زمانہ 3000ق۔م سے 1500ق۔م بتایا جاتا ہے۔ اس دور کو کانسی کا دور (Bronze Age) بھی کہتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں زیور، سکے اور برتن بنانے کے لیے کانسی کے بھرت کا استعمال عام تھا۔ سندھ کی تہذیب کو ہڑپہ تہذیب کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے کیونکہ ہڑپہ وہ پہلا شہر تھا جس کے آثار قدیمہ انیسویں صدی کے وسط میں ملنے شروع ہوئے اور 1920ء میں پورا ہڑپہ شہر دریافت ہوا۔ یہاں سے ملنے والی مہروں، برتنوں اور زیورات سے ماہرین آثار قدیمہ نے اندازہ لگایا ہے کہ 2200 قبل مسیح سے لے کر 1900 قبل مسیح تک ہڑپہ کی تہذیب اپنے عروج پر تھی پھر اچانک ہی اس تہذیب پر زوال آ گیا اور یہ تہذیب ماضی کی تہوں میں گم ہو گئی۔ آثار قدیمہ کے ماہرین ہڑپہ کے گرد و نواح سے ملنے والے انسانی ڈھانچوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کون سے عوامل تھے جو اس تہذیب کی تباہی کا سبب بنے۔ مختلف شواہد سے سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شروع شروع میں اس تہذیب کے لوگ انتہائی امن پسند، ملنسار اور بااخلاق تھے۔ ہر شہری کو بنیادی سہولتیں میسر تھیں اور معاشرہ طبقاتی اونچ نیچ سے پاک تھا مگر آہستہ آہستہ سوسائٹی میں بگاڑ آتا گیا۔ معاشی طبقات وجود میں آ گئے۔ حکمرانوں اور اشرافیہ کی طرف سے غریب اور لاچار طبقے کے لیے ناانصافیاں بڑھتی گئیں۔ نتیجتاً معاشرے میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جس نے بزور طاقت وسائل پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس کشمکش سے معاشرے میں تشدد، لاقانونیت اور انارکی پھیل گئی۔ رہی سہی کسر موسمیاتی تبدیلیوں اور وبائی امراض نے پوری کر دی اور اس طرح دنیا کی یہ عظیم تہذیب مکمل طور پر صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو گئی۔

سے کچھ نہیں ملا سوائے دولت کے اور میں آپ کے پاس لوٹ آنا چاہتی ہوں، میں پھر سے نئی زندگی کی شروعات کروں گی۔ بولتے ہوئے نازیہ کو اپنے ہی الفاظ اجنبی لگے۔اس کی بات سنتے ہی زبیدہ بیگم دہل سی گئیں۔ان کا دل صدمے کی زد میں تھا۔

غم کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ان کی آنکھوں سے عیاں تھا۔وہ بے یقینی سے تواتر سے بولتی نازیہ کو دیکھنے لگیں۔

ان کا دل چاہا ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ دے ماریں جو نہ جانے چاہتی کیا تھی، نہ جانے اور کتنے امتحان باقی تھے ذلت و رسوائی کے۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو، میرے سر میں پھر سے خاک ڈلواؤ گی۔ پہلے ہی لوگوں کی زبان بڑی مشکل سے بند ہوئی ہے۔'' زبیدہ بیگم بولتے بولتے ہانپنے لگیں ذرا دیر رک کے گہری سانس لی اور پھر سے گویا ہوئیں۔ ''اور تم خود کو تنہا کہتی ہو، تنہائی اور دکھ کیا ہوتا ہے مجھ سے پوچھو، تمہارے باپ کے فوت ہوجانے کے بعد میں نے کتنی محنت کی اور اپنی عزت بچاتے ہوئے کیسے تمہیں پالا، تم کیا جانو۔ خدا نے بیٹا نہیں دیا تھا۔ دل میں ارمان ہی رہ گیا، لیکن سجاول کو بیٹا سمجھا، تمہاری شادی اس سے کرنی چاہی لیکن تم نے بے لگام خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے اسے ٹھکرا کر انجان راہ پکڑ لی۔ آج اگر سجاول نہ ہوتا تو میں گھٹ گھٹ کے مر چکی ہوتی، وہ تو مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ میں اس پہ بوجھ نہیں بننا چاہتی، بہت بڑا ظرف ہے اس بچے کا اور تم ایک غلطی سدھارنے کے لیے دوسری بڑی غلطی کرنے کا سوچ رہی ہو؟ اپنے ماتھے پہ طلاق شدہ عورت کا کلنک لگا کے پھر بدنام ہونا چاہتی ہو، یا سوچتی ہو میں زندہ کیوں ہو؟ زبیدہ بیگم نے روتے ہوئے ملامتی نگاہ اس پہ ڈالی، نازیہ حیرت سے دونوں آنکھیں کھولے ان کو دیکھ رہی تھی اور سن رہی تھی، ان کے لہجے سے دکھ ٹپک رہا تھا، بوڑھے جھریوں زدہ چہرے پہ صدیوں جیسی تھکان تھی، وہ بولنے پہ آئیں تو بس بولتی ہی چلی گئیں۔ نازیہ نے سوچا تھا شاید امی اس کی تائید کریں گی۔

اب اپنی ہی سوچ پہ پچھتا رہی تھی، زبیدہ بیگم کے الفاظ اسے پتھر کی مانند لگے تھے۔ خود احتسابی کا آئینہ اس کا عکس دکھانے لگا تھا، زبیدہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ایسے بہہ رہے تھے جیسے آج ہی ختم ہونے ہوں، نازیہ تڑپ اٹھی، وہ انہیں مزید کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

''امی، آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔ آپ روئیں تو ناں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جو آپ چاہیں گی وہی ہوگا۔'' نازیہ نے ان کے سینے سے لگتے ہوئے یقین دلانا چاہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، فیصلہ ہوگیا۔ تم حارث کے پاس لوٹ جاؤ، وہ اتنا برا بھی نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ انسان غلطیاں ضرور کرتا ہے لیکن اس کی معافی بھی ہوتی ہے۔ آپس میں الجھتے رہنے سے رشتے کمزور ہوتے ہیں سوائے جگ ہنسائی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا بہتر ہے تم محبت، تحمل مزاجی اور سمجھوتے سے رشتے کو مضبوط کرو، حارث کو یقین دلاؤ کہ وہ تمہارے لیے اہم ہے، دیکھنا وہ بہت چاہے گا تمہیں، اور اسے ٹوکنا چھوڑ دو۔'' زبیدہ بیگم اسے سمجھا رہی تھیں اور وہ ان کی باتوں کو دل میں اتار رہی تھی، عمل کرنے کا سوچ رہی تھی، اس کے دل میں اچانک تمام شکوے، وہم، محبت میں بدلنے لگے تھے۔ وہ امی کو تشکر بھری نظر سے دیکھ رہی تھی، اپنی طرف یوں ٹکٹکی باندھے دیکھتا پاکر زبیدہ بیگم کو اس پہ بے اختیار پیار آیا تو انہوں نے جھٹ سے اس کی پیشانی چوم ڈالی، امی کے نرم اور ممتا سے بھرپور لمس پہ نازیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''میں کھانا بناتی ہوں، حارث کو فون کرو کہ تمہیں لینے آئے، ایسا نہ ہو وہ سوچے ماں کے گھر جا کے تم اسے بھول جاتی ہو۔'' زبیدہ بیگم نے اسے خود سے الگ کیا اور وہاں سے اٹھ گئیں۔

پہلی ہی بیل پہ حارث نے فون اٹھا لیا، نازیہ نے اسے کہا کہ مجھے لے جاؤ تو وہ حیران ہوا ورنہ اسے تو وہ نازیہ یاد تھی جو شکوہ ہی کرتی رہتی اور امی کے گھر جا کے پلٹنے کا نام نہ لیتی، اگر وہ بدلی تھی تو حارث نے بھی بدلنے کا سوچا۔

''چلو ٹھیک ہے، تم امی کے ساتھ مل کے رات کا کھانا تیار کرو، میں آ رہا ہوں۔'' کھانا مل کے کھائیں گے اور رات بھی تمہاری امی کے ہاں رہیں گے، وہ یہ کہتے ہوئے مسکرا رہا تھا جبکہ نازیہ کو اس کی بات سن کے خوشی بھرا شاک لگا، وہ ورطۂ حیرت میں گھری حارث کی بات کا یقین کرتی رہی، کال بند ہو چکی تھی اس نے مسکراتے ہوئے موبائل کو دیکھا اور اپنے اس گھر کے کچے آنگن کو جس سے اس کی یادیں جڑیں تھیں، ایک آسودہ سانس خارج کی، دل سے ایک بوجھ سا سرکا تھا۔ مغرب کی اذان سنتے ہی وہ وضو کرنے چلی گئی اس کا ارادہ سجدہ شکر ادا کرنے کا تھا۔